اتہاسک لاہور

لاہور میں خوابیدۂ خاک چند اُردو شاعر، ادیب اور صحافی

مُدثّر بشیر

اتہاسک لاہور

اتہاسک لاہور

لاہور میں خوابیدۂ خاک چند اُردو شاعر، ادیب اور صحافی

مُدثر بشیر

سانجھ

اتہاسک لاہور — تاریخی اور ادبی مضامین — مُدثر بشیر

اشاعتِ اوّل	:	نومبر 2018ء
سرورق خطاطی	:	کامران اکرم
سرورق مصوری	:	صائمہ شاہین (نقش سکول آف آرٹس، بھاٹی دروازہ لاہور)
فوٹو	:	حسن سجانی
پروف، ایڈیٹنگ	:	شاہد شیدائی، زاہد نبی، نبیحہ ارشد
کمپوزنگ	:	پرل کمپوزنگ سنٹر، میاں چیمبرز لاہور
ترقین	:	سُلیکھ
تعداد	:	500
قیمت	:	1500

Itehasik Lahore.

(Essays on Literary personalties buried in Lahore by Mudassar Bashir)

Copyright © Nov. 2018 1st Edition

Except in Pakistan this book is sold subject to the condition that it shall not, by way of trade or otherwise, be lent, resold, hired out or circulated without the consent of the author or the publisher in any form of binding or cover other than that in which it is published.

Printed by:
Naveed Hafeez Press, Lahore.

Price:
In Pakistan: Rs. 1500.00

Published by:

سانجھ
SANJH
PUBLICATIONS

Book Street, 46/2 Mozang Road, Lahore, Pakistan.
Phone: +92 42 37355323. Fax: +92 04 37323950
e-mail: sanjhpk@yahoo.com, sanjhpks@gmail.com
Web: www.sanjhpublications.com

ظہور الٰہی، ہذیلہ

اور

محمد طاہر

کے نام

جو نشانِ راہ بھی ہیں اور نشانِ منزل بھی

فہرست

O	اپنی بات	9
O	اُردو ادب کی چند نثری اَصناف کا مختصر جائزہ	16
1	مولوی نُور احمد چشتی	36
2	شمس العُلما مولانا محمد حسین آزاد	42
3	خان بہادر شمس العُلما سیّد محمد لطیف	55
4	ڈاکٹر علامہ محمد اقبالؒ	71
5	آغا حشر کاشمیری	91
6	صوفی غلام مصطفیٰ تبسم	100
7	ابوالاثر حفیظ جالندھری	128
8	سیّد امتیاز علی تاج	135
9	محمد دین تاثیر	142
10	مولانا چراغ حسن حسرت	187
11	اختر شیرانی	197
12	سیّد عابد علی عابد	214
13	سیّد عبدالحمید عدم	227
14	فیض احمد فیض	238
15	سعادت حسن منٹو	267

16	احسان دانش	292
17	حمید نظامی	307
18	احمد ندیم قاسمی	315
19	آغا شورش کاشمیری	358
20	محمد طفیل	379
21	ناصِر کاظمی	403
22	ساغر صدیقی	425
23	حبیب جالب	439
24	پروفیسر محمد اسلم	460

اپنی بات

مَیں نے جب لکھنا سیکھا تھا
پہلے تیرا نام لکھا تھا

ناصر کاظمی

لاہور کی تاریخ پر ایک طالب علم کی حیثیت سے کام کرتے سالہا سال بیت گئے۔ گلیاں گھومتے، پرانی عمارات کو گرتے، تباہ ہوتے دیکھا، کئی قبرستانوں پر جا کر عہدِ رفتہ کے مدفون خزانوں کو سلام پیش کیا۔ اپنی دانست میں جو بن پڑا، دِکھتے مناظر کو پچھلی تحریروں سے ملا کر لکھنے کی کوشش بھی جاری رکھی۔ کام اپنی مختلف اشکال میں احباب کی رسائی تک آیا، کبھی بذریعہ اخبارات تو کبھی جرائد کا حصہ بنتے ہوئے۔ ستمبر 2011ء کو مادری زبان پنجابی میں کچھ کام کتابی صورت ''لہور دِی وار'' میں آیا۔ اب ''اتہاسک لاہور'' حاضرِ خدمت ہے۔ ابتدا ہی میں لفظ ''اتہاس'' کے بارے میں بات کر لی جائے تو بہتر ہے۔ کہیں یہ ہندی اور اُردو زبان میں سے چناؤ کا معاملہ نہ بن جائے۔ ''اتہاس'' سنسکرت زبان سے ہندی زبان میں آیا۔ یہ امر پیشِ نظر رہے کہ انگریز سرکار سے قبل ریختہ اور ہندی ایک ہی زبان کے دو نام تھے، لفظ ''اتہاس'' بھرپور استعمال ہوتا تھا۔ چونکہ سرکار تقسیم در تقسیم کے عمل سے بخوبی واقف تھی اِس لیے زبانیں تقسیم ہوئے بِنا کیونکر رہ سکتی تھیں۔ ایک ہی زبان کو مذہبی رنگ دے کر نفرت اور تعصب کی بنیاد پر ریختہ اور ہندی میں تقسیم کر دیا گیا۔ وہ الفاظ جو ارتقائی طور پر عربی اور فارسی زبانوں کے تھے، وہ اُردو کا حصہ بنے اور سنسکرت اور برج بھاشا کے الفاظ کو الگ کر کے

ہندی کا نام دے دیا گیا۔ اس حوالے سے ایک اقتباس درج ہے جو محمد حنیف شاہد کی کتاب شمس العلماء (صفحہ۔13) سے لیا گیا ہے:

> ''کمپنی کی مجلسِ نظما (Court of directors) نے 22 دسمبر 1677ء کو قلعہ سینٹ جارج (مدراس) کو ایک مراسلہ بھیجا جس میں تحریر تھا:
> ''اس کا اعادہ کیا جاتا ہے کہ کمپنی کے جو ملازمین ''فارسی'' سیکھیں گے۔ اُن کو دس پونڈ اور جو ''انڈوسٹان'' (ہندوستانی، اُردو) زبان سیکھیں گے، اُنھیں بیس 20 پونڈ بطورِ انعام دیے جائیں نیز یہ کہ اس زبان کی تعلیم دینے والے کسی مناسب آدمی کا تقرر بھی کیا جائے۔''

زبان کی اس تقسیم کو انگریز کی واپسی اور دو الگ الگ ریاستوں کے قیام کے بعد عشرے گزر گئے، لیکن آج بھی پاکستانی عوام ہندی فیچر فلم بہ آسانی دیکھ اور سمجھ لیتے ہیں۔ اِسی طرح ہندوستانی عوام پاکستانی اُردو ڈراموں سے بغیر کسی مشکل کے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ مشہور ہندوستانی شاعر اور نثر نگار گلزار نے اپنے شہرۂ آفاق ڈرامے ''میرزا غالب'' میں اس معاملے کو اُٹھانے کی کوشش کی تھی۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ تقسیم سے قبل لفظ ''اتہاس'' نثری ادب میں عام استعمال ہوتا تھا۔

''اتہاسک لاہور'' میں اُن شخصیات کا تذکرہ ہے جو اُردو ادب میں گراں قدر خدمات انجام دے چکی ہیں اور وفات کے بعد جن کی جائے مدفون کا اعزاز لاہور کے قبرستانوں کو حاصل ہوا۔ صِرف اُردو زبان کے حوالے سے اس شہر میں بے شمار قدآور شاعر، ادیب اور صحافی مدفون ہیں۔ اُن تمام مشاہیر کا احاطہ کرنے کے لیے شاید اس طرح کی دس کتب بھی کم ہوں۔ اُن میں سے چنیدہ شخصیات کو اس کتاب کا حصہ بنایا گیا ہے۔ اس سے یہ مُراد ہرگز نہیں کہ وہ شخصیات جو اس کتاب کا حصہ نہیں، وہ کسی طور بھی کسی سے کم تر ہیں۔ ہر ادیب، شاعر اور صحافی کا ایک اپنا خاص طرزِ تحریر اور طرزِ بیان ہوتا ہے۔ حضرتِ انسان کی تاریخ میں کوئی ایسی کسوٹی ایجاد نہیں ہوئی جو تحریروں کے معیار کو جانچ سکے۔ تاریخ اس بات کی بھی شاہد ہے کہ چشمِ فلک نے کئی ایسے عظیم شعرا اور ادبا کو دیکھا جنھیں اُن کے اپنے عہد میں

کوئی خاص پذیرائی حاصل نہ ہوئی۔لیکن اُن حضرات کی زندگی کے بعد جب اُن کے کام کو ازسرِنو دیکھا گیا تو وہ ادب کی عمارت کے مضبوط ترین ستون دِکھائی دیے۔اس حوالے سے انگریزی زبان کے شاعر جان کیٹس کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔غور کیجیے تو تاریخ میں کئی ایسے درباری شاعر اور ادیب بھی دکھائی دیے جو شاہ کے مصاحب تھے اور اپنے عہد کے بڑے نام،لیکن وقت گزرنے کے ساتھ اُن کی پہچان ختم ہوتی گئی۔

زیرِنظر کتاب کی تحقیق وتحریر میں سب سے پہلا اوراہم ترین پہلو یہ ہے کہ کئی ایسے عظیم لوگ جن کا بے پناہ اعلیٰ درجے کا کام موجود تھا،تقسیم کے بعد وہ کس طرح نئی نسل اورآنے والی نسلوں کی نظروں سے اوجھل ہوتے گئے۔ ہمارے ہاں ایسے طلبا کی ایک بڑی تعداد موجود ہے جو کہ ڈِگری یافتہ ہے لیکن وہ محمد دِین تاثیراوراختر شیرانی جیسے ناموں سے نابلد ہے۔

اس کتاب کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ ہماری نصابی کتب میں اکثر جگہوں پر یہ تحریر واضح طور پر ملتی ہے کہ جنگِ آزادی یا غدر کے بعد مسلمانوں پر جدید تعلیم اور ترقی کے دروازے بند کر دیے گئے۔جب اُردو ادب کی تاریخ کو دیکھا جائے اور خصوصاً انیسویں اور بیسویں صدی کے ادب پر توجہ مرکوز کی جائے تو یہ سوال اپنی جگہ آن کھڑا ہوتا ہے کہ انگریز سرکار ہی کے عہد میں اتنی بڑی تعداد میں مسلمان شاعر، ادیب حضرات کہاں سے آ گئے۔ کئی ایسے خاندان بھی دِکھائی دیتے ہیں جن کا پس منظر انتہائی پڑھا لکھا تھا۔منٹو کے خاندان کو بیرسٹرز کا خاندان کہا جاتا تھا۔سیّد لطیف کے خاندان کو آج بھی ججوں کے خاندان کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔سب سے اہم ترین شے مسلمانوں کا عمومی رویہ تھا۔اس ضمن میں مَیں کچھ حوالہ جات ایک مسلمان انڈین سول سرونٹ شوکت علی شاہ کی آپ بیتی ''خیال پور کا آدم خور'' سے پیش کر رہا ہوں جو اپنے خاندان کے بارے میں یوں تحریر فرماتے ہیں:

> ''میں نے پنجاب کے ایک متمول زمیندار گھرانے میں آنکھ کھولی۔ والد صاحب کو زمینیں خریدنے اور خرگوش کے شکار کے علاوہ کوئی شوق نہ تھا۔ ہمارے ڈیرے پر جتنے کتے تھے، اُس سے کہیں زیادہ نوکر تھے۔ ہر گرے ہاؤنڈ کی خدمت اور دیکھ بھال کے لیے ایک نوکر تھا۔

ہر اتوار کی صبح کو والد مرحوم شکار کے لیے نکلتے تو عجیب سماں ہوتا۔ ہمارا قلعہ نما مکان اہلِ دیہہ اور آس پاس کے دیہاتیوں سے بھر جاتا۔ ان میں سے کچھ تو شکاری ہوتے اور باقی حواری، درباری یا وہ غریب مزارعے جنھیں صرف زمیندار کی خوشنودی مقصود ہوتی۔ اس کے علاوہ ہر خرگوش کی نشاندہی پر اُنھیں ایک روپیہ نقد انعام مِلتا۔ شکار پر روانگی سے قبل چائے کا دور چلتا۔ اُن دنوں گاؤں میں چائے اتنی عام نہیں تھی اور اسے باقاعدگی سے پینا ہر کس و ناکس کے بس میں نہیں تھا۔ غریب مزارعے اسے بڑے شوق سے سڑپ سڑپ پیتے اَور نوکر حفظِ مراتب کا باقاعدہ خیال رکھتے۔ مزارعوں کے لیے مٹی کے بٹھل استعمال ہوتے۔ معززین کو میڈ اِن انگلینڈ ٹی کپس میں چائے پلوائی جاتی۔''

شوکت علی شاہ صاحب کا جب ایچی سن میں داخلہ ہوا تو اُنھوں نے لکھا:

''شروع میں ایچیسن کالج کا ماحول بڑا اجنبی لگا۔ جس لڑکے کو دیکھا، اُسے اپنے سے ایک ہاتھ اُوپر ہی پایا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب یہاں صرف نوابوں، راجاؤں اور بڑے بڑے زمینداروں کے لڑکے پڑھنے آتے تھے۔ یہ کالج آج کے نو دولتیوں، ٹٹ پونجیوں اور ذخیرہ اندوزوں کے بچوں سے اَٹا ہوا نہیں تھا۔''

جب اُن کا داخلہ گورنمنٹ کالج لاہور میں ہوا اور درمیانے طبقے کے طالب علم بھی نظر آئے تو اُنھوں نے اِن خیالات کا اظہار کیا:

''پھر سب سے بڑی قباحت یہ تھی کہ یہاں صرف لینڈ ڈارسٹوکریسی نہ تھی، متوسط گھرانوں کے بے شمار لڑکے زیرِ تعلیم تھے۔ چونکہ چیف کالج سے کافی لڑکے داخل ہوئے تھے، اس لیے ہم نے ایچی سونین گروپ قائم کر لیا اور ہماری تمام مومنٹ، اُٹھک بیٹھک اور ایکٹیویٹی اِسی گروپ تک محدود تھی۔''

اسی طرح عبدالحق خیرآبادی مولانا شمس العلما کی زندگی کا ایک واقعہ قلم بند کیا جا رہا ہے۔ جس سے اُس وقت کے مسلمانوں کے کچھ رجحانات کو جاننے میں مدد ملے گی:

''ایک بار لکھنؤ کے ایک دُکاندار مولانا کے لیے الوانین لے کر آئے۔ مولانا نے ایک الوان اسی (80) روپیہ قیمت کی پسند فرمائی۔ قلمدان طلب کیا، کچھ رقم کی کمی تھی۔ دُکاندار سے کہا کہ تم جاؤ ہم روپیہ بھیج کر الوان طلب کر لیں گے۔ طلبہ یہ حال دیکھ رہے تھے، تاجر جب چلنے لگا تو ایک طالب علم اس کے ہمراہ ہوئے اور باہر جا کر اس الوان کو چالیس روپے میں خرید لائے، بعد عصر جب مولانا رونق افروزِ مجلس ہوئے تو الوان اُن کی نذر کی اور ساتھ ہی یہ بھی عرض کر دیا کہ حضور چالیس روپیہ میں خریدی ہے۔ آپ نے اس کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا اور اُٹھا کر پھینک دیا اور فرمایا ''یہ وہ تھوڑی ہی ہے بیوقوف ہم کو احمق سمجھتا ہے اور خود بڑا عقلمند کا بچہ بنا ہے۔ ہم گرہ کٹوا لیتے اور یہ اُس کی گرہ کاٹ لائے۔ اس ناراضی سے وہ طالب علم بہت پریشان ہوا اور مولانا کے پرانے خدمت گزار شبراتی کے پاس پہنچا اور اس کو سفارش پر آمادہ کیا۔ وہ اُٹھا اور الوان کو دُرست کر کے وصلی لپیٹ کر اور ململ کے ٹکڑے پر باندھ کر حاضر خدمت ہوا، اور عرض کی کہ ''حضور حافظ جی سے وہ الوان واپس کرا کے اور چالیس روپیہ مزید دے کر پسند کردہ الوان لے آیا'' مولانا نے الوان کو دیکھ کر فرمایا 'حافظ جی دیکھو کتنا فرق ہے؟ دُکاندار ہمارا نام سن کر آتے ہیں، منہ مانگے دام نہ پائیں تو کوئی کاہے کو آئے، لوگوں میں یہ چرچا تو ہے کہ نوابوں کے مانند ایک بوریہ نشین ملائے مکتبی ایسا ہے کہ امرا کی طرح دل رکھتا ہے۔''

درج بالا تحریروں سے مسلمانوں کی ہزار برس کی حکومت اور حکومتی رویے سے قطعِ نظر نہیں کیا جا سکتا۔ جن لوگوں نے محنت کرنا تھی، اُنھوں نے کی اور جنھوں نے شراب پینا تھی،

اُنھوں نے پی، کبوتر اُڑانا تھے، کبوتر اُڑائے، مرغ، تیتر، بٹیر اور کتے لڑانا تھے لڑائے، اس کے ساتھ ساتھ پڑھے لکھے مسلمانوں کی تعداد کو بھی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ انگریز عہد میں ''شمس العُلما'' ایک انتہائی قابلِ عزت خطاب تھا جو انتہائی عالم فاضل شخصیات کو دیا جاتا تھا۔ محمد حنیف شاہد نے اپنی کتاب ''شمس العُلماءؔ'' میں 104 حضرات کا تذکرہ کیا ہے۔ یہ اَمر انتہائی حیران کن ہے کہ 104 میں سے 102 حضرات مسلمان تھے اور محض دو حضرات غیر مسلم تھے۔ اگر اُس عہد کے مسلمان شاعر، ادیب اور صحافی حضرات کو اُردو ادب سے حذف کر دیا جائے تو ادب کی اس عظیم قلعہ نما عمارت کے محض کھنڈرات ہی دِکھائی دیں گے۔ سو نصاب کی کتب کا ازسرِنو جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔

''اتہاسک لاہور'' کی تحقیق وتحریر میں ایک اور اہم پہلو بھی مدِّنظر رکھا گیا ہے کہ لاہور میں مدفون اکثر بڑے شاعر اور ادیب حضرات پنجاب سے تعلق رکھتے تھے۔ ان لوگوں نے اپنی مادری زبان میں کام کیوں نہ کیا......؟ اگر کیا تو قارئین سے چھپا کیوں رہا......؟ اگر کہیں سے اُن کا کوئی کام ملا ہے تو اُسے بھی مناسب حد تک اِس کتاب کا حصہ بنایا گیا ہے۔ اُردو زبان شاید دُنیا کی واحد زبان ہے جس کی بڑی خدمت ایک دوسری زبان کے افراد یعنی اہلِ پنجاب نے کی ہے۔ خصوصاً بیسویں صدی کے آغاز سے آج تک اُردو اہلِ پنجاب کی ممنون ہے۔ جنوری 1928ء کی بات ہے جب ''نیرنگِ خیال'' کی ایک تقریب میں مولانا ظفر علی خان نے درجِ ذیل الفاظ کہے تھے:

> ''اُردو ادب پر جو پنجاب نے احسان کیے ہیں، وہ زائد از حد شمار ہیں یہ خودستائی نہیں۔ خود غالب و انیس کے نام لینے والے معترف ہیں کہ جو کام دہلی اور لکھنؤ سے نہ ہوسکا، لاہور والوں نے کرکے دِکھایا۔ صحافت کی موقت الشیوع صنف آج کل ادبیات کی جان سمجھی جاتی ہے۔ اس صنفِ سخن میں پنجاب گریز پا ترقی کر رہا ہے اور متعدد بلند پایہ صحائف کا بدیع المنزلت وجود اس پر گواہ۔ یوں تو اِن میں ہر ایک گنجِ شائگاں ہے، لیکن میں بلاخوفِ تردید کہہ سکتا ہوں کہ

''نیرنگِ خیال'' جس کا اہتمام حکیم یُوسف حسن کے باسلیقہ ہاتھوں میں ہے، اِن سب کا سرتاج ہے۔''

اس حقیقت کو بھی مدِّنظر رکھا جائے کہ اُردو ادب کے آسمان پر کئی ستارے 1928ء کے بعد جگمگائے۔ اُن کی ایک لمبی فہرست اپنی جگہ موجود ہے، لیکن اس حوالے سے مولانا ظفر علی خان کے الفاظ ہمیشہ سند رہیں گے۔

پاکستان بننے کے بعد بے شمار فنون اور کومل گُن زوال پذیری کی جانب رہے۔ اس وجہ سے کئی عظیم لوگوں کا بے مثال کام عوامُ الناس کی نظروں سے اوجھل ہوتا گیا۔ زیرِ نظر کاوش میں اُن بلند پایہ ادیب شاعر اور صحافی حضرات کی سوانح کے ساتھ ساتھ اُن کے کام کو بھی قارئین تک پہنچانے کی کوشش کی گئی ہے۔ جس کی وجہ سے عین ممکن ہے کہ کچھ مضامین میں طوالت کا عنصر ملے۔

میں اپنی عرض داشت میں ایک بار پھر دُہرانا چاہتا ہوں کہ وہ عظیم ادبی شخصیات جو اس کتاب کا حصہ نہ بن سکیں، وہ آنے والی کسی کتاب کا حصہ ضرور ہوں گی۔ اس کتاب میں موجود مضامین محض سرزمینِ لاہور کا ادب دوست ہونے کا ایک اعتراف ہے۔

مُدثر بشیر

لاہور، اکتوبر 2018ء

اُردو ادب کی چند نثری اَصناف کا مختصر جائزہ

میَں نے عریاں تجھے اے رشکِ قمر دیکھ لیا
دِیدہ و دل کے جو تھا مدِ نظر دیکھ لیا
نزع میں یار نے صورت نہ دِکھائی مجھ کو
دُشمن و دوست کو ہنگامِ سفر دیکھ لیا
آتش

یہ مضمون اُردو ادب کی کچھ نثری اَصناف کی تعریف، تاریخ اور بیسویں صدی کے بعد اُن کے ارتقا کی بتدریج منازل پر ایک طائرانہ نگاہ کے ساتھ ساتھ اس حقیقت کا بھی احاطہ کرتا ہے کہ اُردو ادب میں اہلِ پنجاب کا کتنا بڑا حصہ ہے۔ مضمون کا آغاز جمیل جالبی کی کتاب کے اِس اقتباس سے کیا جا رہا ہے جس سے اگلے صفحات کی تحریر کو سمجھنے میں خاصی مدد ملے گی:

''۔۔۔اِسی طرح یونانیوں کے دورِ حکومت میں یونانی اثرات بھی پنجابی زبان میں شامل ہو جاتے ہیں، مثلاً یونانی الفاظ کانون، دِپھترا، بھیلگم، تاپھو، کُری وغیرہ پنجابی میں کُنون، دپھتر، بلگم، تبوت اور کُڑی کی شکل میں اور اُردو میں قانون، دفتر، بلغم، تابوت، کُڑی (لڑکی) کی شکل میں آج بھی ملتے ہیں۔ اسی طرح اہلِ پنجاب کی زبان میں ساکا، کُشان، گوجر، جاٹ اور ہُن اقوام کی زبان کے الفاظ بھی شامل ہو جاتے ہیں۔ یہ اثرات جتنے گہرے اور کثرت سے تھے اِسی لحاظ سے

زبان وتہذیب کا ڈھانچا بھی بدلتا گیا۔ مسلمانوں کے اثرات گہرے اور دُور رس تھے جنھوں نے اس تہذیب اور زبان کو ایک نیا روپ عطا کیا۔ جب مسلمان اس علاقے سے نکل کر برِّعظیم کے طُول وعرض میں پھیل گئے تو ان کی یہ زبان مشترک رابطے کی زبان نئے علاقوں کے لسانی وتہذیبی اثرات قبول کرتی ہوئی ان کی فتوحات کے ساتھ برِّعظیم میں پھیلتی چلی گئی۔ اس زبان کا اجرا دیکھنا ہو تو قدیم اُردو کے ابتدائی نمونے دیکھیے۔ آپ کو دونوں زبانوں میں گہری مماثلت ومشابہت کا احساس ہوگا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جیسے جیسے پیچھے کی طرف چلتے جایئے، اس قربت کا احساس بھی بڑھتا جائے گا۔ آج جب اُردو زبان کا معیار اور کیلنڈر مقرر ہوگیا ہے اور مختلف اثرات مل کر ایک جان ہوگئے ہیں، اس ولین تعلق کو محسوس کرنا خاصا مشکل ہوگیا ہے۔ لیکن قدیم دکنی اور پنجابی کے تلفظ، لہجہ، افعال، ضمائر، ذخیرۂ الفاظ، علامت فاعل ''نے'' کا نہ پایا جانا اور جملوں کی ساخت کے مطالعے سے اِس بات کی آج بھی تصدیق ہوسکتی ہے۔

اِس صدی کے اوائل میں جب اہلِ پنجاب اس بات کا دعویٰ کر رہے تھے کہ اُردو کا مولد پنجاب ہے اور اہلِ زبان اس دعوے کو تسلیم کرنے میں پس وپیش کر رہے تھے، اس وقت تک قدیم اُردو کے وہ مخطوطات سامنے نہیں آئے تھے جو 1920ء کے بعد شائع ہوئے اور جن کے مطالعے سے یہ بات سامنے آئی کہ پنجاب کا اُردو سے وہی تعلق ہے جو ایک ماں کا اپنی بیٹی سے ہوتا ہے۔ بیٹی بیاہ کر کہیں چلی جائے لیکن ماں اور بیٹی کا ازلی رشتہ اُسی طرح قائم رہتا ہے اور چونکہ ماں کبھی ڈائن نہیں بن سکتی اِسی لیے اُردو اور اہلِ پنجاب کا یہ رشتہ ناتا آج بھی اُسی طرح قائم ہے۔ پنجاب کے مسلمانوں نے اس سطح پر ہمیشہ قومی نقطۂ نظر کا ثبوت دیا اور کبھی سمجھوتا نہیں کیا۔ 1908ء میں جب ڈاکٹر پرتول چندر چیٹر جی

وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی نے سالانہ جلسۂ تقسیمِ انعامات منعقدہ 22 دسمبر 1908ء کی افتتاحی تقریر میں یہ تجویز پیش کی کہ صوبہ پنجاب کے مدارس میں اُردو کے بجائے پنجابی زبان کو رائج کیا جائے تو علامہ اقبالؒ، علی امام، منشی محبوب عالم، منشی سراج الدین اور دوسرے اہلِ علم اس تحریک کے خلاف نبرد آزما ہوگئے اور اُسے ناکام بنا دیا۔ اُس دور کے اخبار اور رسالے اس بات کے شاہد ہیں۔''

(تاریخِ ادب اردو، جلد اوّل، صفحہ 598_597)

پیش منظر

کہانی، داستان گوئی، افسانہ، ادب کی یہ اَصناف قدامت میں حضرتِ انسان کی اپنی تاریخ کے برابر ہی قدیم دکھائی دیتی ہیں۔ انسان کی اس دھرتی پر معلوم تاریخ میں یہ امر عین ممکن ہے کہ سب سے پہلی کہانی اماں حوّاؑ یا حضرت آدمؑ نے اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کو سنائی ہو۔ وہ کہانی ہوسکتا ہے بہشت کی ہو یا ان دونوں کی اس دھرتی پر اپنے سفر کی۔ اس کے بعد ہابیل، قابیل کی لڑائی کی داستان آج تک لوگوں کی زبان پر ہے۔ زندگی کی کونپلیں جس جس طرح زمین کی کیاری پر مختلف مقامات پر پُھوٹتی رہیں، اسی طرح ہر جگہ، ہر مقام کی اپنی اپنی کہانیاں جنم لیتی گئیں۔ سیاحت کے شوقین افراد جب اپنے گاؤں یا شہر سے کسی دوسرے مقام پر جاتے تو اپنے اپنے علاقے کی باتیں دوسری جگہوں پر سناتے اور واپسی پر اپنے آبائی علاقوں کے باشندوں کو دوسری جگہوں کی باتیں اور رُودادِ سفر سناتے۔ یوں کمال داستانیں جنم لیتی گئیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہزار ہا برس پرانے ادوار میں پیغمبر، بادشاہ، فقرا سیاحت کے دِلدادہ دکھائی دیتے ہیں۔ ربِ ذوالجلال نے بھی بھٹکے بھولے انسان کو سمجھانے اور راہِ راست پر لانے کے لیے اُن سے پہلے ادوار کی داستانیں اپنے پیغمبروں کی زبان سے سنوائیں۔ عہدِ حاضر میں موجود الہامی کتب پر نِگاہ دوڑائی جائے تو بائبل مقدس کے دونوں عہد نامے بھی پرانی اقوام کے قصّوں سے بھرے دِکھائی دیتے ہیں۔ قرآن شریف میں بھی کئی مقامات پر اگلی اقوام کی سبق آموز داستانیں ملتی ہیں۔ اگر ہندوؤں کی مقدس کتب ''مہا بھارت'' اور ''رامائن''

کا تجزیہ کیا جائے تو یہ دونوں بھی قدیم اور طویل نظمیہ داستانیں دِکھائی دیتی ہیں۔ کہانی اور داستان گوئی کی اہمیت کو جانتے ہوئے سُقراط کے بعد افلاطون اور ارسطو جیسے عظیم فلسفیوں نے اپنی تعلیمات میں اس بات پر بہت زور دیا ہے کہ نوجوان نسل کو اپنے آبا، مشاہیر اور سورماؤں کی داستانیں سنائی جائیں۔

داستان گوئی کی تاریخ شاہد ہے کہ دھرتی کے چپے چپے سے لوک داستانیں اکٹھی کی گئیں اور ترجمے کی صفت نے اُنھیں جِلا اور حیات بخش دی۔ ایک عہد اور ایک علاقے کی داستانیں، دوسرے ادوار اور دیگر مقامات میں پڑھی اور لکھی گئیں۔ ان کوششوں کے نتیجے میں الف لیلیٰ اور فیری ٹیلز کی کہانیاں منظرِ عام پر آئیں۔ تراجم کے باعث ایڈگر ایلن پو، جیمز جوائس، ڈی ایچ لارنس، فلبزی او کارنر اور کئی ایک دیگر ادیبوں کے نام ادب کے آکاش پر جگمگائے۔ اُردو زبان کے حوالے سے ہم چھے نثری اَصناف کا تجزیہ پیش کریں گے۔

1۔ افسانہ 2۔ ناول 3۔ سرّی ادب 4۔ خاکہ 5۔ سفرنامہ 6۔ ڈرامہ

افسانہ: اُردو نثر کا ایک بڑا حصہ افسانے ہی کی صورت میں دِکھائی دیتا ہے۔ جے ٹی پلاٹس کی لُغت کے مطابق افسانہ فارسی زبان کا لفظ ہے، جس کے معنی کہانی، عشقیہ کہانی اور داستان کے ہیں۔ عہدِ جدید میں افسانے کی بہت سی تعریفیں مختلف ماہرین نے الگ الگ طریقے سے بیان کی ہیں۔ ذیل میں ڈاکٹر گیان چند کی بیان کردہ تعریف کے ساتھ اِس کی اقسام درج ہیں:

1۔ مختصر افسانہ: یہ ایک معروف صنف ہے جس کی تکنیک یا مختلف اقسام پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس میں اکثر ایک واقعے (Episode) کا بیان ہوتا ہے۔ جب کہ ناول میں کوئی تحریر نہیں ہوتی۔ بہت سے افسانوں میں ماجرا ہی نہیں ہوتا اور ادھر تیس سے پینتیس سال سے تحریری افسانے چل پڑے ہیں، جن میں کردار اور پلاٹ تو کیا، سرے سے افسانہ پن ہی نہیں ہوتا۔

2۔ طویل مختصر افسانہ: یہ مختصر افسانے ہی کی قسم ہے۔ اس کی درازی کی وجہ سے اِسے طویل مختصر افسانہ کہا جاتا ہے۔ لیکن تکنیک کے لحاظ سے اس میں اور مختصر افسانے میں کوئی فرق نہیں۔ نیاز فتح پوری کا ''شباب کی سرگزشت'' اور قرۃ العین حیدر کا ''ہاؤسنگ سوسائٹی''

طویل مختصر افسانے ہیں۔

3۔ افسانچہ یا منی افسانہ: یہ دو چار آٹھ سطروں کا افسانہ ہوتا ہے۔ اس کی تکنیک مختصر افسانے سے الگ ہوتی ہے۔ اس لیے اسے ایک علٰیحدہ صنف کہا جائے گا۔ یہ کوزے میں سمندر بھرنے کے مترادف ہے۔ اس کی معنوی اور اشاریتی بلاغت اپنے اندر ایک جہانِ معنی پوشیدہ رکھتی ہے۔ جوگندر پال نے کثرت سے افسانچے لکھے۔

اُردو افسانے کو ماہرین تین ادوار میں تقسیم کرتے ہیں:

1۔ 1909ء سے 1947ء تک

2۔ 1947ء سے 1960ء تک

3۔ 1960ء سے آج تک

چونکہ افسانے کی بنیادیں کہانی اور داستان گوئی میں گڑی ہوئی ہیں، اس لیے اِنھیں پچھلے ادوار میں یوں تقسیم کیا جاتا ہے:

1۔ 1800ء سے قبل

2۔ 1800ء سے 1857ء تک (1800ء میں فورٹ ولیم کالج کی داغ بیل پڑی)

3۔ 1857ء سے 1947ء تک

4۔ 1947ء سے عہدِ جدید تک

1 ۔ 1800ء سے قبل: اُردو کی سب سے قدیم داستان ''قِصّہ مہر افروز و دِلبر'' مانی جاتی ہے۔ اس داستان کا تذکرہ ڈاکٹر جمیل جالبی نے کِیا ہے:

> ''یہی مزاج ہمیں نواب عیسوی خان کی داستان '' قصۂ مہر افروز و دلبر'' میں ملتا ہے۔ یہ اُردو کی قدیم ترین معلوم داستان ہے جو محمد شاہ یا احمد شاہ کے دور میں کِسی وقت لکھی گئی اور تقریباً ڈھائی سو سال بعد اب پہلی بار سامنے آئی ہے۔ اس داستان کا مخطوطہ جو آغا حیدر حسن کو گوالیار میں حضرت جی کی درگاہ کے سجادہ نشین محمد غنی حضرت جی سے 1929ء میں ملا تھا۔ پروفیسر مسعود حسین خان نے اپنے مقدمے سے مُرتب کر کے 1966ء میں پہلی بار شائع کیا۔''
>
> (تاریخِ ادبِ اُردو، جلد سوم، صفحہ 1082)

اس کے بعد دوسری قابلِ ذکر تصنیف ''نو طرزِ مرصع'' ہے۔ جس کے مصنف میر محمد حسن عطا خان تحسین تھے اور مرصع رقم خان اُن کا خطاب تھا۔ مؤرخین کی رائے کے مُطابق یہ تصنیف 1744ء میں مکمل ہوئی تھی۔ اِس کے بعد شاہ عالم ثانی کے عہد میں ''عجائب القصص'' کی داستان سامنے آتی ہے۔ سیّد حسین شاہ حقیقت کی ''جذبِ عشق'' اسی عہد کی اہم تصنیف ہے جو ''کربل کتھا'' کے ساتھ زبان و بیان میں ہم پلہ مانی جاتی ہے۔ منشی مہر چند کھتری لاہوری کی ''نو آئینِ ہندی'' بھی اُسی عہد کی ایک بے مثال تصنیف ہے۔

2۔ 1800ء سے 1857ء تک: 1800ء میں کمپنی بہادر کی جانب سے کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج کی بنیاد رکھی گئی۔ اس میں تراجم کے ساتھ ساتھ زبانوں کے اُصول وضوابط بھی مقرر کیے گئے۔ فورٹ وِلیم کالج کی فضا میں افسانہ، جدید رُجانات کی جانب رواں دواں ہوا۔

ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش، اُردو افسانے کے ارتقائی سفر کے بارے میں رقم طراز ہیں:

> ''نثری داستانوں کے عروج کے زمانے میں ہی ایک زیریں لہر کے طور پر ردِعمل کا مرحلہ شروع ہو چکا تھا۔ وہ یوں کہ مقناطیس سے چمٹی کہانیاں خود کو داستان سے کاٹ کر اپنی علیحدہ حیثیت تسلیم کرانے کے مَیلان کا اظہار کرنے لگی تھیں۔ بعینہٖ جیسے غزل نے قصیدے سے اپنا دامن چُھڑا لیا تھا اور پھر اپنے علیحدہ تشخص کا اعلان کرنے لگی۔ کہانی کا خود کو داستان سے الگ کرنے کی کوشش کرنا ''افسانہ'' کو وجود میں لانے کی جانب اس کی ایک اہم پیش رفت کہی جا سکتی ہے۔ اُنیسویں صدی کے اوائل ہی میں کلکتہ کے فورٹ وِلیم کالج کی تصانیف کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ اس سلسلے میں میر امن کی ''باغ و بہار''، بہادر علی حسینی کی ''نثرِ بے نظیر''، ''حیدر بخش کے قصے لیلیٰ مجنوں''، ''آرائشِ محفل'' اور'' طوطا کہانی''، نہال چند لاہوری کا قِصّہ ''تاج الملوک اور بکاوَلی''، مظہر علی خان کے قِصّے ''مادھونل و کام کنڈلا'' اور'' بیتال پچیسی'' اب تک مشہور ہیں۔ لیکن اس صدی کی کہانیوں میں ''فسانۂ عجائب''، ''داستانِ امیر حمزہ''، ''طِلسمِ ہوشربا'' اور ''بوستانِ خیال'' زیادہ مقبول و مشہور ہوئیں۔

3۔ 1857ء سے 1947ء تک: جنگ آزادی کے بعد اُردو نثر کے رُجحانات میں بتدریج تبدیلی آتی گئی۔ اُردو زبان کو مُعرّب، مقدس اور نستعلیق الفاظ و تراکیب سے آزادی نصیب ہوئی۔ اس حوالے سے سر سیّد احمد خان اور اُن کے رفقا سرِ فہرست دِکھائی دیتے ہیں۔ اسی دور میں مولوی نذیر احمد دہلی سے ''مراۃ العرُوس'' 1869ء میں ''بنات النعش'' 1872ء میں منظرِ عام پر لائے۔ الطاف حسین نے ''مجلس النساء'' تحریر کی۔ شاد عظیم آبادی نے ''صورت الخیال'' اور نواب افضال الدین نے ''فسانۂ خورشیدی'' پیش کیا۔ اِسی زمانے میں لکھنؤ کے پنڈت رتن ناتھ سرشار کا ناول ''فسانۂ آزاد'' سامنے آیا جو اخبار میں قسط وار چھپتا رہا اور پھر 1880ء میں پہلی بار کتابی شکل میں شائع ہوا۔ اُنیسویں صدی کے آخری دو عشرے جدید افسانہ نگاری یا مختصر افسانہ نگاری کے حوالے سے انتہائی اہم ہیں۔ انھیں عشروں میں سیّد سجاد حیدر یلدرم، منشی پریم چند اور علامہ راشد الخیری جیسے عظیم نام آسمانِ ادب پر اُبھرتے ہیں۔ کئی ناقدین اُردو افسانے کے باقاعدہ آغاز کو منشی پریم چند سے منسوب کرتے ہیں۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی اپنی کتاب ''افسانہ اور افسانے کی تنقید'' میں پریم چند کی افسانہ نگاری کے فن کے بارے میں یوں تحریر کرتے ہیں:

> ''پریم چند کی افسانہ نگاری نہ صِرف فنی حیثیت سے اُردو میں ایک نئی چیز ہے بلکہ معنوی اعتبار سے بھی ایک جدید چیز ہے۔ پریم چند کو اس سلسلے میں اوّلیت کا شرف حاصل ہے کہ اُنھوں نے ہماری اپنی زندگی کو اپنے فن کا موضوع بنایا اور اُردو میں ایک ایسی واقعیت اور حقیقت نگاری کو رواج دیا جو بالکل نئی چیز تھی۔ اُن کے افسانوں میں اُس زمانے کی ہندوستانی زندگی کی ہُو بہُو تصویریں ملتی ہیں۔ اُن کی نظر میں وسعت اور طبیعت میں ہمہ گیری تھی۔''

پریم چند کے افسانوں کے کچھ مجموعے سوزِ وطن، پریم پچیسی، پریم بتیسی، خاکِ پروانہ، خواب و خیال، فردوسِ خیال، پریم چالیسی، آخری تمغہ، زادِ راہ، دُودھ کی قیمت اور واردات کے ناموں سے ملتے ہیں۔ انگریزی، فرانسیسی اور رُوسی ادب کی گہری چھاپ ہمیں اپنے ہاں کے کئی عظیم افسانہ نگاروں پر دکھائی دیتی ہے۔ اسی طرح منشی پریم چند کی تحریروں میں وِکٹر ہیوگو،

ٹالسٹائی اور رومین رولان کے گہرے اَثرات نظر آتے ہیں اور یلدرم کے افسانے حقیقت پسندی اور رُومانیت سے بھرپور ملتے ہیں۔ اُن کی تحریروں پر فارسی، عربی اور ترک ادب کے اثرات بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ ناقدین کی ایک بڑی تعداد نے اُن کے افسانے ''خارستان وگلستان' کو اُردو ادب کا باقاعدہ پہلا جنسی افسانہ قرار دیا ہے۔

بیسویں صدی عیسوی کے آغاز ہی میں اُردو افسانہ اپنی معراج پر دِکھائی دیا۔ اس حوالے سے سب سے پہلا نام غلام عباس کا ہے۔ غلام عباس کا اسلُوب نہایت سادہ ہے۔ اُن کے افسانوں میں معاشرتی پہلو نمایاں ہے۔ ''آنندی'' اُن کی ایک نمائندہ تحریر ہے۔ اُن کے کچھ افسانے سیاسی رنگ میں بھی ہیں، جس کی جھلک ''لچک''، ''سرخ جلوس'' اور ''اوتار'' اَور ناولٹ دھنک میں دیکھی جا سکتی ہے۔ اُن کے افسانوں کے مجموعے آنندی، جاڑے کی چاندنی اَور کن رس کے عنوان سے ہیں۔ غلام عباس کی تحریروں میں ہمہ گیریت اور آفاقیت نمایاں ہے۔ اگر غلام عباس کو اُردو افسانے کی عمارت کا ایک مضبوط ستون کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

اُن کے بعد میرزا ادیب کا نام سامنے آتا ہے۔ ''دِیئو'' کے عنوان سے اُن کا افسانہ، اُن کی بے مثال تحریر ہے۔ اُن کے افسانوں کے دس مجموعے صحرا نورد کے خطوط، صحرا نورد کے رومان، موت کا تحفہ، دیواریں، جنگلی، جنگل، حسرتِ تعمیر، ساتواں چراغ، گلی گلی کہانیاں، کِرنوں سے بندھے ہاتھ کے عنوانات سے شائع ہوئے۔

اُردو افسانے کا ایک اور مضبوط ترین ستون کرشن چندر ہے۔ اُن کی تحریروں کے تراجم کئی دِیگر زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ ''ہم وحشی ہیں''، ''دِل کا چراغ''، پشاور ایکسپریس، ''لال باغ'' اور ''امرتسر'' جیسے لازوال افسانے کرشن کے قلم کے احسان مند ہوئے۔ اُن کے افسانوں کے اُنیس مجموعے شائع ہوئے جن کے عنوان یہ ہیں:

> طلسم خیال، نظارے، اَن داتا، ہم وحشی ہیں، کالا سورج، کتاب کا کفن، مینا بازار، پانی کا درخت، ٹوٹے ہوئے تارے، سپنوں کا قیدی، میں انتظار کروں گا، تین غنڈے، نئے غلام، انسانوں کا چڑیا گھر، زندگی کے موڑ پر، تاش کا کھیل، محبت کی رات میں نینی تال، گل مہرہ اَور کرشن چندر کے شاہکار افسانے۔

اُسی عہد کے ایک اور عظیم افسانہ نگار ممتاز مفتی بھی ہیں۔ وہ اُس وقت کے کئی دِیگر

افسانہ نگاروں کے مانند بیرونی ادب سے گہرے متاثر تھے۔ اُن کے نمائندہ افسانوں میں وہ ہاتھ، وہ انجم، کالے سلیپر، پل، نومان اور منیرہ اور چڑ شامل ہیں۔

اب تذکرہ کرتے ہیں سعادت حسن منٹو کا، جن کا شمار اُردو زبان ہی میں نہیں، دُنیا کی دِیگر زبانوں کے صف اول کے افسانہ نگاروں کے ساتھ ہوتا ہے۔ اُن کی تحریریں کئی دِیگر زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہیں اور اُن کے افسانوں پر کئی فلمیں اور ڈرامے بن چکے ہیں۔ صرف بیالیس برس کی عمر میں منٹو اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔ تقسیم ہند کے بعد منٹو کی زندگی کے کٹھن ترین دنوں کا آغاز ہوا۔ پاکستان میں آخری آٹھ برسوں میں منٹو نے تین برس مقدمہ بازی، دو برس بیماری اور ذہنی عارضے میں گزارے۔ اِردگرد کی بے شمار ریشہ دوانیوں کے باوجود کئی پستہ قد مصنفین، مخالفین اور ادیب حضرات اُن کے قد کی برابری نہ کر سکے۔ منٹو کی وفات کے بعد غلام عباس جیسے عظیم افسانہ نگار نے ''منٹو کی موت'' کے عنوان سے ایک مضمون تحریر کیا۔ جس میں سے ایک اقتباس یہاں نقل کیا جاتا ہے:

> ''منٹو کی ایک خصوصیت جو اُسے دوسرے ادیبوں سے ممتاز کرتی ہے، یہ تھی کہ اُس نے عمر بھر کبھی سیکنڈ فِڈل Second Fiddle بننے یعنی کسی کے ماتحت محض سنگت کا فرض ادا کرنے کی کوشش نہیں کی۔ یہی وجہ ہے کہ اُس نے خود کو کسی جماعت یا گروہ کے ساتھ منسلک نہ ہونے دیا۔ وہ اپنا راگ، بلند یا پست جیسا بھی تھا، اکیلا ہی الاپتا رہا، اُس کو نہ کسی کی اعانت کی ضرورت تھی نہ پروا، یہی وہ بے نیازی تھی جس نے زندگی میں اور ادب میں اُس کے بہت سے مخالف پیدا کر دیے تھے، مگر اُن کی مخالفت اُس قبولِ عام کے سامنے ہیچ ثابت ہوئی، جو اپنی زندگی ہی میں اُسے حاصل ہو گیا تھا اور جس میں آج اُس کے مرنے کے بعد اور بھی اضافہ ہو گیا ہے۔''

منٹو کے افسانوں اور ڈراموں کے مجموعے درجِ ذیل عنوانات کے تحت شائع ہوئے:

آتش پارے، منٹو کے افسانے ' دُھواں ' افسانے اور ڈرامے، لذتِ سنگ ' چغد، ٹھنڈا گوشت، خالی بوتلیں خالی ڈبے، نمرود کی خدائی، بادشاہت کا خاتمہ،

یزید، سڑک کے کنارے، سرکنڈوں کے پیچھے، پھندنے، بغیر اجازت، برقعے،
شکاری عورتیں، رتی ماشہ اور تولہ، انارکلی اور ایک مرد۔

منٹو کی موت کے بعد مجلہ 'نقوش' کا منٹو نمبر شائع ہوا۔ اس کے علاوہ ہندوستان اور پاکستان کے کئی پبلشرز نے کلیات اور باقیاتِ منٹو شائع کیں۔ عصرِ حاضر میں ایک فلم ''منٹو'' کے نام سے نُمائش کے لیے پیش کی گئی۔ جس سے نئی نسل کو منٹو کی جانب مائل ہونے کا پہلو نمایاں ہے۔ ویسے اس فلم میں منٹو کی اصل شخصیت کہیں پیچھے رہ گئی ہے۔ منٹو کا خاندان عہدِ انگریز میں ایک نامور گھرانہ تھا۔ اِس خاندان کے جج اور وکیل حضرات بعد میں بھی نظر آئے۔ منٹو کی حیات میں کئی ادبی اور فلمی حلقوں کے ساتھ ساتھ اُن کے خاندان نے کبھی اُنھیں قبول نہ کیا۔ اُن کے خاندان نے منٹو کو عزت میں اپنے ہم پلہ نہ جانا اور آج اُن کے تمام خاندان کی دُنیا بھر میں پہچان صِرف اور صِرف سعادت حسن منٹو ہی سے ہے۔

راجندر سنگھ بیدی کا نام بھی کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ بیدی کا طرزِ تحریر اچھوتا اور منفرد تھا۔ ڈاکٹر فوزیہ اسلم، بیدی کے فنِ افسانہ نگاری کے بارے میں لکھتی ہیں:

> ''بیدی بنیادی طور پر کلاسیکی مزاج کے افسانہ نگار تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اُنھوں نے زیادہ تر کلاسیکی مصنفوں مثلاً ٹالسٹائی، چیخوف، دوستوفسکی، گوگول، ترگنیف، موپساں، فلاپیر، ٹیگور، بنکم چندر، چیٹر جی اور شرت چندر وغیرہ کا مطالعہ کیا تھا۔ اس لیے افسانہ نگاری میں اُن کا مزاج کلاسیکی بن گیا، تکنیکی لحاظ سے بیدی بیانیہ افسانہ نگار تھے، تاہم ادبی روایت سے بھرپور آگاہی اور معاصر ادب کے شعور نے اُنھیں تکنیکی سطح پر نئے تجربات کی جانب مائل کیا۔''

بیدی کے افسانوی مجموعوں کے نام یہ ہیں: دانہ دوام، گرہن، کوکھ جلی، اپنے دُکھ مجھے دے دو، ہاتھ ہمارے قلم ہوئے، مکتی بودھ۔

1947ء کے بعد کا عہد:

1947ء کے بعد کے عہد میں تقسیم کی بربادیوں، مارشل لا اور دِیگر مسائل کے سبب بڑے بڑے ادیب اور افسانہ نگار سامنے آئے۔ اُن میں انتظار حسین، احمد ندیم قاسمی،

اِشفاق احمد، امتیاز علی تاج، بانو قُدسیہ جیسے بڑے نام دِکھائی دیتے ہیں۔ اس عہد میں ایسے افسانہ نگار بھی تھے جو کلاسیکی عہد کے ساتھ ساتھ جدید افسانے کے بانیوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان میں مرد افسانہ نگاروں کے نمایاں نام یہ ہیں:

پریم چند، پطرس بخاری، بلونت سنگھ، جوگندر پال، چراغ حسن حسرت، دیوندر اسر، دیوندر ستیارتھی، رتن سنگھ، رام لعل، ستیش بترا، شاہد احمد دہلوی، شفیق الرحمن، سیّد عابد علی عابد، شوکت صدیقی، مرزا ہادی رُسوا، اوپندر ناتھ اشک، سیّد انور، انور سجاد، حسن عسکری، حفیظ امین، رشید جہاں، اے حمید، ایم اسلم، شوکت تھانوی، ظہیر بابر، سہیل عظیم آبادی، حیات اللہ انصاری، جلیل قدوانی، آغا بابر، آغا سہیل ابراہیم جلیس، ابن الحسن، ابو الفضل صدیقی، ابو سعید قریشی، احمد سعید، حکیم احمد شجاع، احمد شریف، خواجہ احمد عباس، امجد علی، اختر انصاری، اختر اورینوی، اختر جمال، اختر حسین رائے پوری، اعجاز حسین بٹالوی، اعظم کریوی، امر سنگھ، تیغ رفیق حسن، ریاض تاثیر، صادق الخیری، صادق حسین، شفیق الرحمٰن، مظہر الاسلام، آصف فرخی، غلام محمد، رضا علی عابدی۔ خواتین افسانہ نگاروں میں قرۃ العین حیدر، ہاجرہ مسرور، جیلانی بانو، فرخندہ لودھی، عصمت چغتائی، حجاب امتیاز علی، خدیجہ مستور، واجدہ تبسم، خالدہ حُسین، فہمیدہ ریاض، نیلوفر اقبال، اُمِ عمارہ، فرحت پروین، شبنم شکیل کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

عصرِ حاضر میں اُردو افسانہ نگاری تیزی سے زوال پذیری کی جانب مائل نظر آتی ہے۔ 1990ء کی دہائی کے بعد خصوصاً پاکستان میں دِیگر اصنافِ سخن کے مانند پڑھنے پڑھانے کا وصف بھی ختم ہوتا جا رہا ہے۔ 1985ء میں جب شہروں اور دیہات کی مقامی لائبریری جیتی جاگتی تھی اُن دنوں ایک مباحثہ میں احمد ندیم قاسمی نے کچھ اس طرح کے خیالات کا اظہار کیا۔ یہ مباحثہ نقوش 1985ء کے سالنامہ میں چھپا تھا۔

> ''جدید افسانہ کے بارے میں مَیں سمجھتا ہوں کہ یہ بدقسمتی ہے صنف افسانہ کی کہ اس کی ہر تان یہاں آکر ٹوٹتی ہے، علامت نگاری اور تجرید نگاری، تجرید جو ہے وہ شاعری میں بھی ہوتی ہے اور علامت شاعری میں بھی ہوتی ہے لیکن جو قیامت ٹوٹی ہے افسانہ پر، وہ افسانہ جو میں سمجھتا ہوں کہ ادب کی تمام اَصناف میں مقبول ترین

صنف تھی اور اس کے پڑھنے والے جو تھے وہ ہزاروں، لاکھوں کی تعداد میں تھے، اُن کو تجریدی افسانے اور علامتی افسانے نے اتنا محدود کر دیا ہے کہ اب لوگ رسالہ چھپا ہوا جو دیکھتے ہیں اور پھر فہرست دیکھتے ہیں، فہرست میں افسانہ بالکل نہیں دیکھتے۔ محض خوف زدگی کے باعث، کہ یہ تو وہی علامت نگار اور تجزیہ نگار ہیں، اس لیے ہمارے پلّے تو پڑے گا ہی نہیں، اس لیے اب وہ زیادہ تر سفر نامے دیکھ لیتے ہیں، یا ناول کا کوئی چیپٹر، یا کوئی خودنوشت سوانح پر گزر بسر کر لیتے ہیں، نتیجہ یہ ہے کہ افسانے کا قاری جو میں یہ سمجھتا ہوں کہ ادب پڑھنے والے قارئین کی اکثریت کو ہم نے بالکل ضائع کر دیا ہے بلکہ بھگا دیا ہے۔''

ناول :

اُردو نثر کی ایک اہم ترین صنف افسانہ اوپر زیرِ بحث آچکی ہے۔ اب کچھ دِیگر اَصناف پر ایک سرسری سی نگاہ ڈالتے ہیں۔ اُردو نثر نگاری کی دوسری اہم ترین صنف ناول ہے۔ جس سے ''کچھ نیا پن'' مرادلی جاتی ہے۔ ناول اطالوی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی انوکھا، نرالا اور عجیب کے ہیں۔ اُردو نثر کے حوالے سے ناول اُس قصے یا کہانی کو کہتے ہیں جس میں انسانی حیات اور اس سے جُڑے، گزرے واقعات ایک خاص ترتیب کے ساتھ نظر آئیں۔ اس کے علاوہ کہانی، پلاٹ، کردار، زبان و بیان، مکالمے، منظر نگاری اور فلسفہ حیات اس کے اہم ترین عناصر ہیں۔ ناول عام طور پر اُردو افسانے سے زیادہ طویل ہوتا ہے۔ اِس کے بارے میں ڈاکٹر گیان چند لکھتے ہیں:

''ناول معروف عام صنف ہے، جس کی تعریف یا اقسام قلم بند کرنے کی ضرورت نہیں۔ انگریزی میں تمثیلی ناول پلگرمس پروگرس بالکل ابتدائی ناولوں میں ہے۔ اُردُو میں جن تمثیلی قِصّوں کو ابتدائی ناول کی مثال قرار دیا گیا ہے، اُن کا ناول ہونا اسی طرح محلِ نظر ہے جس طرح نیرنگِ خیال کے تمثیلی مضامین کا مختصر افسانہ ہوتا۔ افسانوں

کی طرح تجریدی ناول بھی لکھے گئے۔ جیمس جوائس کا انگریزی ناول یولسس سب سے مشہور تجریدی ناول ہے۔ اسے اینٹی ناول بھی کہہ سکتے ہیں لیکن بعد میں اسے ایک عظیم ناول مانا گیا۔ اُردو میں انور سجاد کا ''خوشیوں کے باغ'' اور فہیم اعظمی کا جنم کنڈلی تجریدی ناول ہیں۔ ناول کی ایک قسم سوانحی ناول ہے مثلاً قرۃ العین حیدر کا ''کارِ جہاں دراز ہے''۔ عصمت چغتائی کا زیرِ تکمیل ''کاغذی ہے پیرہن''، اپندر ناتھ اشک کا ''گرتی دیواریں'' گو اُن کی سوانح پر مبنی ہے لیکن اس معنی میں سوانحی ناول نہیں جس میں قرۃ العین حیدر یا عصمت چغتائی کے ناول ہیں۔ موضوع اور فن کے لحاظ سے ناولوں کی متعدد قسمیں ہیں جن کا ذِکر یہاں قطع کیا جاتا ہے، بجز جاسوسی ناول کے جو ناول کی ایک مقبول ذیلی صنف ہے۔''

اُردو ناولوں پر نگاہ ڈالی جائے تو ڈپٹی نذیر احمد کا ''ابن الوقت''، رتن ناتھ سرشار کا ''فسانۂ آزاد''، عبدالحلیم شرر کا ''فردوسِ بریں'' اور مرزا ہادی رُسوا کا ''اُمراؤ جان ادا'' اِس صنفِ ادب کی نمائندہ تحریریں ہیں۔

اُن کے بعد قرۃ العین حیدر، ممتاز مفتی، عبداللہ حسین، بانو قدسیہ اُردو کے بڑے ناول نگاروں کی صف میں دِکھائی دیتے ہیں۔ یہاں، میں بطور خاص قمر اجنالوی کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں جو کہ اعلیٰ درجے کے ناول نگار تھے لیکن بدقسمتی سے اُن کی وہ پہچان نہ بن سکی جس کے وہ حق دار تھے۔ اُن کے مقابلے میں سرکاری ناول نگارروں تختِ طاؤس پر بٹھایا گیا۔ نسیم حجازی کو زمانے بھر میں پذیرائی ملی، اُن کے ناولوں پر ٹی وی ڈرامے بھی تشکیل دیے گئے جو سرد جنگ کے دور میں مشہور ہوئے مگر نسیم حجازی قطعاً اس معیار کے ناول نگار نہیں تھے، جس معیار کا اُنھیں کو پیش کیا گیا۔

ناولٹ:

یہ ناول کی ایک اعلیٰ درجے کی قسم ہے جس میں تکنیک مکمل طور پر ایک ناول ہی کی استعمال ہوتی ہے لیکن طوالت کے لحاظ سے اسے ایک طویل افسانہ بھی کہا جاسکتا ہے۔ اُردو کے

کئی افسانہ نگاروں نے اِس صنف میں پر طبع آزمائی کی ہے۔سجاد ظہیر کا ''لندن کی ایک رات''، ارشاد احمد صدیقی کا ''رختِ دل باندھ لو'' ناولٹ کی خوبصورت مثالیں ہیں۔

سرّی ادب:

ناول کی اِس ذیلی صنف ''جاسوسی ناول'' کا تذکرہ ڈاکٹر گیان چند نے بھی کیا تھا۔ اِسے سرّ ی ادب کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے۔ اُردو نثر نگاری میں اس صنف کے موجد اور بانی ابنِ صفی تھے۔ ابنِ صفی سے قبل کچھ انگریزی ناولوں کے تراجم اُردو زبان میں کیے گئے تھے۔ وِکٹر ہیوگو اور آرتھر کینا ڈول کے ناول ہندوستان میں کافی مقبول ہوئے۔ ابنِ صفی کا دور جنوری 1952ء سے شروع ہو کر 1980ء کی دہائی تک رہا۔ اُن کے ناول آج تک پاکستان کے ساتھ ساتھ ہندوستان اور بنگلہ دیش میں بھی مقبول ہیں۔ اُن کے کئی ناولوں کے تراجم بنگلہ زبان میں ہوئے۔ اُن کے ابتدائی چند ناولوں کے مرکزی خیال انگریزی ناولوں سے ماخوذ تھے لیکن کردار اُن کے اپنے ہی تخلیق کردہ تھے۔ جاسوسی دُنیا میں کرنل فریدی، کیپٹن حمید، قاسم، انور اور رشیدہ جیسے لازوال کردار آج بھی زبانِ زدِ عام ہیں۔ اسی طرح عمران سیریز میں عمران، جولیا، صفدر اور جوزف جیسے کردار کئی نسلوں کے دماغ پر حاوی ہیں۔ انھوں نے اگر نثر کی دِیگر اَصناف میں بھی لکھنے کی کوشش کرتے تو شاید بڑے بڑے نام ان کے سامنے ہیچ ہوتے کیونکہ اُن کی منظر نگاری اور مکالمے قاری کو جکڑ لیتے ہیں۔ برصغیر پاک و ہند کی ہزاروں نجی لائبریریاں اُن کے قلم کی مرہون منت تھیں۔ اُن کے تخلیق کردہ منفی کرداروں میں سنگ ہی، تھریسیا آف بمبل بوہیما، فوہی، ایڈلاوا عوام میں بہت مقبول ہوئے۔ ابنِ صفی نے لوگوں میں کئی کئی گھنٹے مستقل بیٹھ کر پڑھنے کا رواج ڈالا۔ لوگ اُن کے ہر ناول کے ماہانہ نمبر کا شدت سے انتظار کرتے۔ آج کے عہد کے کئی بڑے نام اُن کے مرہونِ منت ہیں کہ ابن صفی کے ناولوں کے باعث اُن میں پڑھنے کا شوق پیدا ہوا۔ ہندوستانی شاعر گلزار نے انوپم کھیر کے پروگرام میں برملا کہا تھا کہ اُنھیں پڑھنے کی عادت ابنِ صفی کے ناولوں سے پڑی اور وہ ایک عظیم انسان تھے۔ اُن کی یہ بات سن کر مسکراتے ہوئے انوپم کھیر کا جواب تھا کہ اُنھیں بھی پڑھنے کی عادت ابنِ صفی ہی کی تحریروں نے ڈالی۔ اُن کے تخلیق کردہ کرداروں کو آگے بڑھاتے ہوئے اُن کی وفات کے بعد مظہر کلیم، صفدر شاہین، نجمہ صفی اور کئی دوسرے ناول

نگاروں نے طبع آزمائی کی، مگر مولوی مدن جیسی بات کہاں، کوئی بھی ناول نگار ابنِ صفی کی جگہ نہ لے سکا۔ اُن کے بعد ایک دوسرا اہم نام اشتیاق احمد کا نظر آتا ہے۔ جنھوں نے بچوں کا جاسوسی ادب تخلیق کیا۔ اُن کا عہد 1980ء کی دہائی سے لے کر آج تک جاری ہے۔ انسپکٹر جمشید سیریز، انسپکٹر کامران سیریز اور شوکی سیریز آج بھی بچوں میں حد درجہ مقبول ہیں۔ اُن کی کامیاب تحریروں کا محرک بھی ابنِ صفی ہی کے ناول تھے۔

خاکہ:

خاکہ نگاری کا فن اُردو زبان میں کچھ زیادہ قدیم نہیں۔ یہ صنف بیسویں صدی کے اوائل سے پروان چڑھنا شروع ہوئی۔ خاکہ کسی شخص کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اُجاگر کرنے کا نام ہے۔ یہ خاکہ نویس کا کمال ہوتا ہے کہ وہ کس طرح سے ایک شخص کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے اور پھر اُس کی زندگی کو قلم بند کرتا ہے۔

ڈاکٹر گیان چند ''خاکہ'' کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:

> ''یہ کسی شخصیت کی قلمی تصویر ہوتی ہے۔ اس میں خارجی شخصیت کا بیان بھی ہوتا ہے لیکن اس سے کہیں زیادہ اہم داخلی شخصیت یعنی عادات و اطوار، مزاج، نفسیات، پسند و ناپسند وغیرہ کی تفصیل ہوتی ہے۔ سوانحی کتابوں میں اگر مصنف کی شخصیت کے بارے میں کوئی علیٰحدہ باب ہوتا ہے تو وہ خاکہ ہی ہوتا ہے۔ خاکہ نگاری دراصل انشائیے سے مل جاتی ہے۔ اس کے لکھنے کا انداز بھی انشائیے جیسا ہوتا ہے۔ اس کے ابتدائی خدوخال شعرا کے تذکروں میں ملتے ہیں۔ آزاد کی ''آبِ حیات'' میں شُعرا کے جان دار خاکے پیش کیے گئے ہیں۔ بحیثیت ایک آزاد صنف کے خاکہ نگاری کا وجود بیسویں صدی میں ہوا۔ فرحت اللہ بیگ کا طویل خاکہ، ''نذیر احمد کی کہانی، کچھ اُن کی کچھ میری زبانی'' بہترین خاکہ ہے۔ عبدالحق، رشید احمد صدیقی، شوکت تھانوی، محمد طفیل وغیرہ اہم خاکہ نگار ہیں۔ اب اُردو میں خاکوں کے مجموعوں کا بڑا انبار ہے''۔

مولانا چراغ حسن حسرت، مولانا عبدالمجید سالک، مولانا سیّد سلمان ندوی اور مولانا

سیّد ابوالحسن علی ندوی ابتدائی خاکہ نگاروں میں سے ہیں۔ اُردو خاکہ نگاری میں ایک اہم نام سعادت حسن منٹو کا بھی ہے۔منٹو نے اپنے خاکوں میں زیرِ بحث شخصیت کی زندگی کو کسی لگی لپٹی کے بغیر بیان کیا۔ اُن کی تحریر میں ایک خاص قسم کی برجستگی اور روانی تھی۔ دوسرا اہم ترین وصف حقیقت نگاری تھا۔منٹو اپنے خاکے میں وہی کچھ تحریر کرتے تھے جو اُس شخص میں دِکھائی دیتا تھا۔ اُس کی شخصیت کے تمام مثبت اور منفی پہلو ساتھ ساتھ بیان کرتے تھے۔ آغا حشر کاشمیری، نرگس، اختر شیرانی اور نور جہاں پر اُن کے شخصی خاکے فن کی معراج ہیں۔ احمد ندیم قاسمی نے دو کتابیں ''میرے ہمسفر'' اور ''میرے ہم قدم'' کے عنوان سے تحریر کیں جن میں کئی شخصیات پر اعلیٰ درجے کی تحریریں موجود ہیں۔ محمد طفیل نے بھی انتہائی متاثر کن خاکے تحریر کیے۔ اُن کے شخصی خاکوں کے مجموعے صاحب، جناب، آپ، محترم، مکرّم، مُعظم، مخدومی، محبّی کے عنوان سے شائع ہوئے۔ اُس کے ساتھ ساتھ اُنھوں نے مدیرِ نقوش کی حیثیت سے نقوش کا شخصیات نمبر بھی شائع کیا جس میں کئی شخصیات کی زندگی کے مخفی پہلو سامنے آئے۔ اسی طرح اے حمید کی کتاب ''چاند چہرے'' بھی خاکہ نگاری کی اعلیٰ ترین مثال ہے۔عصرِ حاضر میں اسلامیہ کالج، ریلوے روڈ، لاہور کے ریٹائرڈ پرنسپل امجد علی شاکر کی دو کتابیں ''مسند'' اور ''روایت'' بھی خاکوں کی بہترین مثال ہیں۔

سفر نامہ:

سفر حضرتِ انسان کی بنیادی جبلتوں میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ مذاہب کے بنیادی عقائد کو سامنے رکھا جائے تو تمام قدیم مذاہب حضرت آدمؑ اور اماں حوّا کا جنت سے دھرتی تک کا سفر بیان کرتے ہیں۔حضرت آدمؑ اور اماں حوّا نے دوسرا سفر اس دھرتی پر کیا۔ انسان نے ابتدائی طور پر محفوظ رہائش گاہوں کی تلاش کی اور وہ موسمی اور جغرافیائی تبدیلیوں کے ساتھ مسلسل نبرد آزما رہا جس کے باعث انسان کی کئی نسلوں نے دھرتی کی مختلف جگہوں کا سفر کیا۔قدرت کے ساتھ معاملات بتدریج بہتر ہوتے گئے تو انسان نے بھی انسان دشمنی کا آغاز کر دیا۔ انسان نے انسان ہی کے خون کی وجہ سے ہجرت کو اپنایا۔ ہندوستان ایک ایسا خطہ تھا جس میں خوراک کے وافر ذخیرے تھے اور جغرافیائی حالات بھی انسانی فطرت کے عین مطابق تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ہندوستانی لوگ دوسری جگہوں پر بہت کم منتقل

ہوئے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں ''دھرتی ماں'' اور ''دھرتی پُوجا'' کے نظریات بھی گہرے تھے۔

سفر نامے کی تاریخ کے حوالے سے کچھ اقتباسات درج ذیل ہیں جو'' سپوتنک'' دسمبر 1999ء سے لیے گئے ہیں۔ اس سے سفر نامے، خصوصاً اُردو سفر نامے کی تاریخ کو سمجھنے میں کافی آسانی ہو گی:

''یونانی مؤرخ ہیرو ڈوٹس کو دُنیا کا پہلا سفر نامہ نگار کہا جاتا ہے جبکہ مغربی ادبیات میں سفر نامے کی روایت کا سراغ لگاتے ہوئے ہم تیرھویں صدی عیسوی تک ہی جاتے ہی، جب برطانیہ کی اوّلین سفر نامہ نگار خاتون مارجری کیمپ جو صوفیانہ مسلک کی پابند تھی، تیرھویں صدی عیسوی میں یروشلم تک ہو آئی۔ پھر چوسر کی ''کنٹربھری ٹیل'' ہے جس میں کنٹربری سینٹ بیکٹ کے مزار پر جانے والا مسیحی قافلہ، ہیری بیلی کو میرِ کارواں چنتا ہے اور یہ طے پاتا ہے کہ وقت گزارنے کے لیے زائرین میں سے ہر فرد کوئی نہ کوئی کہانی ضرور سنائے جو نہیں سنائے گا اُسے جرمانہ ہو گا۔''

''قدیم سفر ناموں کی کھوج میں نکلیں تو ہندوستان سے متعلق لکھے گئے سفر ناموں میں ''سفر نامہ ہند'' تک جا نکلتے ہیں۔ یونانی سیاح میگا ستھنز کا یہ سفر نامہ دُنیا کے قدیم ترین سفر ناموں میں شمار ہوتا ہے۔ میگاستھنز تین سو سال قبل مسیح میں ہندوستان کے مہاراجہ چندر گپت موریہ کے دربار (دارالسلطنت پٹنہ) میں بطورِ یونانی سفیر حاضر ہوا اور ہندوستان میں اپنے قیام کی رُوداد سفر نامے کی صورت میں لکھی۔ قیاس غالب ہے کہ سکندرِ اعظم کے ہندوستان پر حملہ کرنے کے لیے اسی سفر نامہ سے حاصل کردہ معلومات کو بنیاد بنایا گیا۔ اوائل پانچویں صدی عیسوی (راجہ بکرماجیت کے عہدِ حکومت) میں چین کا ایک سیاح فاہیاں، بدھ رہبانیات کی نشانیاں محفوظ کرنے کی خاطر ہندوستان آیا اور اپنی

یادداشتیں یادگار چھوڑیں۔''

پروفیسر گیان چند اس صنف کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اس میں ذاتی نقطۂ نظر سے دوسرے مقامات کی سیر کرائی جاتی ہے۔ اس میں تاریخ، جغرافیہ، معاشرت، معاشیات سبھی کی پٹ ہوتی ہے۔ اس میں دوسروں کی شخصیت، ادبی تقریبوں اور ہنگاموں کا بیان عام ہو گیا ہے۔ چونکہ آج کل اُردو والوں کو بڑی تعداد میں باہر کے ملکوں میں جانے کے مواقع مل رہے ہیں، اس لیے اب سفرنامے بیرونی ممالک سے مخصوص ہو گئے ہیں۔ ویسے یہ صنف اُنیسویں صدی ہی سے ملتی ہے۔ قدیم ترین سفرنامہ یوسف خاں کمبل پوش کا عجائباتِ فرہنگ 1847ء ہے۔''

اُردو سفرنامے کے ابتدائی ایام میں سرسیّد احمد خان کا دورۂ انگلستان بھی تحریری شکل میں موجود ہے۔ اُس کے بعد کئی سفرنامے ترجموں اور اصل مسوّدوں کی شکل میں دِکھائی دیے۔ بیسیویں صدی میں ابن انشاء اور مستنصر حسین تارڑ نے اِس صنف میں کئی نئے تجربات بھی کیے۔ خواتین کے حوالے سے اہم ترین نام شہزادی میمونہ سلطان کا ہے جو بھوپال کے حکمران نواب حمید اللہ خاں کی شریک حیات تھیں اور جنھوں نے ''بیگم آف بھوپال'' کا خطاب پایا۔ اُن کا یہ سفرنامہ بھوپال سے لندن، پھر لندن سے جینوا، بلقان، ترکی اور اٹلی تک کی رُوداد ہے۔ محمد طفیل کا ''روزنامچہ'' بھی اپنی نوعیت کا ایک الگ اور خوبصورت طرزِ تحریر کا حامل سفرنامہ ہے۔

ڈرامہ:

ڈرامے کی روایت یونانیوں کے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔ سات سو قبل مسیح کے دور میں یونان میلوں کا گڑھ تھا۔ ''ڈرامہ'' کے لفظی معنی ''کوئی کام کر کے دِکھانے'' کے ہیں۔ ادبی اصطلاح میں اسے ''تنازع کا جنم'' بھی کہا جاتا ہے۔ ہندوستان میں تھیٹر کی اپنی ایک مضبوط روایت موجود ہے۔ صدیوں سے رہس دھاریوں کے تھیٹر ہندوستان کے کئی مقامات پر دِکھائے جاتے رہے۔ مہابھارت اور رامائن کے کرداروں کی بنیادوں پر بھی ڈرامے پیش کیے

جاتے رہے۔ برِصغیر میں اس کے لیے لفظ کھیل، ناٹک اور کھیڈ بھی استعمال ہوتا رہا۔ یہاں کا رقص بذاتِ خود ایک تھیٹر کی حیثیت رکھتا تھا۔جس کی ایک صنف ''کتھک'' کے معنی ہی ناچ کر کہانی کہنے کے ہیں۔ اُردو ڈرامے کا رواج انگریز سرکار کے برصغیر میں آنے کے بعد ہوا۔ اس کی ابتدا شمالی ہندوستان سے ہوئی اور پھر پورے ہندوستان میں تھیٹر کے ادارے بنتے گئے۔ اُردو کے پہلے باقاعدہ ڈرامے کے بارے میں مؤرخین کے دو الگ گروہ اپنی اپنی رائے لیے ہوئے ہیں۔ ایک گروہ میں سے ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا کہنا ہے کہ پہلا ڈرامہ امانت لکھنوی کا تحریر کردہ تھا جس کا نام ''اِندرسبھا'' تھا اور یہ ڈرامہ 1853ء کے آگے پیچھے تحریر ہوا۔ دوسرے گروہ میں امتیاز علی تاج جیسے ہمہ جہت مصنفین شامل ہیں جن کا کہنا ہے کہ پہلا ڈرامہ ''خورشید'' تھا جو 1871ء میں لکھا گیا۔ اِس کے بعد آرام، ظریف، رونق، مراد، حباب، حافظ عبداللہ اور طالب کے ڈرامے منظرِ عام پر آئے۔ پھر مرزا نظیر بیگ، آغا حشر کاشمیری اور رفیع پیر کے ڈرامے ہندوستان بھر میں مشہور ہوئے۔ ڈاکٹر گیان چند نے ڈرامے کے بارے میں تحریر کیا ہے:

> ''ڈرامہ نظم میں بھی ہوتا ہے نثر میں بھی اور نثر و نظم سے مخلوط بھی۔مخلوط ڈرامے کو نثری ڈرامے کے تحت ہی رکھیں گے کیونکہ نثر کے بیچ اشعار اور نظمیں لانے کی اجازت ہے۔ فی الوقت ہمیں محض نثری ڈراموں سے سروکار ہے۔ڈرامے کا ارتقا طویل سے مختصر کی طرف کو ہوا ہے۔ پانچ ایکٹ سے کم ہو کر تین دو اور آخر میں ایک ایکٹ کے ڈرامے لکھے جانے لگے۔ اُردو میں یک بابی ڈرامے کی ابتدا 1925ء اور 1930ء کے درمیان ہوئی۔مختصر افسانے نے اس کی تخلیق کو اُکسایا۔ رسالوں اور ریڈیو نے بھی طویل ڈراموں پر مختصر ڈراموں کو ترجیح دی۔''

> ''ڈرامے کی بہت سی قسمیں ہیں جن کی تفصیل نہیں دی جارہی۔ دوسری اینٹی اصناف (اینٹی افسانہ، اینٹی ناول، اینٹی غزل) کی طرح اینٹی تھیٹر بھی وجود میں آیا۔ اسے ایبسرڈ تھیٹر یا لایعنی ڈرامہ

کہا گیا حالانکہ دراصل یہ اتنا لغو و لایعنی نہیں ہوتا۔ بہرحال لغویت کا تعلق موضوع سے ہے، ہیئت سے نہیں۔''

''یک بابی ڈرامے کی ایک اہم قسم ریڈیو ڈرامہ ہے۔ چونکہ ہمارا موضوع اصنافِ ادب ہے اس لیے ہمیں ریڈیو ڈرامے کی محض تحریری شکل سے سروکار ہے۔ ڈاکٹر اخلاق اثر نے اپنی کتاب ریڈیو ڈرامے کی اَصناف میں متعدد ذیلی اَصناف کا ذکر کیا ہے مثلاً ریڈیو رُوپ، ریڈیو ڈرامہ رُوپ، ریڈیو فیچر، ریڈیو ڈاکیومنٹری، ریڈیو نیوز ریل، ڈرامائی مونو لاگ، فنتاسیہ، مزاحیہ (کامک) وغیرہ۔ ریڈیو روپ (Adaptation) میں کسی تحریری ڈرامے کو صوتی تبدیلیوں کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ ریڈیو ڈرامہ روپ میں دوسرے میڈیموں مثلاً فلم، اسٹیج، ناول، داستان وغیرہ کی کہانیوں کو ریڈیو ڈرامے کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے۔''

جب ٹی وی ڈرامہ شروع ہوا تو کئی عشروں تک پاکستانی ڈرامے دُنیا بھر میں معروف رہے۔ ڈرامہ نویسوں میں اشفاق احمد، بانو قدسیہ، احمد ندیم قاسمی، اے حمید، مُنو بھائی، فاطمہ ثریا بجیا، کمال احمد، امجد اسلام امجد، حسینہ معین، یونس جاوید، اصغر ندیم سیّد، انور مقصود اور کئی دِیگر نام شامل ہیں۔ تھیٹر کے ساتھ یہ ہوا کہ آغا حشر کے نام سے مقبول ہونے والا تھیٹر اب جائے حشر بن چکا ہے۔ تھیٹر کے شائقین کی جگہ تماشبینوں نے لے لی ہے۔ ڈرامے کی جگہ محض ڈیڑھ سے دو گھنٹوں کا مجرا پیش کیا جا رہا ہے۔ فلم اپنی جگہ پر تباہ ہو چکی ہے۔ سینما گھر پلازوں میں تبدیل کیے جا رہے ہیں۔ ڈرامے کی آخری شکل پر اَب آنسو ہی بہائے جا سکتے ہیں۔

درجِ بالا اَصناف کے علاوہ انشائیہ، مقالہ، آپ بیتی، یادداشتیں، رپورتاژ، خطوط، مراسلہ اور دورِ حاضر میں صحافت (اداریے، کالم، فکاہیہ، مطائبات) کو بھی اُردو نثری ادب کی اہم اَصناف میں شمار کیا جاتا ہے۔

مولوی نُور احمد چشتی

1829ء-1867ء

نُور احمد کو الٰہی کر عطا
روزِ محشر دامنِ مشکل کُشا
نُور احمد چشتی

لاہور شہر کی تاریخ نویسی کے حوالے سے جن مُعتبر مؤرخین کے نام ملتے ہیں، اُن میں نُور احمد چشتی بھی شامل ہیں۔ آپ کے جدِ امجد ایران سے نسبت رکھتے تھے۔ ہندوستان میں جب شیر شاہ سوری تخت نشین تھے، ہمایوں نے شہنشاہِ ایران کے پاس پناہ لے رکھی تھی۔ شیر شاہ سوری کی وفات کے بعد جب ہندوستان میں حالات موافق دکھائی دیے تو ہمایوں نے شہنشاہ ایران کی مدد سے دوبارہ ہندوستان کا اقتدار سنبھالا۔ ایران سے ہندوستان آتے ہوئے اس کے ساتھ کئی اہلِ علم و ہنر ہندوستان میں آن بسے۔ اُن اہلِ علم شخصیات میں محمد عاقل بھی تھے جو نُور احمد چشتی کے آبا و اجداد میں سے تھے اور ایک طویل عرصہ مُغل دربار سے وابستہ رہے۔ محمد عاقل کے خاندان کا اپنے ایرانی اقربا سے تعلق ہمیشہ قائم رہا کہ ان کا ایران آنا جانا لگا رہتا تھا۔ دانش، علم و ہُنر کے اوصاف اس خاندان کی گُھٹی میں تھے۔ اہلِ علم مُغل دربار سے رنجیت سنگھ کے دربار تک اور پھر انگریز سرکار سے وابستہ رہے۔ آپ کے والدِ گرامی مولوی

احمد بخش یکدل اپنے وقت کے ایک قابلِ عزت دانشور ادیب تھے۔ اُن کی لیاقت اور علم و فضل کے باعث اُنھیں راجہ دِینا ناتھ کا خاندانی اتالیق مقرر کیا گیا۔ نُور احمد چشتی کی والدہ محترمہ بھی اپنے وقت کے انتہائی عالم فاضل انسان محمد بخش صحاف کی صاحبزادی تھیں۔

نُور احمد چشتی کا جنم 1244ھ بمطابق 1829ء کو لاہور میں ہوا۔ آپ ابھی چھے برس ہی کے تھے کہ والدہ ماجدہ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ اُن کے بعد آپ کی تعلیم و تربیت آپ کے والد کے زیرِ سایہ تکمیل پائی۔ قرآن شریف کی تعلیم کے ساتھ ساتھ چھوٹی عمر ہی میں فارسی، اُردو اور عربی پر ملکہ حاصل کر لیا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی شہرۂ آفاق کتاب ''تحقیقاتِ چشتی'' میں فارسی اور عربی کے گہرے اثرات ہیں۔ 1842ء میں جب آپ اپنی تعلیم مکمل کر چکے تو روزی روٹی کے لیے اپنے اجداد کا آبائی پیشہ درس و تدریس اختیار کیا۔ جب انگریز پنجاب پر قابض ہو گئے تو آپ کئی برس تک انگریز طالب علموں کو اُردُو، فارسی کے ساتھ پنجاب کی قدیم اور اہلِ پنجاب کی مادری زبان پنجابی پڑھاتے رہے۔ اُن طلبہ میں سے کئی ایک بعد میں پنجاب سرکار کے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ ''تحقیقاتِ چشتی'' آپ نے انگریز سرکار کے ایک افسر کے کہنے پر بھی تحریر کی تھی۔ اُنھوں نے کتاب کی تصنیف کے بارے میں صفحہ 38 پر لکھا:

> ''اب ان ایامِ فرصت میں جناب خداوند نعمت، آقائے نامدار عالی وقار، قدردان اہلِ علم و ہُنر مجموعۂ اخلاق، برگزیدۂ آفاق، صاحبِ فیض عمیم جناب مسٹر ولیم کولڈ سٹریم عالی جاہ بہادر، دام اقبالہ اسسٹنٹ کمشنر نے اس کمترین کو حکم دیا کہ حالات عمارات و مزارات و مقابر و مساجد نواح مُفصّل تحریر کروں''۔

اس کتاب کی ابتدائی اشاعت میں عمارتوں کے خاکے بنوا کر بھی چھپوائے گئے۔ اس وقت کے نسخے اب ناپید ہو چکے ہیں۔ عہدِ حاضر میں چھپی کتاب خاکوں کے بغیر ہے۔ اس کتاب کے بارے میں کسریٰ منہاس نے لکھا:

> ''اس کتاب میں بزرگانِ اسلام جو لاہور میں مدفون ہیں، اُن کا ذکر آیا ہے۔ لاہور کی تاریخی عمارات کے متعلق اس کتاب میں بہت کچھ

ملتا ہے۔ معابد و مراسمِ اہلِ نہود پر تبصرہ کیا ہے۔ روئے زمین کے اولیا اللہ اور حتی الامکان ہر ایک خانوادہ کا حال لکھا ہے۔ اس ترتیب میں مطبوعہ کتب کے علاوہ مسموع شواہد کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے۔ جو باتیں خاص اشخاص کی زبانی معلوم ہوئی ہیں، اُنھیں بھی درجِ کتاب کر رکھا ہے۔ اگر چہ کتاب کا یہ پہلو محلِ نظر ہے، یہ کوشش بھی کی ہے کہ صاحبِ مقبرہ کب اور کس زمانہ میں کہاں تولد ہوئے، اُن کی شہرت کا کیا باعث تھا، ان کی کرامات سے عوام نے کیا فیض حاصل کیا۔ آخر کب اور کہاں وفات پائی۔ صحیح تاریخِ وفات کیا تھی۔ کون کون ان کے خلیفہ و مرید و معتقد ہوئے۔ ان کی وفات کے بعد ان کے سجادہ نشین کون کون تھے۔ اب کون موجود ہے۔ وہ کس قوم سے تعلق رکھتے تھے، اور اب اُن کی اولاد میں سے کون زندہ ہیں اور کس مقام پر سکونت پذیر ہیں۔ کیا وہ مقبرہ رجسٹر نزول سرکاری میں درج ہے یا نہیں۔ اس مکان یا مقبرے یا شوالے یا گوردوارے یا ٹھاکردوارے وغیرہ کے ساتھ کیا کیا معافی ہے، زمین ہے یا گاؤں، یا نقدی اور اس تقرر کا باعث کیا ہے۔ یہ معافی کس قدر ہے اور کس کے حکم اور کس وجہ سے یہ پہلے پہل مقرر ہوئی۔ یہ جاگیر یا پنشن حین حیات سجادہ نشین ہی تک تھی، یا نسلاً بعد نسل سجادہ نشین کو عطا ہوئی ہے۔ اور سالانہ اس پر کیا خرچ ہوتا ہے۔ اور خرچ میں کتنی پتیاں ہیں۔ عرس وغیرہ کس تاریخ کو مقرر ہے۔ اور عرس پر کیا کیا تقسیم ہوتا ہے۔ عرس پر لوگ کس تعداد میں جمع ہوتے ہیں۔ خانقاہ میں کتنی قبور ہیں اور کون کون بزرگ ان میں مدفون ہیں۔ عمارت یا مکان کس زمانے میں تعمیر ہوئے۔ ان کے بنانے والے کا کیا نام تھا۔ کس زمانے میں اس کا کچھ حصہ مسمار ہوا اور پھر کس قدر عمارات ایزاد کی گئیں۔ نیز یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اس خانقاہ میں کس قدر چار دیواریاں تھیں، کتنی کوٹھریاں، کتنے احاطۂ قبور اور کتنے دالان تھے۔ طول وعرض

وارتفاع اس عمارت کا نہایت کوشش سے پیش کیا جاتا ہے۔ اس قسم کی باتیں بھی مندرج ہیں کہ وارثان حال کیا وارث حقیقی ہیں یا غاصب ان کو کیونکر قبضہ حاصل ہوا اور حقیقی وارث کس طرح بے دخل ہوئے۔"

(نقوش، لاہور نمبر، صفحہ 980-981)

مولوی نُور احمد چشتی موزوں طبع بھی تھے۔ فارسی، اُردُو، پنجابی تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ ۲۳ فروری ۱۸۵۸ء کے اخبار کوہ نُور لاہور سے پتا چلتا ہے کہ "مولوی نُور احمد چشتی میلہ چراغاں احباب کے ساتھ منا رہے ہیں اور فی البدیہہ یہ اشعار فرما رہے ہیں:

وہ جو پہلو سے اُٹھے درد دل ایسا اُٹھا
ضبط کی تاب نہ باقی رہی چلاِ اُٹھا
حالت عشق مری دیکھ کے وہ ہنستا تھا
کیوں رے ہاں اب تو بتا شور یہ کیسا اُٹھا
اس کی الفت سے بھلا فائدہ کیا نکلا ہے
نام بدنام ہوا مفت میں پیسا اُٹھا
عشق کی رمز و کنایہ کی سمجھ میں یارو
مجنوں مشہور تھا پر چشتی بھی ویسا اُٹھا

اُن کی پنجابی شاعری کا کچھ نمونہ مولا بخش کشتہ کی کتاب میں یوں ملتا ہے:

"ایہناں دِی اِک پنجابی لکھت سی حرفی نُور احمد مطبوعہ 1860ء لاہور دی چھپی ہوئی موجود اے جس وچ کربلا بارے ڈیوڑھ لکھے ہن۔ ایہہ پورے 30 بیت ہن کُجھ ڈیوڑھ ونگی لئی:

الف ارادے تیرے سچّے توں ہیں جگ دا والی شکوں خالی
کُن کہہ فیکُون دِکھایا قدرت تیری عالی کسے نہ بھالی
دُنیا نوں اِک باغ بنایا مینوں اس دا مالی خوب سنبھالی
نُور احمد توں ایسے رب دا چل کے ہو سوالی؟ لے خوش حالی

ث ثابت من آل نبیؐ نوں جو کوئی اُتول آیا! رُتبہ پایا
واہ دا ذات حسینؑ علی دِی کربل سر کٹوایا درد نہ آیا
کر قربان گھرانا اپنا اُمّت نوں بخشایا! رنج اُٹھایا
نُور احمد واہ رتبہ اُس دا سارا گھر کہایا! تے لٹوایا

غ غرور دے مارے کوئی ہس ہس گلّاں کر دے مُول نہ ڈردے
ربّ جیہناں نوں رُسوا کردا پیر اَوتّے دھر دے بندے زردے
پاک محمد سرور ساڈا اسیں چاکر اُس گھر دے وانگر بردے
نُور احمد جے ایس دِی ہوندے ماں وِچ کربل لڑدے آخر مردے

ذ ذلیل شقیّاں وچوں جس نے رتبہ پایا شہر وَل آیا
چُھٹّے دم تے لڑیا غازی نام شہید دھرایا! اُچّا پایا
پھیر مصعب بھائی اُس دا نالے بیٹا آیا! سِر کُھوایا
نُور احمد سوہے نیں چنگے جیہناں شہید کہایا گھر گٹوایا

ر رب دے کمّیں دم نہ مارے جو چاہے سو کردا مُول نہ ڈر دا
جے دو قطرے پانی رلدا کیوں کر اصغر مَردا ہَے ہَے دردا
رو رو بانو شہ تھیں پچّھے کون ہُن والی گھر دا جیہڑا سردا
پیاس دے مارے نُور احمد مُونہہ سُکا ہر ہر دا حکم شمر دا

(پنجابی شاعراں دا تذکرہ، صفحہ 184)

آپ کی کتاب میں کتابت کی کچھ غلطیاں اور دیگر مؤرخین سے اختلاف ملتا ہے؛ تاہم کنہیا لال ہندی (مصنف تاریخِ لاہور) کے سوا ہر مصنف نے اس کتاب سے استفادہ کیا۔ سیّد لطیف نے بھی انگریزی زبان میں تحریر کردہ ''تاریخِ لاہور'' میں اس کتاب سے بہت

رہنمائی حاصل کی جس کا اعتراف انھوں نے خود اپنی کتاب کے آغاز میں کیا ہے۔ بغور دیکھا جائے تو پتا چلتا ہے کہ کئی مقامات پر سیّد صاحب نے نُور احمد چشتی کی تحریر ہی کو انگریزی میں منتقل کیا ہے۔ ''تحقیقاتِ چشتی'' کے علاوہ آپ نے کئی اور کتب بھی تحریر کیں لیکن یہی کتاب آپ کی پہچان ٹھہری۔

دِیگر کتب میں نُورالانشا، حمایت الصبیان، خیالاتِ دانش، دیوانِ چشتی، ذخیرۃ الظرافت، ندیم الرمل، فالِ اختر، لُغاتِ محاورہ، تحفۂ چشتی، یادگارِ چشتی شامل ہیں۔ اِن کتب کا ذکر افضل حق قرشی نے اپنے اُس مضمون میں بھی کیا ہے جو ''تحقیقاتِ چشتی'' میں شامل ہے۔

اس عظیم المرتبت مؤرخ، شاعر اور انشا پرداز کا انتقال 11 اگست 1867ء کو ہوا۔ آخری ایام میں اُن کی رہائش گاہ اندرونِ لاہور شہر محلّہ چابک سواراں میں تھی۔ اُنھیں شمالی لاہور میں ''مزار گھوڑے شاہ'' کے قریب واقع ایک چھوٹے سے قبرستان میں دفن کیا گیا۔ یہ قبرستان وہیں لال مسجد کے عقب میں واقع ہے۔ اُن کے والد صاحب کی قبر بھی اِسی قبرستان میں موجود ہے۔ آپ کا تذکرہ پروفیسر اسلم نے اپنی کتاب خُفتگانِ خاکِ لاہور (ص۔ 357) میں اِس طرح کیا ہے:

> ''احمد بخش یکدل کی قبر سے مُلحق جانب قبلہ اُن کے فرزند مولوی نُور احمد چشتی محوِ خوابِ ابدی ہیں۔ ان کی قبر کا کتبہ چوری ہو گیا ہے۔ اُن کا انتقال 1867ء میں ہوا تھا۔ ''تحقیقاتِ چشتی'' اُن کی مشہور تصنیف ہے۔''

شمس العلما مولانا محمد حسین آزاد

1830ء-1910ء

جگایا اُس نے جادو اپنے فن کا
سخن داں تھا کہ افسوں ساز تھا وہ
ہوئے مسحور دِل اس کی نوا سے
یقیناً صاحبِ اعجاز تھا وہ
طاہر شادانی

مولانا محمد حسین آزاد ایک شخصیت، ایک تاریخ، جدوجہد کی لازوال داستان اور ایک عہد تھے۔ آپ کے آباؤ اجداد مُغل بادشاہ شاہ عالم کے دورِ حکومت میں ایران سے تشریف لائے تھے۔ آپ کے بزرگ اور خاندان کے دیگر اکابرین اپنے علم، حکمت، دانش اور زبان دانی کے باعث خاص شہرہ رکھتے تھے۔ آپ کے والدِ گرامی محمد باقر کا شمار اپنے عہد کی قدآور شخصیات میں ہوتا تھا۔ ذِالحجہ 1245ھ بمطابق 5 جون 1830ء کو آزاد کا جنم دہلی میں ہوا۔ بعض مؤرخین کے مطابق اُن کی تاریخِ پیدائش 5 جون نہیں 10 جون 1830ء ہے۔ آپ کے والد صاحب عربی، فارسی اور اُردو کے ماہر تھے۔ اُنھیں اُردو زبان کے حوالے سے ایک اور اعزاز بھی حاصل ہے کہ شمالی ہندوستان کا سب سے پہلا اُردو اخبار ''دہلی اُردو اخبار''

اُنھوں نے جاری کیا تھا۔ یوں آزاد کی زبان دانی، عربی ، فارسی اور اُردو کی بنیادی تربیت اُن کے والد صاحب کے ہاتھوں گھر پر انجام پائی۔ 1845ء میں آزاد نے دہلی کالج میں داخلہ لیا۔ اُن کی علمیت اور قابلیت کو دیکھتے ہوئے اُنھیں اُس زمانے میں سولہ روپے ماہوار وظیفہ جاری کیا گیا۔ مولوی محمد باقر چوں کہ ایک سرکاری ملازم تھے، اس لیے اُن کے جاری کردہ اخبار پر پرنٹر اور پبلشر کی حیثیت سے آزاد کا نام چھپتا تھا۔ تعلیم کے دوران (1853ء) ہی میں، آزاد نے باقاعدہ طور پر یہ ذمے داری بھی سنبھال لی جسے غدر یعنی جنگِ آزادی تک انجام دیتے رہے۔ اس تمام عرصے میں آزاد کے قلم کی فصاحت اپنا لوہا منوا چکی تھی۔ نثر نگاری اور شاعری دونوں میدانوں میں آزاد کا ڈنکا بجنے لگا تھا۔ شاعری کے حوالے سے وہ اُستاد ذوق کے معتقدین میں سے تھے۔ اُستاد ذوق بھی آپ کے ساتھ ایک خاص قسم کا رویہ اور پیار رکھتے تھے۔ 1854ء میں اُستاد ذوق اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے اور آزاد نے کافی عرصہ شدید غم میں بسر کیا۔ 24 مئی 1857ء کو آپ کے اپنے اخبار ''دہلی اُردو اخبار'' میں آپ کی ایک نظم ''تاریخِ انقلاب افزا'' شائع ہوئی۔ آزاد کی معلوم تاریخ کے حوالے سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ اُن کی پہلی طبع شدہ نظم تھی۔ 1857ء کا سال جسے ہندوستان کی تاریخ میں جنگِ آزادی اور غدر کے دو الگ الگ ناموں سے جانا جاتا ہے، پورے ہندوستان کے لیے کسی بڑے المیے اور سانحے سے کم نہ تھا، آزاد کی اس برس سے بہت سی تلخ یادیں وابستہ ہیں۔ آپ کے والدِ گرامی مولوی باقر اور ایک انگریز افسر مسٹر ٹیلر کی آپس میں گاڑھی چھنتی تھی۔ غدر کے دوران میں جب عوام کی اکثریت گوروں کے خلاف تھی، مسٹر ٹیلر مولوی صاحب ہی کے ہاں پناہ گزیں ہوئے۔ کچھ نوجوانوں نے آپ کے گھر پر آنے کی کوشش کی لیکن مولوی صاحب کے سمجھانے بجھانے پر واپس چلے گئے۔ مسٹر ٹیلر نے اُن کے گھر پر چار دن قیام کیا، لیکن وہ وہاں غیر یقینی حالت ہی میں رہے۔ مولوی صاحب کے منع کرنے کے باوجود وہ چار روز کے بعد ان کے گھر سے کسی محفوظ ٹھکانے کی جانب بھاگے۔ کچھ نوجوان پہلے سے گھات لگائے بیٹھے تھے، یوں مسٹر ٹیلر قتل ہو گئے۔ غدر کے بعد جب انگریز راج آیا۔ مولوی باقر کو مسٹر ٹیلر کی جان نہ بچانے کے الزام میں شہید کر دیا گیا اور اُن کی کل جائداد بحقِ سرکار ضبط کر لی گئی۔ آزاد کو اپنے والد کی شہادت کے بعد انتہائی بے سروسامانی کے عالم میں بے زمین و بے مکان ہونا پڑا۔

اُن کے ساتھ اہلِ خانہ کے اُنیس (19) دِیگر افراد بھی تھے۔ آزاد گھر سے نکلے تو اُس راہ میں آپ کی ایک کمسن بہن بھی اگلے جہان سُدھار گئیں۔ زندگی کے ساتھ اس لڑائی میں آزاد نے لکھنؤ، مدراس، نیل گری اور کئی دیگر شہروں کا سفر کیا۔ کچھ عرصہ کے لیے راجہ سروپ سنگھ کی ملازمت کی اور پھر 1860ء میں لدھیانہ کے ارسطو جاہ مولوی رجب علی خان بہادر کے قائم کردہ مطبع مجمع البحرین میں پرنٹر اور پبلشر کے طور پر ملازمت کی۔ یہاں ''دہلی اُردو اخبار'' کا تجربہ کام آیا۔ اس کے بعد اُنھوں نے کئی مقامات پر مختصر عرصہ قیام کیا اور قلیل مدت کی ملازمتیں اختیار کیں جن میں محکمہ جنرل پوسٹ ماسٹر اور محکمہ تعلیم قابلِ ذکر ہیں۔ 1863ء میں آپ کے ہاں آغا محمد ابراہیم کی ولادت ہوئی، وہ اُن کی نرینہ اولاد میں سے واحد شخص تھے جو اُن کی وفات کے بعد بھی اُن کے کام کو آگے بڑھاتے رہے۔ کیونکہ اُن کے دیگر بیٹے اُن کی بیٹیاں زندگی ہی میں دارِ فانی سے کوچ کر گئے تھے۔ آزاد کی زندگی کا ایک خاصہ سیاحت بھی تھا۔ اُنھیں کو مشکل حالات میں بھی سیاحت کا موقع ملتا تو وہ نکل پڑتے۔ اُن دنوں انگریز سرکار کے کہنے پر آپ نے وسط ایشیا کی ریاستوں اور سوویت یونین کا سفر کیا۔ وہاں کے حالات کا جائزہ لے کر ایک مُفصّل رپورٹ سرکار کو پیش کی۔ بخارا تک کیے گئے اس سفر کی خاطر آپ نے پشتو اور تُرکی زبانیں سیکھیں۔ فارسی، عربی پر پہلے ہی ملکہ تھا۔ سفر کی دِیگر مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے آپ نے یہ منزل بھی انتہائی کامیابی سے طے کی۔ جب واپس آئے تو 1868ء میں آپ کو انجمنِ پنجاب کا سیکرٹری مقرر کر دیا گیا۔ آزاد کی تحریروں میں ایک عرصے تک بچوں کا ادب سرِ فہرست رہا۔ اُنھوں نے ایک کتاب ''نصیحت کا کرن پھول'' بھی لکھی تھی۔ انگریز سرکار نے آپ کو پنجاب میں درسی کتب کی تشکیل اور تاریخِ ہند ترتیب دینے کے لیے مسٹر پیسٹرین کی اعانت پر مقرر کیا۔ 1863ء میں قصص الہند کا دوسرا حصہ بھی مکمل کر ڈالا۔ 1869ء میں گورنمنٹ کالج لاہور کے عربی کے اسسٹنٹ پروفیسر مولوی علمدار حسین نے بیماری کے باعث چار ماہ کی رخصت لی تو اِس عارضی آسامی کو آزاد نے پُر کیا اور آپ کی ماہانہ تنخواہ 75 روپے مقرر ہوئی۔ مولوی علمدار حسین کے ساتھ زندگی نے وفا نہ کی اور ان کے انتقال کے بعد آزاد کو مستقل طور پر اسسٹنٹ پروفیسر تعینات کر دیا گیا اور تنخواہ 150 روپے ماہانہ مقرر ہوئی جو اُس زمانے میں اچھی خاصی رقم تھی۔ یوں اُن کے معاشی مسائل حل ہوئے تو آپ نے تحریر

اور درس و تدریس پر پوری توجہ دینا شروع کر دی۔ ان عوامل کا ذکر ڈاکٹر اسلم فرخی نے اپنے ایک مضمون میں کیا ہے:

> ''توسیع و اشاعتِ علم کی کارروائی تین طریقوں پر منحصر ہے۔ تدریس، تقریر اور تحریر۔ شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد ان تینوں طریقوں پر کار بند ہوئے۔ اُن کے نامور معاصرین مولوی نذیر احمد، مولوی ذکا اللہ، خواجہ الطاف حسین حالی اور مولانا شبلی نعمانی کے ہاں بھی یہی سہ جہتی انداز ملتا ہے جس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا کہ توسیع و اشاعت علم کا سہ جہتی انداز عہدِ آزاد کی خصوصیت تھا۔''

(محمد حسین آزاد گورنمنٹ کالج میں)

1870ء میں آپ نے کچھ عرصے کے لیے ''اخبار ہائے پنجاب'' میں بھی کام کیا۔ آزاد، شاعری میں بھی نئے تجربات کے حامی تھے۔ خصوصاً نظم نگاری کی طرف آپ کا خاص رُجحان تھا۔ چونکہ عالمی سطح پر گل و بلبل کی جگہ پر مناظرِ فطرت کو موضوع بنایا جا رہا تھا، اس لیے اُن کے زیرِ نگرانی اپریل 1874ء کو نئی نظم کا ماہانہ مشاعرہ شروع ہوا۔ اور یہ سلسلہ ایک برس تک جاری رہا جس میں کامیاب مشاعروں کا انعقاد ہوا لیکن اس تمام عرصے میں قدامت پسندوں کا شدید احتجاج بھی جاری رہا۔ نظم کی نئی بنیاد اور جدید رُجحانات کا پھیلاؤ تمام ہندوستان میں نظر آ رہا تھا۔ لیکن قدامت پسندوں کی جانب سے پیدا کی گئی بدمزگی کے باعث اس سلسلے کو بند کرنا پڑا۔ یہ بات روزِ روشن کے مانند عیاں ہے کہ برصغیر پاک و ہند میں نیچرل شاعری کی داغ بیل اسی عرصے میں پڑی تھی۔ اس کے بعد کے اگلے تین برس آزاد پر بھاری گزرے کہ آپ کے دو جوان بیٹے محمد باقر اور خلیفہ محمد اکبر اسی عرصے جہانِ فانی سے کوچ کر گئے۔ اُن کی وفات کے کچھ عرصہ بعد آپ کے گھر میں آگ لگ گئی اور بہت سا قیمتی سامان جل کر راکھ ہو گیا اور آپ کی بوڑھی پھوپھی صاحبہ جنھوں نے بچپن سے ہر غم میں آزاد کا ساتھ نبھایا تھا، اس آگ میں جھلس کر وفات پا گئیں۔ 1880ء میں آپ کی شہرۂ آفاق کتاب ''آبِ حیات'' کی اشاعت ہوئی جس نے آپ کو شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دیا۔ آپ کی کئی دِیگر کتب

بھی مشہور ہوئیں لیکن آپ کی شناخت آج بھی آبِ حیات ہی ہے۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں آزاد نے پندرہ برس سے زائد درس و تدریس کا فریضہ انجام دیا اور اس عرصے میں وہ اپنے لباس اور اندازِ تعلیم کے باعث معروف رہے۔ اُن کا گھر کالج سے کوئی ایک ڈیڑھ میل کی مسافت پر تھا اور وہ اپنے خاص لباس اور خاص سواری سمیت کالج آتے تھے۔ اس بات کا ذکر ڈاکٹر الحمید عبدالمجید یزدانی نے اپنے ایک مضمون میں کیا ہے:

''جب مولانا کا یہاں تقرر ہوا ہے، اس وقت کالج میں طلبہ کی تعداد بہت تھوڑی تھی، یہی کوئی چالیس پینتالیس کے قریب اور اس میں بھی کمی بیشی ہوتی رہتی تھی۔ ان طلبہ میں بیشتر ہندو ہوتے۔ جیسا کہ آغا باقر نے لکھا ہے، مولانا کا مکان کالج سے کوئی دو ڈیڑھ میل کے فاصلے پر واقع تھا، اسی بنا پر اُنھیں ایک گھوڑے کا انتظام کرنا پڑا جس پر بیٹھ کر وہ کالج پہنچتے۔ گھوڑے کے آگے آگے یا پیچھے پیچھے سائیس چلتا اور دائیں بائیں مولانا کے شاگرد اپنی کتابیں بغل میں دبائے ساتھ ساتھ چلتے۔ جب وہ شہر سے باہر نکلتے تو شاگرد کتابیں کھول لیتے اور مولانا سے اپنے سبق کے بارے میں ضروری باتیں پوچھتے۔ امتحانوں کے دنوں میں ایسے شاگردوں کی تعداد میں اضافہ ہو جاتا، ہر طالبِ علم کوئی نہ کوئی سوال پوچھتا جاتا اور مولانا اس کے سوال کا جواب دیتے جاتے۔ بعض مرتبہ وہ خود بھی ضروری سوالات اور ان کے جوابات اُنھیں بتاتے جاتے۔''

کالج میں آزاد اپنے خاص لباس میں آتے جو مولویانہ قسم کا اور قدیم وضع کا ہوتا تھا۔ اس لباس کی تفصیل آغا باقر نے دی ہے:

''بر کے پائنچے کا لٹھے کا پاجامہ اور لٹھے ہی کا مُغلئی گریبان کا کرتا...... (پاؤں میں) عام طور پر سلیم شاہی نری کی جوتی۔ گرمیوں میں نین سکھ کا انگرکھا...... اس پر سفید نین سکھ کا چغا، سر پر چوگوشیہ

ٹوپی......اس پر سفید صافہ بائیں جانب سے باندھتے۔ سفید جرابیں پہننے کا بہت شوق تھا۔قدیم وضع کے مطابق گلے میں سفید لٹھے کا رومال بھی باندھتے......سردیوں میں پائجامے کو پنڈلیوں پر لپیٹ کر باندھا کرتے تھے۔ اگر زیادہ سردی ہوتی تو کشمیرے کی نیم آستین پہنتے۔ سخت سردیوں میں روئی کا کوٹ بھی پہن لیتے تھے، ورنہ نیم آستین پر فرغل پہنتے۔ سر پر بجائے ململ کے صافے کے سفید یا فاختائی رنگ کا گرم کشمیری صافہ باندھتے۔ پاؤں میں سفید اونی جرابیں اور دیسی جوتا۔ کشمیری کام کیا ہوا چغا زیادہ استعمال کرتے تھے اور گلے میں وہی سفید لٹھے کا رومال۔"

(اورینٹل کالج میگزین ،ص9–108 /مولانا آزاد گورنمنٹ کالج میں)

1880ء ہی میں آزاد کو ایک بڑے صدمے کا سامنا کرنا پڑا، آپ مجذوبیت کا شکار ہوگئے۔ اس برس اُن کی اکلوتی جوان بیٹی اُمتہ السکینہ بھی انتقال کر گئیں۔ اُمتہ السکینہ اُن کے تمام ادبی اور تخلیقی کاموں میں اُن کے شانہ بشانہ ہوتی تھیں۔ اُن کی وفات اور گورنمنٹ کالج لاہور سے علیٰحدگی کے باعث مجذوبیت کی شدت میں اضافہ ہوتا گیا۔لیکن سیاحت کا نشہ ویسے ہی موجزن تھا؛اس حالت میں بھی وہ سیاحت کے لیے ایران چلے گئے مقدس مقامات کی زیارتیں کرنے کی شدید خواہش رکھتے تھے، اس کے ساتھ وہ اپنے آباو اجداد کے علاقے بھی گھوم پھر کر دیکھنا چاہتے تھے۔ تین برس کی سیاحت کے بعد جب وہ ہندوستان واپس لوٹے تو اُن کے ساتھ نادر اور نایاب کتب کا ایک خزانہ بھی تھا۔ عمر بھر کی جمع پونجی اُن کتب پر صرف کر ڈالی تھی۔ وطن لوٹے تو 14 فروری 1887ء کو ملکہ وکٹوریہ کی گولڈن جوبلی کے موقع پر آپ کی عظیم الشان علمی خدمات کے اعتراف میں شمس العلما کا خطاب دیا گیا۔

آزاد کی نثر نگاری پر زینو (ZENO) نے اپنے ایک مضمون "Azad as a

"Fiction Writer" میں لکھا:

That is as good a critique of the entire work of Azad as Maulvie Abdul Haq could afford. And it is not to be regarded as scant praise. To be a great story teller is no mean achievement. Few writers in Urdu can claim that title, and very few critics have written so entertainingly that their lies should have been given more credence than the truth itself. Much of what we would like to believe about our poets and historical personaages, indeed what we do believe about them, has been spread about and made current by this giant among story tellers. The authenticity is not in the facts that he unravels, but in the entrancing manner in which he has told them. The performance has such magic about it, that generation after generation of Urdu reading public is steeped in the unforgettable lies that his pen has committed so indelibly to paper.

اسی طرح آزاد کے طرزِ تحریر اور ندرتِ بیان کے بارے میں سجاد باقر رضوی نے اپنے ایک مضمون "Azad's Style" میں تحریر کیا کہ:

In Azad's style, the novelty and freshness and ornamentation equalled against fluency, are the product of his insight into ture implications of words. Because of his deep concern and love for words, he not only became an unparallelled stylist but also the first explorer of the world of linguistics. The relationship between culture and words and how wrods live a parallel existence with human history, which he says is a phenomenon.

درجِ بالا اقتباسات میں موجود آزاد کی مدح سرائی کی تصدیق کے لیے میں آزاد کی تحریر کردہ کتاب ''دربارِ اکبری'' میں سے ایک اقتباس قارئین کی خدمت میں پیش کرنا چاہوں

گا کہ آزاد ایسی بے باکی سے الفاظ کا استعمال کرتے تھے کہ تحریر ایک منظر کی شکل میں دِکھائی دینے لگ جاتی تھی:

> ''اکبر نے امرائے دربار کی طرف دیکھ کر کہا کہ دشمن سر پر آ پہنچا، کابل بہت دُور ہے۔ اُڑ کر بھی جاؤ گے تو نہ پہنچ سکو گے اور میرے دل کی بات تو یہ ہے کہ اب ہندوستان کے ساتھ سر لگا ہوا ہے۔ جو ہو سو یہیں ہو۔ یا تخت یا تختہ، دیکھو خان بابا! شاہ مغفرت پناہ نے بھی سب کاروبار کا اختیار تمھیں دیا تھا۔ میں تمھیں اپنے سر کی اور اُن کی روح کی قسم دے کر کہتا ہوں کہ جو مناسب وقت اور مصلحتِ دولت دیکھو، اُسی طرح کرو۔ دشمنوں کی کچھ پروا نہ کرو۔ میں نے تمھیں اختیار دیا۔''
>
> (جلال الدین اکبر، صفحہ 17)

شمس العلما کا خطاب پانے کے بعد آزاد ایک بار پھر اپنے کتب خانے کی تعمیر میں لگ گئے جس کا خواب اُنھوں نے برسوں سے دیکھ رکھا تھا۔ اسی کتب خانے کے لیے اُنھوں نے سفرِ ایران سے نادر کتب کا خزانہ اکٹھا کیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اُن میں کئی قلمی نسخے پانچ سو برس پرانے بھی تھے۔ اس کتب خانے کے لیے آپ نے بیرونِ دلی دروازہ لاہور میں شاہ محمد غوث کی درگاہ سے مُتصل جگہ لی تھی اور یہیں پر آپ نے کتب خانے کی تعمیر شروع کی تھی۔ آپ کا کتب خانہ تو حالات کے باعث مستقل جگہ نہ پا سکا لیکن وہاں آج بھی ایک لائبریری موجود ہے۔ 1889ء میں ایک بار پھر مجذوبیت کی شدّت نے آ لیا اور وہ آزاد جو پرانے لاہور کے باغوں اور بہتی نہر کے کنارے کئی کئی گھنٹے چہل قدمی کیا کرتے تھے، اپنے گھر والوں کو بتائے بغیر لاہور سے پیدل پٹیالہ، دہلی اور علی گڑھ کے سفر کو نکل پڑے۔ آغا محمد ابراہیم اپنے والد کو جگہ جگہ ڈھونڈتے رہے اور آزاد آگے آگے بڑھتے رہے۔ 1890ء میں آزاد کی گورنمنٹ کالج لاہور سے پنشن منظور ہوئی، اگلے برس آزاد کے زیرِ نگرانی اُن کے اُستادِ محترم

ذوق کے دیوان کی اشاعت ہوئی۔ آزاد کی گراں قدر خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے آپ کے لیے 75 روپے ماہانہ خاص پنشن کا اجرا وزیرِ ہند کی جانب سے ہوا۔ آزاد کی مجذوبیت روز بروز بڑھتی گئی لیکن آغا محمد ابراہیم اپنے والد گرامی کا کام سنبھالتے رہے۔ 1897ء میں نظمِ آزاد اور 1898ء میں دربارِ اکبری کی اشاعت منظرِ عام پر آئی۔ 1901ء میں آغا محمد ابراہیم کے زیرِ نگرانی اندرونِ اکبری منڈی میں آزاد منزل کی تعمیر مکمل ہوئی۔ آپ نے کئی کتب نامکمل چھوڑیں جن کے قلمی نسخے حوادثِ زمانہ کی نذر ہو گئے، جن میں تاریخ لاہور کا نسخہ بھی شامل تھا۔ آپ کی زندگی میں بھی اور زندگی کے بعد بھی آپ پر بہت کچھ تحریر ہوا۔ بڑی بڑی یونیورسٹیوں نے اُن پر کام کرنے والے طلبا کو ایم اے اور پی ایچ ڈی کی ڈِگریاں دِیں۔ اُن کی حیات، نثر نگاری، شاعری، تنقید پر سب سے بہترین کام گورنمنٹ کالج لاہور کے مجلّے راوی 1983ء کے آزاد نمبر میں شائع ہوا۔ نقوش، شخصیات نمبر، نقوش آپ بیتی نمبر اور نقوش لاہور نمبر میں بھی آپ پر خصوصی تحریریں ملتی ہیں۔ آپ کی کتب کی تفصیل درجِ ذیل ہے:

کتابوں کی فہرست:

(۱) اُردو کی پہلی کتاب سِلسلۂ قدیم
(۲) اُردو کی دوسری کتاب سِلسلۂ قدیم
(۳) فارسی کی پہلی کتاب
(۴) فارسی کی دوسری کتاب
(۵) اُردو کی پہلی کتاب
(۶) اُردو کی دوسری کتاب
(۷) اُردو کی تیسری کتاب
(۸) اُردو کی چوتھی کتاب

(۹) قصص الہند حصہ دوم

(۱۰) ترجمہ عربک انٹرنس کورس (انگریزی)

(۱۱) جامع القواعد

(۱۲) فارسی قواعد

(۱۳) اُردو قواعد

(۱۴) ترکی قواعد

(۱۵) عربی قواعد

(۱۶) قواعد فارسی برائے مڈل سکول

(۱۷) آئینۂ صحت

(۱۸) نصیحت کا کرن پھول

(۱۹) قندِ پارسی

(۲۰) آموزگار

(۲۱) کائنات عرب

(۲۲) تذکرۂ علماء

(۲۳) حکایاتِ آزاد

(۲۴) شہزادہ ابراہیم کی کہانی

(۲۵) لغتِ آزاد

(۲۶) جغرافیہ پنجاب

(۲۷) آبِ حیات

(۲۸) بیاضِ آزاد

(۲۹) جانورستان

(۳۰) خم کدۂ آزاد

(۳۱) دربارِ اکبری

(۳۲) دیوانِ ذوق مرتبہ آزاد

(۳۳) ڈرامۂ اکبر

(۳۴) رسائل سپاک ونماک

(۳۵) سیرِ ایران

(۳۶) فلسفۂ الٰہیات

(۳۷) مجموعۂ نظم آزاد

(۳۸) مکتوبات آزاد

(۳۹) نگارستانِ فارس

(۴۰) سخن دانِ فارس

(۴۱) نیرنگِ خیال

راوی 1983ء آزاد نمبر کے صفحۂ اول پر آزاد کی عظمت کے بارے میں مولانا حامد علی خان کی یہ تحریر ملتی ہے جسے یہاں منقبس کیا جاتا ہے:

''ایک مدت گزری جب میاں بشیر احمد (مدیرِ ''ہمایوں'') نے ذکر کیا تھا کہ ایک مرتبہ یورپ میں کہیں جاتے ہوئے ایک عام جرمن، ریل میں اُن کا ہمسفر تھا۔ وہ کوئی مستشرق نہ تھا مگر میاں بشیر احمد اُس کا ایک سوال سن کر حیران رہ گئے۔ اُس نے پوچھا: ''جناب ہندوستان میں آزاد جیسی اُردو لکھنے والے کچھ اور ادیب بھی ہیں؟'' یہ سوال سن کر میاں صاحب کا سر فخر سے بلند ہوگیا اور اُنھوں نے برجستہ یہ جواب دیا کہ ''اگر ہمارے ہاں کوئی دوسرا آزاد ہوتا تو آپ اُس سے بھی بے خبر

نہ ہوتے۔‘‘(مولانا حامد علی خان، سابق مدیر ’ہمایوں‘ و ’مخزن‘)

اکیس برس مجذوبیت میں گزارنے کے بعد آپ 9 محرم الحرام 1328ھ بمطابق 22 فروری 1910ء کو دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔ لیکن آج بھی آپ کا ذکر اُردو کی تاریخ کے صفحۂ اوّل پر سنہری حروف میں ملتا ہے۔ اُنھیں عاشورے کی قدر و منزلت کے ساتھ ساتھ کربلا گامے شاہ میں دفن کیا گیا۔ آپ کی قبر کے کتبے کا احوال پروفیسر اسلم نے ’’خُفتگان خاکِ لاہور‘‘ (ص۔ 406) میں یوں دیا ہے:

آزاد کی قبر کے سرہانے لوح نصب نہیں کی گئی البتہ تعویز پر یہ عبارت کندہ ہے:

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ

علی ولی اللہ وصی رسول اللہ

مرقدِ شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد دہلوی

کہ بتاریخ ہژدم ذی الحج ۱۱۴۵ھ تولد شد و بشب نہم محرم الحرام ۱۳۲۸ھ ازین دارِ فانی رحلت فرمود قطعۂ تاریخ وفات و بنائے مزار جناب شمس العلما مولانا مولوی محمد حسین صاحب آزاد دہلوی نوراللہ مرقدہ۔

جناب قبلہ محمد حسین آزاد آہ
کہ بود عالم اُستادِ نثر و نظم نگار
بہ بے نظیر تصانیف نامیِ دوراں
بعلم و فضل چو پدرش شہیر شہر و دیار

به شعر شعرے شعارش فدا همه شعرا
به نثره نثره نثارش نثار هر نثار
یگانه موجدِ نو طرز اُردو لٹریچر
که گذشت خاتمه آں ز رحلتش یکبار
وفات در شب تا سوءِ محرم یافت
شد از غروب چناں ماه دہر تیره و تار
رشید پورش آغا محمد ابراہیم
بساخت در لاہور ایں مزارِ پُرانوار
پئے وفات و بنائے مزارِ اقدس او
بخواستم تاریخ اے متین دل فگار
بغیر تعمیه و تخرجه سروش گفت
وفاتِ اُستاد آزاد و ہم بنائے مزار
۱۳۲۸ھ
از ہیچمدان اندوہگین خلیفه سیّد محمد محسن متین

خان بہادر شمس العلما سیّد محمد لطیف

1845ء-1902ء

اُس شہر کی حفاظت کرنی تھی ہم کو جس میں
آندھی کی تھیں فصیلیں اور گرد کا مکاں تھا
جون ایلیا

1857ء کی جنگ کو جنگِ آزادی کہا جائے یا غدر کہا جائے، ان دونوں لفظوں سے پوری جنگ کا نظریہ مخالف سمتوں میں چلا جاتا ہے۔"1857ء کے بعد مسلمانوں کے پاس پڑھنے کے مواقع کم تھے، اُنھیں انگریز سرکار نے آگے نہ آنے دیا۔" تاریخ کے حوالے سے یہ جملہ بھی ہم نے اپنی کئی درسی وغیر درسی کتابوں میں پڑھا ہے۔ دوسری جانب جب تمام ہندوستان کے نوابوں اور راجاؤں کی تاریخ کو دیکھا جائے تو اکثریت مسلمانوں کی تھی جو انگلستان کے بڑے تعلیمی اداروں سے تعلیم یافتہ تھے۔ بیسویں صدی میں اُردو زبان کے بڑے شاعروں، ادیبوں اور صحافیوں میں اکثریت مسلمان ہی کی تھی۔ اِن حالات میں دیکھا جائے تو اُوپر رقم کیا گیا جملہ بھی ایک سوالیہ نشان ہی ہے۔

انگریز سرکار کے عہد میں دو کتابیں پنجاب کی تاریخ کے حوالے سے انتہائی اہمیت کی حامل ہیں۔ ایک تاریخِ پنجاب از کنہیا لال ہندی اور دوسری تاریخِ پنجاب از سیّد محمد لطیف، ان دونوں صاحبانِ علم نے دیگر کتب کے علاوہ لاہور کی تاریخ کے حوالے سے بھی انتہائی اہم کتب تحریر کیں۔ عہدِ حاضر میں یہ دونوں کتابیں، نُور احمد چشتی کی کتاب کے ساتھ لاہور کی تاریخ پر کام کرنے والے محققین اور طلبہ کے لیے اہم حوالہ جاتی کتابوں میں شمار ہوتی ہیں۔ سیّد لطیف کی تاریخِ پنجاب اور تاریخِ لاہور کی بین الاقوامی اہمیت اُس وقت اور بھی زیادہ بڑھ گئی جب اُن کی تحریر کردہ کتب انگریزی زبان میں منظرِ عام پر آئیں۔ روایاتِ مشہور کے مطابق اُنھوں نے اِن کتابوں کے تراجم اپنی زندگی ہی میں کر لیے تھے۔

سیّد محمد لطیف کے آبا و اَجداد ایک خاص قسم کی مذہبی اور علمی فضیلت کے حامل تھے۔ عہدِ شاہ جہانی تک اُن کا خاندان حجازِ مقدس کے انتہائی بابرکت شہر مدینہ منورہ میں رہائش پذیر تھا۔ اُن کے علم کا شہرہ زمانے بھر میں تھا۔ شہنشاہِ ہند شاہ جہان کی درخواست پر اُن کے ایک بزرگ مولانا حاجی محمد عرب، ہندوستان کے شہر دہلی آن بسے۔ اُنھیں شاہی معلم کا درجہ دیا گیا۔ ان کی آنے والی نسلیں کسی نہ کسی شکل میں مُغل دربار سے ضرور منسلک رہیں۔ سیّد محمد لطیف کے والد کا نام منشی سیّد محمد عظیم تھا۔ منشی صاحب انتہائی عالم فاضل اور صاحبِ ذوق انسان تھے۔ وہ قدامت پسندی کا عنصر رکھتے ہوئے بھی جدیدیت کے قائل تھے۔ یہی وجہ ہے کہ خاندانی روایات کے برعکس، وہ انگریزی زبان کے مخالف نہ تھے اَور اِسی باعث سر سیّد احمد خان سے اُن کے گہرے مراسم تھے۔

1945ء میں اُن کے ہاں سیّد لطیف کا جنم ہوا۔ سیّد لطیف کو اپنی زندگی کے ابتدائی ایام ہی میں ادبی اور علمی ماحول ملا۔ اُس عہد کے نامور اُدبا اور شعرا کرام سے منشی صاحب کے ذاتی مراسم تھے۔ وہ ہر ماہ اپنے گھر پر مشاعرے کا اہتمام بھی کیا کرتے تھے۔ سیّد لطیف کا بچپن ادیبوں شاعروں کی صحبت میں پروان چڑھا۔ عربی فارسی اور اُردو زبان میں شعر کہتے تھے۔ جب وہ اخبار ''پنجابی'' سے منسلک ہوئے تو نثر نگاری، خصوصاً تاریخ نویسی کا رُجحان تقویت پکڑتا گیا۔

اُن کی زندگی کے ابتدائی حالات کے بارے میں اُن کے پوتے سیّد منہاج الدین نے درجِ ذیل الفاظ رقم کیے:

''سیّد محمد لطیف صاحب نے ایک علمی، ادبی اور مذہبی گھرانے میں آنکھ کھولی۔ یُوں تو آپ کے خاندان میں انگریزی تعلیم کو معیوب سمجھا جاتا تھا، مگر اس روایت کو آپ کے والدِ محترم سیّد محمد عظیم صاحب نے توڑ ڈالا، لہٰذا آپ کو انگریزی تعلیم حاصل کرنے میں کسی قسم کی رکاوٹ کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ فارسی، عربی اور دِیگر مروجہ علوم کی ابتدائی تعلیم کے بعد اُنھوں نے ہندوستان کی اعلیٰ درس گاہوں سے علم حاصل کیا۔ کٹڑہ تارکشاں (لاہور) میں قیام کے دوران میں آپ نے فارسی اور عربی منشی اسد اللہ صاحب سے پڑھی۔

نوجوانی کے ایام میں ہی سیّد محمد لطیف صاحب کا تعلق دہلی کے ایک اور علمی و ادبی خاندان سے ہوگیا، جب اُن کی شادی قاضی ولی جان صاحب کی دُختر سے قرار پائی۔ قاضی ولی جان صاحب، سرسیّد احمد خاں صاحب اور خان بہادر مولوی سمیع اللہ جج صاحب کے قریبی عزیز تھے۔ اس نسبت سے سیّد محمد لطیف صاحب اور سرسیّد احمد خاں ایک دوسرے کے خاصے قریب ہوگئے اور مختلف ملکی و مذہبی مسائل کے بارے میں تبادلۂ خیال کرتے رہتے تھے۔ دونوں کے درمیان سلسلۂ خط و کتابت کافی عرصے تک قائم رہا۔ سرسیّد احمد خاں کے دورۂ پنجاب (1884ء) کے دوران میں مراد آباد کے اخبار ''نیرِ اعظم'' نے اُن کے خیالات پر نکتہ چینی کی تو سیّد محمد لطیف صاحب نے ''پنجابی'' اخبار میں اُس کا مدلل جواب دیا۔''

سیّد محمد لطیف کے ابتدائی ایام کے بارے میں دوسرا اہم ترین حوالہ نقوش لاہور نمبر

(ص99۔) پر اس طرح مِلتا ہے:

''سیّد محمد لطیف 1846ء میں سیّد محمد عظیم کے گھر پیدا ہوئے۔ابتدا ہی سے وہ ذہین وفطین تھے۔ اُردُو، فارسی، عربی اور انگریزی میں پوری دستگاہ رکھتے تھے۔ کلکتہ یونیورسٹی سے میٹرک کا امتحان 1862ء میں پاس کیا۔ اُن کے والدِ ماجد سیّد محمد عظیم نے لاہور میں 1848ء میں ایک پریس قائم کیا۔ پنجاب میں یہ اوّلین پریس تھا جس میں فارسی اور انگریزی کے شعبے علیٰحدہ علیٰحدہ تھے۔ یہ پریس ایک شاہی عمارت میں جو نولکھا کے نام سے مشہور تھی، قائم کیا گیا تھا۔ نولکھا کی یہ عظیم عمارت جہاں اب ریلوے اسٹیشن ہے، وہاں واقع تھی۔ نولکھا تھانہ آج بھی اس کے نام کی یاد تازہ کر رہا ہے۔ سیّد محمد عظیم نے یہیں سے اخبار ''لاہور کرانیکل'' انگریزی زبان میں جاری کیا۔ یہ اخبار سرکار انگلشیہ کی پالیسی کی زبان تھا۔ حکومت کی نظر میں اس کی وقعت تھی۔ ملکی خبروں کو بڑی احتیاط سے مُرتب کیا جاتا تھا۔ کسی وجہ سے جب اس اخبار کے عملے میں پھوٹ پڑ گئی اور مقدمہ بازی تک نوبت پہنچی تو سیّد عظیم نے اس سے علیحدگی اختیار کی اور ایک دوسرا اخبار ''پنجابی اخبار'' کے نام سے نکالا جو پہلے انگریزی میں طبع ہوتا تھا، پھر اُردو میں چھپنے لگا۔

اس علمی ماحول میں سیّد محمد لطیف کی پرورش ہوئی اور اس کے مطابق ان کا مزاج ڈھلنے لگا۔ شروع جوانی ہی سے وہ اُردو انگریزی اخبارات میں مضامین لکھتے تھے جن سے ان کی استعداد اورشہرت میں چار چاند لگ گئے۔ وہ اُردو انگریزی دونوں زبانوں کے انشا پرداز تھے۔ اُن کی زبان میں سادگی اور ندرت تھی۔ ملک بھر میں اُن کی تحریروں کی دھوم تھی اور خاص و عام میں ان کو زبردست شہرت ومقبولیت حاصل تھی۔''

سیّد محمد لطیف نے 1888ء میں ''تاریخِ پنجاب'' تحریر کی۔ یہی کتاب ایک دوسرے سرورق اور عنوان ''تاریخ پنجاب مع احوالِ شہرِ لاہور'' کے نام سے بھی معروف ہے۔نقوش لاہور نمبر میں اِسے اُردو زبان میں تحریر کیے جانے کا حوالہ بھی ملتا ہے۔ اس کتاب کی تحقیق و تالیف میں حوالہ جاتی کتب میں عہدِ رنجیت سنگھ کی کتب سے استفادہ کیا گیا جس کے باعث اِس کتاب کی اہمیت دِیگر کتب کے مقابلے میں بڑھ جاتی ہے۔ 1889ء میں ایک اور اہم کتاب ''آگرہ کی تاریخ'' منظر عام پر آئی۔ 1891ء میں ایک اور تحقیقی کتاب ''ملتان کی قدیم تاریخ'' شائع ہوئی۔ اِسی ''تاریخِ پنجاب'' انگریزی زبان میں منظرِ عام پر آئی۔ 1892ء میں ''تاریخِ لاہور'' انگریزی زبان میں چھپی۔ انگریزی زبان میں اُن کی مہارت مسلّم تھی۔ اُن کی تحریریں انگلستان سے جاری ہونے والے اخبارات و جرائد کی زینت بنتی رہیں۔ انگریزی زبان کے علاوہ سیّد لطیف ہندی، سنسکرت اور فرانسیسی زبان پر بھی ایک خاص درجے کی مہارت رکھتے تھے۔ مقامی زبانوں پر دسترس رکھنے کے باعث وہ پنجاب کی تاریخ کو اپنی خاص نظر اور نقطۂ نظر کے حوالے سے پرکھتے اور جانچتے رہے۔ ذیل میں ایک اقتباس درج ہے جو کہ تاریخِ پنجاب (ترجمہ) کے باب نمبر ایک کے صفحہ نمبر ایک پر رقم ہے:

لفظ ''پنجاب'' کی ابتدا

> ''یونانی مؤرخین کا بسٹاپوٹیمیہ اور ہندوستان کی سلطنت کا شمال مغربی علاقہ پنجاب، اس کے نام کو فارسی زبان کے دو الفاظ پنج (پانچ) اور آب (پانی) سے اخذ کیا گیا ہے۔ یہ نام دراصل اس کو پانچ دریاؤں کے باعث دیا گیا، جنھوں نے اس علاقہ پر نمایاں طبعی اثرات مُرتب کیے ہیں۔ شمال کی جانب کوہِ ہمالیہ کے بلند و بالا پہاڑی سلسلوں نے اس کو احاطہ کیا ہوا ہے، جو اسے چین، تبت اور کشمیر سے جدا کرتے ہیں۔ مشرق کی جانب دریائے جمنا، شمال مغربی صوبہ جات

اور چینی سلطنت ہے۔ جنوب کی طرف سندھ اور ستلج کے دریا ہیں، جو اسے بہاولپور اور راجپوتانہ سے علیحدہ کرتے ہیں اور مغرب کی طرف کوہِ سلیمان کا سلسلہ ہے، جو اسے بلوچستان اور افغانستان سے جدا کرتا ہے اور خیبر سے جا ملتا ہے۔ ہمالیہ کے بلند و بالا پہاڑی سلسلوں کے ساتھ شمالی سرحد میں چمبہ، مندی، سکت اور ناہن کے علاوہ شملہ کا پرفضا مقام بمع چھوٹی پہاڑی ریاستوں کے شامل ہے اور انتہائی شمال میں مشہور و معروف کانگڑا، ابو الفضل، کانگر کوٹ، بشمول، کلو سیوراج، لاہول، سپتی اور ڈلہوزی موجود ہیں۔ اس سلسلہ کی مغربی جانب مری کی پہاڑیاں اور سرسبز و شاداب ہزارہ کی وادی، ان پہاڑوں کی شان و شوکت میں زبردست اضافہ کرتی ہیں۔ جنوب مشرق میں واقع دہلی اور حصار کے ڈویژنوں کو، جو پہلے آگرہ کی حکومت کے علاقے کا حصہ تھیں، اُنھیں 1857ء کے غدر کے بعد مقامی انتظامیہ کی سہولت کے لیے پنجاب میں منتقل کر دیا گیا۔''

1947ء میں حضرتِ انساں کی جس طرح تذلیل ہوئی، اُس کی مثال کم ہی دِکھائی دیتی ہے۔ صدیوں اکٹھے رہنے والے انسان، ایک دوسرے کی جان، مال اور عزت کے دشمن بن بیٹھے۔ اِس تمام منظر نامے اور تماشے کے انگریز لکھاری اِن بھولے بھالے ہندوستانیوں پر ایک جانب کھڑے مسکراتے رہے۔ ظلم اور بربادیوں کے وہ سلسلے آج بھی قائم ہیں۔ رب تعالیٰ نے وہ تمام قدرتی ذرائع جو انسان کی فلاح و بہبود کے لیے پیدا فرمائے، ان پر انسانوں ہی نے بندشیں قائم کر کے دِیگر انسانوں کے لیے نعمتیں متروک کر ڈالیں۔ قدرت کی نعمتوں میں سے آبی وسائل کی نعمت زندگی کی اساس کا درجہ رکھتی ہے۔ یہ آبی وسائل میدانی علاقوں میں دریاؤں کی صورت میں دِکھائی دیتے ہیں۔ ہندوستان کی قدیم تاریخ میں بھی شہر دریاؤں ہی کے کناروں پر آباد ملتے ہیں۔ شہر لاہور کے ساتھ دریائے راوی بہتا تھا۔ 1980ء کی دہائی تک اہلِ لاہور نے اس دریا کو اپنے بھرپور جوبن میں دیکھا۔ یہ دریا اب ایک

جوہڑ کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ دریا کے راستے اور اس سے ملحقہ جگہوں پر قبضہ مافیا کا راج ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کے آبی معاہدے نے لاہور شہر کے اس لازمی جزو کو کس طرح ختم کر دیا اور لاکھوں کروڑوں انسانوں کو کس طرح کے مسائل سے دو چار کر دیا، اس کی اصل شکل آنے والے برسوں میں واضح ہوگی۔ دریائے راوی کی بربادی پر سیّد لطیف صاحب کا مضمون جو ''تاریخِ پنجاب'' کا حصہ ہے، قارئین کی دلچسپی کے لیے یہاں نقل کیا جا رہا ہے:

''قدیم جغرافیہ دانوں کا ہائیڈ روٹس اور یروٹیس، راوی پنجاب کے دِیگر دریاؤں سے بہت چھوٹا ہے۔ یہ درہ روٹنگ کے مغرب میں کچھ فاصلے پر تقریباً 33 ڈگری 6 فٹ عرض اور 77 ڈِگری طول میں بنگل کے نشیبی پہاڑوں میں ضلع کانگڑا میں کلو سے پھوٹتا ہے۔ مغرب کی طرف رُخ کرنے کے بعد یہ ایک ندی سبیکر روٹر سے مل جاتا ہے، جو منی میں یا مانی موھیس کے قریب ڈل کنڈ اور گوری کنڈ کے درمیان ایک چشمے سے نکلتی ہے جس کو ہندو مقدس خیال کرتے ہیں اور یہ دونوں پہاڑی ندی نالوں کے باعث تلاطم کی وجہ سے جنوب مغرب کی طرف انتہائی تندی اور ہنگامہ خیزی کے ساتھ بہتے ہیں۔ ان پہاڑی راستوں میں لوگ اس دریا کو ''رائند'' کہتے ہیں۔ اس کی تنگ گھاٹیوں سے نکلنے کے بعد یہ شہر چمبہ کے دوسری جانب بہتا ہے۔ اپنے دائیں کنارے پر الانس تک بہتے ہوئے، دارالحکومت سے 30 کوس کے فاصلے پر چمبہ علاقے میں بھاؤنسو سے اس میں لیانگ شامل ہو جاتا ہے۔ یہاں پر اسے راوی کہا جاتا ہے۔ جموں سے 10 کوس کے فاصلے پر بدروا کے علاقے میں ''تریموں'' کے گھاٹ پر دریائے توی اس میں شامل ہو جاتا ہے، جو سیوج کے پہاڑوں سے نکلتا ہے۔ تیس کوس نشیب میں لاہور سے 15 یا 20 کوس کے فاصلے پر اس دریا

کو شاہ دولہ پل قطع کرتا ہے۔ یہ راج پور کے قریب میدانوں میں داخل ہوتا ہے۔ اس مقام سے پرانے وقتوں میں لاہور تک تقریباً 80 میل کے فاصلے تک شاہ نہر کھودی گئی تھی۔ چناب اور وزیر آباد گھاٹ سے راوی پر میانی کا فاصلہ 55 میل ہے۔ میانی کے قرب و جوار میں دریا میں بہت سی ریتلی دلدلیں ہیں۔ اس کے کنارے چھوٹے ہیں لیکن ان پر جنگلات اُگے ہیں۔ ضلع گورداسپور میں مادھوبلور کے مقام پر باری دوآب نہر کے ہیڈ ورکس پر مصنوعی نہروں کے باعث دریا کا پانی بہت کم ہوگیا ہے۔ اسی ضلع میں 1870ء میں دریا قصبہ ڈیرہ نانک کے کناروں کو بہانے کے بعد سکھوں کی مقدس خانقاہ ٹاھلی صاحب کو بہا کر لے گیا تھا۔ اس کے کناروں پر سکھوں کے مقدس شہر کو ابھی تک خطرہ ہے۔ پہاڑوں سے نکلنے کے بعد عام طور پر دریا کا راستہ جنوب مغربی جانب ہوتا ہے اور اسی طرف گورداسپور اور امرتسر اضلاع میں سے گزرنے کے بعد یہ ضلع لاہور میں داخل ہوتا ہے۔ لاہور شہر کے قریب دریا تین شاخوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ ان میں سے ایک شہر کے قریب بہتی ہے۔ جنوب مغربی راستے کی طرف سفر جاری رکھتے ہوئے، لیکن بعد میں مغرب کی طرف رُخ موڑتے ہوئے دائیں کنارے پر ضلع منٹگمری میں اس میں ڈیگ شامل ہو جاتی ہے اور ضلع ملتان سے گزرتے ہوئے آخر کار یہ احمد پور کے قریب 30 ڈگری 40 فٹ شمالاً عرض میں چناب اور جہلم کے مشترکہ دریا میں اپنے منبع سے 450 میل اور ملتان شہر سے 40 میل اُوپر کے فاصلے پر مدغم ہو جاتا ہے۔ اس مقام کے بعد اس دریا (جواب چناب ہے) کی طغیانی اور چوڑائی کا خاص طور پر سکندر اور تیمور کے مؤرخوں نے مشاہدہ کیا۔

راوی کا پانی چناب کے مقابلے میں زیادہ سرخ ہے اور سال میں آٹھ ماہ کے دوران کئی مقامات پر پایاب ہوتا ہے۔ دیگر

دریاؤں کے مقابلہ میں اس کی تہہ میں کیچڑ زیادہ ہوتا ہے لیکن اس کے کنارے بلند اور مضبوط ہیں اور صرف چند مقامات پر اس کی چوڑائی میں 150 گز سے زائد اضافہ ہوا ہے۔ تاہم اس کی پُرپیچی سے کوئی چیز بڑھ نہیں سکتی جو فاصلے کو دوگنا کر دیتی ہے اور کشتی رانی میں زبردست رکاوٹ ہے؛ چنانچہ لاہور راوی کے دہانے سے صرف 175 میل کے فاصلے پر ہے لیکن دریا سے اس کا فاصلہ 380 میل سے بھی بڑھ جاتا ہے۔ لاہور سے کشتیوں کے ذریعے غلے کی بہت بڑی مقدار برآمد کی جاتی ہے اور سیلاب کے موسم میں چمبہ کے جنگلوں سے دیودار کے شہتیر نشیبی علاقوں کی طرف بہا کر لائے جاتے ہیں۔

اپنی تہہ میں کیچڑ ہونے کی صورت میں (تقریباً 1/5 حصہ کیچڑ اور باقی ماندہ ریت ہے) راوی ایک آلودہ دریا ہے اور اس کے کناروں پر ریت جمع رہتی ہے۔ ان میں سے بہت سی ریتلی دلدلوں کی شکل میں ہونے کے باعث بہت زیادہ خطرناک ہیں۔ لاہور کے قریب اس کے کنارے بعض اوقات عمودی شکل میں چالیس فٹ بلند ہو جاتے ہیں۔ دوسرے مقامات پر ان کی بلندی اس سے نصف ہوتی ہے اور اس کے باعث دریا ایک چھوٹی نہر کی طرح دِکھائی دیتا ہے۔ 1661ء میں شہر لاہور کی طرف دریا کا رخ ہونے کے باعث بہت زیادہ خطرہ پیدا ہو گیا۔ بادشاہ اورنگ زیب نے اس کے کنارے کے ساتھ تین میل تک پختہ اینٹوں کا ایک عظیم الشان پشتہ تعمیر کرا دیا۔ اس عظیم پشتے کے آثار اب بھی شہر کے شمال مغربی جانب دیکھے جا سکتے ہیں۔''

(راوی صفحہ 49)

سیّد محمد لطیف کے گھرانے کو ''ججوں کا خاندان'' بھی کہا جاتا ہے۔ اُن سے چھوٹے دو بھائی بھی انگریز عہد میں جج کے عہدوں پر فائز رہے۔ اُن کے منجھلے بھائی سیّد شمس الدین سب جج ریٹائر ہوئے اور 1911ء میں وفات پائی۔ اُن سے چھوٹے بھائی سیّد سراج الدین بہاولپور ریاست میں چیف جج تھے۔ اُنھوں نے 1936/37ء میں وفات پائی۔ آج بھی اندرون بھاٹی دروازہ لاہور میں ایک بہت بڑا محلہ ''جسٹس سیّد لطیف'' کے نام سے مشہور ہے۔ سیّد لطیف نے اپنے دورِ ملازمت میں ہندوستان کے کئی مقامات کی سیر کی اور اُن کی تاریخ کا بھرپور مطالعہ کیا۔ اس وقت کے اہلِ علم و ہُنر کو اپنے مذاہب کے علاوہ دِیگر مذاہب پر بھی ایک خاص قسم کی جانکاری اور دسترس حاصل تھی۔ ہنود، اہلِ اسلام کے بیشتر رسم و رواج سے نہ صِرف بہرہ مند تھے بلکہ اُن میں شریک بھی ہوتے تھے۔ یہی حال سِکھ اور مسیح برادریوں کا تھا۔ بدقسمتی سے آج ہم اپنی تہذیب و ثقافت سے بھی کلی طور پر ناآشنا ہیں اور لسانی اور مذہبی تقسیم سے دو چار ہیں۔ سیّد محمد لطیف بذاتِ خود ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتے تھے جو حجاز اور نجف کی مقدس دھرتی سے یہاں آیا تھا۔ اسی خاندان کے اس سپوت کی اہلِ ہند کی تاریخ پر کتنی گہری نظر تھی، اس کا اندازہ ''رامائن اور مہا بھارت'' کے اس اقتباس سے لگایا جاسکتا ہے۔ جو ''تاریخِ پنجاب'' کا حصہ ہے:

> ہندو ادب نے دو عظیم منظوم داستانوں کو جنم دیا، یعنی رامائن اور مہا بھارت، اوّل الذکر سے متعلقہ واقعات کو تقریباً 1000 قبل مسیح کے زمانے سے منسوب کیا گیا ہے، لیکن اس کو مرتب کرنے کی تاریخ کا تعلق بعد کے زمانہ سے ہے۔ اس کا شہرت یافتہ مصنف ایک شاعر والمیکی تھا۔ اس کا موضوع یہ ہے کہ اودھ کے بادشاہ رام نے لنکا پر حملہ کر دیا، کیونکہ اس کی بیوی سِیتا کو لنکا کے باشندے یا راکھشس شہزادے راون نے اغوا کرلیا تھا۔ ایک بہت بڑی جنگ ہوئی اور سِیتا کو بازیاب کرالیا گیا۔

مشہورِ زمانہ داستان مہابھارت کا تعلق تقریباً 1200 قبلِ مسیح سے ہے۔ اس منظوم داستان میں ایک دانشور ''وسایا'' سے خطاب کیا گیا ہے جو دوسری صدی قبل مسیح میں رہتا تھا۔ یہ داستان پانڈوؤں یا سوریہ (سورج) قوم کے لوگوں، (اس وقت ان کا بادشاہ یودیشتر اُن کی نمائندگی کر رہا تھا) اور کوروؤں یا چندرا (چاند) قوم کے لوگوں (جن کا سربراہ ہریتز راشترا تھا) کے درمیان لڑی گئی، عظیم جنگ کے بارے میں بیان کرتی ہے۔

پانڈوؤں کا دارالخلافہ یمنہ (جمنا) کے کنارے پر اندراپرستھا (دہلی) تھا اور کوروؤں کا گنگا کے کنارے ہستینیہ پور تھا۔ یودیشتر اپنے مخالف کی سلطنت کا دعوے دار تھا اور اس جھگڑے کا فیصلہ کرنے کے لیے سوریہ (سورج) قوم کے تمام سردار، دریشادوتی (موجودہ تھانیسر) کے قریب، کوروک شیترا کے میدانوں پر پیش قدمی کرتے ہوئے ایک میدانِ جنگ کی طرف بڑھے، جس میں بعد کے ادوار میں اکثر ہندوستان کی سلطنت کے بارے میں جنگ کرنے والوں کی قسمت کا فیصلہ ہوا۔ خوبصورت، ثابت قدم سورما کرشنا، جس نے اپنی جوانی میں دیہاتیوں کے درمیان ناچتے ہوئے اپنے موسیقی کے فن سے یکدم گوپیوں اور شہزادیوں کے دل موہ لیے تھے، وہ بھی پانڈوؤں کی جانب تھا۔ سندھ سے نربادا اور ہمالیہ کی وادیوں سے بنگال اور بہار تک کے علاقوں کے پچاس شاہی سردار اور بہت سے ماتحت اور حلیف شہزادے میدانِ جنگ میں جمع ہوئے۔ جنگ پورے ہندوستان میں پھیل گئی۔ یودیشتر زرد اور سنہری لباس میں ملبوس اپنی فوجوں

کے ہمراہ میدانِ جنگ کی طرف بڑھا۔ وہ اپنی شاہی سواری پہ بیٹھا تھا۔ اس کے بعد تیز نگاہ اور گھنی بھنوؤں کے ساتھ لمبے بازوؤں والا بھیما آیا۔ اس نے اپنے ہاتھ میں سونے کے جڑاؤ والا آہنی نیزا تھام رکھا تھا اور بہادر ارجنا، جس نے ہاتھ میں بہت بڑی کمان اُٹھا رکھی تھی اور اس کے جھنڈے پر بندر کی تصویر تھی۔ جیسے ہی عظیم فوجیں یکجا ہوئیں، ایک کورو جرنیل بھشما، مخالف سمت سے اپنے سنہری رتھ پر سے اپنا جھنڈا لہراتا ہوا آگے بڑھا اور اپنے جنگجوؤں سے چیخ کر مخاطب ہوا: ''آج آسمان کے دروازے بہادروں کے لیے کھول دیے گئے ہیں۔ اس راستے پر جاؤ، جس سے تمھارے باپ اور آباو اجداد بہادری اور شان کے ساتھ آسمانوں کی طرف گئے ہیں۔ کیا تم بستر پر اذیت کے ساتھ اپنی زندگی ختم کرنا پسند کرو گے؟ ایک شتری (سپاہی) کو میدان میں مرنا چاہیے۔'' اس کے بعد اس نے سنکھ بجا دیا اور فوجیں ایک دوسرے کے ساتھ برسرِ پیکار ہوگئیں۔ زبردست کشت و خون شروع ہوگیا۔ ''جتے ہوئے ہاتھی'' بے قابو ہوگئے اور انتہائی غیظ و غضب کے ساتھ جنگجوؤں کو ان کے رتھوں سے گھسیٹ کر لے گئے۔ برسرِ پیکار فوجیں ایک دوسرے پر تیروں کی بارش کرنے لگیں۔ مُنقش کھالوں کی ڈھالیں چھلنی بن گئیں اور جنگجو ''پاگل شیروں'' کی طرح دو بدو اور دست بدست لڑائی میں مشغول ہوگئے۔ یہ جنگ اٹھارہ روز تک انتہائی غیظ و غضب کے ساتھ لڑی گئی اور اس کے نتیجے میں کوروؤں کو مکمل شکست ہوئی۔

مشہور و معروف سپاہی بھشما سمیت ان کے بڑے بڑے جرنیلوں کو قتل کر دیا گیا اور ان کی فوج نیست و نابود ہو گئی۔ فاتح خوشی سے چلاتے اور سنکھ بجاتے تھے۔ سونا، چاندی، قیمتی پتھر، کھالوں کے ملبوسات اور کنیز دوشیزاؤں کی صورت میں بہت بڑے بڑے خزانے اُن کے ہاتھ لگے۔ مفتوح اور بوڑھا بادشاہ دھریتا رشترا اپنی بیوی گندھاری کے ہمراہ گنگا کے جنگلوں میں نکل گیا اور وہاں جل کر مر گیا۔ پانڈو فتح مندی کے ساتھ ہستینیہ پور میں داخل ہوئے، جہاں یودیشتر تخت پر براجمان ہوا اور مفتوح بادشاہوں نے اُسے خراجِ عقیدت پیش کیا۔ گھوڑوں کی ایک بہت بڑی قربانی پیش کی گئی، جس میں تمام حلیف شہزادوں نے حصہ لیا۔ ارجنہ نے اس کے بعد یودیشتر کے لیے سندھوواس یا سندھ کے علاقے اور دریائے راوی کے پار کے علاقے گندھارا (قندھار) کو فتح کیا۔ یودیشتر نے 36 سال تک حکومت کی، اس کے بعد اس کا انتقال ہو گیا۔

یہ مہا بھارت یا ''عظیم جنگ'' کی کہانی ہے۔ داستان کے اختتام پر ہمیں بتایا گیا ہے کہ برہمن باقی ماندہ نسلِ انسانیت کے لیے گائے دوسرے چوپایوں کے لیے اور سمندر جوہڑ کے لیے کیا ہے؛ اور اسی طرح مہا بھارت دیگر تاریخوں کے مقابلے میں کیا ہے!

کہا جاتا ہے کہ اس کتاب کو پڑھنے اور سننے والوں کا گھر جنت میں ہے اور ان کے تمام گناہ معاف کر دیے گئے ہیں۔

ہندوؤں کے قانون کی ایک قدیم کتاب ''دھما پدم'' میں ''بہترین اور اعلیٰ نسل کے سندھو گھوڑوں'' کا ذکر کیا گیا ہے۔ دریائے سندھ کے کناروں پر جن گھوڑوں کی نسل کشی کی جاتی تھی، اُنھیں

پورے ہندوستان میں بہترین خیال کیا جاتا تھا۔ رامائن میں اِراوتی (راوی) اور دیپاسہ (بیاس) کے بالائی راستے میں آباد ''کیکیاس'' قوم کا ذکر ملتا ہے۔ کیکیاس کا بادشاہ ''اسواپتی'' یا ''گھوڑوں کا بادشاہ'' کے لقب سے مشہور تھا۔ وہ چوتھی صدی قبل مسیح میں گزرا ہے اور رامائن میں اس کے دارالخلافہ کو ''گریوراجہ'' کہا گیا ہے۔ دریائے سندھ کے بائیں کنارے پر ٹیکسلا کا عظیم شہر تھا، جس پر اسی صدی میں مقدونیہ کے سکندرِ اعظم نے حملہ کیا تھا۔ ان علاقوں میں برہمنوں کے قوانین پھیل گئے اور مجرموں کو سزائے موت دینے اور مُردوں کو دفن کرنے کے فرائض چندلا یا اصل باشندے ادا کرتے تھے۔

گنگا برہمن پنجاب اپنے قدیم وطن کے لوگوں کو حقارت کی نِگاہ سے دیکھتے تھے۔ وہ اُنھیں پلیکا یعنی ''خارجی'' اور ورتیاس یا ''کافر'' کہتے تھے۔ وہ کہتے ''ان کی عورتیں، گلیوں اور میدانوں میں ہاروں سے آراستہ نشہ کیے ہوئے اور بے پردہ گھومتی ہیں۔ وہ گھوڑوں کی طرح ہنہناتے ہوئے اور شور مچاتے ہوئے نہانے کی جگہوں کی طرف دوڑتے ہیں۔'' تاہم ان خیالات میں زبردست مبالغہ آرائی کی گئی ہے اور اس میں گنگا کے برہمنوں میں غرور نظر آتا ہے، جو خود اپنے اور پنجاب کے ہندو قبائل میں مشترکہ ربط کو نظرانداز کرنا چاہتے تھے۔

پنجاب کے بارے میں مغربی مصنفین کے تمام بیانات کو یکجا کرنے سے اس امر کی شہادت ملتی ہے کہ تیسری صدی قبل مسیح کے دوسرے نصف حصّے میں برہمن فلسفے کو پانچ دریاؤں کے علاقے میں برتری حاصل تھی۔ یہ علاقہ گنجان آباد تھا۔ یہ بے شمار ریاستوں میں منقسم

تھا اور ان پر جنگجو شہزادے اور اعلیٰ خاندان حکمرانی کرتے تھے۔ وہاں قوموں کے نگران اور شہروں و اضلاع کے سردار تھے۔ وہاں پر فصیل دار شہروں میں آزاد قومیں رہتی تھیں اور وہ اپنے طور پر 50 ہزار سپاہیوں کی فوج میدان میں لا سکتی تھیں۔ اُن کے پاس ایسے شہر تھے، جن میں 70 ہزار آدمیوں کو جنگی قیدیوں کے طور پر رکھا جا سکتا تھا۔ آزاد قوموں اور شہزادوں، دونوں کے پاس ہاتھی اور رتھ ہوتے تھے۔ ان کے شہروں کے گرد اینٹوں اور پتھر کی دیواریں اور مینار ہوتے تھے۔ میگاس تھینز کے مطابق ان میں سے چند شہروں کے گرد کشادہ اور گہری خندقیں ہوتی تھیں، جن کو دریاؤں کے پانی سے بھر دیا جاتا تھا۔ ان بادشاہتوں میں سب سے زیادہ طاقتور کشمیر کی بادشاہت تھی جو ابیے سارا کی سرزمین تک پھیلی ہوئی تھی۔ وتاسا (بیاس) کے بالائی راستے اور اسکینی (چناب) کے درمیانی علاقے پر پاور اواؤں کے شاہی خاندانوں کی حکمرانی تھی۔‘‘

(رامائن اور مہا بھارت، صفحہ 102)

سیّد محمد لطیف کی بے پناہ محنتوں اور تاریخی، تحقیقی، ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے سرکار انگریز نے اُنھیں خان بہادر کا خطاب 1890ء میں اور شمس العلما کا خطاب 1898ء میں دیا۔ ایک سیّد زادے کی اس محنت اور لگن کا تمام عرصہ انگریز سرکار ہی میں گزرا۔ اس لیے اس مضمون کے آغاز میں کی گئی بحث کہ مسلمانوں کے پاس آگے بڑھنے کے مواقع کم تھے، ایک بڑا سوالیہ نشان ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ جن لوگوں نے کبوتر اُڑانا تھے، وہ تمام عمر کبوتر ہی اُڑاتے رہے اور جنھوں نے شطرنج کی بازیوں کے ساتھ ساتھ مے نوشی کی محفلیں سجانا تھیں، اُنھوں نے تمام عمر ایسا ہی کیا، اس میں کسی مذہب کا کوئی دخل نہیں۔ صدیوں سے حکمرانی کے نشے میں مبتلا نسلوں میں محنت کرنے کے عناصر ویسے ہی ناپید ہو چکے تھے۔ اسی عہد میں سیّد لطیف صاحب کلکتہ سے چھپنے والے ’’جرنل آف رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال‘

اور ''کلکتہ رِیویو'' کے مستقل معاونِ خصوصی تھے۔ پنجاب یونیورسٹی کے علاوہ وہ رائل سٹرونومیکل سوسائٹی اور رائل جیوگرافیکل سوسائٹی کے ممبر بھی تھے۔ وہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال اور سوسائٹی ڈی لاء پیرس کے رُکن بھی تھے۔ سیّد لطیف چیف کورٹ کے رِیڈر بھی رہے، جہاں سے ترقی پاتے ہوئے ایکسٹرا اسسٹنٹ جوڈیشنل کمشنر کے عہدہ پر پہنچے۔ پھر کئی اضلاع میں ڈِسٹرکٹ اینڈ سیشن کورٹ کے جج کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ 1902ء میں آپ گوجرانوالہ میں تعینات تھے اور اُن کا نام چیف کورٹ کے جج کے لیے تجویز کیا گیا لیکن تقرری سے قبل ہی 9 فروری 1902ء کو وفات پا گئے۔ میّت کو گوجرانوالہ سے لاہور لایا گیا اور اُن کو قبرستان میانی صاحب اُن کے آبائی احاطے میں دفنایا گیا۔ پروفیسر اسلم صاحب نے اپنی کتاب ''خفتگانِ خاکِ لاہور'' میں اُن کے کتبے پر موجود تحریر درج کی ہے:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ

مزار

خان بہادر شمس العلما سیّد لطیف غفرنہ

سیشن جج پنجاب

فیلو پنجاب یونیورسٹی، ممبر بنگال ایشیاٹک سوسائٹی

فیلو رائل ایشیاٹک سوسائٹی، فیلو رائل جیوگرافیکل سوسائٹی وغیرہ

مصنف تاریخِ پنجاب، تاریخِ لاہور، تاریخِ آگرہ ملتان وغیرہ

تاریخِ وفات

9 فروری 1902ء مطابق 29 شوال 1319ھ یوم یک شنبہ

عاقلے گفت احوال اُو بامن کاین بیت

برلب آورد درآن لحظہ کہ کار آخر شد

حیف در چشم زدن صحبتِ یار آخر شد

روئے گل سیر ندیدم کہ بہار آخر شد

بہرِ تاریخ وصالش شنیدم کہ سروش
حیرتے خورد و بگفت آہ بہار آخر شد

1319 ھ

ڈاکٹر علامہ محمد اقبالؒ

1877ء–1838ء

نہیں منت کشِ تابِ شنیدن داستاں میری
خموشی گفتگو ہے بے زبانی ہے زباں میری
اقبالؒ

اقبالؒ کا شمار حضرتِ انساں کی معلوم تاریخ کے اُن گنے چنے شعرا اور اُدبا میں ہوتا ہے جنھیں اُن کی حیات اور بعد از حیات بھی دوام حاصل ہوا۔ تاہم تاریخ کے پنوں پر کچھ ایسی قد آور شخصیات بھی دیکھنے کو ملتی ہیں جنھیں اُن کی زندگی میں تو اہلِ نظر اور حلقۂ ارباب نے ہرگز تسلیم نہ کیا لیکن بعد از مرگ ہر دور کے بڑے مُفکروں، شاعروں اور ادیبوں نے اُن کی تقلید کی جیسا کہ انگریزی شاعری میں جان کیٹس اَور اُردو شاعری میں میرزا اسداللہ غالب۔

اسی طرح کچھ ایسی شخصیات بھی تھیں جنھیں اُن کی زندگی میں بے پناہ شہرت ملی لیکن بعد میں وہ محض تاریخ کا حصہ بن کر رہ گئیں: اِس حوالے سے متقدمین میں سے کئی بڑے شعرا کا نام لیا جا سکتا ہے۔

اُردو شاعری کے حوالے سے کسی نے کبھی یہ نہ سوچا تھا کہ میرزا غالب کے بعد اقبالؒ اور فیض جیسے عظیم نام سامنے آئیں گے۔ اقبالؒ کی حیات پر لکھنے سے قبل ایک بات کی وضاحت کرنا چاہوں گا کہ اقبالؒ ایک ایسی شخصیت ہیں کہ اُن کی زندگی پر آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد کچھ ایسی تحریریں سامنے آئیں کہ لکھنے والوں نے ایک ہی شخص کو الگ الگ ڈھنگ سے پیش کیا۔ بعض تحریروں میں یوں بھی محسوس ہوا کہ لکھاریوں نے اقبالؒ کی شخصیت کو اپنے ذاتی مفادات کے لیے استعمال کیا۔ اِسی تناظر میں اقبالؒ کے آباو اجداد پر تحقیق بھی موجود ہے۔ تقسیم سے قبل آپ پر لکھنے والے اس بات پر مکمل اتفاقِ رکھتے تھے کہ اقبالؒ کی پیدائش سے قریباً دو سو برس قبل اقبالؒ کے آباو اجداد کا تعلق ایک باعزت ہندو برہمن خاندان سے تھا۔ لیکن تقسیم کے بعد کچھ حلقۂ احباب نے اس بات پر زور دینا شروع کیا کہ ایسا ہرگز نہیں تھا۔ اس ضمن میں پروفیسر ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی کی کتاب (عروجِ اقبال، صفحہ 5) کا یہ اقتباس بڑی اہمیت کا حامل ہے:

> ''اقبالؒ کے اجداد براہمۂ کشمیر کے اُسی ''سپرو'' فرقے سے تعلق رکھتے تھے۔ اب سوال یہ ہے کہ اقبالؒ کے نومسلم جدِ اعلیٰ کون تھے اور وہ کب مسلمان ہوئے؟ اس نومسلم خاندان کے سِلسلۂ نسب کی جو کڑیاں دریافت ہوئی ہیں، ان میں ایک صوفی بزرگ، بابا لول حج'' کو اوّلیت حاصل ہے اور اس دریافت کا سہرا بھی اقبالؒ کے سر ہے۔ وہ اپنے والد ماجد سے ''بابا لول حج'' کا ذِکر سن چکے تھے۔ اتفاقاً اُن کے حالات کا سراغ بھی اُنھیں مل گیا۔ اس انکشاف کا ذکر اُنھوں نے اپنے برادر بزرگ شیخ عطا محمد کے نام ۵، اکتوبر ۱۹۶۵ء کے ایک خط میں کیا ہے۔ اصل خط شیخ اعجاز احمد کے پاس محفوظ ہے جس کا عکس ڈاکٹر

محمد باقر نے اپنے ایک مقالے (اقبالؒ کے اجداد کا سلسلۂ عالیہ) کے ضمن میں مجلہ ''صحیفہ'' کے اقبالؒ نمبر (حصہ اول، اکتوبر ۱۹۷۳ء) میں شائع کیا ہے۔ اس خط کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''......آپ اور آپ کے والد مکرم یہ سن کر خوش ہوں گے کہ مدت کی جستجو کے بعد آج اپنے بزرگوں کا سراغ مل گیا ہے۔ حضرت بابا لول حج کشمیر کے مشہور مشائخ میں سے تھے۔ اُن کا ذکر خواجہ اعظم کی تاریخ کشمیر میں اتفاقاً مل گیا ہے۔ والد مکرم نے جو کچھ اپنے بزرگوں سے سنا تھا وہ بحیثیتِ مجموعی دُرست ہے۔ اُن کا اصلی گاؤں لوچر نہ تھا، بلکہ موضع چکور ہرگنہ آدوَن تھا۔ بارہ سال کشمیر سے باہر رہے اور ممالک کی سیر میں مصروف رہے۔ بیوی کے ساتھ اُن کے تعلقات اچھے نہ تھے، اس واسطے ترکِ دُنیا کر کے کشمیر سے نکل گئے۔ واپس آنے پر اشارۂ غیبی پا کر حضرت بابا نصرالدینؒ کے مرید ہوئے جو حضرت نُورالدین ولی کے مرید تھے۔ بقیہ عمر اُنھوں نے بابا نصرالدین کی صحبت میں گزاری اور اپنے مرشد کے جوار میں مدفون ہیں......''

''آپ کے جدِ اعلیٰ تقریباً سوا دو سو سال ہوئے (عالمگیر کے زمانے میں) مسلمان ہو گئے تھے۔'' پھر ربع صدی بعد، مصنف ''ذکرِ اقبالؒ'' نے فوق کے اس بیان پر اعتماد کرتے ہوئے، تفاوتِ زمانی کے لحاظ سے ''کوئی اڑھائی سو سال پیشتر'' کے الفاظ لِکھ دیے۔ وہ بھی بابا لول حج کے حالات سے بے خبر تھے (ذکرِ اقبالؒ میں ان کا نام تک مذکور نہیں)، لہٰذا مزید تحقیق کی ضرورت نہیں سمجھی اور اب، حال کی ایک تصنیف ''سرگزشتِ اقبالؒ'' میں یہ جدید انکشاف ہوا ہے کہ ''اس خاندان نے اٹھارھویں صدی کے آغاز میں اسلام قبول کیا۔''

(عروجِ اقبال، صفحہ 5)

اقبالؒ کا جنم 9 نومبر 1877ء کو برصغیر پاک و ہند کے ایک قدیم اور تاریخی شہر سیالکوٹ میں ہوا۔ یہ وہی عظیم شہر ہے جہاں راجہ رسالو، پورن اور رانی اچھراں کے کردار مشہور ہیں۔اس شہر کے عروج کا حال آریائی تہذیب سے عہدِ جدید تک میں دیکھا جا سکتا ہے۔اقبالؒ کے والد گرامی کا نام شیخ نُور محمد تھا۔اُن کی والدہ محترمہ کا نام امام بی بی تھا جو انتہائی دِین دار اور پرہیزگار خاتون تھیں۔شیخ نُور محمد کے دادا، پردادا سب کا تعلق علم و دانش سے تھا۔یوں اقبالؒ کو ابتدائی تعلیم کے لیے اس وقت کے مروجّہ نظامِ تعلیم کے تحت سب سے پہلے قرآنِ مجید کی ناظرہ تعلیم کے لیے مسجد کے مکتب میں بھیجا گیا۔اُن کے گھر کے قریب ہی محلہ شوالہ کی ایک مسجد میں مولانا ابوعبداللہ غلام حسن کا قائم کردہ مکتب تھاتعلیمِ قرآن مجید کے حوالے سے جس کا شمار نہ صرف سیالکوٹ بلکہ پنجاب بھر کی مشہور درسگاہوں میں ہوتا تھا۔ناظرۂ قرآن کی تعلیم کے بعد شیخ نُور محمد نے اپنے فرزندِ ارجمند کو مولوی میر حسن جیسے عظیم اُستاد کے حوالے کر دیا۔زبان دانی کے علاوہ ریاضی کی تعلیم کے واسطے اقبالؒ کو سردار سندر سِنگھ کے پاس بھجوانا شروع کیا۔کچھ عرصے کے بعد اُنھیں مشن ہائی سکول سیالکوٹ میں داخل کروا دیا گیا۔اس سکول سے 1888ء میں پرائمری، 1891ء میں مِڈل اور 1893ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔سیالکوٹ میں قیام کے دوران میں اقبال سکول کی تعلیم کے علاوہ بھی مولوی میر حسن کی نگرانی ہی میں رہے۔یہی وجہ تھی کہ چھوٹی عمر ہی میں اقبالؒ کو اُردُو، عربی اور فارسی پر خاصی مہارت حاصل ہو چکی تھی۔میٹرک تک اُنھوں نے شاعری کے علاوہ کچھ دِیگر مشاغل بھی اپنائے، جن میں پنجابی منظوم خوش الحانی سے سنانا، فنِ موسیقی کے رموز کی جانکاری اور کبوتر اُڑانا شامل ہیں۔بعض مؤرخین کی رائے میں اقبالؒ ستار بھی بہت اچھا بجاتے تھے۔میٹرک کے بعد اقبالؒ کو ان کی مرضی کے برخلاف محترمہ کریم بی بی کے ساتھ رشتۂ ازدواج میں باندھ دیا گیا۔کریم بی بی اُس وقت کے انتہائی معزز شخص خان بہادر ڈاکٹر عطا محمد کی صاحبزادی تھیں۔خان بہادر کا شمار برصغیر کے گنے چنے سِول سرجن ڈاکٹروں میں ہوتا تھا۔اُنھوں نے کئی برس حجازِ مقدس کی سرزمین پر گزارے تھے یہی وجہ تھی کہ اقبالؒ کی پہلی اہلیہ کریم بی بی اہلِ زبان کے مانند عربی بولتی تھیں۔1895ء میں اقبالؒ نے سکاچ مشن کالج سیالکوٹ سے ایف اے کا امتحان پاس کیا۔اس کالج کو بعدازاں مرے

کالج کا نام دے دیا گیا کیونکہ مرے نامی ایک فوجی شخص نے اپنی جائیداد کا ایک بڑا حصہ اس تاریخی ادارے کے نام کر دیا تھا۔ ایف اے کے بعد اقبالؒ لاہور تشریف لے آئے اور گورنمنٹ کالج لاہور کی تاریخی درسگاہ میں بی اے میں داخلہ لیا۔ 1897ء میں بی۔ اے اور 1899ء میں ایم۔ اے فلسفہ کا امتحان پاس کیا۔ فلسفے کی جماعت میں آپ واحد اُمیدوار تھے۔ اس مضمون کی تعلیم کے دوران میں اُن کی ملاقات پروفیسر آرنلڈ سے ہوئی۔ پروفیسر آرنلڈ مقامی تہذیب اور سر سیّد احمد خان سے بہت متاثر تھے۔ اُن کا اور اقبالؒ کا ساتھ عمر بھر رہا۔ آرنلڈ خواہ انگلستان میں رہے یا ہندوستان میں اُن کا اقبالؒ سے بہر صورت رابطہ رہا۔ آرنلڈ کی تعلیمات کا اقبالؒ پر گہرا اثر تھا۔ اقبالؒ جب لاہور تشریف لائے تو ابتدا میں کالج ہوسٹل کے بجائے قریباً ایک برس تک اندرون بھاٹی دروازہ، بازار حکیماں میں ایک کرایے کے مکان میں رہے۔ اس مکان میں رہائش کے دوران میں آپ کے اندر کا شاعر اور مُفکر اُبھر کر باہر آ گیا۔ اندرون بھاٹی دروازہ شیخ امین الدین کے گھر پر آئے روز مشاعرے کا اہتمام ہوا کرتا تھا۔ ان مشاعروں میں اقبالؒ باقاعدگی سے شریک ہوتے تھے۔ جہاں پر نامور شعرا اور ادیبوں کے ساتھ اُن کی ملاقاتیں ہوئیں۔ جس مکان میں اقبالؒ نے ایک برس سے زائد قیام کیا، وہ مکان آج بھی اندرون بھاٹی دروازے میں موجود ہے۔ اس تاریخی مکان کو اس کے مالک نے تنگیِ حالات کے باعث گِروی چڑھا رکھا ہے۔ 1899ء میں جب اقبالؒ نے گورنمنٹ کالج سے ایم اے کیا تو کچھ اتفاق ایسا ہوا کہ اُنھیں پروفیسر آرنلڈ کی خدمت کے لیے پانچ برس اور مل گئے۔ معاملہ کچھ یوں ہوا کہ ڈاکٹر ایم اے سٹائن جو اورینٹل کالج لاہور کے پرنسپل تھے، اپنے عہدے سے سبکدوش ہو کر مدرسہ عالیہ کلکتہ میں بطورِ پرنسپل چلے گئے اور پروفیسر آرنلڈ کو اورینٹل کالج کے پرنسپل کا اضافی عہدہ بھی دے دیا گیا۔ اُنھوں نے وہاں پر عارضی پرنسپل کی حیثیت سے کام کرنا شروع کر دیا۔ اُنھیں دنوں اورینٹل کالج میں میکلوڈ عربک ریڈر شپ کی آسامی خالی ہوئی جو اقبالؒ کو بہ آسانی مل گئی۔ پروفیسر آرنلڈ کی رفاقت میں اقبالؒ نے سنسکرت زبان سیکھی اور ہندو فلسفے کا عمیق نگاہی سے مطالعہ کیا۔ خاص طور پر اُنھوں نے سوامی رام تیرتھ کی صحبت میں شنکر اچاریہ کے ویدانت کا گہرا مطالعہ کیا۔ اورینٹل کالج میں اقبالؒ کی دِیگر مصروفیات بھی بامِ عروج پر تھیں۔ مشاعرے، سنگیت، ادبی نشستیں: ان سب میں اقبالؒ بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے

رہے۔ اندرون بھاٹی دروازے میں حکیم امین الدین اور حکیم شہباز دین کے زیرِ انتظام مشاعروں میں حصہ لیتے رہے۔ علاوہ ازیں آپ کئی ادبی شخصیتوں کے گھروں میں کرایہ دار کی حیثیت سے مختصر عرصے کے لیے قیام پذیر رہے، جن میں شیخ گلاب دین وکیل، شیخ عبدالقادر، مولوی محمد باقر، مولوی محمد حُسین، مُفتی عبداللہ ٹونکی، مولوی حاکم علی، مولوی احمد بخش، مولوی ضیاالدین کے نام شامل ہیں۔ اس عرصے میں آپ کی ابتدائی نظموں کے باعث انجمن حمایتِ اسلام سے بھی آپ کا تعلق گہرا ہوتا گیا۔ انجمن کے مشاعروں میں اقبالؒ اپنا کلام ترنم سے سناتے اور ہزاروں لوگ ہمہ تن گوش ہو کر آپ کی نظمیں سنتے تھے۔

7 ستمبر 1905ء کو اقبالؒ کی زندگی میں ایک نیا موڑ آیا، جس نے اُن کے فلسفے اور مشاہدے کو جِلا بخشی، یہ تھا اُن کا ہندوستان سے انگلستان اور یورپ کا سفر۔ اس سفر کے دوران میں اُنھوں نے انگلستان اور یورپ کی کئی علمی اور ادبی شخصیات سے مُلاقاتیں کیں۔ کئی اہم اور تاریخی مقامات پر گئے۔ اقبالؒ کی اُس شبانہ روز زندگی پر ایک نظر پروفیسر ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی نے یوں ڈالی ہے:

> ’’کیمبرج سے جب کبھی لندن جاتے تو اقبالؒ کو اپنے احباب، خصوصاً شیخ عبدالقادر کے ساتھ وہاں کی علمی مجالس میں بھی شریک ہونے کا موقع ملتا تھا، وہ اپنی کم آمیزی کے باوجود، لندن اور کیمبرج کی ان دعوتوں، چائے کی پارٹیوں اور تفریحی اجتماعات (پکنک پارٹیوں) میں ضرور شریک ہوتے تھے، جہاں اہلِ علم کی صحبتیں میسر آتی تھیں، اور اس طرح یہ تقریباً بے تکلف علمی مذاکروں کا رنگ اختیار کر لیتی تھیں۔ اقبالؒ ان مذاکروں میں بڑی دلچسپی اور سرگرمی سے حصہ لیتے تھے۔ لندن میں مس اے جی بیک کے مکان پر ہندوستانی طلبہ اور مقامی دانشوروں کے اجتماعات ہوتے تھے۔ مس بیک جونیشنل انڈین ایسوسی ایشن کی آنریری سیکرٹری تھیں، اپنے بھائی مسٹر تھیوڈور بیک، سابق پرنسپل علی گڑھ کالج کے تعلق کی بنا پر، ہندوستانی طلبہ کے مسائل

میں خاص دلچسپی رکھتی تھیں اور بقول عطیہ بیگم، ''اُن سے مادرِ مشفق کا سا برتاؤ کرتی تھیں۔'' پروفیسر آرنلڈ بھی اقبالؒ کے پاسِ خاطر سے، ایسی مخصوص تقریبات کا اہتمام فرمایا کرتے تھے۔ کیمبرج میں ڈاکٹر سیّد علی بلگرامی کے یہاں اکثر علمی مجالس برپا ہوتی تھیں۔ عطیہ بیگم نے ایسی بعض محفلوں کا ذکر اپنی کتاب میں کیا ہے۔ مثلاً جب بلگرامی کی طرف سے عطیہ فیضی کو مدعو کرنے کے لیے، اقبالؒ لندن آئے تو مس بیک نے ملاقات کی ایک تقریب پیدا کی۔ یکم اپریل ۱۹۰۷ء کی اس صحبت میں مشرقی ادبیات، بالخصوص حافظ اور بابافغانی کا کلام موضوعِ گفتگو رہا۔ چند روز بعد اقبالؒ نے فراسکیٹس (Frascatis) نامی ریستوران میں، عطیہ کو چند جرمن فضلا سے ملاقات کے لیے، جن کے ساتھ وہ کام کر رہے تھے، ڈنر پر مدعو کیا۔ اس صحبت میں گہرے فلسفیانہ مسائل پر گفتگو ہوتی رہی۔ ۱۵۔ اپریل کو عطیہ بیگم نے چائے کی دعوت میں اقبالؒ کے علاوہ، اپنی چند فاضل دوستوں کو مدعو کیا جو لندن میں زبان اور فلسفے کی ممتاز و معروف طالبات تھیں۔ ''فضا میں شروع سے آخر تک علمی پھلجھڑیاں چھٹتی رہیں۔'' اس مرتبہ لندن میں اقبالؒ تین ہفتے مُقیم رہے۔ اب وہ کیمبرج میں اپنا تحقیقی کام مکمل کر کے ایک نئی منزل کی طرف گامزن تھے۔ عطیہ قدیم و جدید فلسفے میں اپنا نصابِ تعلیم مکمل کر چکی تھیں۔ لندن کی ان ابتدائی ملاقاتوں میں افلاطون اور نطشے کا فلسفہ اکثر زیرِ بحث رہا۔ بعض اختلافی مسائل پر کیمبرج سے بذریعۂ مراسلت، بحث کا سلسلہ جاری رہا۔ ۲۲ اپریل کو اقبالؒ، شیخ عبدالقادر اور عطیہ، لندن سے کیمبرج کے فضلا بھی جمع تھے۔ یہ دن، بلگرامیوں کے یہاں مدعوئین کے درمیان، تابناک گفتگو اور عالمانہ مباحث میں گزرا۔ کیمبرج میں اس قسم کی آخری تقریب، یکم جون ۱۹۰۷ء کی وہ ''پکنک پارٹی'' تھی، جس کا اہتمام پروفیسر آرنلڈ نے کیا

تھا۔ کیم ندی کے کنارے، ایک درخت کے نیچے طلبہ اور نامور فضلا کی مجلس آراستہ ہوئی۔ کچھ دیر عام مسائل پر باتیں ہوتی رہیں۔ پھر آرنلڈ نے گفتگو کا رُخ موت و حیات کے فلسفیانہ مسئلے کی طرف موڑ دیا۔ سب نے اپنا اپنا نقطۂ نظر پیش کیا۔ اقبالؒ کیمبرج کو خیر باد کہنے والے تھے، اور شاید اسی لیے خلاف معمول خاموش اور کچھ مضمحل تھے۔ آرنلڈ نے موضوعِ بحث کے بارے میں اقبالؒ کی رائے پوچھی تو یہ مختصر سا جملہ کہا اور اسی پر بحث کا خاتمہ ہو گیا:

''زندگی موت کی شروعات ہے اور موت زندگی کی۔''

(عروجِ اقبال، صفحہ 302)

اقبالؒ اپنی علمی اور ادبی مصروفیات کے ساتھ ساتھ اپنی زندگی کے ایک اہم باب، اپنی عائلی زندگی سے کبھی خوش نہیں تھے۔ اُن کی پہلی شادی جومیٹرک کے امتحان کے بعد ہوئی تھی، اس کا انجام 1916ء میں علیٰحدگی کی صورت میں ہوا۔ دورانِ سفر میں بھی آپ کو اپنی زندگی کے اس باب کا شدید احساس رہا۔ یہی وجہ تھی کہ انگلستان میں عطیہ فیضی اور جرمنی میں ایما ویگے نامی خواتین نے آپ کی زندگی پر گہرے اثرات چھوڑے۔ اس سلسلے میں پروفیسر ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی کی کتاب میں سے کچھ اور اقتباسات ملاحظہ ہوں:

''قیامِ یورپ کے زمانے میں اقبالؒ نے عطیہ کو کئی خط لکھے۔ کیمبرج کے خطوط میں فلسفیانہ موضوعات پر تبادلۂ خیال ہوتا رہا۔ بعض خطوط میں کتابوں کے انتخاب اور اس طرح کے دیگر علمی معاملات میں عطیہ سے مشورہ طلب کیا گیا تھا۔ لیکن اس دور کے خطوط میں سے صرف مذکورہ بالا ایک خط اور اس کے ساتھ مرسلہ غزل کتاب میں شامل ہے۔ وہ لکھتی ہیں کہ ان میں سے اکثر خطوط ''جواب دے دینے کے بعد معرضِ وجود میں نہ رہے۔'' میونخ اور لندن سے بھی ''بہت خطوط آئے'' لیکن ان کے بارے میں بھی عطیہ کا عذر یہ ہے کہ ''اُن کا

ریکارڈ میرے پاس محفوظ نہیں رہا۔'' اس عذر کے بعد اب یہ بوالعجبی ملاحظہ ہو کہ اُنھوں نے اپنے آخری مضمون میں اقبالؒ کا وہ پہلا خط جس میں اُنھوں نے بغرضِ ملاقات، کیمبرج سے لندن آنے کی اطلاع دی تھی، حرف بہ حرف نقل کیا ہے۔ وھو ہذا:

"My dear Miss Fayzee! I am coming to London and looking forward to meet you.

Yours. S.M. Iqbal

P.S. My address in London is "Hammer smith."

''تنہائی کا احساس روز بروز بڑھتا رہا۔ ایما کی رفاقت میں گزرے ہوئے ''بہجت آفریں'' دنوں کی یاد اُن کا واحد سہارا بنی رہی۔ بے بسی اور نااُمیدی کے باوجود ''دامانِ خیالِ یار'' چھوٹنے نہ پایا۔ اگرچہ خطوط میں تواتر و تسلسل باقی نہ رہا لیکن دوستانہ مراسم قائم رکھنے کے لیے اگلے سال تحائف کے تبادلے بھی ہوئے۔ اس سے اگلے سال ۱۱ مئی ۱۹۱۱ء کے مختصر سے خط میں جرمنی کے سفر کی تمنا اور ملاقات کی حسرت کے اظہار کے بعد ایک طویل خط لکھنے کی درخواست بھی کی ہے۔ اسی سال ۶ اکتوبر کو اکبر الہ آبادی کے نام ایک خط میں اپنے احساسِ تنہائی کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''لاہور ایک بڑا شہر ہے لیکن میں اس ہجوم میں تنہا ہوں۔ ایک فردِ واحد بھی ایسا نہیں جس سے دل کھول کر اپنے جذبات کا اظہار کیا جا سکے......'' اپنے ذاتی معاملات میں وہ ''سراپا تن بہ تقدیر'' بن چکے تھے۔ غالباً اسی سال لاہور کے ایک کشمیری گھرانے میں اُن کی دوسری شادی ہوئی لیکن بعض غلط فہمیوں کی بنا پر ایک طویل عرصے تک رُخصتی نہ ہو سکی۔ ۱۹۱۳ء میں لدھیانہ کے ایک متمول کشمیری خاندان میں رشتہ طے ہوا۔ تیسری شادی کے بعد دوسری بیوی (محترمہ سردار بیگم، والدۂ جاوید اقبال) کے بارے میں غلط فہمی

کا ازالہ ہو گیا اور وہ دوبارہ حبالۂ عقد میں آ گئیں۔ اس طرح اقبالؒ کا گھر آباد ہوا، ازدواجی زندگی کی آسائشیں اور آسودگی اُنھیں حاصل ہوئی، لیکن مس ایما نے عمر بھر شادی نہیں کی۔ ۱۳ جولائی ۱۹۱۳ء کو ایما کے والد کی وفات کی خبر پا کر اقبالؒ نے پہلی مرتبہ انگریزی میں نہایت پر خلوص اور طویل تعزیت نامہ بھیجا، جس کا خاتمہ ان حسرت بھری یادوں پر ہوا ہے: ''مجھے وہ وقت بخوبی یاد ہے جب میں نے گوئٹے کی شاعری آپ کے ساتھ پڑھی تھی، اور مجھے اُمید ہے کہ آپ کو بھی وہ ایام خوش یاد ہوں گے جب ہم روحانی طور پر ایک دوسرے کے کس قدر قریب تھے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ ہم اب بھی ایک دوسرے سے قریب ہیں، یہاں تک کہ میں رُوحانی لحاظ سے آپ کا شریکِ غم ہوں۔''

علامہ اقبالؒ سے ایک ملاقات کا تذکرہ محمد دِین تاثیر نے بھی قلم بند کیا، جو ''مقالاتِ تاثیر'' میں شامل ہے۔ اُس میں سے ایک اقتباس درج ذیل ہے:

'' اُن دِنوں علامہ کی صحت اچھی بھلی تھی۔ نقرس کے علاوہ کوئی خاص عارضہ نہ تھا۔ لیکن جاوید منزل میں عوارض کے باوجود سیر کے لیے نکلنا مجھے بہت ہی عجیب معلوم ہوا۔ ملازم سے پوچھا ''کب گئے تھے؟'' کہنے لگا کہ دس منٹ ہوئے ہوں گے اور مجھے مایوس سا دیکھ کر کہنے لگا کہ دس بارہ منٹ میں آ جائیں گے، موٹر پر گئے ہیں۔ میں ہنسنے لگا۔ چہل قدمی بھی نہ تھی، ہوا خوری تھی۔ ہم باتیں کر رہے تھے کہ ڈاکٹر صاحب کی موٹر آ گئی۔ وہ موٹر سے نکل کر میرے برابر سے ہو کر سیدھے اپنے کمرے میں چلے گئے، مجھ سے بات بھی نہ کی۔ میں برآمدے میں کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ دو منٹ بعد ننگے پاؤں باہر نکل آئے، اور آبدیدہ ہو کر گلے لگا لیا۔ کہنے لگے ''دیکھا! اب میری آنکھ کام نہیں کرتی۔ مجھے تو بارہا خیال گزرا کرتا تھا کہ جیتے جی ملاقات نہ

ہوگی۔'' کمرے میں بیٹھے تو آپ نے پہلا سوال یہ کیا: ''کہو شادی کر آئے ہو؟'' میں نے جواب میں ذرا تامل کیا تو انگریزی میں کہنے لگے: ''جاؤ واپس جاؤ اور شادی کر کے آؤ۔ میں تمھیں تمھارے بچپن سے جانتا ہوں۔تم یہاں کبھی خوش نہ رہو گے۔ جاؤ شادی کر کے آؤ۔'' میں نے مسکرا کر کہا آپ تو اہلِ فرنگ اور فرنگ کی مذمت کرتے رہے ہیں۔ مجھے وہاں شادی کے لیے کہتے ہیں!'' کہنے لگے ''تم بھی یوں کہتے ہو۔ تم جانتے ہو میں فرنگ کی کس بات کی مذمت کرتا ہوں' اور سبابہ اٹھا کر اپنا ایک مصرع پڑھا؛''افرنگ کا ہر قریہ ہے فردوس کی مانند۔''

میں نے کہا کہ ''منگنی کر آیا ہوں۔ پانچ چھ مہینے الگ رہ کر دیکھتے ہیں۔ اگر لاچار ہو گئے تو شادی کر لیں گے۔''
ہنسنے لگے ''میں جانتا تھا تم شادی کر کے آؤ گے۔ وہ جرمن لڑکی کا واقعہ، تمھیں یاد ہے'' میں نے کئی لوگوں کو تمھارا فقرہ سنایا ہے۔
یہ واقعہ یوں تھا کہ جب ڈاکٹر صاحب گول میز کانفرنس سے واپس آئے تو کہنے لگے: ''تمھارے لیے ایک لڑکی پسند کر آئے ہیں۔ جرمن ہے اور مجھے جرمن لڑکیاں خانہ داری کی وجہ سے پسند ہیں۔ انگریزی، فرانسیسی اور ہسپانوی خوب جانتی ہے۔نہایت خوش شکل ہے۔ امومت صفت ہے۔تم جانتے ہو، عورتیں دو طرح کی ہوتی ہیں: امومت صفت اور معشوق صفت۔ ہندوؤں کے کوک شاستر میں کئی قسمیں ہیں۔ لیکن کرداری صفات کے اعتبار سے یہی دو قسمیں واضح ہیں۔ میں نے تمھارے ایک دو جاننے والوں سے بھی پوچھا تھا۔ سب مجھ سے متفق تھے کہ تاثیر کے لیے نہایت مناسب ہے۔ میں اسے کہہ آیا ہوں، وہ یہاں آ جائے گی۔''
میں نے عرض کیا کہ ''ایسے ہی نادیدہ شادی ہوتی ہے تو مشرق نے کیا قصور کیا ہے۔ یہیں شادی کیوں نہ کر لیتا۔'' اس پر ڈاکٹر صاحب خوب

ہنسے اور معاملہ رفع دفع ہوگیا۔ اب شادی کا مسئلہ دوبارہ پیش ہوا۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا: ''نکاح نامہ میں خود تیار کروں گا۔ اسلامی قانون کے جملہ امکانات کو استعمال کر کے اس طرح بناؤں گا کہ ایک مثال کا کام دے۔ عورت کے وہ تمام حقوق، جو ہندی رسوم اور دِیگر موانعات کی وجہ سے کالعدم ہوگئے ہیں، اُن کی تجدید کی جائے گی۔ یہ نکاح نامہ تم ولایت بھیجو تا کہ لڑکی خود دیکھ لے، وکیلوں کو دِکھائے اور اطمینان کے بعد اس کی توثیق کی جائے۔ نکاح بھی میں خود پڑھوں گا۔'' چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ڈاکٹر صاحب اسلامی قانون کے ماہر تھے۔ اُنھوں نے اپنے وکیل احباب سے بھی مشورہ کیا، بالخصوص غلام رسول بیرسٹر ایٹ لا سے اور تین مہینے کی محنت کے بعد مسودہ تیار ہوا۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا ''اگر چاہو تو کبھی تم اس نکاح نامے کو شائع کر دینا تا کہ دوسروں کے کام آئے۔'' اس لیے اس دستاویز کو رجسٹر بھی کروالیا تا کہ تلف نہ ہو جائے۔ جب آپ نکاح کی رسم کے لیے بارُود خانے پہنچے تو آپ علالت کی وجہ سے ایسے نحیف ہو چکے تھے کہ ہمارے ہاں پہنچ کر بے ہوش ہو گئے۔ مگر نکاح خود پڑھایا۔ لڑکی سے پوچھا کہ ''آپ پہلے سے مسلمان ہیں یا اب مسلمان ہوئی ہیں۔'' ساتھ ہی یہ کہا کہ ''اسلام میں عیسائی سے شادی مذہب تبدیل کیے بغیر بھی ہوسکتی ہے۔'' جب اس نے کہا کہ میں پہلے سے مسلمان ہوں تو فرمایا: ''میں مولوی یا پادری نہیں۔ اسلام میں پادری وغیرہ نہیں ہوتے۔ نکاح کے لیے کسی مسلمان یا پادری کی ضرورت نہیں۔ یہ دو شخصوں کا ایجاب وقبول ہے۔ میں اس عہد نامے کا گواہ ہوں اور بس۔''

جس ملاقات کا میں ذکر کر رہا تھا، اس میں فقط شادی کی بات نہ ہوئی تھی۔ لیکن اس کی اہمیت اور ذاتی لذت کی وجہ سے میں نے زیادہ شرح و بسط سے کام لیا ہے۔ ایک اور بات جو قابل ذکر ہوئی، اس کا

تعلق سیاسیات سے بھی ہے اور علامہ اقبالؒ کی اپنی ذات سے بھی۔
ڈاکٹر صاحب کو آکسفورڈ سے روڈز لیکچر دینے کی دعوت آئی۔"

(عروجِ اقبال، صفحہ 325، 326، 337، 338)

اقبالؒ کی سیاسی اور انقلابی زندگی پر تقسیم اور بعد از تقسیم بہت کچھ تحریر ہو چکا ہے۔اس لیے میں نے اس پہلو پر کچھ اختصار سے کام لیا ہے۔مختصر یہ ہے کہ اقبالؒ نے وکالت اور شاعری کے ساتھ ساتھ عملی سیاست میں بھی کام کیا۔انجمن حمایت اسلام سے آپ کا تعلق تو پہلے ہی گہرا تھا۔اس کے ساتھ ساتھ آپ نے آل انڈیا مسلم لیگ کی عملی سیاست میں بھی بھر پور حصہ لیا۔پہلی جنگِ عظیم کے دوران میں اس میں ہندوستان کی شمولیت کو سراہا، اس کے بعد خلافت کی تحریکوں میں آپ اس وقت کے عظیم مسلم رہنماؤں مولانا محمد علی جوہر اور محمد علی جناحؒ (قائداعظمؒ) کے ساتھ مشاورت میں رہے۔اُنھوں نے کئی مقامات پر انڈین نیشنل کانگریس کو حرفِ تنقید بنایا۔نومبر ۱۹۲۶ء میں اقبالؒ نے پنجاب کی دستور ساز اسمبلی کا الیکشن لڑا اور اپنے مخالف کو 3177 ووٹوں سے شکست دی اور قائداعظمؒ کو ایک خط میں لکھا:

> "I know you are a busy man but I do hope you won't mind my writing to you often, as you are the only Muslim in India today to whom the community has right to look up for safe guidance through the storm which is coming to North-West India and, perhaps, to the whole of India."

اقبالؒ نے اہلِ ہند اور تمام دُنیا کے مسلمانوں کو اسلامی تعلیمات کی رُو سے ریاست کا ایک عالمگیری تصور دیا۔اس سلسلے میں اقبالؒ کا خطبہ آلہ آباد آج بھی ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔اس حوالے سے ایک اقتباس حافظ عبداللہ فاروقی کا درج ہے جو اُنھوں نے "Iqbal's Concept of State" کے عنوان سے تحریر کیا۔یہ Iqbal's Thought and Art میں شامل ہے:

IQBAL'S CONCEPT OF STATES

Iqbal outright rejects a theory of State which maintains a dualism of Church and State for this is not allowed by Islam. "In Islam, he holds, "it is the same reality which appears as the Church looked at from one point of view and the State from another. It is not true to say that the Church and the State are two sides or facets of the same thing. Islam is a single unanalysable reality which is one or the other as your point of view varies." He further maintains that "The Islamic idea of the State must not be confounded with the European idea of the separation of Church and State. The former is only a division of functions as is clear from the gradual creation in the Muslim State of the office of Shaikh_ul_Islam and Ministers; the latter is based on the metaphysical dualism of spirit and matter."

(Article "Iqbal's concept of state" in Iqbal's thought and Art, p. 373)

حضرت غالب کے خطوط اُردو نثر میں اُردوئے معلیٰ کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ تاریخ کے اوراق پر کئی شاعر اور مُفکر ایسے ملتے ہیں، جن کی زندگی کے بعد اُن کے تحریر کردہ خطوط خاص اہمیت حاصل کر گئے۔ عہدِ حاضر میں فیض صاحب اور واصف علی واصفؒ کے خطوط کی خاص اہمیت دکھائی دیتی ہے۔ اسی طرح اقبالؒ کے بعد اُن کے خطوط بھی خاص اہمیت رکھتے ہیں جن میں اُن کی زندگی کے کئی پہلو اُجاگر ہوتے ہیں۔ ذیل میں نقوش خطوط نمبر سے ایک خط نقل کیا جا رہا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبالؒ کس طرح اچھے شعر کے بارے میں رائے دیتے، داد دیتے اور داد وصول کرتے تھے۔

بنام شیخ غلام قادر گرامی

''ڈیئر مولانا گرامی!

السلام علیکم!......آپ کا خط اسی روز پہنچا، جس روز میں دہلی جا رہا تھا۔ اشعار نے خوب مزہ دیا۔ کیا خوب کہا ہے:

ذوقِ وارفتگی کج کلہان دہلی

ہر شعر اور ہر مصرع لا جواب۔ کاش آپ بھی دہلی تشریف لاتے تو دو چار روز جو میں وہاں رہا خوب کٹ جاتے۔ مہاراجہ صاحب بہادر سے ملاقات ہوئی۔ میں نے اُنھیں کے دولت خانے میں قیام کیا اور دل کو اُن کے شکریوں سے مملو واپس لایا۔ مُلازمت کے متعلق اُنھوں نے مجھ سے گفتگو کی تھی مگر کوئی خاص بات نہ تھی۔ عام گفتگو تھی جس سے میں اُن کا عندیہ معلوم نہ کر سکا۔ بہر حال مجھے بیتابی نہیں۔ مقدر کا قائل جو شخص ہو، اس کی طبیعت مطمئن رہتی ہے۔ مجھ کو جہاں ہوں، اپنے فرائض مفوضہ کی ادائیگی سے کام ہے، خواہ لاہور میں ہوں خواہ لندن میں ہوں، کسی خاص جگہ ملازمت کرنے کی خواہش بھی دل میں پیدا نہیں کرتا، کیونکہ سراپا تن بہ تقدیر ہوں۔

والسلام

آپ کا مخلص

محمد اقبالؒ'

مولانا اکبرالہ آبادی کا کیا خوب شعر ہے:

گفت ہاشم بے سببِ زِ انگلش مرا اکراہ نیست
ہر کتابے را کہ بکشاویم بسم اللہ نیست

اقبالؒ کی حیات اور بعد از حیات زمانے بھر میں آپ کی مدح سرائی رہی۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ کے فلسفۂ حیات، فلسفہ خودی، تحریر اور ذاتی زندگی پر مختلف زاویوں سے تنقید بھی کی گئی۔ سیاسی حوالے سے ہندوستان کی تقسیم، آزاد ریاستوں اور شاعری کے حوالے سے

مولانا رومیؒ کی شاعری سے مماثلت کو موضوعِ بحث بنایا گیا۔ ذاتی زندگی کے حوالے سے آپ کی پہلی بیوی سے ان کے بڑے بیٹے نے جو انگلستان میں بیرسٹر تھے اور اُدھر ہی رہے، اپنے والد کو کافی حرفِ تنقید بنایا۔ علی عباس جلالپوری کی تحریر کردہ کتاب ''اقبالؒ کا علم الکلام'' خاصی اہمیت رکھتی ہے۔ اسی تناظر میں مجھے اپنے گیارھویں اور بارھویں جماعت کے سال 1989ء اور 1990ء یاد آتے ہیں جب میں اپنے دیگر دوستوں کے ساتھ پاک ٹی ہاؤس جا کر بیٹھا کرتا تھا۔ وہاں اقبالؒ کے حوالے سے جو مباحث اکثر چائے کی میزوں پر ہوتے تھے، اُن پر میں نے اقبالؒ کی تعریف بھی سنی اور تنقید بھی اکثر یہ بھی دیکھا کہ کئی تنقید کرنے والے وقت گزرنے کے ساتھ اقبالیات کا شکار بھی ہوئے اور اقبال کے گن بھی گاتے رہے۔ اقبالؒ کے حق میں بولنے والوں نے ہمیشہ مخالفین کو بہتر جواب دیے، ماسوائے ایک واقعے کے جب میں پاک ٹی ہاؤس میں بیٹھا تھا۔ دو اصحاب بحث کر رہے تھے، میں اُن کے ناموں سے واقف نہ تھا۔ میں تو بس اس جگہ بیٹھنا ہی اعزاز سمجھتا تھا۔ اقبالؒ پر تنقید کرتے ہوئے ایک شخص بولا: ''بھائی، اقبالؒ کی والدہ کی زبان پنجابی تھی اور والد گرامی کاشمیری تھے، اقبالؒ تمام عمر حُقہ پیتے رہے۔ عام زندگی میں پنجابی پیرہن میں دکھائی دیے۔ تو اقبالؒ نے والد اور والدہ کی زبانوں، پنجابی اور کاشمیری میں کیوں نہ لکھا اور نہ ہی شاعری کی۔'' اس سوال کا جواب کوئی شخص نہ دے سکا۔ شاید اس کا جواب حضرتِ اقبالؒ خود ہی دے سکتے ہوں۔

اقبالؒ نے ہمیشہ سیاسی اور انقلابی زندگی گزاری۔ ہندوستان کے علاوہ دُنیا بھر میں آپ کو اعزازات سے نوازا گیا۔ آپ کے نام کے اعزازی ڈاک ٹکٹ جاری ہوئے۔ اُن کا کلام کئی زبانوں میں ترجمہ ہوا۔ آپ پر لکھے گئے مقالوں پر طلبہ کو اعلیٰ ترین ڈگریوں سے نوازا گیا۔ اقبالؒ کی زندگی کا ایک بہت بڑا اعزاز یہ بھی ہے کہ اہلِ ایران نے آپ کو فارسی کا عظیم شاعر مانا۔ اقبالؒ کا کلام نہ صرف پاک و ہند کے نامور گلوکاروں نے گایا بلکہ اُن کی فارسی غزلوں کو پچھلی صدی کی عظیم مصری گلوکارہ اُمِ کلثوم کا لحن بھی نصیب ہوا۔ اُن کا لکھا ترانہ آج بھی بھارت میں زبان زدِ عام ہے۔ یومِ اقبال پر تمام ملک میں عام تعطیل ہوا کرتی تھی جو چند برس پہلے ختم کر دی گئی۔ مزارِ اقبالؒ پر گارڈز کی تبدیلی کی تقریب منعقد ہوتی ہے۔ 2002ء کو حکومت پاکستان کی جانب سے اقبالؒ کا سال قرار دیا گیا۔ اسی کے پیشِ نظر گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور میں

سوندھی ٹرانسلیشن سوسائٹی نے ''اقبالؒ مشرق و مغرب کی نظر میں'' شائع کی جس میں کئی نامور ادبا اور مُفکرین کے مضامین شامل تھے۔ نقوش نے اپنے کئی اہم شماروں میں آپ کی زندگی پر مقالے شائع کیے اور اقبالؒ نمبر کا اِجرا بھی کیا۔ پاکستان میں کئی ادارے اور سڑکیں آپ کے نام سے منسوب کی گئیں۔ اداروں میں علامہ اقبال اکیڈمی، بزمِ اقبال، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، علامہ اقبال میڈیکل کالج نمایاں ہیں۔ عمارتوں میں علامہ اقبال انٹرنیشنل ائیر پورٹ لاہور، ایوانِ اقبال لاہور شامل ہیں۔ لاہور ریلوے اسٹیشن سے ایک سڑک گڑھی شاہو تک جاتی ہے۔ اس سڑک پر آپ کے بیٹے جاوید اقبال کے نام پر تعمیر کی گئی عمارت ''جاوید منزل'' کہلاتی ہے۔ اس عمارت کو اب اقبال میوزیم کا درجہ حاصل ہے، اور اسی سڑک کو علامہ اقبال روڈ کا نام دیا گیا ہے۔ اسی طرح کئی لاکھ نفوس پر مشتمل لاہور کی ایک آبادی علامہ اقبال کے نام سے منسوب ہے۔

اُردو اور فارسی کی تاریخ اقبالؒ المعروف اقبالؒ لاہوری کے بغیر اُدھوری سمجھی جائے گی۔ آپ کے اُردو کلام میں بانگِ درا، بالِ جبریل، ضربِ کلیم، ارمغانِ حجاز شامل ہیں جو اقبال اکیڈمی نے ''کُلیاتِ اقبالؒ'' کے نام سے شائع کی ہے۔

1933ء میں اُنھوں نے سپین اور افغانستان کی سیاحت کی، ہندوستان واپس آ کر ادارہ دارالسلام میں کام شروع کیا۔ مگر اس دوران میں آپ کی صحت خراب ہونا شروع ہوگئی۔ 1938ء میں آپ انتقال کر گئے۔ اُن کی وفات کا تذکرہ چراغ حسن حسرت نے ''اقبالؒ کی موت'' کے عنوان سے تاثیر کی زبانی بیان کیا ہے۔ یہ تحریر مقالاتِ تاثیر کے صفحہ 122 پر موجود ہے:

> ''چند دن ہوئے، میں جاوید منزل میں بیٹھا علامہ اقبالؒ سے باتیں کر رہا تھا۔ کوئی ایک گھنٹے کے بعد سہج سہج سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے کرتے اُن کا دم اُلٹ گیا۔ دمے کا دورہ شروع ہوگیا۔ اُن کا سر تکیے پر جھکا ہوا تھا۔ ایک خدمتگار اُن کی کمر دبا رہا تھے۔ سارا بدن پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ چند دنوں کے وقفے کے بعد ذرا افاقہ ہوا تو وہ اسی طرح جھکے جھکے سر تکیے پر رکھے فرمانے لگے: ''تاثیر، کہو آسٹریا کے الحاق کے بعد جرمنی کا کیا

ارادہ ہوگا۔ دُنیا کا سیاسی نقشہ.....'' اور یوں دیر تک وہ دُنیا اور قوموں کی سیاسی تقدیر پر گفتگو کرتے رہے۔ میں غیر معمولی طور پر محض ''ہوں ہاں'' یا ایک آدھ فقرے سے زیادہ کچھ نہ کہتا، کیونکہ مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ ڈاکٹروں کی رائے میں اُن کی زندگی کب کی ختم ہو چکی ہے، اور زیادہ گرم گفتاری اُن کے لیے مضر ہے۔ وہ اسی طرح دمے کے دوران میں گہری فلسفیانہ باتیں کیے جاتے تھے اور میں خاموش تھا۔

دورہ تھم گیا تو وہ سیدھے ہو کر چارپائی پر بیٹھ گئے اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے گہرائیوں میں اُتر جانے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہنے لگے: ''تم آج غیر معمولی طور پر خاموش ہو'' اور پھر یورپ کی سیاسی حالت، فاشزم کی بربریت اور سوشلزم کے مستقبل پر گفتگو کرنے لگے۔ انگریزی میں ایک نئی کتاب لکھنے کی تجویز پر بحث کرنے لگے۔ اسلامی قانون پر اپنی تازہ ریسرچ (تحقیق) اور ایک بڑی معرکہ آرا تصنیف کا خاکہ بناتے رہے۔ اُردو میں بہت سے نئے اشعار اور رُباعیات سنائیں۔ غرض جو بات تھی، مستقبل کے متعلق زندگی سے بھرپور، قومی ومحکم ارادے کی ترجمان۔ میں ایک زندہ دل، تازہ دماغ، جواں ہمت شخصیت کے رُوبرو تھا اور ڈاکٹر کہتے تھے، اُن کی زندگی ختم ہو چکی ہے، چند گنتی کے دن باقی ہیں۔ ڈاکٹروں کے نزدیک میں، تم، ہم سب چلتے پھرتے، دوڑتے بھاگتے، کھاتے پیتے حیوانِ ناطق زندہ ہیں اور اقبالؒ زندہ نہیں لیکن مجھے یقین نہ تھا اور نہ اب یقین ہے۔ میں ایک لمحے کے لیے باور نہ کر سکتا تھا کہ یہ سورج کی طرح دمکتا ہوا دماغ، یہ بجلی کی طرح تڑپتا ہوا دل، یہ زمین و آسمان پر چھایا ہوا تخیل، یہ انسان کی روحانی ترقی کی معراج— یہ اقبالؒ جو روز بروز بہتر سے بہتر اشعار لکھتا ہے، یہ زندگی سے دُور ہے اور موت کے

قریب ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اس وقت میری نظر نے نحیف بدن کو دیکھا، میرے کانوں نے اُن کی کانپتی ہوئی آواز کو سنا، لیکن اس طرح جیسے نہ دیکھا نہ سنا ہو۔ میرے دل و دماغ اُن کی زندگی افروز شخصیت کے انوار سے تاب دار تھے۔ مجھے اقبالؒ کے آس پاس زندگی ہی زندگی نظر آتی تھی۔ اُن کی صحبت میں میری نبضِ حیات تیز سے تیز تر ہوتی جاتی تھی۔ یہ زندہ اور زندگی بخش اقبالؒ آج وفات پا گیا۔ طبیبوں کا کہنا سچ نکلا۔ اقبالؒ کی زندگی کے دن ختم ہوگئے۔ اقبالؒ کا نحیف و نزار بدن گھل گھل کر ہلاک ہوگیا۔ اُن کی کانپتی لرزتی ہوئی آواز ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگئی۔ اقبالؒ کی اولاد، اقبالؒ کے احباب، اقبالؒ کے عزیز و اقارب، اقبالؒ کے ارادت مند رو رہے ہیں، فریادیں کر رہے ہیں کہ اقبالؒ، اُن کا اقبالؒ وفات پا گیا۔ وہ اقبالؒ جس کے پاس ہم اپنے دُکھیا دلوں کا مرہم، اپنی بے اطمینانیوں کی دوا پاتے تھے، اپنی ذاتی مصیبتوں کی چارہ سازی چاہتے تھے، وہ اقبالؒ اب ہم میں نہیں رہا۔ لیکن اقبالؒ کبھی اس ذاتی محدود دُنیا کا رہنے والا نہ تھا۔ وہ اس دُنیا میں کبھی اطمینان کا سانس نہ لیتا تھا۔ ہماری تمھاری ذاتی تعلقات کی دُنیا میں اسے دم بھر کے لیے چین حاصل نہ تھا۔ وہ صحیح معنوں میں دُنیا دار تھا۔ جملہ انسانی فرائض ادا کرتا تھا۔ خوش مزاج اس قدر کہ روتوں کو ہنساتا تھا۔ بے تکلف اتنا کہ پہلی ملاقات میں رسمی قیود اُٹھا دیتا تھا۔ لیکن اس قدر وسیع حلقۂ احباب رکھتے ہوئے بھی اقبالؒ تنہا تھا۔ اس کا کوئی دوست، کوئی ہم خیال نہ تھا۔ وہ جن بلندیوں پر رہتا تھا، وہاں کسی اور انسان کے دم مارنے کی جگہ نہ تھی۔ یوں کبھی کبھی کوئی درد رسیدہ قلب بہت تڑپا، کوئی روشن دماغ دم بھر کے لیے تمتما اُٹھا، کوئی زندگی کی لہر اُچھل پڑی تو اقبالؒ — بانگِ درا، پیامِ مشرق، بالِ جبریل کے اقبالؒ سے ہم کلامی نصیب ہوگئی۔ اس دُنیا کے اقبالؒ سے اس دُنیا کے رہنے والے رُوبرو

ہوگئے۔ جہاں کہیں جب کبھی کسی دل کو چوٹ لگی، کسی دماغ میں تازگی آئی، اقبالؒ سے ہم کلامی نصیب ہوگئی۔ شخصیتوں کے لیے اقبالؒ اب بھی زندہ ہیں۔ ہمیشہ کے لیے زندہ ہیں۔ آج سے اقبالؒ کی تنہائی ختم ہوگئی۔ ہمیں ماتم اب بھی تنہائی کا ہے، اپنی بے مائیگی کا رونا ہے:

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نُوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

اُنھیں بادشاہی مسجد لاہور میں سیڑھیوں کی شمالی سیدھ میں ایک مزار میں دفنایا گیا، اُنھیں کے ساتھ سر سکندر حیات مدفون ہیں۔ اُن کی قبر کی لوح اور ان کی اندرونی، بیرونی جانب درج ذیل عبارت کندہ ہے:

ان من الشعر لحکمۃ
و ان من البیان لسحر آ
نہ افغانیم و نہ ترک و تتاریم
چمن زادیم و از یک شاخساریم
تمیز رنگ و بُو بر ما حرام است
کہ ما پروردۂ یک نو بہاریم

لوح مزار کے باہر کی جانب یہ عبارت کندہ ہے:

ھوالغفور الرحیم

شاعر و فیلسوف مشرق ڈاکٹر محمد اقبالؒ
کہ راہ سعی و عمل و روح اسلام را
بہمگنان روشنساختہ و ازین رو

مظہر قبول اعلیٰحضرت محمد نادر شاہ غازی
و ملّتِ افغان واقع شدِ در
۱۲۹۴ق تولد و بسنہ ۱۳۵۷ق وفات یافت

آغا حشر کاشمیری

1879ء-1935ء

لڑتے ہیں اختلافِ عقائد پہ حشر کیوں
یہ تو ہے اک معاملہ دل کا خدا کے ساتھ
حشر

اُردو زبان کے اتہاس میں تھیٹر اور ڈرامہ نویسی کی جب بھی داستان رقم ہوگی، آغا حشر کاشمیری کا نام سرِ فہرست ہوگا۔ اُن کا جنم یکم اپریل 1879ء بروز جمعۃ المبارک بنارس میں ہوا۔ بعض مؤرخین اُن کی جائے پیدائش امرتسر بتلاتے ہیں، لیکن عشرت رحمانی نے اپنے مضامین میں اس بات کی سختی سے تردید کی ہے اور جائے پیدائش بنارس ہی بتلائی ہے۔ والدین نے اپنے بیٹے کا نام آغا محمد شاہ رکھا جو آگے چل کر آغا حشر کے نام سے معروف ہوا۔ آغا حشر کے والدِ گرامی کا نام آغا محمد غنی شاہ تھا۔ آغا صاحب کے آباواَجداد صدیوں سے جنت نظیر کشمیر (سری نگر) کے باسی تھے۔ اُن کے خاندان کے دو بزرگ سیّد عزیز اللہ شاہ اور سیّد احسن اللہ شاہ تجارت کی غرض سے سری نگر سے امرتسر آئے۔ کچھ عرصے کے بعد بنارس چلے گئے۔ اِن دونوں بزرگوں نے جو رشتے میں آغا محمد غنی کے ماموں تھے، اپنے بھانجے کو اپریل 1868ء میں بنارس بلا لیا۔ اُن کا خاندان تجارت کے ساتھ ساتھ ادب، علم و ہنر کا بھی داعی تھا۔ آغا محمد غنی کو عربی، فارسی اور اُردو زبان پر دسترس حاصل تھی۔ آغا حشر کو زباندانی کا علم اپنے گھر ہی سے حاصل ہوا۔ مروجہ اور نصابی تعلیم کے لیے آپ کو بنارس ہی کے ایک راج نارائن نامی سکول میں داخل کروا دیا گیا۔ ابھی آٹھویں جماعت میں تھے کہ اُردو اور فارسی زبان میں شعر کہنے لگے۔ دونوں زبانوں میں حشر تخلص اختیار کیا۔ وہ اپنے کہے ہوئے اشعار ایک خاص ترنم کے ساتھ سناتے تھے، ترنم گوئی کے وصف کے سبب وہ اپنے حلقۂ احباب میں معروف تھے۔ پھر یہ سلسلہ دوستوں کی محافل سے نکل کر مقامی مشاعروں تک جا پہنچا۔ اُن کے خاندان کے بزرگ زباندانی کے علم کے ساتھ ساتھ خاص قسم کے مذہبی رُجحانات کے مالک بھی تھے اور مشاعروں اور اس طرح کی دِیگر مصروفیات کو پسند نہ کرتے تھے۔ اس لیے آغا حشر اپنے ان تمام کاموں کو اپنے بزرگوں سے چھپا کر رکھتے تھے۔

انگریز راج کے باعث برصغیر میں جدید تھیٹر نے اپنے قدم جمانا شروع کر دیے تھے۔ اس سلسلے میں کئی کمپنیاں معرضِ وجود میں آئیں جن میں زیادہ تر پارسی برادری کی ملکیت تھیں۔ 1897ء میں ایک مشہور تھیٹر کمپنی ''پارسی الفریڈ تھیٹریکل کمپنی'' بنارس آئی۔

ڈرامے اور فلم کے حوالے سے ایک بات رقم کرتا چلوں کہ ہندوستان کے ابتدائی دور کے ڈرامے اور فلم میں فن کاروں کا اداکاری کے ساتھ ساتھ ایک اچھا گویا ہونا بھی ضروری تھا کیوں کہ اس وقت پلے بیک کا کوئی رواج نہیں تھا۔ اسی طرح ڈرامہ نویس جنھیں اس وقت

’’منشی‘‘ کے نام سے جانا جاتا تھا۔ اُن کا بھی نثر نگاری، مکالمہ نویسی کے ساتھ ساتھ شاعر ہونا لازمی تھا، کیوں کہ ڈرامے کا زیادہ تر حصہ شاعری پر مشتمل ہوتا تھا کہ فن کار مکالمے بھی شعروں کی صورت میں ادا کرتے تھے۔ اُس کمپنی کے کچھ ڈرامے آغا حشر نے بھی دیکھے جو زیادہ تر منشی احسن کے تحریر کردہ تھے اور وہ اپنے ایک کامیاب ڈرامے ’’چندراولی‘‘ کے حوالے سے کافی شہرت رکھتے تھے۔ وہ ڈرامے دیکھ کر آغا حشر میں ڈرامہ نویسی کا شوق پروان چڑھا۔ اس سلسلے میں آپ نے ایک ڈرامہ ’’آفتابِ محبت‘‘ تحریر کیا اور کچھ تھیٹر کمپنیوں کو دِکھایا، جنھوں نے ڈرامے کو کوئی خاص اہمیت نہ دی جس سے آغا حشر کی کافی حوصلہ شکنی ہوئی۔ آغا حشر نے وہ ڈرامہ بنارس کے ایک ناشر بسم اللہ خان کو صرف ساٹھ روپے میں فروخت کردیا، یہ ڈرامہ کبھی سٹیج نہ ہو سکا، لیکن دُھن کے پکے آغا حشر نے ہمت نہ ہاری اور ایک وقت ایسا بھی آیا کہ ہندوستان کی مشہور تھیٹر کمپنیوں کے مالکان اُن کے آگے پیچھے پھرنے لگے۔ اس تناظر میں عشرت رحمانی کے تحریر کردہ مضمون میں سے ایک اقتباس درج ہے:

> ’’۱۹۰۵ء میں جبکہ تھیٹر اور سٹیج کی دُنیا میں داخل ہوئے آغا صاحب کو صرف پانچ برس گزرے تھے، پارسی الفریڈ تھیئٹریکل کمپنی کے مالک سے ذرا سی بات پر جھگڑ بیٹھے اور بگڑ کر نوروز جی پارسی کی منت خوشامد پر اس کمپنی میں ملازمت اختیار کر لی۔ اس کمپنی کے لیے اسی سال ڈراما ’’میٹھی چُھری‘‘ لکھا۔ مگر کچھ عرصہ بعد نوروز جی سے بھی ان بن ہوگئی اور سیٹھ اردشیر بھائی ٹھونٹھی کی کمپنی میں بمبئی سے مدراس چلے گئے۔ وہاں ’’سفید خون‘‘ اور ’’صیدِ ہوس‘‘ اس دور کے دو مشہور ڈرامے لکھے۔ اس عرصے میں پارسی الفریڈ کمپنی کے مالک بار بار اُن کو منانے کی سعی کر چکے تھے۔ آخر اُن کے پیہم اصرار اور ہزاروں خوشامدوں سے مجبور ہو کر پھر ان کے ساتھ شریک ہو گئے۔ لیکن ان سیٹھوں کے مقابلہ میں ان کی تنک مزاجی اور خودداری کبھی دب کر نہ رہی اور آئے دن اسی طرح روٹھنا منانا جاری رہا۔ آخر وہ لوگ آغا صاحب کے مزاج سے واقف ہو گئے اور کسی معاملہ میں کبھی کوئی بات ان کے سوءِ مزاج نہ کرتے۔ حتیٰ کہ آغا صاحب ان کے ساتھ تلخ کلامی اور فحش گوئی سے بھی

پیش آتے مگر سب کے سب آغا صاحب کا بے حد لحاظ اور پاس ادب کرتے۔ ہر وقت خائف رہتے کہ معلوم نہیں آغا صاحب کب کسی موقع پر ناراض ہوکر ان کی بے عزتی پر آمادہ ہو جائیں اور ذرا سی بات پر روٹھ کر قطع تعلق کر لیں۔ کیونکہ حشر کے ڈرامے اب اسٹیج کی بقا کے ضامن تسلیم کیے جاتے تھے اور ان کی نظرِ التفات ان تھیٹر کمپنیوں کی شہرت اور دولت کا سب سے بڑا ذریعہ بن گئی تھی۔ اس لیے ہر کمپنی کا مالک حشر کے اشاروں پر چلتا۔ اور حشر اس سلوک کو خود غرضی اور مطلب پرستی پر محمول کر کے ہر ایک سے مناسب برتاؤ کرتے۔"

(''نقوش''، شخصیات نمبر، صفحہ 78)

1912ء میں آغا حشر ایک نیا ڈرامہ تحریر کر رہے تھے۔ اس دوران میں اُنھیں کسی کام کی غرض سے چند دن کے لیے اپنے گھر بنارس آنا پڑا۔ جب گھر پہنچے تو خاندان کے بزرگوں اور احباب کے اصرار پر آپ کی شادی آپ کے عزیزوں میں سے ایک نیک سیرت خاتون سے کر دی گئی۔ شادی کے بعد آغا صاحب، جو اپنی تھیٹر کمپنی قائم کر چکے تھے، دہلی سے بنارس اور پھر بنارس سے کلکتہ منتقل ہوگئے۔ اس کے بعد کے چار برس آغا حشر کے ڈراموں کی کامیابی کے برس تھے۔ ان برسوں میں آغا صاحب نے ''مدُھر مُرلی''، ''بھگیرت گنگا''، ''تُرکی حُور'' جیسے لازوال ڈرامے تحریر کیے۔ کامیاب زندگی میں آپ اچانک دو بڑے حادثوں کا شکار ہوئے۔ پہلا حادثہ یہ ہوا کہ آپ کا اکلوتا بیٹا نادر شاہ محض ڈیڑھ برس کی عمر میں انتقال کر گیا۔ بیٹے کی وفات کا اثر آپ سے کہیں زیادہ اہلیہ پر ہوا اور وہ شدید بیمار پڑ گئیں۔ علاج کی غرض سے آغا حشر اُنھیں لے کر کلکتہ سے لاہور اپنے انتہائی قریبی دوست حکیم فقیر محمد چشتی کے پاس گئے۔ حکیم صاحب کے علاج کے باوجود اُن کی اہلیہ جانبر نہ ہوسکیں۔ نومبر 1916ء میں وہ انتقال کر گئیں اور اُنھیں لاہور کے قبرستان میانی صاحب میں دفنایا گیا۔

شِیر خوار بیٹے اور جواں سال اہلیہ کی وفات کا روگ آغا صاحب کو ایسا لگا کہ اس کے بعد چار پانچ برس تک اُنھوں نے ڈرامہ نویسی کو یوں چھوڑا جیسے اُنھوں نے کبھی کوئی ڈرامہ

تحریر ہی نہ کیا تھا۔ تھیٹر سے غائب ہونے کے عرصے میں کئی دِیگر ڈرامہ نویسوں نے آپ کی ہم سری کرنے کی کوشش کی لیکن کسی ڈرامہ نویس کو وہ مقام نصیب نہ ہوا جس پر آغا صاحب فائز تھے۔ اُن کی عائلی زندگی تو دوبارہ کبھی شاداب نہ ہو سکی لیکن 1921ء میں وہ ایک بار پھر ڈرامہ نویسی کی طرف راغب ہوئے۔ اس کے بعد اُنھوں نے کئی فقید المِثال ڈرامے تحریر کیے۔ اہلیہ کی وفات کے بعد آغا صاحب کے کئی خواتین کے ساتھ گہرے مراسم رہے جن میں اُس وقت کی ایک مشہور فن کارہ اور گائیکہ مختار بیگم سرِ فہرست تھیں اور کئی لوگ اُنھیں آغا صاحب کی اہلیہ سمجھتے تھے۔ لیکن نہ تو مختار بیگم آپ کی بیوی بنی اور نہ ہی کوئی دوسری خاتون۔ زندگی کے آخری ایام تک اُن پر خاندان اور دِیگر احباب کا اصرار تھا کہ وہ دوسری شادی کر لیں مگر وہ نہ مانے۔ آغا صاحب اپنی ظرافت، علم و دانش اور بلا نوشی کے حوالے سے بھی بہت شہرت رکھتے تھے۔ اس ضمن میں سعادت حسن منٹو کے شخصی خاکے میں سے ایک اقتباس درج ذیل ہے:

''باہر صحن میں کرسیوں پر کچھ آدمی بیٹھے تھے۔ ایک کونے میں تخت پر پنڈت محسن بیٹھے گڑگڑی پی رہے تھے۔ سب سے پہلے ایک عجیب و غریب آدمی میری نگاہوں سے ٹکرایا۔ چیختے ہوئے لال رنگ کی چمکدار ساٹن کا لاچا، دو گھوڑے کی بوسکی کی کالر والی سفید قمیص، کمر پر نیلے رنگ کا پھندنوں والا آزار بند، بڑی بڑی بے ہنگم آنکھیں...... میں نے سوچا کٹڑہ گھنیاں کا کوئی پیر ہوگا۔ لیکن فوراً ہی کسی نے اس کو ''آغا صاحب'' کہہ کر مخاطب کیا۔ مجھے دھکا سا لگا۔

ہری سنگھ نے بڑھ کر اس عجیب و غریب آدمی سے مصافحہ کیا، اور میری طرف اشارہ کر کے اس سے کہا: ''میرے دوست سعادت حسن منٹو......آپ سے ملنے کے بہت مشتاق تھے۔

آغا صاحب نے اپنی بڑی بڑی بے ہنگم آنکھیں میری طرف گھمائیں اور مسکرا کر کہا: ''لارڈ منٹو سے کیا رشتہ ہے تمھارا۔''

میں تو جواب نہ دے سکا۔ لیکن ہری سنگھ نے کہا؛ ''آپ

مِنٹو نہیں ہیں منٹو ہیں...... کشمیری۔''

آغا صاحب نے ایک لمبی ''اوہ'' کی اور پنڈت محسن سے کشمیریوں کی ''آل'' کے متعلق طویل گفتگو شروع کر دی۔ میں پاس ہی بنچ پر بیٹھ گیا۔ پنڈت جی کو قطعاً آغا صاحب کی اس گفتگو سے دلچسپی نہیں تھی کیونکہ وہ بار بار اُن سے کہتے تھے: ''آغا صاحب اس کو چھوڑیے یہ بتائیے کہ آپ کب میرے لیے دوریل کا مزاحیہ ڈرامہ لکھیں گے۔''

آغا صاحب کو اس مزاحیہ ڈرامے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ گفتگو تو کشمیریوں کی ''آل'' کے بارے میں کر رہے تھے، مگر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دماغ کچھ اور ہی سوچ رہا ہے۔ ایک دوبار اُنھوں نے دورانِ گفتگو اپنے نوکر کو موٹی موٹی گالیاں دے کر یاد کیا کہ وہ ابھی تک آیا کیوں نہیں۔

آغا صاحب جب خاموش ہوئے تو پنڈت محسن نے اُن سے کہا: ''آغا صاحب، اس وقت آپ کی طبیعت موزوں ہے۔ میں کاغذ قلم لاتا ہوں، آپ وہ کومیڈی لکھوانا شروع کر دیجیے۔''

آغا صاحب کی ایک آنکھ بھینگی تھی۔ آپ نے اسے گھما کر کچھ عجیب انداز سے پنڈت جی کی طرف دیکھا؛ ''ابے چُپ کر۔ آغا حشر کی طبیعت ہر وقت موزوں ہوتی ہے۔''

پنڈت جی خاموش ہو گئے اور اپنی گڑ گڑی گڑگڑانے لگے۔ دفعتاً مجھے محسوس ہوا کہ میرا سر چکرا رہا ہے۔ تیز خوشبو کے بھبکے آ رہے تھے۔ میں نے دیکھا، آغا صاحب کے دونوں کانوں میں عطر کے پھُوئے پھنسے ہوئے تھے۔ اور غالباً سر بھی عطر ہی سے چپڑا ہوا تھا۔ میں کچھ تو اس تیز خوشبو اور آغا صاحب کے لاچے اور آزار بند کے شوخ رنگوں میں قریب قریب غرق ہو چکا تھا۔

بازار میں دفعتاً شور وغل برپا ہوا۔ ایک صاحب نے اٹھ کر

باہر جھانکا اور آغا صاحب سے کہا: ''آغا صاحب، تشریف لائیے۔ مہندی کا جلوس آرہا ہے۔''

آغا صاحب نے کہا ''بکواس ہے'' اور حادثۂ کربلا پر نہایت ہی محققانہ لیکچر دینا شروع کر دیا۔ ایسے ایسے نکتے نکالے کہ سب دنگ رہ گئے۔ آخر میں بڑے ڈرامائی انداز میں کہا: ''دجلے کا منہ بند تھا۔ فرات خشک پڑی تھی۔ پینے کو پانی کی ایک بوند نہیں تھی۔ مہندی گوندی کس سے گئی۔ آغا حشر......اس سے آگے کہتے کہتے رک گئے۔ ایک صاحب جو غالباً شیعہ تھے، محفل سے اُٹھ کر چلے گئے۔ آغا صاحب نے موضوع بدل دیا۔

پنڈت محسن کو موقع ملا، چنانچہ اُنھوں نے پھر درخواست کی: ''آغا صاحب دو ریل کی کامیڈی آپ کو لکھنی ہوگی۔''

آغا صاحب نے یہ موٹی گالی دی ''کامیڈی کی...... یہاں ٹریجڈی کی باتیں ہو رہی تھیں اور تم اپنی کامیڈی لے آئے ہو۔'' یہ کہہ کر آغا صاحب نے حادثۂ کربلا کے بارے میں پھر عالمانہ انداز میں بحث شروع کر دی، کیونکہ وہ جی بھر کے اس موضوع پر اپنی معلومات اور خیالات کا اظہار نہیں کر سکے تھے۔ مگر فوراً جانے کیا جی میں آئی کہ ایک دم اپنے نوکر کو گالیاں دینا شروع کر دیں کہ وہ ابھی تک آیا کیوں نہیں۔ چنانچہ وہ سلسلہ منقطع ہوگیا۔''

(آغا حشر سے دو ملاقاتیں مشمولہ گنجے فرشتے)

آغا صاحب کے ڈراموں کے شعری مکالمے اکثر ضرب الامثال کی صورت اختیار کر جاتے تھے۔ جیسے ''اسیرِ ہوس'' کا یہ مکالمہ:

''صفدر: جی ہاں! وہی قسمت کا بیٹا جو موت کی گود میں لیٹا

پھول تو دو دن بہارِ جاں فزا دِکھلا گئے

حسرت اُن غنچوں پہ ہے جوبِن کھلے مرجھا گئے

آغا صاحب ڈرامے کی باریکیوں کو بخوبی سمجھتے تھے۔ اُس وقت کے مروجہ تھیٹر میں فنِ موسیقی کی اہمیت کو جانتے ہوئے اُنھوں نے اِس سے واقفیت کے لیے خاصی محنت کی۔ ڈرامے کے مختلف مناظر میں گائے گئے گانے اور مکالمے کچھ یوں ترتیب دیے جاتے کہ موسیقار اُن کی ترتیب کردہ بندش اورتحریر پر حیران رہ جاتے تھے۔ ذیل میں آپ کے ایک ڈرامے ''ٹھنڈی آگ'' میں سے ایک اقتباس پیشِ خدمت ہے:

گانا

سہیلی ۱:

میکشی سے خاک اب توبہ کریں
ایک دو دم زندگانی اور ہے
توبہ بھی کر لیں گے ناصح پی تو لیں
کوئی دن کی یہ جوانی اور ہے

سہیلی ۲:

فائدہ کیا تسبیح و زنّار سے
دین کی زاہد نشانی اور ہے
کیا ہوا گر حشر تک زندہ رہے
خضر ! عمرِ جاودانی اور ہے

(کورس گانا)

رنگ رلیاں مناویں آج، دُھرپد سناویں آج
بھر بھر جام پلاویں، نئی راگنی گاویں آج
ناز و انداز سے شان و غمّاز سے
دُھن سے گن سے گاویں آج
شاہ کے سر پہ تاج و کلاہ، آسماں پہ نُور کھلا
روشن ہے تاروں میں چاند ستاروں میں، فرمان ہزاروں میں

رنگ رلیاں مناویں آج......

آغا حشر تمام عمر ڈرامے کو بہتر سے بہتر اَور مؤثر انداز میں پیش کرنے کی کوشش میں رہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ہندوستان میں بڑھتے ہوئے فلمی رُجحان کے باعث ہندوستان کی فلمی دنیا سے بھی وابستہ رہے۔ اسی عرصے میں آپ نے دیوداس جیسی کامیاب فلم کی کہانی بھی تحریر کی جس میں کے ایل سہگل ایسے عظیم گویے نے دیوداس کا کردار ادا کیا۔ آخری ایام میں آپ نے لاہور میں ''حشر پکچرز'' کے نام سے اپنی ایک کمپنی بھی قائم کی تھی، اور ایک فلم کی شوٹنگ میں دن رات کام کیا، جس میں کئی مناظر لاہور کی تاریخی عمارات پر فلمائے گئے۔ فلم میں مرکزی کردار مختار بیگم ادا کر رہی تھیں۔ لیکن یہ فلم کبھی پردۂ سکرین پر نمودار نہ ہو سکی کیونکہ اس کے مکمل ہونے سے قبل آغا حشر 23 اپریل 1935ء کو اِس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔ اُن کے انتقال کے بارے میں عشرت رحمانی نے تحریر کیا:

> ''فلم کی شوٹنگ لاہور کے شاہی قلعے میں بھی ہوتی تھی اور آغا صاحب بہت سرگرمی اور تیزی سے کام کر رہے تھے کیونکہ وہ اسے جلد سے جلد مکمل کرنا چاہتے تھے۔ مگر یہ فلم کبھی مکمل نہ ہو سکی کیونکہ شب و روز کی مصروفیت کے سبب اضمحلالِ طبع میں رفتہ رفتہ شِدّت ہوتی گئی۔ حکیم شفاء الملک کا کچھ دنوں علاج رہا۔ پھر حکیم صاحب کے مشورے سے کئی ڈاکٹروں کا بھی علاج ہوا مگر بمصداق ''مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔'' بالآخر ۲۸۔ اپریل ۱۹۳۵ء کو اچانک حرکتِ قلب بند ہو گئی اور وہ اپنے آقا خالقِ حقیقی سے جا ملے۔''

(آغا حشر کے ڈرامے، جلد اول)

آغا حشر کی وفات کے بعد اُن کے فن اور سوانح کے بارے میں بہت کچھ تحریر کیا گیا۔ دُنیا کی کئی بڑی یونیورسٹیوں نے آپ پر لکھے گئے مقالوں پر اعلیٰ ترین ڈگریاں جاری کیں۔ اُن کی قبر پر لگا کتبہ حوادث کی نذر ہوا جس کی جگہ نیا کتبہ نصب کر دیا گیا۔ اُن کی قبر کے کتبے کے بارے میں پروفیسر اسلم نے اپنی کتاب ''خفتگانِ خاکِ لاہور'' (ص۔۱۰) پر تحریر کیا:

میرے زمانۂ طالب علمی میں اس پر جو کتبہ نصب تھا، اس پر ''مزارِ اقدس فخرِ ملک وقوم آغا حشر''

کندہ تھا۔ وہ کتبہ غالباً ٹوٹ گیا یا چوری ہوگیا تو اُن کے عقیدت مندوں نے اس کی جگہ نیا کتبہ لگا دیا ہے۔جس کی عبارت یوں ہے:

مزارِ پُرانوار آغا سیّد محمد شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ
المعروف (بہ) انڈین شیکسپیئر حضرت آغا حشر کاشمیری
اظہارِ عقیدت مبنی برحقیقت

ایک اِک تمثیل تیری وقت کا تھی شاہکار
پھر گئی تیری دُہائی مچ گئی تیری پکار
تیری تصنیفات کے اوصاف اتنے بیشمار
لکھنے بیٹھوں تو یہ صبح حشر بھی ہو آشکار
پھر بھی نظم و ضبط سے باہر ہو جولانی تِری
بند سے باندھی گئی کب حشر طغیانی تِری

۲۸ ماہ اپریل ۱۹۳۵ء
مہاراج خاک پائے حشر ادیب العصر منشی دل لکھنوی عقیدت
کیشان و خادمین حسین کتھک، اصغر نظامی، عاشق جٹ

صوفی غلام مصطفیٰ تبسم

1899ء–1978ء

میں ہر دُشواری انجام کو آساں سمجھتا ہوں
یہ آسانی مِری یا رب کہیں مشکل نہ بن جائے
تبسم

گزشتہ نِصف صدی اور شاید اس سے بھی زائد عرصہ قبل برصغیر پاک و ہند میں وہ تمام گھر جہاں اُردو اور ہندی بولی اور سمجھی جاتی تھی، بہت کم ایسے بچے ہوں گے جنھوں نے درج ذیل نظم نہ سنی ہو:

ایک دو تین چار
آؤ مل کر بیٹھیں یار
پانچ چھ سات
سنو ہماری بات
آٹھ نو دس
بات ہماری بس

روایتی لوریوں کے ساتھ ساتھ درج ذیل نظمیں بچیوں کے لیے ایک لوری ہی کا کام کرتی رہیں:

ثُریا کی گڑیا نہانے لگی
نہانے لگی ڈوب جانے لگی
بڑی مشکلوں سے بچایا اُسے
کنارے پہ میں کھینچ لایا اُسے

عذرا کی گڑیا، سوئی ہوئی ہے
گھنٹی بجاؤ، اُس کو جگاؤ
توبہ ہے میری، میں نہ جگاؤں
وہ رو پڑے گی مجھ سے لڑے گی

اِسی طرح ایک اور زندہ و جاوید کردار ٹوٹ بٹوٹ کے نام سے جانا جاتا تھا۔

ایک تھا لڑکا ٹوٹ بٹوٹ

اِن بے شمار کرداروں اور نظموں کے خالق کا نام صوفی غلام مصطفیٰ تبسم تھا۔صوفی صاحب 4 اگست 1899ء کو چٹہ کٹڑہ امرتسر (پنجاب۔مشترکہ ہندوستان) میں پیدا ہوئے۔بعض مؤرخین نے اُن کی تاریخ پیدائش 16 اگست 1899ء اور بعض نے یکم اکتوبر 1898ء بھی تحریر کی ہے۔لیکن ڈاکٹر نثار احمد قریشی نے اپنے تحقیقی مقالہ میں چار اگست 1899ء ہی کو درست قرار دیا ہے۔اسی مقالے کی بنیاد پر اُنھیں پی ایچ ڈی کی ڈگری سے نوازا گیا۔

صوفی صاحب کے آباؤ اجداد کشمیری تھے اور اُن کا خاندانی پیشہ شال اور پشمینہ بافی تھا۔کشمیر میں ایک بار شدید قحط پڑا تو اُس وقت کی رہائشی آبادی کی ایک بڑی تعداد نے وہاں سے ہجرت کی۔صوفی صاحب کے خاندان کے بھی کئی گھرانوں نے کشمیر چھوڑ کر پنجاب کے مختلف شہروں میں سکونت اختیار کی۔صوفی صاحب کے دادا شیخ امداد صوفی بھی اپنے خاندان سمیت امرتسر میں آن بسے۔صوفی صاحب کے گھرانے کے ساتھ لفظ ''صوفی'' کی اضافت کے بارے میں بھی مختلف آرا موجود ہیں۔بعض مؤرخین اور علماء کے مطابق وہ مسلمان جو ریاضت اور عبادت میں مشغول رہتے تھے اُنھیں صوفی کہا گیا۔بعض علماء نے لفظ صوفی ایک عربی لفظ ''صوف'' سے مُستعار ہے، جس کے معنی پشمینہ، اُون اور نمدہ کے ہیں، لٰہذا وہ لوگ جنھوں نے پشمینے کا کام اور کسب بطور روزگار اختیار کیا، وہ بھی صوفی کہلائے۔اس کے علاوہ کشمیری لوگ اُن افراد کو بھی صوفی کہہ کر پکارتے تھے جو نانبائیوں کا کام کرتے تھے۔یوں درجِ بالا تینوں اوصاف صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کے خاندان میں دِکھائی دیتے ہیں کیونکہ اُن کے دادا شال بافی کا کام کرتے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ اُن کی نانبائیوں کی دُکان بھی تھی۔اُن کے دادا اور والد کا شمار اپنے دور کی انتہائی پرہیز گار اور عبادت گزار شخصیات میں ہوتا تھا۔اس کے ساتھ ساتھ وہ دونوں علم دوست شخصیات تھیں۔صوفی صاحب کے بچپن کا زیادہ تر حصہ اپنے دادا کی رفاقت میں گزرا جس کی وجہ سے علم دوستی اور قلچہ لگانے میں مہارت کے اوصاف اُن میں بدرجۂ اتم موجود تھے۔صوفی صاحب کی ابتدائی تعلیم سے کالج تک کی تعلیم کے بارے میں ایک اقتباس درجِ ذیل ہے:

''بچپن میں صوفی تبسم کو اُن کے دادا نے ایک مسجد میں بٹھایا جس کے امام اُن کے شاگرد تھے۔ کچھ عرصہ مسجد میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد جب آپ کے دادا اور دادی انتقال کر گئے تو آپ نے اپنے گھر کے سامنے ایک مطب میں حکیم مفتی غلام رسول کے ہاں جانا شروع کیا۔ اُن سے آپ نے اُردو کا قاعدہ اور پہلی کتاب پڑھی۔ مفتی صاحب اُن کے دادا کے دوست تھے؛ وہ ایک بلند مرتبہ طبیب اور جیّد عالم تھے۔ ابتدائی حساب اور لکھائی کا کام اُنھیں اُن کی والدہ نے سکھایا۔ جب آپ سکول جانے کے قابل ہوئے تو اُن کے والد نے اُنھیں شہر کے ایک مدرسے چرچ مشن ہائی سکول کی ایک پرائمری برانچ میں داخل کرا دیا۔ یہ مدرسہ اُس وقت صوبے کی بہترین درسگاہ سمجھا جاتا تھا۔ اس مدرسے کی بابت صوفی تبسم لکھتے ہیں:

''انگلستان کی کلیسائی تبلیغی جماعت نے اس شہر میں اپنا پہلا مدرسہ قائم کیا۔ چرچ مشن ہائی سکول وہی مدرسہ تھا جو الحاق پنجاب کے تین سال بعد انگریزی عملداری میں جاری ہوا۔ عیسائیت کے خلاف عام تعصب کے باوجود ایک کامیاب تعلیمی درس گاہ تھا۔''

صوفی صاحب کے زمانۂ طالب علمی میں پرائمری درجے میں تین جماعتیں ہوا کرتی تھیں۔ یہ تین جماعتیں تین ہی سالوں میں پاس کرنے کے بعد آپ سکول کے ہائی حصے میں آ گئے۔ پرائمری کے درجے میں سکول کے اساتذہ کی شفقت نے اُن کے دل میں سکول کے لیے ایسی محبت اور کشش پیدا کر دی کہ بعض اوقات انتہائی خراب موسم کے باوجود آپ سکول جانے کے لیے بضد ہوتے اور زار زار رونا شروع کر دیتے۔

پرائمری کی تین جماعتیں پاس کرنے کے بعد آپ چوتھی جماعت میں داخل ہو گئے اور نظام رائج الوقت کے مطابق اسی جماعت

سے اُن کی فارسی اور انگریزی کی تعلیم شروع ہوئی۔ مارچ 1911ء میں صوفی صاحب نے وظیفے کے امتحان میں ضلع بھر میں اوّل پوزیشن حاصل کی۔

ہائی سکول کے اساتذہ میں فارسی، انگریزی اور ڈرائنگ کے اُستادوں نے صوفی صاحب کو بطور خاص متاثر کیا اور اُن مضامین کا ذوق اُن کی طبیعت میں پیدا کیا۔ ان اساتذہ کا طرزِ تدریس کیسا تھا اور اپنے اپنے مضمون پر کس قدر قدرت رکھتے تھے، اِس کا ذکر کرتے ہوئے صوفی تبسم لکھتے ہیں:

''ہائی سکول میں آتے ہی ایک ایسے بالغ نظر اُستاد سے ملاقات ہوئی جن کی یاد نصف صدی گزرنے پر بھی ویسی ہی تازہ ہے۔ یہ اُستاد، اللہ اُنھیں غریقِ رحمت کرے، ماسٹر شبدت سنگھ تھے، تھے وہ ریاضی کے ماسٹر لیکن فارسی بھی پڑھاتے تھے۔ فارسی کے چند ابتدائی اسباق پڑھنے کے بعد گلستان، بوستان کا درس شروع ہوا اور رفتہ رفتہ شاہنامہ، سکندر نامہ، مثنوی مولانا روم اور حافظ تک نوبت آئی۔ مجھے ابھی تک یاد ہے کہ وہ تنگ پاجامہ، سفید اچکن اور ہاشم پگڑی باندھ کر لوہے کی کرسی پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاتے اور سبق پڑھاتے۔ اُن کے ہاتھ میں کوئی کتاب نہیں ہوتی تھی۔ اُنھیں سب کچھ ازبر ہوتا تھا۔ میں ساتویں کلاس میں تھا کہ سکول میں دو اور ماسٹر آئے۔ ایک ڈرائنگ ماسٹر، ماسٹر اللہ بخش اور دوسرے انگریزی کے مُعلّم قاضی حفیظ اللہ۔ ماسٹر اللہ بخش ماسٹر ہی نہیں آرٹسٹ بھی تھے اور قاضی صاحب شاعر اور ادیب۔ اُن کے ادبی ذوق کا یہ عالم تھا کہ صبح سویرے کلاس میں آتے تو زمیندار اخبار کا پرچہ ساتھ لاتے۔ زمیندار کے پہلے صفحے پر بالعموم نظم ہوتی تھی، وہ پڑھ کر سناتے اور مجھ سے پوچھتے (اس لیے کہ مجھے شعر سے شغف تھا) کہ کیسی ہے نظم؟ میں نے ظفر علی خان، اکبر الہ آبادی،

حسرت موہانی اور اقبالؒ کے نام سب سے پہلے اُنھیں سے سنے۔‘‘

ان اساتذہ کی محنت و شفقت کو آپ تمام عمر نہیں بھولے۔ اس لیے کہ اُنھیں کے طفیل صوفی صاحب نے علم و ادب کے ذوق سے آ گاہی حاصل کی اور آئندہ زندگی کی بنیاد اسی پر رکھی۔ اساتذہ کی محنتِ شاقہ ہی کا نتیجہ تھا کہ صوفی صاحب نے 1917ء میں میٹرک کا امتحان بھی فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔

صوفی تبسم کا تعلق مندرجہ ذیل چار کالجوں سے رہا:

1۔ خالصہ کالج امرتسر 1917۔1920ء

2۔ ایف۔سی کالج لاہور 1921۔1922ء

3۔ اسلامیہ کالج لاہور 1923۔1924ء

4۔ سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور 1925۔1926ء

میٹرک کا امتحان اعزاز کے ساتھ پاس کرنے کے بعد صوفی صاحب کا ارادہ تھا کہ آئندہ تعلیم علی گڑھ یونیورسٹی میں حاصل کریں مگر آپ کم عمر تھے، اس لیے اُن کے والد صاحب کے دوستوں نے مشورہ دیا کہ اُن کے لیے شہر کے کالج (خالصہ کالج امرتسر) میں داخلہ لینا بہتر ہے۔ چنانچہ صوفی صاحب اس کالج میں داخل ہو گئے۔ یہ کالج شہر سے تین چار میل کے فاصلے پر تھا۔ یہاں جن اساتذہ نے صوفی صاحب کو زیادہ متاثر کیا، اُن میں پروفیسر ارجن ناتھ نوشہ (اُستادِ سنسکرت) اور پروفیسر مولوی مرتضیٰ حسین ٹونکی (استادِ فارسی) قابلِ ذکر ہیں۔ اُن اساتذہ کی تحریک و تشویق کے نتیجے میں صوفی تبسم نے کالج کی بزمِ سخن میں غزلیں پڑھیں اور کالج میگزین میں تنقیدی مضامین بھی لکھے۔ خالصہ کالج امرتسر ہی کے زمانے میں صوفی صاحب کا تعارف ایڈیٹر کشمیری میگزین مولوی محمد دین فوق سے ہوا اور صوفی صاحب نے فوق صاحب کی خواہش پر اس میگزین میں ایک سلسلۂ مضامین بعنوان ’’اہلِ

کشمیر کی علمی کاوشیں اور کارنامے'' تحریر کرنا شروع کیا، مگر کچھ عرصے کے بعد مصروفیت کی وجہ سے یہ سلسلہ منقطع ہوگیا۔ 1919ء میں اُنھوں نے اسی کالج سے آرٹس میں ایف اے کا امتحان سیکنڈ ڈویژن میں پاس کیا اور بی اے میں داخلہ لے لیا۔ پھر کالج سے فارغ ہونے کے بعد اُنھوں نے امرتسر میں عربی کے سکالر مولانا محمد عالم آسی سے عربی صرف ونحو اور مولانا محمد حسین ہزاروی سے حدیث پڑھی۔ امرتسر کے معروف سیاسی لیڈر جناب سیف الدین کچلو سے اُنھوں نے فرانسیسی زبان سیکھی۔

کالج میں نصابی کتب کے علاوہ صوفی صاحب نے ''شعرالعجم'' اور'' دیوانِ غالب'' کا بھی مطالعہ کیا، جس سے اُن کے ذوقِ شعر کو پختگی اور معیارِ شعر کو بلندی حاصل ہوئی۔ پھر اسی ذوق کو آپ نے شاگردوں تک پہنچایا۔سکول کے زمانے سے صوفی صاحب نے شعرگوئی کا سلسلہ شروع کر دیا تھا، چنانچہ کالج میں پہنچ کر آپ نے معروف شاعر اور عالم علامہ فیروز الدین طغرائی سے باقاعدہ تلمذ اختیار کیا۔ امرتسر کے مشہور عالم اور شاعر علامہ محمد حسین عرشی جو صوفی صاحب کے پڑوس میں آ کر آباد ہوئے تھے، آپ کے دوست بن گئے۔ ان بزرگوں کی صحبت نے صوفی صاحب کے شعری ذوق کو جِلا بخشی۔ اسی زمانے میں فارسی گوئی نے اُردو گوئی کے مقابلے میں شدت اختیار کی اور اُن کی طبع شعرگوئی کی جانب اس قدر مائل ہوگئی کہ آپ نصابی کتب کی طرف بھرپور توجہ نہ دے سکے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ بی اے کے امتحان میں فیل ہوگئے۔

صوفی صاحب نے لاہور آ کر ایف سی کالج میں داخلہ لیا۔ اس کالج میں آپ کے ہم جماعت ساتھیوں میں تاثیر، بشیر ہاشمی، کرنل مجید ملک اور پنڈت دینا ناتھ رتشی کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

ایف سی کالج میں صوفی صاحب کے ٹیوٹر پروفیسر مہر چند سوری نے کالج میں ادبی محافل قائم کر رکھی تھیں اور علم و ادب سے شغف رکھنے والے طلبہ کی بہت حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ صوفی صاحب نے بھی ان مجالس میں اپنی ادبی نگارشات پیش کیں، جن میں سے کچھ کالج میگزین میں بھی شائع ہوئیں۔

صوفی تبسم ایک ادبی مجلس کا احوال تحریر کرتے ہیں کہ:

''اس کالج میں پروفیسر مہر چند سوری میرے اور تاثیر کے ٹیوٹر تھے۔ وہ ریاضی کے اُستاد تھے لیکن طبیعت شعر و ادب میں رچی ہوئی تھی۔ کالج میں ادبی محفلیں مناتے تھے۔ مجھے کالج میں آئے ابھی ہفتہ گزرا تھا کہ تاثیر نے اکبرالہ آبادی پر تنقیدی مقالہ پڑھا۔ میں نے جسارت کر کے آئندہ ہفتے کے لیے غالب کی شاعری کا عنوان پیش کیا۔ مقالہ پینتالیس صفحات پر مشتمل تھا۔ پروفیسر سوری نے ہاتھ چُومے اور کالج میگزین کے لیے مقالہ چھین لیا۔ دوسرے دن پرنسپل لوکس نے شاباش بھی دیں اور ڈانٹ بھی پلائی اور کہا کہ آئندہ ایسا مقالہ لکھنا ہو تو ہمیں پہلے سے نوٹس دیا کرو تاکہ ہم مزید رقم کا انتظام کر لیا کریں۔''

بی اے میں صوفی صاحب کے مضامین فلسفہ اور فارسی تھے اور آپ نے فارسی (آنرز) کا مضمون بھی لے رکھا تھا۔ 1923ء میں فارسی آنرز کے ساتھ آپ نے بی اے کا امتحان پاس کیا اور صوبے بھر میں دوسری پوزیشن حاصل کی۔

اسلامیہ کالج لاہور

صوفی تبسم کے والد چونکہ کاروباری آدمی تھے، اس لیے بی اے کرنے کے بعد اُنھوں نے اپنے بیٹے کو بھی کاروبار کی طرف راغب کرنا چاہا اور صوفی صاحب کو درآمدات و برآمدات کا ایک دفتر کھول دیا۔ صوفی صاحب نے یہ کام چند ماہ تک جاری رکھا۔ ایک دفعہ

کاروباری سلسلے میں لاہور آئے، دوستوں کو کالج جاتے دیکھا تو خود بھی اسلامیہ کالج لاہور میں ایم اے فارسی میں داخلہ لے لیا۔ دِیگر اساتذہ کے علاوہ یہاں ڈاکٹر شیخ محمد اقبالؒ اور پروفیسر قاضی فضل حق سے بھی آپ نے پڑھا۔ اسلامیہ کالج لاہور سے آپ نے ایک ہی سال میں ایم اے فارسی کا امتحان پاس کر لیا۔صوفی تبسم کے ٹیوٹر پروفیسر مہر چند سوری ڈاکٹر محمد اقبالؒ اور پروفیسر قاضی فضل حق نے مختلف سر ٹیفکیٹ میں صوفی صاحب کی طالب علمانہ صلاحیتوں کا اعتراف کیا۔

ایم اے کرنے کے بعد صوفی صاحب نے چند مہینے گورنمنٹ آف انڈیا آرمی ہیڈ کوارٹرز میڈیکل ڈائریکٹوریٹ میں ملازمت کی مگر چونکہ طبیعت مُعلّمی کی طرف راغب تھی،اس لیے مذکورہ ملازمت ترک کر کے آپ نے سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور میں بی ٹی کلاس میں داخلہ لیا اور 1926ء میں بی ٹی کا امتحان پاس کر کے تعلیم کا سلسلہ مکمل کیا۔''

(مقالہ از ڈاکٹر نثار احمد قریشی مشمولہ ''سپوتنک'' اپریل 2003ء)

عائلی زندگی کے حوالے سے صوفی صاحب کے تعلقات اپنی اہلیہ کے ساتھ انتہائی خوشگوار رہے۔ یہ بات عام مشاہدے میں رہی ہے کہ شاعروں ادیبوں کے تعلقات اپنی اہلیہ کے ساتھ کچھ خاص اچھے نہیں رہتے صوفی صاحب کے خاندان میں دو شادیوں کا رواج بھی عام تھا۔ اُن کے دادا اور والد کی دو دو شادیاں ہوئی تھیں لیکن صوفی صاحب نے کبھی دوسری شادی کا نہ سوچا۔ اِس کی ایک وجہ اُن کی اہلیہ کی اُن سے بے پناہ محبت تھی۔کہا جاتا ہے کہ اُن کی اہلیہ اپنی سینتیس برس کی شادی شدہ زندگی میں کبھی اپنے میکے نہ گئی تھیں۔

1928ء میں صوفی صاحب امرتسر کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ کر مستقل طور پر لاہور آن بسے۔ اُنھوں نے چار برس تک ٹریننگ کالج میں پڑھایا اور اُس کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور سے منسلک ہو گئے، جہاں وہ اپنی ریٹائرمنٹ کے آخری دن تک پڑھاتے رہے۔ صوفی صاحب کے شاگردوں کی ایک طویل فہرست موجود ہے جنھوں نے گورنمنٹ کالج لاہور کا نام زمانے بھر میں روشن کیا۔ ان میں ڈاکٹر وحید قریشی، جگن ناتھ آزاد، اشفاق احمد،

بانو قدسیہ، مرزا منور، ن م راشد اور جسٹس نسیم حسن شاہ جیسے طلبا کی ایک لمبی گنتی موجود ہے۔
اُستاد اور شاگرد کے رشتے کو اُن کے ایک شاگرد محمود نظامی نے ایک مضمون میں تحریر کیا:

''تبسم پروفیسر صوفی غلام مصطفی کا نام اور تخلص ہی نہیں حلیہ بھی ہے، فطرت بھی ہے اور عادت بھی۔ لیکن اگر پروفیسر تبسم صوفی بھی کہلاتے ہیں تو یہ تصوف پر ایک ذی رُوح طنز ہے کیونکہ جو لوگ صوفی غلام مصطفی تبسم کو پوری طرح نہیں جانتے۔ اُنھیں اس پوشیدہ ولی پر بعض اوقات کھلے کافر کا بھی گمان ہوسکتا ہے۔

میرے اُن شفیق اُستادوں میں، جنھوں نے پچھلے تیس برس کے عرصے میں مجھے سکھانے پڑھانے کی ایک مسلسل کوشش کو جاری رکھا ہے، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم ایک ایسے بزرگ ہیں جن کی شخصیت کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ جو کچھ نظر آ رہے ہیں وہ دراصل ہیں یا نہیں اور وہ جو کچھ دراصل ہیں وہ نظر بھی آتے ہیں یا نہیں۔ میں نے جب اُنھیں پہلے پہل دیکھا تھا تو میں خود کئی قسم کے اوہام میں گرفتار ہوگیا تھا۔ یہ انیس سو اٹھائیس کی بات ہے، میں اسلامیہ کالج لاہور میں فرسٹ ایئر میں پڑھتا تھا۔ ایک شام میں اور میرے چند ہم جماعت اپنے اُستاد ڈاکٹر تاثیر کے ہاں بارُود خانہ روڈ والی حویلی میں بیٹھے کسی درسی مسئلے پر ان کے خیالات سن رہے تھے کہ اچانک ایک چھوٹے قد کے دُبلے پتلے بزرگوار جو اپنے حلیے کے اعتبار سے لاہور کے پبلشروں کے نمائندے معلوم ہوتے تھے، کمرے میں وارد ہوئے۔ اُن کے آتے ہی تاثیر کا چہرہ یوں کھل گیا گویا اُنھیں کوئی نعمت ہاتھ آ گئی ہے اور وہ ''آ بھئی صوف'' کا فقرہ ادا کرتے ہی درس وتدریس کے مسئلے کو بھول کر نو وارد پر اپنی فقرہ بازیوں، پھبتیوں اور طرح طرح کے مزاحیہ کلمات کے ساتھ پل پڑے۔ ان میں سے اکثر فقروں میں بڑے خوفناک قسم کے ذم کا پہلو نکلتا تھا، جس سے صوفی صاحب کی صفات

کے بارے میں کوئی شریفانہ یا معقول رائے قائم کرنا قدرے مشکل تھا۔ لیکن مجھے یاد ہے صوفی صاحب نہایت متانت اور سکونِ قلب سے تاثیر کے اُن فقروں کا چپ چاپ لطف لیتے رہے۔ کبھی کبھی وہ کن انکھیوں سے تاثیر کے شاگردوں کو ایک نظر دیکھ لیتے، غالباً اس خیال سے کہ ان برخورداروں کی موجودگی میں اب کوئی جواب میں کیا کہے لیکن جب تاثیر کی ''خوش کلامی'' بہت ہی طوالت اختیار کر گئی تو صوفی صاحب نے میز پر رکھی ہوئی پلیٹ میں سے پان اٹھایا اور اسے چباتے ہوئے ایک ہی مرتبہ جو تاثیر پر ایک فقرہ چست کیا تو طلبہ کی ساری مجلس اپنے اُستاد کے ادب کے باوجود ہنستے ہنستے بے حال ہو گئی۔

اسی مجلس میں مجھ پر پہلی مرتبہ تبسم کی طبیعت کے کئی ایسے جوہر کھلے جو آج بھی اُن کی شخصیت اور کردار کی نمایاں ترجمانی کرتے ہیں۔ اُن کی طبیعت کا سکون اور ٹھہراؤ، اُن کی بذلہ سنجی، اُن کا خلوص اور اُن کی شفقت، برخورداروں کا لحاظ، ہمعصروں کا احترام یہ سب باتیں جو میں نے ان میں روزِ اوّل دیکھی تھیں، آج تیس برس گزر جانے پر بھی میں اُنھیں جوں کا توں دیکھتا ہوں۔ اس پہلی ملاقات میں جس خاص بات نے مجھے حد درجہ متاثر کیا وہ یہ تھی کہ اپنی تمام قابلیت کے باوجود تبسم نے کسی پر اپنے تبحرِ علمی کا رُعب ڈالنے کی کوشش نہیں کی۔ آج بھی اُن کی یہی حالت ہے کہ ادیبوں کی معلمی کے بعد جب بھی مجھ ایسے کسی نااہل شاگرد سے ملتے ہیں تو اُن کی سعی یہ ہوتی ہے کہ نہ صرف اسے اس کی ذاتی قابلیت کا احساس نہ ہونے دیا جائے بلکہ اس پر اپنی قابلیت اور علم کا رُعب بھی کسی طور پر نہ گانٹھا جائے۔

لیکن اس پہلی ملاقات میں مجھے صوفی صاحب کی ادبی شخصیت کا کوئی زیادہ علم نہ ہو سکا تھا، کیونکہ یہ مجلس زیادہ تر پُرمذاق فقروں اور پھبتیوں تک ہی محدود رہی؛ البتہ اتنا ضرور پتا چلا کہ صوفی

صاحب ٹریننگ کالج سے تبادلے پر گورنمنٹ کالج میں گئے ہیں اور پھر آہستہ آہستہ صوفی صاحب کی ادبی عظمت کا حال ہم معتقدین پر کھلنے لگا۔ چند ہفتے بعد ایک دن تاثیر نے کہا، آج صوفی کے ہاں ہلہ بولنے کا دن ہے۔ شب دیگ اور مچھلی کی ضیافت ہے۔ کون کون آئے گا میرے ساتھ۔ صلائے عام دیکھ کر ہم میں سے کئی لوگ ہتھے مارنے کے لیے آمادہ ہو گئے اور فوراً ایک مختصر سا قافلہ بارُود خانہ روڈ سے تانگوں میں سوار ہو کر حضرت داتا گنج بخشؒ کے عقب میں ذیلدار روڈ کی ایک گلی کے دہانے پر جا پہنچا۔

کھانے کے بعد نمکین چائے کا دور چل رہا تھا کہ حضرت ابوالاثر حفیظ جالندھری اپنی ایک غزل کا ایک مصرع گنگنانے لگے اور پھر احباب کی فرمائش یا اِصرار کا انتظار کیے بغیر اُنھوں نے ازخود غزل سنانا شروع کر دی۔ جملہ حاضرین ہمہ تن گوش ہو گئے اور اُن کے کلام کا لطف لینے کے لیے آگے کو اُن کی طرف سِرک گئے لیکن اس دوران میں یہ بات ہم طلبہ کے لیے اچنبھے کا موجب بنی رہی کہ اپنا کلام سنانے کے دوران میں حفیظ کا روئے سخن بیشتر صوفی تبسم ہی کی طرف رہا اور وہ اُنھیں کو مخاطب کر کے شعر پڑھتے رہے اور پھر خود تبسم کی باری آ گئی اُنھوں نے اپنا کلام سنایا جس پر تاثیر اور حفیظ نے خوب دل کھول کر داد دی۔ لیکن اُنھوں نے جو کچھ بھی سنایا، وہ صرف فارسی میں تھا اور پھر عرصے تک ہم نے صوفی صاحب کا جو بھی کلام سنا یا پڑھا، فارسی ہی میں تھا۔ یہ بات کئی برس بعد معلوم ہوئی کہ صوفی صاحب کی طبیعت فارسی سے اُکتا کر اب اِدھر اُدھر ہر طرف میدان مار رہی ہے۔ چنانچہ اگر آج آپ صوفی صاحب کے بارے میں یہ بات وثوق سے کہہ دیں کہ وہ ایک ہمہ گیر شاعر ہیں تو وہ صاف مکر جائیں گے کہ میں ہمہ گیر تو ضرور ہوں مگر سپورٹس مین۔ آپ بحیثیت ایک پنجابی شاعر کے

اُن کے فن کو سراہنا شروع کریں تو وہ اپنا فارسی کلام سنا کر آپ کو سوالیہ نشان بنا دیں گے۔ آپ اب اُن کی فارسی شاعری پر روشنی ڈالنے لگیں تو وہ اُردو کی غزل سنا کر آپ کو ایک مرتبہ پھر چکرا دیں گے۔ آپ گھبرا کر جب یہ فیصلہ کر لیں کہ وہ اُردُو، پنجابی اور فارسی تینوں زبانوں کے نہایت بالغ نظر شاعر ہیں تو وہ اپنے کلام کا خود مجموعہ لے کر اپنا تخلص اپنے چہرے پر برساتے نظر آئیں گے۔''

(نقوش، شخصیات نمبر)

1955ء میں صوفی صاحب خانۂ فرہنگ ایران کے ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔ اُنھیں اعزاز بھی حاصل رہا کہ وہ اس وقت واحد ڈائریکٹر تھے جو ایرانی نہیں تھے۔ 1956ء میں لیل ونہار کے مدیر بن گئے۔ صوفی صاحب نے تمام عمر بھرپور کام کرتے گزاری۔ وہ قیامِ پاکستان سے قبل اور بعد از قیام، دونوں ادوار میں انتہائی محنت کش انسان کے روپ میں دکھائی دیے۔ ویسے تو چشمِ فلک نے ایسا بھی دیکھا کہ تقسیم کے بعد کیسے کیسے، کیا سے کیا ہو گئے۔ صوفی صاحب کی کام سے لگن کے حوالے سے ایک اقتباس ڈاکٹر نثار احمد قریشی کے مقالے میں سے نقل کیا جاتا ہے جس میں واضح طور پر ان کا سماجی اور عملی رویہ دِکھائی دیتا ہے:

''مصروفیت کے اعتبار سے صوفی صاحب نے ایک بھرپور عملی زندگی بسر کی۔ تقریباً 79 (اناسی) سالہ زندگی میں آپ جن مختلف اداروں، انجمنوں اور سوسائٹیوں سے منسلک رہے، زمانی ترتیب سے اُن کی فہرست درجِ ذیل ہے:

نائب مُعتمد و رکن، انجمن کشمیریاں امرتسر	1920ء
ممبر، اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ لاہور	1928ء۔1935ء
اعزازی مدیر، ماہنامہ مخزن لاہور	1930ء
جنرل سیکرٹری، اُمت مُسلمہ ہند، امرتسر	1930ء
نائب صدر، بزمِ سخن گورنمنٹ کالج لاہور	1931ء
ممبر، استقبالیہ کمیٹی ادارۂ معارفِ اسلامیہ، لاہور	1933ء

صدر مجلسِ اُردو، گورنمنٹ کالج، لاہور	1933ء
مدیر اعزازی، رسالہ ابلاغ، امرتسر	1936ء
ایڈیٹر، ماہنامہ ''دوست'' گورنمنٹ کالج، لاہور	1940ء
رُکن، حلقۂ اربابِ ذوق، لاہور	1940ء
سیکرٹری، انجمن ترقی پسند مصنفین	س۔ن
سپرنٹنڈنٹ، کواڈرینگل ہاسٹل	
(اقبال ہاسٹل) گورنمنٹ کالج، لاہور	1947ء
سپرنٹنڈنٹ، نیو ہاسٹل گورنمنٹ کالج، لاہور	1947ء
سیکرٹری، پنجاب ریجنل کمیٹی، سروے آف ہسٹاریکل ریکارڈز	1948ء
ممبر، نصابِ تعلیم کمیٹی، حکومت پنجاب (اُردُو)	1948ء
ایضاً (عربی و فارسی)	1948ء
رُکن، مجلسِ ترجمہ لاہور (مجلس ترقی ادب کا سابقہ نام)	1950۔1953ء
رُکن، بزمِ اقبال، لاہور	1954۔1956ء
ڈائریکٹر و مُعلم، خانۂ فرہنگ ایران، لاہور	1956۔1961ء
نگران، ماہنامہ پنجابی ادب، لاہور	1960۔1971ء
ممبر، رائٹرز گلڈ برائے پنجابی	
سٹاف آرٹسٹ وسکرپٹ رائٹر، ریڈیو پاکستان، لاہور	1964۔1970ء
ممبر، ویسٹ پاکستان کوآپریٹو کنزیومر سوسائٹی لمیٹڈ	1970ء
ممبر، مجلسِ مشاورت، ماہنامہ پھول، لاہور	1971ء
ممبر، پنجابی ایڈہاک کمیٹی	1971۔72ء
ممبر، اطلاعات ومطبوعات کمیٹی، خاندانی منصوبہ بندی، لاہور	1971۔1978ء
رُکن، مشاورتی مجلسِ اُردو، حکومت پنجاب	1972۔73ء
ممبر، آفیشل لینگوج کمیٹی و مجلس استناد	1972۔78ء
ممبر، مجلسِ انتظامیہ، دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری، لاہور	1972۔78ء

ممبر، نصاب کمیٹی، ایم اے پنجابی	1973ء
اعزازی، مدیرِ اعلیٰ ماہنامہ سکھی گھر، لاہور	1973ـ1978ء
ممبر، نصاب کمیٹی ایم اے پنجابی	1973ء
ممبر، پنجاب گورنمنٹ کمیٹی	
برائے فارسی عربی لرننگ سروے (Learning Survey)	1974ء
(National Performing Right Society)	1974ء
نگران، ماہنامہ اطفال، لاہور	1974ـ76ء
ممبر، بورڈ آف سٹڈیز، اُردُو	1974ـ77ء
ممبر، جشنِ امیر خسرو کمیٹی	1975ء
کنوینر، صوبائی نصاب کمیٹی برائے پنجاب، جماعت نہم و دہم	1975ء
رُکن، مجلس ترقی ادب، لاہور	1975ـ78ء
چیئرمین، پاکستان آرٹس کونسل، لاہور	1976ـ78ء
چیف ایڈیٹر و چیئرمین، ایل پی ریکارڈ کمیٹی برائے	
صد سالہ تقریبات ولادت علامہ محمد اقبالؒ	1977ء
ممبر، کلچر پروگرام کمیٹی، زیرِ نگرانی انٹرنیشنل کانگریس علامہ اقبالؒ	1977ء
ممبر، سائٹ سیئنگ کمیٹی (Sight seing Committee)	1977ء
ممبر، پرنٹنگ اینڈ پبلی کیشن کمیٹی	1977ء

صوفی صاحب کی ایک اُستاد کی حیثیت اپنی جگہ قائم اور مُسلّم ہے۔ بچوں کا ادب اور نثر نگاری اعلیٰ درجے کی تھی۔ لیکن شعری حوالے سے سب سے اہم بات یہ تھی کہ وہ بیک وقت پنجابی، فارسی اور اُردو کے شاعر تھے۔ تینوں زبانوں میں اُن کی شاعری اعلیٰ پائے کی تھی۔ اپنی مادری زبان پنجابی میں شاعری کی طرف رُجحان تقسیم کے بعد ہوا۔ تقسیم سے قبل وہ اُردو اور فارسی شاعری کے حوالے سے جانے جاتے تھے۔ اُن کی ابتدائی زمانے کی یہ اُردو غزل بہت مقبول ہے:

غزل

دل کو جب بے کلی نہیں ہوتی | زندگی زندگی نہیں ہوتی
جان پر کھیلتے ہیں اہلِ وفا | عاشقی دل لگی نہیں ہوتی
کیا کرو گے کسی کی دِلداری | تم سے تو دِلبری نہیں ہوتی
موت کی دھمکیاں نہ دو مجھ کو | موت کیا زندگی نہیں ہوتی
غور سے دیکھتا ہوں جب تجھ کو | میری ہستی مِری نہیں ہوتی
عشق میں ہوشیاریاں بھی ہیں | محض وارفتگی نہیں ہوتی
توبہ کرتے ہیں اس لیے زاہد | ہم نے اُس وقت پی نہیں ہوتی
عشق کی اشک ریزیوں کے بغیر | آبرو حسن کی نہیں ہوتی
اُس کو میں بزم کس طرح کہہ دوں | جس میں صورت تری نہیں ہوتی

دل تبسم کسی کو دو پہلے
مفت میں شاعری نہیں ہوتی

روایتی اُردو شاعری کے ساتھ ساتھ اُن کی شاعری پر اقبالؒ کے گہرے اثرات بھی موجود تھے۔ انسان اور مذہب کو ایک خاص زاویۂ نگاہ سے دیکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اُنھوں نے اقبالؒ کے مانند کئی مقامات پر مُلائیت کو حرفِ تنقید بنایا۔

مُلا کو مسلمان کی توقیر سے کیا کام
تخریب کے شیدائی کو تعمیر سے کیا کام
اس خوگرِ گفتار کو کردار سے کیا ربط
اس ماہیِ تقدیر کو تدبیر سے کیا کام

تقسیم نے ہندوستان کی تاریخ اور پنجاب اور بنگال پر بطورِ خاص انتہائی گہرے اور کربناک اثرات چھوڑے۔ حضرتِ انسان کی جو تذلیل اور رُسوائی تقسیم کے دوران میں ہوئی، وہ انسانی تاریخ میں پہلے کبھی نہ دیکھی گئی۔ اس پر طرہ یہ کہ اس بربادی کا برطانیہ سرکار کو پہلے سے بھرپور علم تھا۔ ظلم کی داستانوں کا یہ سلسلہ آج تک قائم ہے۔ صوفی صاحب نے تقسیم کو کس طرح سے دیکھا، ڈاکٹر نثار احمد قریشی نے کچھ یوں قلم بند کیا ہے:

”قیامِ پاکستان سے پہلے صوفی صاحب کی گھریلو زندگی پُر بہار تھی اور مجلسی

زندگی بھی گونا گوں مشاغل سے لبریز تھی مگر شومیِ قسمت کہ قیامِ پاکستان کے ساتھ ہی حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ ان دونوں بہاروں کی بساط یک دم الٹ گئی۔ پاکستان کا قیام بلاشبہ برِصغیر کے مسلمانوں کی ایک دیرینہ خواہش کی تکمیل تھی مگر کچھ تلخیاں، مسائل و مصائب بھی اس کے حصّے میں آئے۔ قتل خون، غارت گری، آتش زنی، عصمت درّی اور اِغوا روزمرہ کا معمول بن گیا۔ آزادی کے پرنشاط نغمے المناک نوحوں کی شکل اختیار کرنے لگے۔ ہجرت کے عمل میں کئی ماؤں کے جگر گوشے اُن سے چھن گئے۔ کتنے سُہاگ اُجڑے اور کئی معصوم بچے اپنے والدین سے بچھڑ گئے۔ صوفی صاحب کے اہلِ خاندان جب امرتسر سے لاہور منتقل ہوئے تو اُن کے تین اعزہ کو وہاں شہید کر دیا گیا۔ امرتسر میں اُن کا قیمتی مال و اسباب اور جائیداد اُن سے چھن گئی۔ جان و مال کے اس عظیم ناقابل تلافی نقصان کے نتیجے میں ایک حساس طبع شاعر کا متاثر ہونا ایک فطری امر تھا۔ باپ دادا کی سرزمین، مانوس فضا اور ہنستے بستے گھروں کی بربادی کے بعد اُنھیں ہر جگہ اجنبی نظر آتی ہے تو شاعر اپنے احساسات کا اظہار ان اشعار میں کرتا ہے:

یہ آج آئے ہیں کس اجنبی سے دیس میں ہم
ترس گئی ہے نظر چشمِ آشنا کے لیے
یہ میں نے مانا جُدائی مرا مقدر ہے
مگر یہ بات نہ منہ سے کہو خدا کے لیے
حدودِ زیست میں بھی مل سکی نہ منزلِ زیست
نہ جانے کون سی ہم رہ گزر کو کھو بیٹھے
کچھ اس طرح سے تری یاد چھن گئی ہم سے
سفر میں جیسے کوئی ہمسفر کو کھو بیٹھے'

تقسیم کی بربادیوں کا کلی دُکھ ابھی کم نہ ہوا تھا کہ صوفی صاحب کو 1950ء میں ایک

انفرادی گہرا گھاؤ سہنا پڑا جب اُن کی رفیقۂ حیات دارِ فانی سے کوچ کر گئیں۔ اس دُکھ سے وہ آخری سانس تک نہ نکل سکے۔

صوفی صاحب نے اپنی بہترین شاعری اپنی مادری زبان پنجابی میں کی۔ پنجابی کلام کے کچھ نمونے درج ذیل ہیں:

ساڈے عشق دے چمکدے لیکھاں اُتے غم دیاں سیاہیاں ڈُلھ گئیاں
جیہڑیاں حُسن تیرے چمکائیاں سن اوہ چاننیاں راتاں رُلھ گئیاں
ایس عشق نمانے دے دھاگے دِیاں کجھ ایڈ اَولیاں گُنجھلاں سن
کجھ کُھلدیاں کُھلدیاں ہور پیاں، کجھ پیندیاں پیندیاں کُھل گئیاں
گلاں مِٹھیاں مِٹھیاں پیار دِیاں جیہڑیاں دوہاں بیٹھ کے رِکیتیاں سن
جیہڑیاں نال اساڈے بیتیاں سن سانوں یاد رہیاں تینوں بھُل گئیاں

من دے اندر ڈھک کے رکھے پیاں نظر دِیاں گلاّں
ہر اِک نال نہیں کر دے پھردے لوکی گھر دِیاں گلاّں
ظاہر چُپ چپیتے رہندے لب نہ بول ہلاندے
اکھاں دے نال کر چھڈیاں نیں دُنیا بھر دِیاں گلاّں

منتاں کردیاں ترلے لیندیاں ہوکے بھر دِیاں اکھاں
تیری دِید دی خاطر سجناں کیہ کجھ کر دِیاں اکھاں
کدی دِلاں دے راز چھپاون پلکاں توں وی اوہلے
کدی محبت دے وِچ آ کے گلاں کر دِیاں اکھاں

پھُلاں دِیاں خوشیاں مات پیاں اوہ طور نہ رہے گلزاراں دے
جد نظراں پھریاں یار دِیاں رنگ اُڈ پڈ گئے بہاراں دے
اسیں اپنی دُنیا وسدے ساں، خود رونے ساں خود ہسدے ساں

کیہا دِل نوں روگ لگایا اے مونہہ تکنے پۓ غم خوراں دے

1965ء کی جنگ میں اُن کے لکھے ہوئے نغمے زمانے بھر میں معروف رہے جنھیں آج بھی یاد کیا جاتا ہے۔عصرِ حاضر میں بھی جب کوئی فوجی جوان دہشت گردی کی جنگ میں شہید ہو جائے تو یہ نغمہ ''ایہہ پُتر ہٹاں تے نہیں وِکدے'' اُن کی یاد میں ملکۂ ترنم نُور جہاں کی آواز میں گونج اُٹھتا ہے۔اسی عہد کے دو نغمے درج ذیل ہیں:

میریا ڈھول سپاہیا تینوں ربّ دِیاں رکھاں
اج تکدیاں تینوں سارے جگ دِیاں اکھاں
جدھر نظراں پاویں ویری مار لنگھاویں
جیہناں راہواں توں جاویں جیہناں راہواں،توں آویں
اوہناں راہواں دی مٹی چمن میریاں اکھاں
میریا ڈھول سپاہیا تینوں رب دِیاں رکھاں

O

اوہ ماہی چھیل چھبیلا
ہائے نی کرنیل نی جرنیل نی
سارے جگ کولوں نیارا
سانوں چن کولوں پیارا
اوہ ماہی رنگ رنگیلا
ہائے نی کرنیل نی جرنیل نی

اپنی جان دُکھاں وِچ پا کے
دیس دِی عزت آن بچاوے
لوکی دین دعائیں شالا دُور بلائیں

میرا جیوے ڈھول سجیلا
ہائے نی کرنیل نی جرنیل نی

صوفی صاحب نے انتہائی سادگی اور درویشی میں زندگی بسر کی۔ وہ زندگی میں لوگوں سے ایک عام شخص کی طرح کا برتاؤ رکھتے تھے۔ اُن کے رویے سے کبھی ظاہر نہ ہوتا کہ وہ اپنے عہد کے ایک عظیم اُستاد، ادیب اور شاعر ہیں۔ وہ بچوں کے ساتھ بچے بن جاتے وہ قلچوں کی تیاری اور آخری مراحل تک نہ صرف معلومات رکھتے تھے بلکہ ضرورت پڑنے پر خود تنور پر جا بیٹھتے تھے۔ اُن کے فنِ نانبائی کی باریکیوں اور دیگر حالاتِ زندگی کے حوالے سے کچھ معلومات اے حمید نے اپنے مضمون میں تحریر کیں۔ جو اُن کی کتاب ''چاند چہرے'' میں شامل ہے۔ اُس میں سے ایک اقتباس درج ذیل ہے:

''امرتسری کشمیری ہونے کے ناتے صوفی صاحب کی طبیعت میں ایک کُھردرا پن بھی تھا۔ امرتسری کشمیریوں کے بارے میں یہ بات مشہور ہے کہ بزرگی کی عمر میں پہنچ کر وہ تنک مزاج ہو جاتے ہیں۔ نکتہ چینی اُن کی عادت بن جاتی ہے۔ صوفی صاحب ویسے تو بڑے ٹھنڈے مزاج کے تھے مگر کبھی کسی چھوٹی سی بات پر گرم بھی ہو جاتے تھے۔ پھر اگر اُنھیں میز پر رکھا خالی کپ بھی نظر آتا تو جُھنجھلا کر کہتے:

''اوئے یہ کپ یہاں کس نے رکھ دیا ہے۔''

امرتسر میں ہمارے محلّے میں ایک بزرگ کاکا جی کی قُلچوں کی دُکان تھی۔ میں چھوٹا تھا جب صوفی کاکا جی کا انتقال ہوگیا۔ مجھے اُن کی شکل خواب کی طرح یاد ہے۔ ستواں ناک، چمکیلی آنکھیں، بھری بھری ڈاڑھی، بالوں کے لمبے لمبے پٹے۔ بالوں میں سفیدی آ چکی تھی۔ کاکا جی میرے دادا کے دوست تھے۔ دادا جان سنایا کرتے تھے کہ امرتسر میں جس روز بڑا بھونچال آیا تو میں اپنے بازار والے چوبارے کی رونق پر بیٹھا ٹپہ کر رہا تھا۔ میرے والد صاحب

اکھاڑے زور کرنے گئے ہوئے تھے۔اچانک ایک آواز پیدا ہوئی اور بازار کے مکان ایک دوسرے سے گلے ملنے لگے۔شہر میں کُہرام مچ گیا۔ دادا جان کا کہنا ہے کہ میں وہیں بیٹھا کلمہ شریف پڑھتا رہا کہ اب جو ہونا ہوگا ہو جائے گا۔صوفی کاکا جی اپنے تنور والے مکان کی پچھلی کوٹھڑی میں سو رہے تھے۔ اُن کے مکان کا ایک حصہ گر گیا۔ بھونچال ختم ہوا تو لوگوں نے کہا، کاکا جی کوٹھڑی میں سو رہے تھے۔اُن کا پتا کرو۔ اس وقت کاکا جی اپنی ڈاڑھی پر سے مٹی جھاڑتے ہوئے باہر نکلے اور بولے۔

''یار میں زندہ ہوں۔کیوں شور مچا رہے ہو؟''

یہ کاکا جی صوفی تبسم کے رشتے داروں میں سے تھے۔ میں نے صوفی تبسم صاحب کو امرتسر میں نہیں دیکھا۔شاید اس لیے کہ ایک تو صوفی صاحب کا محلہ ہمارے محلّے سے کافی دُور شہر کے دوسرے کنارے پر تھا۔ دوسرے وہ شروع ہی میں لاہور چلے آئے تھے۔ لیکن صوفی صاحب کے کچھ عزیز کاکا جی سے ملنے ضرور آتے جاتے تھے جن کو میں نے پاکستان بننے کے بعد لاہور میں صوفی صاحب کے ہاں دیکھا۔ یہاں میں ایک اور بات کی وضاحت کرتا چلوں کہ میرے علم اور بزرگوں کے بیان کے مطابق کشمیری تاندروں یعنی نانبائیوں کو صوفی کہا جاتا ہے۔ان خاندانوں میں علم و ادب کا بڑا چرچا ہوتا تھا اور تصوف سے لگاؤ بھی ان خاندانوں میں عام تھا۔شاید اسی لگاؤ کی وجہ سے ان تاندر بائی خاندان والوں کو صوفی کا لقب ملا۔

امرتسری کشمیری عام طور پر گالیوں کے معاملے میں کچھ زیادہ ہی بے تکلف واقع ہوئے ہیں مگر صوفی صاحب کو میں نے جب تک میں اُن کی خدمت میں رہا، کبھی کوئی کلاسیکی قسم کی گالی دیتے نہیں سنا۔ کسی نوکر وغیرہ پر ناراض ہوتے تو بس سُور دیا پُترا کہہ کر خاموش

ہوجاتے تھے۔ اُن کی نفاست پسندی بھی اپنی جگہ پر مثالی حیثیت رکھتی تھی۔ ہمیشہ استری شدہ سادے اور صاف ستھرے کپڑے پہنتے۔ پاکستان بننے کے بعد اُنھیں سوٹ میں بھی ملبوس دیکھا۔ گہرے کلر کا سوٹ وہ بڑے شوق سے پہنا کرتے۔ بعد میں شلوار قمیص اور واسکٹ ہی پہناوا رہا۔ 1960ء کے بعد ریڈیو پاکستان لاہور سے وابستہ ہو گئے تھے۔ میں پہلے ہی ریڈیو سٹیشن پر بطور سٹاف آرٹسٹ ملازم تھا۔ صوفی صاحب بھی بطور سٹاف آرٹسٹ ہی آئے مگر وہ ہمارے ہیڈ تھے۔ اس ملازمت میں وقت کی کوئی پابندی نہیں تھی، صرف وقت پر سکرپٹ تیار کر کے دینا ہی سب سے بڑی پابندی تھی اور وہ کم از کم میں اکثر گھر سے ہی لِکھ کر لے آتا اور ریڈیو سٹیشن پر دوستوں کے ساتھ چائے کے دور چلتے۔ کبھی کبھار وقت کے وقت بھی سکرپٹ لکھنا پڑ جاتا۔ پرانے ریڈیو سٹیشن کا ایک گول کمرہ ہوا کرتا تھا۔ صوفی صاحب کو یہی کمرہ ملا، میری کرسی بھی اُن کے ساتھ ہی لگا دی گئی۔ یہ بڑے یادگار دن تھے۔ اس دوران میں نے صوفی صاحب سے بہت کچھ سیکھا۔ فارسی شاعری کا خاص طور پر ایک ذوق حاصل کیا جس کے لیے میں تاحیات صوفی صاحب کا ممنون احسان رہوں گا۔ ایسے ہمہ جہت اُستاد پھر کہاں ملیں گے۔ وہ سحر خیز تھے۔ ٹھیک وقت پر دفتر آ جاتے۔ میری بھی منہ اندھیرے اُٹھنے کی عادت ہے۔ میں صوفی صاحب سے پہلے ہی کمرے میں موجود ہوتا تھا۔ اُن کے آنے تک میں کینٹین سے چائے نہیں منگواتا تھا۔ صوفی صاحب کے ساتھ صبح کی چائے پینا اور اُن کی خوبصورت علمی باتیں سننا بجائے خود ایک حسین اور رومانوی تجربہ تھا۔

گرمیوں کے دنوں میں صوفی صاحب کمرے میں داخل ہوتے ہی پنکھے کے نیچے کھڑے ہو جاتے اور میری طرف آنکھیں پوری کھول کر دیکھتے اور بریف کیس میز پر ٹکانے کے بعد رومال سے

چہرے کا پسینہ پونچھتے ہوئے کہتے۔

''اس کی ہوا بھی کم ہوگئی ہے۔''

ووڈ بائن کا سگریٹ سلگاتے۔ کہنیاں میز پر ٹکاتے اور سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیتے۔ گہرا سانس بھر کر فرماتے:

''گرمی کا یہی حال رہا تو آگے کیا ہوگا''

صوفی صاحب کے مزاج میں سادگی کا عنصر بہت زیادہ تھا۔ دُنیا داری سے وہ کوسوں دُور تھے۔ جن دنوں وہ سنت نگر والے مکان میں رہتے تھے، میں ایک بار ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو حقے کا کش لگا کر بولے:

''یار میرا ایک پبلشر دوست تمھارے افسانوں کا مجموعہ چھاپنا چاہتا ہے۔ اس نے مجھے بیچ میں ڈالا ہے۔ افسانے تیار ہوں تو اُنھیں دے دو۔''

میں صوفی صاحب کی بات کیسے ٹال سکتا تھا۔ میں نے اسی پبلشر کو کہانیوں کا ایک مسودہ دے دیا۔ اس معاہدے میں مجھے بڑا نقصان اُٹھانا پڑا مگر میں نے کوئی شکایت نہ کی۔ آخر کچھ عرصے کے بعد صوفی صاحب نے بھی دھیمی آواز میں گلہ کیا۔

''اچھا پبلشر نہیں تھا۔ اس نے مجھے کافی نقصان پہنچایا۔''

پاکستان رائٹرز گلڈ کے قیام میں صوفی صاحب نے بھی بھرپور کردار ادا کیا۔ وہ گلڈ کے بنیادی اراکین میں سے تھے۔ گلڈ کے پہلے اجلاس میں شرکت کے لیے وہ بھی ہمارے ساتھ ہی کراچی گئے۔ صوفی صاحب بڑے باہمت تھے۔ دن میں بارہ بارہ گھنٹے بھی میں نے اُنھیں کام کرتے دیکھا ہے۔ عمر کے آخری دنوں تک بھی کام ہی کرتے رہے۔''

صوفی صاحب کئی کتابوں کے مصنف بھی رہے اور مدیر بھی۔ لاہور ریڈیو کے ساتھ

ایک طویل عرصہ منسلک رہے۔ اُن کی گرانقدر خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے حکومتِ پاکستان نے اُنھیں 1962ء میں ''ستارۂ خدمت'' اور 1967ء میں ''ستارہ امتیاز'' سے نوازا۔ حکومت ایران نے اُنھیں ''نشانِ فضیلت'' عطا کیا۔ صوفی صاحب نے سات فروری 1978ء کو انتقال فرمایا۔

اُن کے سفرِ آخرت اور اُن کی کتب کی تفاصیل ڈاکٹر نثار احمد قریشی نے بیان کی ہیں:

> ''صوفی تبسم نے کم عمری ہی میں لکھنا شروع کر دیا تھا۔ زمانۂ طالب علمی ہی سے اُن کے مضامین اور کلام کالج میگزین کے ساتھ ساتھ ملک کے معتبر علمی جرائد مثلاً مخزن، نیرنگ خیال وغیرہ میں شائع ہونا شروع ہو گیا تھا۔ آپ نے تاریخِ اِسلام، تصوف، تحقیق، تنقید، شعر، ڈرامہ، سوانح اقبالیات، شرح، ترجمہ، مقالہ اور دیباچہ غرض کہ ادب کی کئی اَصناف میں لکھا۔ اُن کی تصانیف و تالیف کی تعداد بتیس اور نصابی کتب کی تعداد چالیس ہے۔ دونوں ملا کر بہتر (72) کتابیں بنتی ہیں۔ ان مختلف النوع تصانیف کی تعداد پہلے موضوعاتی اور بعد میں زمانی اعتبار سے درج کی جاتی ہے۔''

تخلیقات (بہ اعتبارِ حروفِ تہجی)

1۔ انجمن (مجموعۂ کلام فارسی اُردو پنجابی)
2۔ پنجاب کی شاعری پر فارسی روایات کا اثر (اُردُو)
3۔ ٹوٹ بٹوٹ اور دوسری نظمیں (اُردُو)
4۔ ٹول مٹول (اُردُو)
5۔ جھولنے (اُردُو)
6۔ دامنِ دل (غزلوں اور نظموں کا مجموعہ)
7۔ سرشکِ تبسم (نعتوں، نظموں، گیتوں اور ملی ترانوں کا مجموعہ)
8۔ کلیات صوفی تبسم (بچوں کے لیے)

تراجم (بہ اعتبارِ حروفِ تہجی)

9۔ جاہ وجلال (اُردو)

10۔ حِکمت قرآن (اُردو)

11۔ دوگونہ (فارسی، اُردو)

12۔ دو ناٹک: ساون رین دا سفنا، خطرناک لوک (پنجابی)

13۔ سراپردہ افلاک (فارسی، اُردُو)

14۔ علامہ اقبالؒ (اُردُو)

15۔ مسلمانوں کا علم جغرافیہ اور شوقِ سیاحت (اُردُو)

16۔ نقشِ اقبالؒ (فارسی، پنجابی)

17۔ شرحِ غالب (اُردُو، فارسی)

18۔ شرحِ صد شعرِ اقبالؒ (اُردُو)

19۔ شرحِ غزلیات غالب جلد اول و دوم (فارسی، اُردُو)

تالیفات

20۔ اقبالؒ اور بچے (اُردُو)

21۔ انتخاب کلام اقبالؒ (اُردُو، فارسی)

22۔ انتخاب کلام امیر خسرو، طوطی شکر مقال (فارسی)

23۔ تیر ونشتر (اُردو)

24۔ تیر ونشتر (فارسی)

25۔ حرف وصوت (اُردُو، فارسی)

26۔ زندہ نغمے (اُردُو، پنجابی)

27۔ شعرِ فارسی معاصر (فارسی، اردو)

28۔ کلیاتِ طغرائی (اردو، فارسی)

29۔ یک ہزار و یک سخن (فارسی، اُردُو)

مندرجہ بالا کتب درجِ ذیل زمانی ترتیب سے شائع ہوئیں:

1۔ کلیات طغرائی 1933ء

2۔	جاوہ وجلال	1940ء
3۔	جھولنے	1948ء
4۔	مسلمانوں کا علمِ جغرافیہ اور شوقِ سیاحت	ایضاً
5۔	حکمتِ قرآن	ایضاً
6۔	علامہ اقبالؒ	1955ء
7۔	انجمن	1961ء
8۔	زندہ نغمے	1967ء
9۔	روحِ غالب	1969ء
10۔	ٹوٹ بٹوٹ اور دوسری نظمیں	1970ء
11۔	انتخابِ کلامِ امیر خسرو	1975ء
12۔	دوگونہ	ایضاً
13۔	انتخابِ کلامِ اقبالؒ	1977ء
14۔	سراپردہ افلاک	ایضاً
15۔	شرحِ صد شعرِ اقبالؒ	ایضاً
16۔	نقشِ اقبالؒ	ایضاً
17۔	تیر و نشتر (انتخابِ کلامِ اقبالؒ فارسی)	ایضاً
18۔	تیر و نشتر (اردو)	ایضاً
19۔	حرف وصوت	ایضاً
20۔	اقبالؒ اور بچے	1978ء
21۔	شرحِ غزلیاتِ غالب (فارسی) جلد اول و دوم	1980۔81ء
22۔	پنجاب کی شاعری پر فارسی روایات کا اثر	ایضاً
23۔	دوناٹک	ایضاً
24۔	شعرِ فارسی معاصر	ایضاً
25۔	یک ہزار و یک سخن	ایضاً

26۔ کلیاتِ صوفی تبسم (بچوں کے لیے) بعداز وفات 1989ء

27۔ ٹول مٹول (بچوں کی نظمیں) بعداز وفات 1979ء

28۔ دامنِ دل (غزلیات، نظموں کا مجموعہ) بعداز وفات 1984ء

29۔ سرشکِ تبسم (نعتوں اور نظموں کا مجموعہ) بعداز وفات 1988ء

30۔ علامہ اقبالؒ سے آخری ملاقاتیں، کچھ یادیں، بعداز وفات 1989ء

31۔ صد شعرِ اقبالؒ فارسی، بعداز وفات 1995ء

32۔ کلیاتِ صُوفی تبسم (بعداز وفات) 1999ء

صوفی صاحب کے دورِ جوانی اور بڑھاپے کے ساتھیوں میں سے بیشتر کی رائے یہی ہے کہ خوش گوئی و خندہ مزاجی ہر دور میں ان کے مزاج کا جزو رہی۔ مشکلات و مصائب میں بھی اللہ تعالیٰ نے اُنھیں مستقل مزاجی و استقامت کی خصوصیات سے نوازا تھا۔ غیر معمولی حوصلے اور صبر و تحمل کے باوجود زندگی کے آخری ایاّم میں آپ بعض نجی اُلجھنوں کے باعث بعض اوقات چڑچڑے پن کا شکار ہو جاتے تھے۔ اُن پریشانیوں میں ایک نمایاں الجھن یہ تھی کہ آپ کا بیٹا صوفی مختار احمد ذہنی عارضے میں مبتلا تھا اور یہ بات ان کے لیے دائمی پریشانی کا باعث تھی۔ علاوہ ازیں عمر کے بالکل آخری ایام میں آپ کو اپنے دیرینہ اور ہم مزاج دوستوں کے بچھڑ جانے کا غم شدت سے ستاتا اور گھر کے کچھ ناموافق حالات کی بنا پر آپ خود کو بہت تنہا سمجھنے لگے تھے۔ آخری ایام میں آپ پر دل کی بیماری کا حملہ ہوا، جس کے باعث ان کے احساسِ تنہائی نے خوفِ مرگ کی شکل اختیار کر لی چنانچہ آپ تنہا بیٹھنے سے گھبراتے تھے اور دوست احباب کی محفل میں اس خوف پر قابو پانے کی کوشش کیا کرتے تھے۔

ان نفسیاتی و جسمانی عوارض کے باوجود زندگی کے آخری دنوں میں بھی آپ کے معمولات میں کوئی فرق نہ پڑا۔ آپ باقاعدگی

سے صبح کی سیر کرتے۔ گھر کے لیے سودا سلف خریدنے کو خود جاتے اور دیگر منصبی مصروفیات میں یکساں باقاعدگی کے ساتھ مشغول رہے۔ ذہنی طور پر تو آپ آخری دم تک فکری بلندیوں کی طرف مائل رہے۔

صوفی صاحب نے اپنی زندگی میں متعدد سفر کیے، جن میں اندرون و بیرون ملک سفر شامل ہیں مگر آئندہ سطور میں بیان کردہ سفر ان کے لیے سفرِ آخرت ثابت ہوا۔

5 فروری 1978ء کو آپ پاکستان ٹیلی وژن پر علامہ اقبالؒ کے لیے ایک پروگرام کے سلسلے میں لاہور سے راولپنڈی روانہ ہوئے۔ 6 فروری کو پروگرام ریکارڈ کروایا اور 7 فروری کی صبح کو آپ بذریعہ ریل کار راولپنڈی سے لاہور کے لیے روانہ ہوئے۔ راولپنڈی سے لاہور تک تقریباً پانچ گھنٹے کا یہ سفر بالکل ٹھیک ٹھاک گزرا اور دورانِ سفر اپنے ایک بہت پرانے شاگرد محمد صادق راجپوت (جو اُن کے ساتھ راولپنڈی سے ہی ریل کار میں سوار ہوئے تھے) کے ساتھ تمام وقت لطیفہ گوئی اور خوش گپیوں میں گزارا۔ لاہور ریلوے سٹیشن پر ریل کار پہنچی۔ اپنے شاگرد کی مدد سے اپنا سامان اٹھا کر آپ تیز تیز چلتے سٹیشن سے باہر نکل رہے تھے کہ سیڑھیوں پر ہی دل کا شدید دورہ پڑا اور اسی لمحے دن کے ڈیڑھ بجے جناب صادق راجپوت کے ہاتھوں میں ہی جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی اور یوں 7 فروری 1978ء بروز منگل یہ ہستی ہمیشہ کے لیے اس دُنیا سے رخصت ہوگئی:

انا للہ وانا الیہ راجعون۔

دوسرے دن 8 فروری بروز بدھ نماز جنازہ میں سینکڑوں افراد نے شرکت کی اور لاتعداد سوگواروں کی موجودگی میں قبرستان میانی صاحب میں دفن کیے گئے۔''

جیسا کہ اوپر درج ہے، اُنھیں قبرستان میانی صاحب لاہور میں دفن کیا گیا۔ اُن کی

قبر کے پاس ہی اُن کے بیٹے اور مشہور کلاسیکل گائیک اُستاد نذیر بٹ کی قبور ہیں۔ اُن کی قبر کے کتبے پر یہ تحریر کندہ ہے:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مرقد

اُستاد شاعر ادیب

صوفی غلام مصطفیٰ تبسم

تاریخ وفات

7 فروری 1978ء

ابوالاثر حفیظ جالندھری

1900ء–1982ء

نا آشنا نہیں رہِ رسمِ جہاں سے ہم
لائیں مگر فریب کی صورت کہاں سے ہم
حفیظ جالندھری

حفیظ جالندھری کا نام دُنیا بھر میں پاکستان کے قومی ترانے کے خالق کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔ اُن کی یہ شناخت اتنی گہری ہے کہ اُن کی زندگی کے دِیگر شُعبے اور تصانیف قومی ترانے ہی کے زیرِ اثر رہیں۔ وہ 14 جنوری 1900ء کو جالندھر میں حافظ شمس الدین کے ہاں پیدا ہوئے۔ جائے پیدائش سے آپ کے نام نسبت عمر بھر کے لیے ایک جزوِ لازم بن گئی۔ آپ نے سب سے مسجد سے قرآن مجید کی تعلیم حاصل کی۔ درسی تعلیم کے لیے اُن کے والدِ گرامی نے مقامی سکول میں داخل کروایا۔ ساتویں جماعت تک سکول جاتے رہے، لیکن پھر سکول کو ایسا خیر باد کہا کہ پھر کبھی پلٹ کر نہ دیکھا۔ چھوٹی عمر ہی سے شعر گوئی کا شوق تھا۔ شاعری کے اسلوب کو بہتر کرنے کے لیے غلام قادر جیسے عظیم شاعر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ اُستاد نے اپنے ہونہار طالبِ علم پر خاص توجہ دی اور حفیظ کا شمار اپنے وقت کے بڑے شعرا میں ہونے لگا۔ اس حوالے سے ایک اہم بات یہ ہے کہ کسی بھی قد آور شخصیت کی عظمت کو ماننے کے لیے ضروری نہیں کہ اس کا تعلق کسی بڑے ادارے یا کسی کالج، یونیورسٹی سے رہا ہو۔ حفیظ جالندھری نے بحیثیتِ شاعر پہلی باقاعدہ ملازمت ریاست خیر پور کے نواب کے ہاں کی۔ تنخواہ تین سو روپے ماہوار مقرر ہوئی جو اُس زمانے کے لحاظ سے تھی انتہائی معقول تھی۔ نواب صاحب کی ایک بیگم کسی وقت طوائف بھی رہ چکی تھیں۔ اتفاق سے بیگم صاحبہ کا جنم دن آ گیا۔ ریاست کے شاعر ہونے کے باعث آپ سے قصیدہ لکھنے کی فرمائش کی گئی۔ حفیظ جالندھری کی حق گوئی اور بے باکی کا پہلا ثبوت یوں منظرِ عام پر آیا کہ آپ نے قصیدے کا عنوان ''رقاصہ'' رکھ۔ اس جرأت کا صِلہ اُنھیں قلعے کی سزا کی صورت میں ملا؛ اُس وقت آپ کی عمر صرف پچیس برس تھی۔ سزا بھگتنے کے بعد آپ لاہور تشریف لے آئے جہاں آپ کو علامہ اقبالؒ، اختر شیرانی، محمد دِین تاثیر، ایم اسلم، پنڈت ہری چند اختر، عاشق حسین بٹالوی، حکیم احمد شجاع پاشا اور حکیم نیر واسطی جیسی علمی اور ادبی شخصیات کا قرب حاصل ہوا۔ لاہور کے حوالے سے اُنھوں نے کہا:

وہی لاہور ہے وہی در و بام	وہی ہنگامۂ خواص و عام
زلزلے، آگ، آندھیاں، سیلاب	لائے تشریف چل دیے ناکام
عارضی سی شکست و ریخت کے ساتھ	چل رہا ہے وہی قدیم نظام
شجر و شاخ ہے کہ برگ و ثمر	اپنے معمول پر ہیں پختہ و عام

اُنھوں نے غزل، گیت، ترانے اور نیچر کی شاعری میں نئے نئے تجربات کیے اَور نعت گوئی میں بھی آپ کو خاص کمال حاصل تھا۔ آپ کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ شاہنامۂ اسلام کی تصنیف تھی، جو آپ کا رسولِ اکرم ﷺ سے بے پناہ عشق کا نتیجہ تھا۔ اِسی وجہ سے اُنھیں شاعرِ اسلام کہا گیا۔ اس حوالے سے ایک واقعہ عزیز ملک نے نقوش شخصیات نمبر میں صفحہ 332 پر تحریر کیا ہے:

”جس دن لاہور میں رُسوائے عالم راجپال کو شان رسول ﷺ میں گُستاخی کے بدلے قتل کیا گیا، حفیظ اسی شام کسی کام سے جالندھر جا رہا تھا۔ جب گاڑی امرتسر سٹیشن پر رُکی تو ہندو سکھوں کے مشتعل ہجوم نے ڈبوں میں اِدھر اُدھر جھانکنا شروع کر دیا۔ ایک مہاسبھائی نے حفیظ کو پہچان کر اپنے حلیفوں کو پکارا: ”بھائیو ادھر آؤ شکار مل گیا۔“ یہ اشارہ اِس اَمر کا تھا کہ ایک مشہور مسلمان تشدد کا نشانہ بن سکتا ہے، بے دریغ چلے آؤ۔ چنانچہ بے شمار ہندو اور سکھ یمین و یسار سے اُمنڈ آئے اور دربارِ رسالت ﷺ کا مدح خواں بے طرح پیٹا جانے لگا۔ اس کی پیشانی پر شدید زخم آیا۔ یہ سب کچھ اتنی عجلت میں ہوا کہ دوسرے ہم سفروں کی سمجھ میں بھی نہ آیا کہ کیا ہوا ہے اور کیوں ہوا ہے۔ اس ضربتِ کاری کا نشان حبِ رسول ﷺ کی سند بن کر آج بھی اس کی پیشانی پر جگمگا رہا ہے۔“ گویا:

حفیظِ بے نوا بھی ہے گدائے کوچۂ الفت
عقیدت کی جبیں تیری مروت سے ہے نورانی“

حفیظ جالندھری کی عزیز ملک کے ساتھ دوستی کی بنیاد بھی عشق رسول ﷺ اور قرآنِ مجید سے محبت تھی۔ اس کی وجہ سے دونوں کی باہمی ملاقات کے علاوہ خط کتابت میں بھی اسی طرح کے موضوعات ملتے ہیں۔ اسی تناظر میں حفیظ صاحب کا عزیز ملک کو تحریر کیا گیا ایک خط ذیل میں نقل کیا جاتا ہے:

''عزیزم السلام علیکم!

خط ملا، میرے خیالات کی استقامت کے لیے آپ کی دُعا کا شکریہ۔ معراج، اُس انقلاب کا نام ہے جو انسان کی رُوح میں اُس وحی کو سمجھنے اور اُس کے مطابق عمل کرنے سے پیدا ہوتا ہے۔ جب یہ انقلاب پیدا ہوتا ہے تو انسان مومن بننا چاہتا ہے اور بلندی کی طرف رجوع کرتا ہے، یہیں سے معراج شروع ہوا ہے۔ محمد ﷺ تک پہنچنا ہی مسلمان کی معراج ہے، اِس سے آگے کوئی مقام ہی نہیں۔ لیکن یہ کہنا کہ کون وہاں تک پہنچا ہے، آسان نہیں۔ اِس کے لیے صرف ایک معیار ہے اور وہ ہے وحی جس کا نام قرآن ہے...... میں نہیں جانتا کہ میرے یہ خیالات میرے سینے میں کب سے ہیں، مگر یہ نئے نہیں ہیں۔ تم بہت اچھے آدمی ہو مگر گھر کے حالات اور ستا بک جانے اور کلرکی کو مجبوراً اپنا محور بنا لینے کی وجہ سے اپنی ناکامی دیکھتے ہو، اور تم سچے بھی ہو لیکن مایوس نہیں ہو۔

میرا ایک تازہ شعر ہے بلکہ دو ہیں۔ کل ہی لکھے ہیں:

عرضِ ہنر بھی وجہِ شکایات ہو گئی | چھوٹا سا منہ تھا مجھ سے بڑی بات ہو گئی
دیکھا جو کھا کے تیر کمیں گاہ کی طرف | اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہو گئی

ڈاکٹر باقر ٹھیک کہتے ہیں۔ میں بھی ٹھیک کہتا تھا۔ تم بھی ٹھیک تھے جو عمل نہ کر سکے۔ ہر چیز اپنے لیے ایک وقت اور مقام رکھتی ہے۔

دسمبر میں رخصت لے کر کہاں رہنے کا ارادہ ہے؟

۵۴/۱۰/۲۰   ۲۰۶، پی ای سی ایچ سوسائٹی   دُعا گو حفیظ''

عائلی زندگی کے حوالے سے حفیظ جالندھری کی پہلی شادی سترہ برس کی عمر میں اُن کی خالہ زاد زینت بیگم سے ہوئی۔ اِس خاتون سے اُن کی سات بیٹیوں نے جنم لیا۔ دوسری شادی آپ نے 1939ء میں ایک انگریز خاتون سے کی، جس سے اُن کی ایک بیٹی نے جنم لیا؛ لیکن انگریز خاتون سے شادی سے کچھ عرصے کے بعد علیٰحدگی کی صورت پیدا ہوگئی۔

قائدِ اعظم نے قومی ترانے کے لیے جگن ناتھ آزاد کو نامزد کیا۔ اُنھوں نے کچھ ترانے لکھے بھی لیکن بعض مقتدر ہستیوں نے اُن کے ترانوں کے خلاف یہ دلیل دی کہ یہ ایک غیر مسلم کا تحریر کردہ ترانہ ہوگا۔ چنانچہ پاکستان بننے کے بعد یہاں کے شعرا کو دعوت دی گئی۔ مقابلے میں تین سو سے زائد شاعروں نے ترانہ اول قرار پایا۔ واضح رہے کہ ترانے کی دُھن پہلے تیار کی گئی تھی۔ حفیظ جالندھری چونکہ موسیقی کے رموز سے واقف تھے اِس لے اُنھوں نے اُس دُھن میں الفاظ کے اِستعمال میں کہیں ٹھوکر نہ کھائی۔

قیامِ پاکستان کے بعد پاکستان کی وہ شکل سامنے آئی جو تصورِ پاکستان سے کلی طور پر مختلف تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اُس دور کے شاعر، ادیب خاموش نہ رہ سکے۔ حفیظ جالندھری نے بھی اس صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے کہا:

اب تو کچھ اور بھی اندھیرا ہے
یہ مری ذات کا سویرا ہے
رہزنوں سے تو بھاگ نکلا ہوں
اب مجھے رہبروں نے گھیرا ہے

اُن کی زندگی کی سب سے ضخیم اور عظیم کتاب شاہنامۂ اسلام چار جلدوں پر مشتمل ہے، جس میں حضورؐ کی حیاتِ طیبہ اور تاریخِ اسلام کے واقعات کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ نثر نگاری میں آپ کے افسانوں کی کتاب ''ہفت پیکر'' کے نام سے ملتی ہے۔ شاعری میں حضرتِ داغ دہلوی سے متاثر تھے۔ اُن کے مجموعے نسخہ زا، سوز و ساز، تلخ بہ شیریں اور چراغِ سحر کے نام سے شائع ہوئے۔ اُنھوں نے کئی ادبی ماہناموں کی ادارت بھی کی جن میں نونہال، ہزار داستان، تہذیبِ نسواں اور مخزن نمایاں ہیں۔ حفیظ جالندھری کے کہے ہوئے

اشعار میں سے کئی ایک ضرب الامثال کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ ذیل میں آپ کا ایک شعر نقل کیا جا رہا ہے جو زبان زدِ عام ہے:

دیکھا جو کھا کے تیر کمیں گاہ کی طرف
اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہو گئی

1954ء میں آپ کی پہلی اہلیہ انتقال کر گئیں۔ اُن کی وفات کے بعد 1955ء میں اُنھوں نے تیسری شادی خورشید بیگم سے کی۔ اُن سے بھی اُن کی ایک بیٹی نے جنم لیا۔ قیامِ پاکستان سے قبل حفیظ جالندھری نے لاہور کی سڑکوں پر مزدوری بھی کی۔ قیامِ پاکستان کے بعد اُنھوں نے کئی بڑے سرکاری عہدوں پر کام کیا۔ آخری ایام میں آپ نے چیونٹی نامہ بھی تحریر کیا۔ ادبی حلقوں میں آپ کی بہت کم لوگوں سے بنتی تھی لیکن سیّد ضمیر جعفری، انتظار حسین اور اے حمید سے کافی یارانہ تھا۔ اس حوالے سے ایک اقتباس اے حمید کی کتاب ''چاند چہرے'' سے نقل کیا جا رہا ہے جس میں اُنھوں نے حفیظ جالندھری کی وفات سے کچھ عرصہ قبل کی کیفیت بیان کی ہے:

''میں آخری بار حفیظ صاحب سے اُن کے گھر واقع ماڈل ٹاؤن میں ملا۔ میں ریڈیو پاکستان لاہور سے وابستہ تھا۔ اپنے ایک پروگرام کے سلسلے میں اُن کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ اُنھوں نے مجھے اُوپر بلوالیا۔ وہ کوٹھی کی دوسری منزل پر تھے۔ چاروں طرف کتابیں ہی کتابیں تھیں۔ کمرے کی حالت بڑی شکستہ تھی۔ حفیظ صاحب دری کے فرش پر پرانا سا گاؤ تکیہ لگائے بیٹھے تھے۔ درمیان میں کوئلے کی بجھی ہوئی انگیٹھی، کیتلی اور دو تین پیالیاں پڑی تھیں۔ وہ بہت کمزور ہو گئے تھے۔ اپنی خاص شگفتہ مسکراہٹ اور پُرخلوص شفقت کے ساتھ ملے۔ سب کا حال احوال پوچھا۔ میں اُن کے پاس دری پر بڑے ادب سے بیٹھا تھا۔ باہر دوسری منزل کا برآمدہ نظر آ رہا تھا۔ وہاں ایک بڑے صندوق پر کتابیں ہی کتابیں اور فائلیں پڑی تھیں۔ پاس ہی ایک

بوسیدہ سا صوفہ تھا۔ صوفے پر بھی ایک طرف پرانی کتابوں کا ڈھیر لگا تھا۔ وہاں کوئی شے ایسی نہ تھی جس پر گرد نہ پڑی ہو۔ اُن کی صحت ٹھیک نہیں تھی، مگر اُن کی زندہ دلی اور طبعی شگفتگی اُسی آب وتاب کے ساتھ قائم تھی۔ چہرے پر وہی شرارتی دِل آویز مسکراہٹ تھی۔ دوستوں کا نام لے لے کر پوچھا۔ ''وہ کہاں ہے؟''...... ''اس سے کہو میں لاہور ہی میں ہوں۔'' پھر مجھے ساتھ لے کر برآمدے میں آگئے۔ کچھ پرانی کتابیں اور بڑے نایاب قسم کے مسودے دِکھانے لگے۔ میں کچھ دیر اُن کی خدمت میں بیٹھا رہا۔ پھر اُن سے اجازت لی اور سیڑھیاں اُتر کر صحن میں آگیا جہاں ریڈیو پاکستان کی گاڑی کھڑی تھی۔ حفیظ صاحب کے گھر سے لے کر ریڈیو سٹیشن کے گیٹ تک میں بہت کچھ سوچتا رہا۔ مجھے بہت کچھ یاد آتا رہا۔ گاڑی ریڈیو پاکستان کے گیٹ میں داخل ہوئی تو ایک روشن دن کا سورج ریڈیو پاکستان کی عمارت کے پیچھے آہستہ آہستہ غروب ہو رہا تھا......ایک بار پھر اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ طلوع ہونے کے لیے۔''

(چاند چہرے، ص78)

حفیظ جالندھری کا انتقال 21دسمبر 1982ء کو 82 برس کی عمر میں ہوا۔ اُنھیں قبرستان ماڈل ٹاؤن لاہور میں امانتاً دفن کیا گیا۔ اِسی قبرستان میں آپ کی اہلیہ اور بیٹی کی قبور بھی ہیں۔ بعدازاں 27دسمبر 1991 کو اُن کا جسدِ خاکی مینار پاکستان کے احاطے میں منتقل کر دیا گیا۔

دِیدۂ تر سے بھی سرزد ہوا اک جرمِ عظیم
حشر میں نامۂ اعمال کو دھونا چاہا

اُن کی بے مثل اور بے لوث خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے اُن کی قبر کو مزار کی شکل دی گئی۔ اُنھیں تمغۂ حُسنِ کارکردگی اور ہلالِ امتیاز سے بھی نوازا گیا۔ اُن کے مزار کی لوح پر درجِ ذیل عبارت رقم ہے:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

مزارِ خالقِ شاہنامۂ اسلام و ترانۂ پاکستان

ابوالاثر حفیظ جالندھری مرحوم

تاریخ پیدائش: ۱۴ جنوری ۱۹۰۰ء

تاریخ وفات: ۲۱ دسمبر ۱۹۸۲ء

سنگِ بنیاد بدستِ جناب نواز شریف

وزیر اعلیٰ پنجاب ۱۴۔ اگست ۱۹۸۸ء

لوحِ مزار پر یہ عبارت بھی درج ہے:

یا اللہ بسم اللہ الرحمن الرحیم یا محمد

عرش کی رفعت لیے بیٹھا ہوں فرشِ خاک پر

سر مرا آسودہ ہے پائے رسولِ ﷺ پاک پر

خالق شاہنامۂ اسلام و ترانۂ پاکستان

ابوالاثر حفیظ جالندھری مرحوم

پیدائش ۱۴ جنوری ۱۹۰۰ء

وفات ۲۱ دسمبر ۱۹۸۲ء

سیّد امتیاز علی تاج

ہم کو مٹا سکے، یہ زمانے میں دم نہیں
ہم سے زمانہ خود ہے، زمانے سے ہم نہیں
جگر

ایک مشہور کہاوت ہے: ''افسانے کبھی حقیقت نہیں بنتے''۔ لیکن اس کہاوت کو سیّد امتیاز علی تاج نے غلط ثابت کر دکھایا اور محض 22 برس کی عمر میں ''انارکلی'' کے عنوان سے ایک شہرۂ آفاق ڈرامہ تحریر کیا۔ اُس ڈرامے میں پیش کی گئی مغل دربار کی ایک کنیز، انارکلی کے وجود سے بیشتر مؤرخین انکاری ہیں۔ لیکن اس امتیاز علی تاج نے کمال ہُنر وری سے اس کردار کو زندۂ جاوید بنا دیا۔

سیّد امتیاز علی تاج کا جنم لاہور میں شمس العلما مولوی ممتاز علی کے ہاں ہوا، جن کا علم و اَدب سے گہرا تعلق تھا اور جو لاہور ریلوے سٹیشن کے قریب اپنا ذاتی اشاعتی ادارہ ''دارالاشاعت'' کے نام سے چلا رہے تھے۔ مولوی ممتاز علی انگریزی ادب سے بہت متاثر تھے۔ یہ خوبیاں بیٹے میں بھی پیدا ہوئیں اَور باپ بیٹا دونوں انگریزی ادب کے ساتھ ساتھ اُردو کلاسیکی ادب کے بھی داعی تھے۔ امتیاز علی تاج کو ''حلقۂ نیاز مندانِ لاہور'' کے ایک سرگرم رُکن کے طور پر بھی جانا جاتا ہے۔ اسی حلقے میں حفیظ جالندھری، پطرس بُخاری، محمد دِین تاثیر، مجید ملک، ہری چند اختر، عبدالرحمان چغتائی اور مولانا عبدالمجید سالک جیسے بڑے فن کاروں کی محفل جمتی تھی۔

سیّد امتیاز علی تاج نے سکول کی تعلیم کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لیا جہاں وہ 1922ء میں راوی کے مدیر بھی رہے۔ اِسی برس اُنھوں نے ڈرامہ ''انارکلی'' تحریر کیا۔ کالج کے زمانے میں سیّد امتیاز علی تاج نے کلاسیکی انگریزی ادب کے ڈراموں کو اُردو میں ڈھالنا شروع کیا۔ اُنھوں نے کئی ترجمہ شدہ اَور بعض ڈراموں کو انگریزی ہی میں اپنی ہدایات میں

سٹیج کیا۔ سید امتیاز علی تاج اداکاری کے رُموز سے بھی گہری واقفیت رکھتے تھے۔ اُنھوں نے کالج کے زمانے میں ہدایت کاری کے ساتھ ساتھ کئی ڈراموں میں نسوانی کردار بھی ادا کیے۔ اُن کی ابتدائی تحریروں میں بچوں اور خواتین کے لیے زیادہ جگہ دکھائی دیتی ہے۔ اس حوالے سے اُن کی بہت سی تحریریں ''پُھول'' اور ''تہذیبِ نسواں'' میں ملتی ہیں۔ 1918ء میں اُنھوں نے ایک ادبی شمارے ''کہکشاں'' کی بنیاد رکھی۔ اس میں اُن کا ساتھ مولانا عبدالمجید سالک نے دیا۔ اُن کی دِیگر ادبی کاوشوں میں غلام عباس اور احمد ندیم قاسمی پیش پیش تھے۔ 1926ء میں اُنھوں نے اپنے ایک مشہورِ زمانہ کردار چچا چھکن کے حوالے سے کہانیاں تحریر کیں۔ اس مزاحیہ کردار کی بنیاد ایک مشہور انگریزی کردار ''انکل پوگر'' سے مُستعار تھی۔ اس کے بعد وہ کئی طرح کی ملازمتوں کے ساتھ ساتھ لاہور کی فلمی دُنیا سے بھی منسلک رہے، اِن مصروفیات کے باعث وہ دوبارہ انارکلی جیسا ڈرامہ تحریر نہ کر سکے۔ اس بات کا تذکرہ شاہد دہلوی نے اپنے مضمون ''لاہور... جب اور اب'' میں ان لفظوں میں کِیا ہے:

''ڈرامہ لکھنے کا شوق لاہور کے دو ادیبوں کو تھا۔ ایک حکیم احمد شجاع دوسرے سیّد امتیاز علی تاج۔ حکیم صاحب نے دو ایک فلمی کہانیاں اور مکالمے لکھ کر ادب سے قطع تعلق کر لیا۔ سیّد صاحب کو ریڈیو اور فلموں نے ایسا گھیرا کہ ''انارکلی'' کے بعد کوئی بڑا ڈرامہ نہ لکھ سکے۔ ہمارے بعض بہت اچھے ادیبوں کو نوکریاں کھا گئیں۔''

سیّد امتیاز علی تاج تمام عمر ادبی کاموں میں مصروفِ عمل رہے۔ نئی تحریروں کے ساتھ کئی پرانی کتب کو نئے سِرے سے شائع کیا۔ اُن کی شادی اُس وقت کی انتہائی پڑھی لکھی خاتون، حجاب اسماعیل سے ہوئی جو شادی کے بعد حجاب امتیاز علی کے نام سے معروف ہوئیں۔ محترمہ بذاتِ خود ایک مُستند ناول نگار کی حیثیت سے جانی جاتی ہیں۔ سید صاحب کی گھریلو زندگی اور دیگر معاملات پر شوکت تھانوی کے ایک مضمون سے ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

''گھر میں اُن کی حیثیت ایک دوست باپ، ایک مُہذب شوہر اور ایک

فراخ دل آقا کی ہونے کے علاوہ ایک معصوم بچے کی بھی ہے جو آنکھ بچا کر بد پرہیزی بھی کر سکتا ہے اور پھر نہایت بھولپن سے اس کا اعتراف بھی کر لیتا ہے۔ مثلاً پھوٹ گئی نکسیر اور ڈاکٹر نے طے کر دیا کہ یہ بلڈ پریشر کا شاخسانہ ہے۔ چنانچہ تمبا کو قطعاً بند، نہ پان میں کھا سکتے ہیں نہ سگریٹ کے طور پر استعمال کر سکتے ہیں اور کمال کیا تاج صاحب نے کہ واقعی پان بھی چھوڑ دیا جو اُن کی زندگی کی واحد عیاشی تھا۔ میں اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ نکسیر لاکھ پھوٹے مگر پانوں کے سلسلے میں تقدیر پھوٹ جائے، یہ میں برداشت نہیں کر سکتا۔ خیر میں تو یوں بھی بد پرہیز ہوں اور بڑی گھٹیا قسم کی بد پرہیزیاں کر گزرتا ہوں مثلاً گلے میں درد تھا۔ ڈاکٹر نے بولنے کی قطعی ممانعت کر دی اور کاغذ پنسل سرہانے رکھ دیا کہ لکھ کر بات کرو۔ چنانچہ میں باتیں تو لکھ لکھ کرتا رہا، جب تنہائی ملتی تھی تو تھوڑا بہت گا لیا کرتا تھا۔

تاج صاحب نے شروع شروع میں تو بڑی پابندی سے پرہیز کیا، پان واقعی نہیں کھایا مگر جب ان کو حُقہ پینے کی اجازت مل گئی تو چوری چھپے سگریٹ بھی پینے لگے اور بیگم حجاب امتیاز نے موردِ الزام اُن کو نہیں بلکہ اُن کو قرار دیا جو اُن کو سگریٹ پلا دیتے ہیں۔ میں نے اب تک سنجیدگی سے پان یا پان کے خشک مسالے کی دعوت نہیں دی ہے ورنہ شاید میں ان کو اپنے اعتماد میں لے کر اور راز داری کا وعدہ کر کے تمبا کو بھی کھلا دیتا اور وہ میری دوستی کے بے انتہا قائل بھی ہو جاتے۔

تاج صاحب مدت سے لکھ رہے ہیں اور یہ سلسلہ جاری ہے۔ اُن کا قلم ابھی بوڑھا نہیں ہوا ہے مگر فلمی سرگرمیوں نے انارکلی کے خالق سے کوئی ایسی ہی تخلیق اب تک ممکن نہ ہونے دی۔ وہ کہتے ہیں کہ ''یار علامہ یہ فلمی مشاغل واہیات'' مگر مصیبت یہ ہے کہ اب یہ کمبل نہیں

چھوڑ سکتے۔

حال ہی میں آپ ایک نئے عزم کے ساتھ اپنے دارالاشاعت کی طرف متوجہ ہوئے ہیں اور اس توجہ کے کئی شان دار ثبوت بھی پیش کر چکے ہیں۔ سلیقہ، محنت اور انہماک کی اب بھی کمی نہیں مگر خدا کرے کہ کوئی فلم پروڈیوسر پھر نہ آجائے۔''

(نقوش: شخصیات نمبر ص۔ 994)

قیامِ پاکستان کے بعد اُنھیں کی تجویز پر ریڈیو پاکستان لاہور سے ایک پروگرام ''پاکستان ہمارا ہے'' شروع کِیا گیا۔ اس پروگرام کا بنیادی مقصد لوگوں میں مِلّی شعور اُجاگر کرنا تھا۔ انارکلی کے بعد بھی اُن کے قلم سے ڈرامے اور افسانے تحریر ہوتے رہے۔ اُن کی دِیگر مشہور تحریروں میں قرطبہ کا قاضی، آرام، ظریف اَور بھارت سپوت نمایاں دِکھائی دیتے ہیں۔ اُن کے ایک مشہور افسانے ''کہ عالم دوبارہ نیست'' میں سے ایک اقتباس:

نوجوان فرعون کا ایوان نشاطِ عشرت و تجمل کا ایک نادر و یگانہ خواب تھا جسے معمار اور نجار اور مُصور اور سنگتراش کی متفقہ مجنونانہ کاوشوں نے زندگی بخش دی تھی۔ عظمت و نزہت میں اہرام کھڑے کرنے والوں کی اولاد کے شایانِ شان طول و عرض میں اس قدر وافر کہ ایک ازدحام کی جمعیت اس میں ناچیز نظر آتی تھی۔ اس کی وسعت اپنے اندر ایک شورِ قیامت کو گرم کر سکتی تھی۔ مجلّے و مصفی فرش پر منقش اور رنگین دیواروں کے ساتھ ساتھ استر کاری کے ستونوں کی ایک دُنیا آباد جن کے پائے، اور سر قدیم صناعی اور رنگ آمیزی کا ایک فردوس تھے۔ اور ان کے درمیان جا بجا دیوی بسط کے عظیم مُجسمے وقار اور تمکنت تر شے ہوئے کھڑے تھے۔ ایوان کی وسعت کے برابر نیچی نیچی اور چوڑی چکلی بے شمار سیڑھیاں دو ایسے ہی وسیع تختوں کی جانب رہنمائی کرتی تھیں۔ گرانڈیل صد شاخوں کی مختلف اللون روشنیوں میں انسانی صناعی کا یہ

حیرت ناک منظر جس میں رنگ و آہنگ کی موجوں پر خوشبوئیں ہلکورے لے رہی تھیں، اپنی تابانی و درخشا سے ہوش رُبانی کر رہا تھا۔

رنگدار پایوں کے ہزاروں تخت اور کرسیاں بچھی تھیں جن پر نوجوان فرعون کے مہمان ضیافت کے بعد رنگ رلیوں سے لطف اندوز ہونے کے لیے بیٹھے تھے۔ نیل کی مچھلیوں اور بطوں اور جنوبی جنگلوں کے غزالوں اور گایوں کے کبابوں کے ساتھ مہمانوں کو کرنب کھلایا گیا کہ اُن کی پیاس بھڑک اُٹھے جسے وہ وادیِ نیل کے انگوروں کی لال اور سفید شراب سے بجھا سکیں۔''

اب چچا چھکن میں سے یہ قاشیں ملاحظہ کیجئے:

''چچا چھکن کبھی کبھار کوئی کام اپنے ذمے کیا لے لیتے ہیں، گھر بھر کو تگنی کا ناچ نچا دیتے ہیں۔ آ بے لونڈے۔ جا بے لونڈے ۔ یہ کیجیو، وہ دیجیو۔ گھر بازار ایک ہو جاتا ہے۔ دُور کیوں جاؤ، پرسوں پر لے روز کا ذکر ہے، دُکان سے تصویر کا چوکھٹا لگ کر آیا۔ اُس وقت تو دیوان خانے میں رکھ دی گئی، کل شام کہیں چچی کی نظر اُس پر پڑی تو بولیں: چُھٹن کے ابا تصویر کب سے رکھی ہوئی ہے۔ خیر سے بچوں کا گھر ٹھہرا، کہیں ٹوٹ پھوٹ گئی تو بیٹھے بٹھائے روپے دو روپے کا دھکا لگ جائے گا۔ کون ٹانگے گا اس کو؟

''ٹانگتا اور کون، میں خود ٹانگوں گا، کون سی ایسی جوئے شیر لانی ہے، رہنے دو میں ابھی سب کچھ خود ہی کیے لیتا ہوں'' کہنے کے ساتھ ہی شیروانی اُتار، چچا تصویر ٹانگنے کے درپے ہو گئے۔ امامی سے کہا ''بیوی سے دو آنے پیسے لے کر میخیں لے آ۔'' اِدھر وہ دروازے سے نکلا اُدھر مودے سے کہا: ''مودے! مودے! جانا امامی کے پیچھے، کہیو تین انچ

کی ہوں میخیں۔ بھاگ کر جا۔ جالیجو اسے راستے ہی میں۔'' لیجئے تصویر ٹانگنے کی داغ بیل پڑ گئی اور اب آئی گھر بھر کی شامت۔

ننھے کو پکارا: ''او ننھے جانا ذرا میرا ہتھوڑا لے آنا۔ بنّو! جاؤ اپنے بستے میں سے چفتی نکال لاؤ اور سیڑھی کی ضرورت بھی تو ہوگی ہم کو۔ ارے بھائی للّو! ذرا تم جا کر کسی سے کہہ دیتے سیڑھی یہاں آ کر لگا دے، اور دیکھنا وہ لکڑی کے تختے والی کرسی بھی لیتے آتے تو خوب ہوتا۔ چھٹن بیٹے! چائے پی لی تم نے؟ ذرا جانا تو اپنے ان ہمسائے میر باقر علی کے گھر، کہنا ابا نے سلام کہا ہے اور پوچھا ہے کہ آپ کی ٹانگ اب کیسی ہے اور کہیو وہ جو ہے نا آپ کے پاس کیا نام ہے اس کا۔ اے لو بھول گیا۔ پلول تھا کہ ٹلول۔ اللہ جانے کیا تھا خیر وہ کچھ بھی تھا۔ تو یوں کہہ دیجو کہ وہ جو آپ کے پاس آلہ ہے نا جس سے سیدھ معلوم ہوتی ہے، وہ ذرا دے دیجیے۔ تصویر ٹانگنی ہے جائیو میرے بیٹے! پر دیکھنا سلام ضرور کرنا اور ٹانگ کا پوچھنا نہ بھول جانا...... یہ تم کہاں چل دیے للو؟ کہا جو ہے، ذرا یہیں ٹھہرے رہو۔ سیڑھی پر روشنی کون دکھائے گا ہم کو؟ آ گیا امامی؟ لے آیا میخیں؟ موا مل گیا تھا؟ تین تین انچ ہی کی ہیں نا؟ بس بہت ٹھیک ہیں۔ اے لو ستلی منگوانے کا تو خیال ہی نہ رہا۔ اب کیا کروں؟ جانا میرا بھائی جلدی سے ہوا کی طرح جا اور دیکھو بس گز سوا گز ہو ستلی۔ نہ بہت موٹی ہو نہ پتلی۔ کہہ دینا تصویر ٹانگنے کو چاہیے ہے۔ لے آیا؟ او وڈّو کہاں گیا؟ وڈّو میاں! اسی وقت سب کو اپنے اپنے کام کی سُوجھی ہے؟ یُوں نہیں کہ آ کر ذرا ہاتھ بٹائیں۔ یہاں آؤ۔ تم کرسی پر چڑھ کر مجھے تصویر پکڑانا۔''

اس عظیم المرتبت نثر نگار اور ڈرامہ نویس کی وفات انتہائی المناک اور پُر اسرار تھی۔ ۱۹ اپریل ۱۹۷۰ء کی رات تھی۔ تاج صاحب اَور اُن کی بیگم اپنے گھر میں سو رہے تھے۔ کسی

نا معلوم قاتل نے گھر میں گھس کر اِنتہائی بے رحمی سے اُنھیں قتل کر دیا۔ مزاحمت کرتے ہوئے حجاب امتیاز علی بھی شدید زخمی ہوگئیں۔ اِس قتل کے پیچھے کس کا ہاتھ تھا، قاتل کون تھا، اِن سوالوں کا جواب شاید کبھی نہ مل سکے۔ اُنھیں قبرستان مومن پورہ میں دفن کیا گیا۔ اُن کی قبر کے کتبے کی تفصیل پروفیسر اسلم نے خفتگانِ خاکِ لاہور میں صفحہ 300 پر تحریر کی ہے:

اُن کے مزار کا کتبہ امامِ فن حافظ یُوسف سدیدی مرحوم کے قلمِ معجز نگار کا شاہکار ہے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ حافظ سدیدی کے اِن فن پاروں کو عجائب گھر میں محفوظ کر دیا جائے۔ لوحِ مزار پر یہ عبارت کندہ ہے:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

یاایتھا النفس المطمئنة ارجعی الی ربک راضیة مرضیة

مرقد

سیّد امتیاز علی تاج

ولادت ۱۳ اکتوبر ۱۹۰۰ء

شہادت ۱۹ اپریل ۱۹۷۰ء

باغِ جنت میں شگفتہ ہو ترے دل کی کلی
تجھ کو عقبیٰ میں ملے قربِ حسین ابن علیؑ

۱۳۹۰ھ

محمد دین تاثیر

1902ء–1950ء

طرز یہ تخئیل کا، اسلوب یہ تحریر کا
چھپ نہیں سکتا چھپائے سے بیاں تاثیر کا
آنکھ اب تک دیکھتی ہے لب ترے ہلتے ہوئے
جان لیتے ہیں مزہ اب تک تری تقریر کا
تاثیر

محمد دین تاثیر کا شمار اُن شخصیات میں ہوتا ہے جنھوں نے عہد انگلشیہ میں نہ صرف ہندوستان میں اپنے علم و دانش کا سکہ جمایا بلکہ وہ انگلستان، امریکہ اور دُنیا کے کئی دِیگر مما لک میں بھی برِصغیر کی پہچان بنے۔ تاثیر کو انگریزی، اُردو اور فارسی تینوں زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ اُنھوں نے اپنی مادری زبان پنجابی میں کچھ تحریر نہ کیا مگر اپنے آپ کو پنجابی کہہ کر فخر محسوس کرتے رہے۔ تاثیر کے بارے میں بھی بلاشبہ کہا جاسکتا ہے کہ رب تعالیٰ نے اُنھیں کئی صلاحیتوں سے نواز کر دُنیا میں بھیجا اور اِس کے بعد وہ اپنی بے پناہ محنت اور ریاضت کے باعث ایک ہی وقت میں عظیم اُستاد، ماہر نقاد، ماہرِ علمِ موسیقی، بہترین شاعر اور کمال کے نثر نگار مانے گئے۔ اِس کے ساتھ ساتھ وہ مُصوری اور مُجسمہ سازی کی باریکیوں سے بھی گہری آشنائی رکھتے تھے۔ وہ تاثیر ہی تھے جنھوں نے عظیم مُصور و خطاط عبدالرحمان چغتائی کو ہندوستان کے علاوہ باہر کی دُنیا میں بھی رُوشناس کروایا۔ وہ ہمیشہ اُردو زبان کے داعی رہے۔ لیکن افسوس کی بات ہے کہ تخلیقِ پاکستان کے بعد تاثیر جیسی عظیم شخصیت کی ذات اور اُن کے بے پناہ تخلیقی کام کی وہ سنبھال نہ ہوسکی جس کے وہ حق دار تھے۔ تاہم اِس ضمن میں فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی اور ممتاز مرزا کی کوششیں بہرحال قابلِ ستائش ضرور ہیں۔

تاثیر کا جنم 1902ء میں امرتسر (پنجاب۔مشترکہ ہندوستان) کے قریب ایک قصبے اجنالہ میں ہوا۔ یہ بات انتہائی حیران کن ہے کہ تاثیر جیسی علمی و ادبی شخصیت کے پیدائش کے مہینے اور دِن کے بارے میں اُن کی حوالہ جاتی کتب میں کوئی معلومات درج نہیں۔

اُن کی پیدائش کے محض دو برس بعد امرتسر اور اس کے گرد و نواح میں طاعون کی وبا پھیلی۔ اس بیماری کے باعث پہلے اُن کی والدہ اور بعد میں والد کا انتقال ہو گیا۔ والد کی وفات کے بعد تاثیر لاہور میں اپنی خالہ کے گھر آ گئے۔ اُن کی خالہ اُس وقت لاہور کے ایک انتہائی معزز رئیس میاں نظام الدین کی تیسری اہلیہ تھیں۔ میاں صاحب ایک زِیرک انسان تھے اَور اُن کا شمار اہلِ علم اور اہلِ نظر میں ہوتا تھا۔ اُنھوں نے تاثیر کی پرورش میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ یہ اُن کی رفاقت کا اثر تھا کہ کتاب بینی کا شوق تاثیر میں پروان چڑھتا گیا۔ میاں نظام الدین کے ذاتی کتب خانے میں کئی نادر اور نایاب کتب موجود تھیں، تاثیر جن کا مطالعہ سکول کے ایام میں کرتے رہے۔ اُنھوں نے ''اسلامیہ ہائی سکول شیرانوالہ گیٹ'' سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ سکول کے بعد ایف سی کالج لاہور میں داخلہ لیا اور پھر یہیں سے ایم اے انگریزی کی ڈگری حاصل کی۔ کالج کے دِنوں ہی سے تاثیر کا رُجحان ادبی سرگرمیوں کی جانب تھا اور وہ اس عہد کے کئی نوجوانوں کی شناخت ''اقبالؒ'' کی شخصیت سے انتہائی متاثر تھے اَور اقبالؒ کے ساتھ اُن کے ذاتی مراسم بھی تھے۔ ایم اے انگریزی کے بعد اُنھوں نے لأ کالج میں داخلہ لیا لیکن قانون کی تعلیم کی طرف طبیعت زیادہ مائل نہ ہوئی نے کوئی خاص میل نہ کھایا اور یہ سلسلہ ابتدا ہی میں ٹوٹ گیا۔ اُن دنوں میں اسلامیہ کالج لاہور میں جے وی کی کلاسوں کے لیے انگریزی اُستاد کی ضرورت تھی اور تاثیر کو اسلامیہ کالج میں پڑھانے کا موقع مل گیا۔ چند ماہ کے بعد اُنھوں نے علامہ اقبالؒ کی وساطت سے حکومتِ پنجاب کے ایک ادارے ''پریس برانچ'' میں ملازمت حاصل کر لی۔ اس نوکری سے بھی دل جلد اُکتا گیا اور تاثیر نے ایک بار پھر اسلامیہ کالج لاہور میں پڑھانا شروع کر دیا جہاں وہ 1928ء سے 1934ء تک پڑھاتے رہے۔ 1934ء ہی میں تاثیر انگریزی میں پی ایچ ڈی کرنے کے لیے کیمبرج یونیورسٹی برطانیہ چلے گئے۔ ستمبر 1934ء میں تاثیر نے ایک خط مولانا سیّد سلیمان ندوی کو تحریر کیا جس میں سے کچھ قاشیں یہاں درج کی جارہی ہیں۔ اُنھوں نے اپنی تعلیمی مصروفیات کا تذکرہ بھی کیا۔ یہ خط

مقالات تاثیر (ص۔629) چھپا اس میں سے کچھ اقتباسات درج ذیل ہیں:

''میرا موضوع:

آپ خوش ہوں گے کہ جو کام میں کر رہا ہوں وہ ادبی بھی ہے اور اسلامی بھی۔ دِین و دُنیا دونوں کی بہتری کی اُمید ہے، انشا اللہ۔ میرے مضمون کا عنوان ہے''مشرق کا تصور انگریزی ادب میں۔ اَز ابتدا تا حال''۔مشرق سے مغرب کی بیشتر مُراد مسلمان ہی رہے ہیں اور میرے اس کام سے عجب عجب انکشافات کی توقعات ہیں۔ شاید ہمارے اُن مغرب زدہ حضرات کو، جو آپ ہی آپ مغرب کو مذہب سے عاری قرار دے کر اپنے دماغی افلاس کے لیے سہارا ڈھونڈتے رہتے ہیں، کچھ عبرت حاصل ہو۔ میں نے یہ کام بالکل ہی ابتدائے عہد سے شروع کیا ہے۔ آج کل اینگلو سیکسن عہد کی تصنیفات میں مشغول ہوں۔مشکل یہ ہے کہ انگریزی ادب کی ہر صنفِ نظم و نثر، ڈرامہ، ناول، سیاست وغیرہ کی کتب کو میرے زاویے سے کبھی نہیں دیکھا گیا، اس لیے وہ مجھے پوری راہبری کی اُمید نہیں دلاتے۔لیکن یہاں کے پروفیسر اس قدر فنا فی العلم ہیں اور اس قدر خوش اخلاق اور منکسر المزاج ہیں کہ ہر وقت ہر قسم کی مدد کے لیے تیار رہتے ہیں۔

یورپین اساتذہ اور مذاہب:

میرے نگرانِ کار، جو انگریزی شعبے کے صدر ہیں، نائیٹ ہیں اور بیسیوں کتابوں کے مصنف ہیں اور عہدِ حاضر کے مُشاہیر میں شمار ہوتے ہیں... سر آرتھر کولرج ...وہ ان تمام صفات میں شاید سب سے برتر ہیں، مغربی کلچر کا بہترین نمونہ ہیں، مگر گرجے بھی جاتے ہیں اور مذہبی تصنیفات سے بھی پوری طرح واقف ہیں۔کل ہی اُن کی میز پر پلوٹیشن پر ڈین انگ کی کتاب پڑی تھی۔ ہمارے ''تعلیم یافتہ'' حضرات میں سے کتنے ایسے ہیں جنھوں نے سِیرت ہی کو اچھی طرح تو

کیا، پڑھا ہی ہو۔ اُنھوں نے مخالفوں کی تحریروں کو بھی نہیں پڑھا ہوتا۔ اس میں قصور ہمارا اپنا ہی ہے۔ انگریزی کی سرکاری درسگاہوں میں مذہبی تعلیم کا نہ ہونا تو شاید قابلِ مدافعت ہو لیکن ہمارے اسلامی اداروں میں جو بے نیازی برتی جاتی ہے، اس کا کیا جواب ہے۔ کیا مسلم یونیورسٹی میں کوئی باقاعدہ Syllabus موجود ہے؟ کیا اس قسم کی کوئی تجویز پیش نظر ہے؟ میں نے اپنے کالج والوں کو تو چند تجاویز لکھ کر بھیجی ہیں۔ دیکھئے کیا انجام ہوتا ہے۔ اربابِ کار کو آپ سے استمداد کے لیے بھی لکھا۔ اُمید ہے کہ آپ میری پرانی عادت سمجھ کر معاف کر دیں گے۔ (ایک دو ادبی رسائل کو حال ہی میں آپ کے پیچھے ڈال چکا ہوں) مگر ایسا کام تو اسلامی دُنیا کے کسی گوشے میں ہو، آپ کی طرف لازمی طور پر ہاتھ پھیلائے جائیں گے، ضروریاتِ حاضرہ کے مطابق دِینی تعلیم کا نظامِ تدریسی!

دیوان کے متعلق گب نے دوسری جلد کے کسی حاشیے میں ریویو سے اختلاف کیا ہے، مگر نہ دلائل دیے ہیں اور نہ کنگز کالج اور نہ پیٹرز برگ کے حوالہ جات کی تردید کی ہے، حالانکہ براؤن نے نظرِ ثانی اور ترتیب کی ہے بلکہ لکھا ہے کہ ریویو کی یہ غلطی النادر کالمعدوم کالعدم کا حکم رکھتی ہے۔

آئندہ کام:

مجھے ڈر ہے کہ میرا خط ''مقالۂ افتتاحیہ'' بنتا جاتا ہے۔ اسے چار مہینے کی خاموشی کا ردِعمل سمجھیے۔ اب نئے ٹرم کا آغاز ہے، لہٰذا 9 جون تک مصروف رہوں گا۔ پھر لمبی چھٹیوں کا بیشتر حصہ برٹش میوزیم میں گزاروں گا۔ کیمبرج ہی میں رہنا مگر یہاں کی لائبریری کئی صدیوں کے بعد نئی عمارت میں منتقل ہو رہی ہے، لہٰذا چار مہینے تک بند رہے گی۔ پروفیسر اور ریسرچ کرنے والے طلبہ سراسیمہ ہو رہے ہیں۔ مجھے خود لندن کا شور وغوغا پسند نہیں مگر مجبوری ہے۔ شاید کچھ عرصہ فرانس

میں رہوں۔ وہاں کی گیلری دوبارہ بہ اِطمینان دیکھنا چاہتا ہوں اور خوش قسمتی سے فرانسیسی سیکھنے کے لیے جو وظیفہ ملا ہے، اُس کے لیے بھی وہاں جانا ضروری ہوگا۔ لہجہ دُرست کرنے کی خاطر۔

تعلیمی کامیابی:

آپ خوش ہوں گے کہ پہلے ٹرم کے کام کے بعد مجھے انگلش بورڈ نے ایم لٹ سے اٹھا کر پی ایچ ڈی میں ڈال دیا ہے۔ اس سے میرے بعد آنے والے ہندوستانی اور دِیگر اجنبی طلبہ کے لیے نظیر قائم ہوگئی ہے۔ گو براہِ راست انگریزی کی پی ایچ ڈی میں نہیں لیں گے مگر دو تین ماہ کے کام کے بعد تو لے لیں گے، قاعدہ کلیہ کی استثنا تو ہوگئی۔

میں شاید پہلا ہندوستانی ہوں گا جیسے انگریزی میں کیمبرج یا آکسفورڈ سے پی ایچ ڈی ملے گی، خدا اگر کامیاب کر دے۔ مجھے اپنی نااہلیت کا سخت احساس ہے، میرے لیے دُعا مانگتے رہیے، میں آپ کی دُعاؤں کا بے حد محتاج ہوں:

آنانکہ خاک را بنظر کیمیا کنند
آیا بود کہ گوشۂ چشمے بما کنند

دیگر کار لائقہ سے یاد فرمایئے۔ آپ نے لکھا تھا کہ تم سے بہت سے کام لینے ہیں، فرمایئے۔‘‘

(مقالاتِ تاثیر۔صفحہ 629)

تاثیر کی ادبی زندگی 1928ء سے شروع ہو کر آخری سانس 1950ء تک جاری رہی۔ اس دور میں اُن کی ادبی سرگرمیاں ہندوستان اور انگلستان دونوں جگہوں پر جاری رہیں۔ وہ اختر شیرانی کے مانند اُردو شاعری میں جدت کے رُجحان کو پسند کرتے تھے۔ اُنھوں نے نثری نظموں کے بھی کئی کامیاب تجربات کیے اور غزل کی پرانی روایت کو بھی جاری رکھا۔ ذیل

میں اُن کی دو نظمیں اور غزلیں پیش کی جا رہی ہیں:

سنہری دِیا

سنہری دِیا جھلملانے لگا ہے
پُرافشاں ہیں سائے
کہ دریا پہ جیسے
ہوائیں، رِدائیں
سیہ، قرمزی سے کنارے
اُبھرتی سی لہریں دمکتے سے دھارے
سنہری دیا جھلملانے لگا ہے!......
کہ جیسے کسی سرمئی فاختہ کے
کلیجے میں چبھ جائیں سونے کے کانٹے
نہ مژگاں نہ بازو نہ پَر پھڑ پھڑائیں
مگر ہلکی ہلکی سی آہیں کہ دریا پہ جیسے ہوائیں
سنہری دِیا جھلملانے لگا ہے!—

سنہری دیا جھلملانے لگا ہے
ہوا ہے مخالف مگر کچھ نہیں ہے
سنہری دِیے پر اثر کچھ نہیں ہے
جو دشمن ہے بیرونِ در، کچھ نہیں ہے
سنہری دِیا جھلملانے لگا ہے

کہ بتی کے بل سب کے سب کھل گئے ہیں،
کہ روغن کے قطرے جو تھے آنسوؤں کی طرح

پھوٹ کر بہ رہے ہیں‘‘!
سنہری دِیا جھلملانے لگا ہے!—

نغمۂ شب

یہ میں نے تاروں سے شب کو پوچھا — ہے کوئی تحفہ کسی کے قابل!
زمیں سے تا آسماں خموشی — یہ کہہ رہی تھی سکوتِ کامل!

سکوتِ کامل میں چلنے والے — محیطِ دریا سے میں نے پوچھا :
کہ تیرے دامن بھرے ہوئے ہیں،
زر و جواہر لدے ہوئے ہیں!
مگر، ہے گہرائیوں میں تیری،
کوئی بھی تحفہ کسی کے قابل؟
فضائے تاریک و تار دُنیا
یہ کہہ رہی تھی سکوتِ کامل

سکوت کامل! سکوت کامل
یہ کون تحفہ ہے کس کے قابل؟

میں اُن کو نغمے سنا سکوں گا!
میں آہ و زاری بپا کروں گا!
میں ہر طرح حالِ دل کہوں گا
مگر خموشی! سکوتِ کامل
یہ مجھ سے اے دل نہ ہوسکے گا!
سکوتِ کامل نہ ہوسکے گا!

غزلیں

تیرے اندازِ تغافل کو حیا سمجھا تھا میں
جورِ پیہم کو بھی اک طرزِ وفا سمجھا تھا میں
تجھ کو اپنی زندگی کا آسرا سمجھا تھا میں
اے فریبِ آرزو تم کیا تھے کیا سمجھا تھا میں
شیوۂ تسلیم تھا مجھ کو مآلِ زندگی
تیری ہر خواہش کو اپنا مدعا سمجھا تھا میں
تشنہ کامانِ محبت کی اُمنگیں کچھ نہ پوچھ
انتہائے آرزو کو ابتدا سمجھا تھا میں
زلف آوارہ گریباں چاک اے مستِ شباب
تیری صورت سے تجھے درد آشنا سمجھا تھا میں

یہ اختیار میسر کہ چاہتا ہوں تجھے
اور اس پہ جبر کہ تجھ پر کچھ اختیار نہیں
ستارے شمع بہ کف منتظر ہیں صف بستہ
یہ کہکشاں کہیں ان کی تو رہ گزار نہیں
وہ تو کہ تیری ہنسی زہر خند ہے واعظ
یہ مے کہ تلخ ہے اور پھر بھی ناگوار نہیں
وہ تیرا اپنا فرشتہ، وہ دشمنِ آدم
میں کیا کروں کہ مجھے اس پہ اختیار نہیں
ترے کرم کی قسم تیری بخششوں کے طفیل
وہ پاکباز نہیں جو گناہ گار نہیں
قدم قدم پہ ہیں پھانسیں یہاں وہاں صیاد
بہار نام ہے کس کا جو یہ بہار نہیں

تاثیر کی نثری اور تحقیقی تحریریں مختلف ادبی مجلوں اَور جریدوں کی زینت بنتی رہیں۔ لیکن کوئی بھی نثری اور شعری مجموعہ اُن کی زندگی میں نہ چھپ سکا۔ اس کی ایک وجہ شاید تاثیر کی اپنے کام کے حوالے سے درویشی یا بے پرواہی تھی۔ اُن کی تحریریں زیادہ تر مخزن، نیرنگِ خیال، عالمگیر، شاہکار، ادبی دُنیا، کارواں، نرگس، قوسِ قزح، ماہِ نو، ادبِ لطیف اور نقوش جیسے پرچوں کا حصہ بنیں۔ ''نیرنگِ خیال'' کا اُن کی زندگی میں خاص کردار رہا۔ وہ دو برس کے لیے 1924ء سے 1926ء تک اِس کے نائب مدیر بھی رہے۔ تاثیر اپنے اصلی نام کے علاوہ کئی دِیگر قلمی ناموں سے بھی مضامین تحریر کرتے رہے۔ نثر میں ''نظامی قدوسی''، ''مفکر'' اَور ''ڈاکٹر حجازی'' کے نام سے مضامین اور شاعری میں ''فتونہار'' کے نام سے لکھتے رہے۔ لندن میں ادبی سرگرمیوں کے حوالے سے اُنھوں نے ایک خط مولانا عبدالمجید سالک کو اپریل 1935ء میں تحریر کیا (یہ خط بھی مقالاتِ تاثیر میں موجود ہے۔ اِس میں سے ایک اقتباس درجِ ذیل ہے:

''یورپ کا مطلع بہت مکدر ہو رہا ہے۔ ان گرمیوں میں خدا خیر کرے۔ اگر اب کے یہ بلا ٹل گئی تو سردیاں محفوظ رہیں گی۔ میں سردیوں میں آ رہا ہوں۔ جرمنی کی تیاری اکتوبر میں مکمل ہو گی، انگلستان کی نومبر میں۔ اسی طرح ہر ملک اسی سال پوری طرح لیس ہو جائے گا۔ مگر ہر ملک یہ چاہتا ہے کہ دوسرے کی تیاری سے پہلے لپک پڑے، 1914ء کی طرح۔ آپ کو یاد ہے 1914ء میں Kiel Canal مکمل ہوئی تھی۔ لہٰذا لارڈ فشر 1911ء میں جرمنی پر حملہ کرنا چاہتا تھا۔ کنگ ایڈورڈ اس کا حامی تھا مگر وہ مر گیا اور جرمنی نے Canal بنتے ہی حملہ کر دیا۔

آج کل یہاں Jubilee کا چرچا ہے۔ ایک پُرلطف پمفلٹ شائع ہوا ہے: *The Jubile and How* اِبتدا ملاحظہ ہو۔

Trade risk in the King Business

By

T.A. Jackson

On May 6th, we shall all have a holiday. For most of us this will be without pay, but all of us will be (officially) expected to rejoice, why!

To hold a job in a competitive market for a quarter of a century, is, nowadays, no small fect. And though the post of a king can hardly be said to fall within the competitive category, there have been in the past years as many cases of kings deposed, dethroned and otherwise placed on the retired list that we all can well understand why....

شاید ہندوستان میں ایسی باتیں کشتنی قرار دینے کے قابل ہوں گی۔

یہاں بھی کوئی اتنی آزادی نہیں۔ قانوناً سہی مگر اقتصادی بندشیں کچھ کم نہیں اضافی طور پر۔

''افکار'' میں ایک صاحب جلال قریشی کی ناک کے بیمے کے متعلق لکھا تھا۔ یہ صاحب جالندھری ہیں۔ بڑے باہمت مسلمان ہیں۔ عطریات کا ایک کارخانہ لنڈن میں کھول رکھا ہے۔ ناک کا بیمہ عطر شناسی کے لیے کرایا تھا، علی گڑھ کے اولڈ بوائے ہیں۔ چنانچہ علی گڑھ ایسوسی ایشن کے جلسے پر ان کا ایجاد کردہ عطر Klex Marine شہزادی مرینہ کی شادی کی تقریب پر present کیا گیا ہے جسے بصد تشکر قبول کیا گیا۔ آپ BBC میں براڈ کاسٹ بھی کر چکے ہیں۔ ان کے عربی لباس میں فوٹو اخبارات میں چھپتے رہتے ہیں۔ پلاؤ اچھا پکاتے ہیں۔

ہندوستانی بزم پُرلطف چیز ہے۔ چائے اور شاعری ہوتی ہے۔ سر شادی لال بھی ہوتے ہیں۔ غرض ہر طرح مخلوط جلسہ ہوتا ہے مرد، عورتیں، ہندو، مسلم، عیسائی، افرنگی، پارسی، ہندی افراد کا۔ پچھلے جلسے میں آئندہ جلسے کی تاریخ اور دن کا تعین ہو رہا تھا تو سر عبدالقادر نے گنتی میں کچھ غلطی کی۔ سر شادی لال نے ٹوک دیا تو سر عبدالقادر فوراً بول اٹھے کہ صاحب! حساب میں مَیں ہمیشہ آپ سے دبا رہا ہوں۔ ''ہمیشہ'' پر فرمائشی قہقہہ ہوا۔ سر شادی لال غالباً اس مذاق کو سمجھے ہی نہیں، لہٰذا رسید ہی نہیں دی۔ شاید مصلحتاً سمجھے ہی نہیں۔ اس بزم میں میں نے ایک دو بار ''بالِ جبریل'' سے بھی کچھ سنایا ہے۔ 16 اپریل کو ایک اور جگہ میں نے علامہ اقبالؒ پر ایک مضمون بھی پڑھا تھا۔ اس میں تازہ ترین کلام پر تبصرہ بھی تھا۔ لوگ ''بالِ جبریل'' کی سلاست پر بہت خوش اور حیران تھے۔

اور کیا لکھتا چلا جاؤں، مجھے اب برٹش میوزیم جانا ہے اور پھر ایک دن میں تین دعوتیں۔ لنچ، چائے اور ڈنر، تینوں جابجا لندن کے فاصلوں کا

اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ مجھے پچیس میل سے زیادہ مُسافت طے کرنی ہوگی ان تینوں کو بُھگتانے کے لیے۔ یہ مہنگا سودا ہے۔ دو اڑھائی روپے کرایہ پڑ جاتا ہے۔''

(مقالاتِ تاثیر۔صفحہ 637)

تاثیر اُردو زبان کے داعی بھی تھے اور اس کے ساتھ پنجابی نیشنلزم کے حامی بھی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ پنجابی زبان کو اُردو زبان کی ماں زبان اور بنیاد گردانتے تھے۔ مئی 1928ء میں اُنھوں نے پروفیسر محمود شیرانی (حافظ محمود شیرانی) کی کتاب ''پنجاب میں اُردُو'' پر تبصرہ تحریر کیا۔ یہ تبصرہ ''مخزن'' میں چھپا اور بعد میں مقالاتِ تاثیر میں شامل ہوا۔ اس کے ص393 میں سے ایک اقتباس درج ذیل ہے:

''پنجابی اور اُردُو'' کا باب بہت اہم ہے۔ اس میں مصنف نے پوری طرح ثابت کر دیا ہے کہ اُردُو، بھاشا سے بھی زیادہ پنجابی سے ملتی ہے۔ اگر مُماثلت کی وجہ سے بھاشا کو اس کی اصل قرار دیا جاسکتا ہے تو پنجابی کو یہ حق کیوں نہ دیا جائے۔ کیونکہ فارسیوں اور ہندیوں کا امتزاج (جسے نئی زبان کے بننے کی وجہ قرار دیا جاتا ہے) اوّل اوّل پنجاب ہی میں ہوا۔

اوّل تو ساٹھ فیصد لُغت اُردو اور پنجابی کی ایک ہے۔ یہ تھوڑی سی بات نہیں، پھر صرف ونحو میں بہت مماثلت ہے مثلاً

(1) مصدر کا قاعدہ دونوں زبانوں میں ایک ہے۔

(2) تذکیر و تانیث کے قواعد ایک ہیں۔ وہی مُغل سے مُغلانی، اونٹ سے اونٹنی، میراثی سے میراثن، کھتری سے کھترانی۔

(3) اعلام و اسما اور اسمائے صفات دونوں زبانوں میں الف پر ختم ہوتے ہیں جبکہ برج بھاشا میں واو مجہول پر ہوتے ہیں۔

(4) اسما صفات تذکیر و تانیث اور جمع واحد اپنے موصوف کی حالت کے مطابق ہوتے ہیں:

اُردُو: (1) میرا لڑکا (2) بڑے لڑکے (3) دوڑتے گھوڑے سے

پنجابی: (1) میرا مُنڈا (2) وڈے منڈے (3) دوڑ دے گھوڑے توں۔

برج بھاشا میں اس موقع پر میرو چھورا وغیرہ بولیں گے۔

جہاں اس قاعدے سے اختلاف ہے، وہ بعد کی ایجاد ہے مثلاً پنجابی میں ہے ''چھوٹیاں کڑیاں'' اُردو میں ہے ''چھوٹی لڑکیاں'' مگر قدیم اُردو میں صِفت بھی جمع تھی۔

احمد دکنی:

سو چا دون سے پالیاں سو پالیاں لکھیاں

(5) خبر تذکیر و تانیث اور واحد جمع میں مبتدا کے مطابق ہوتی ہے۔''

اُردُو: (1) یہ بات بھلی نہیں ہے۔ (2) یہ باتیں بھلی نہیں۔

پنجابی: (1) ایہہ گل بھلی نہیں۔ (2) ایہہ گلاں بھلیاں نہیں۔

اُردو کے جملہ میں جمع کے متعلق اختلاف ہے مگر سودا کے وقت یہ بے ضابطگی نہ تھی:

دوانہ ہوگیا سودا تو آخر ریختہ پڑھ پڑھ
نہ میں کہتا تھا اے ظالم کہ یہ باتیں نہیں بھلیاں

غرض بیسیوں ہی مماثلتیں ہیں جو فاضل مصنف نے پیش کی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اُردو اور پنجابی کی ولایت گاہ ایک ہی مقام ہے۔ دونوں نے تربت بھی ایک ہی جگہ پائی ہے۔ جب تنہائی ہوگئی ہے، تب ان میں جدائی واقع ہوئی ہے۔ اختلاف اس وقت ہوئے جب دہلی اور لکھنؤ کے شعرا نے اسے لے پالک بنا لیا اور ان کی اصلاح و ترمیم

ہر موقع پر بہتر نہ تھی مثلاً افعال و اسما سے جمع مؤنث کے ترک کرنے سے اُنھوں نے موسیقیت اور خوش آہنگی کا ایک بڑا عنصر برباد کر دیا۔ سودا کے یہ شعر دیکھو۔ ایک مسلسل ترنم ہے:

خاک وخوں میں صورتیں کیا کیا نہ رلیاں دیکھیاں
اے فلک باتیں تری کوئی نہ بھلیاں دیکھیاں
وہ رہا دستِ تاسف کے تئیں ملتا ہوا
جس نے وہ اکھیاں خمار آلود ملیاں دیکھیاں

اب ان اشعار کو اگر کسی زمانۂ حال کے فارسی زدہ پنجابی گو شاعر کے کلام سے ملایا جائے تو یقینا سودا کے شعر پنجابی سے زیادہ مماثل ہوں گے اور سودا کے شعر ذرا سی تبدیلی سے ٹھیٹھ پنجابی بن سکتے ہیں— ایسی پنجابی کہ چوہدری شہاب الدین بھی خوش ہو جائیں:

خاک وخوں وچ صورتاں کیا کیا نہ رلیاں ویکھیاں
اے فلک تیریاں کوئی گلاں نہ بھلیاں ویکھیاں
اوہ رہیا دستِ تاسف دے تئیں ملدا ہویا
جس نے اوہ اکھیاں خمار آلود سلیاں ویکھیاں

سب سے زیادہ اہم وہ حصہ ہے جہاں مصنف نے وہ نمونے دِکھائے ہیں جو اُردو میں متروک ہو گئے ہیں مگر پنجابی میں موجود ہیں۔ مثلاً:

(1) ''سی'' بمعنی گا۔ ملتانی میں ہے اُردو میں نہیں۔ ولی دکنی اُردو شاعری کا باوا آدم:

کیا ہے زہر کا تاثیر اس میں
نہ چل سی کچھ مرا تدبیر اس میں

(2) پنجابی میں بعض مصادر کی ماضی خلافِ قاعدہ آیا کرتی ہے۔ مثلاً کرنے، لینے سے، کیتا لیتا۔ یہ برج بھاشا اور جدید اُردو میں غیر مُستعمل ہے۔ لیکن قدیم اُردو میں ہے:

جو کچھ تم نے لیا سو ہم نے لیتا

جو کچھ تم نے کیا سو ہم نے کیتا

برج بھاشا والے کینا، لینا وغیرہ بولتے ہیں۔

(3) پنجابی میں غیر زبان کے آگے ''ی'' زائد اضافہ کر دیتے ہیں۔ حیات سے حیاتی— نظر سے نظری وغیرہ۔ قدیم اُردو میں ہے:

ہماری موت اور ان کی حیاتی
اگر ہوتی تو مجھ کو ایہہ (اے) خوش آتی

اور تو اور آتش لکھنوی لکھتا ہے:

بہارِ گلستاں کی ہے آمد آمد
خوشی پھرتے ہیں باغباں کیسے کیسے

اس شعر کی بنا پر کئی لوگ آتش کو جاہل اور ان پڑھ قرار دیتے ہیں، حالانکہ وہ پنجابی محاورہ کا صحیح استعمال کر رہا تھا۔

فاضل مصنف نے اس سلسلے میں کئی اُردو کے مزعومہ توابع مہمل کی توضیح کی ہے اور ایسے الفاظ، جو آج تک لُغت نویسوں کے لیے بُجھارت بنے ہوئے تھے، واضح کر دیا ہے کہ یہ اصل میں پنجابی کے ہم معنی الفاظ ہیں مثلاً دن دہاڑے، مانگے تانگے۔

غالباً سب سے زیادہ مفید و مقابلہ ہے جہاں پنجابی، بھاشا اور اُردو کے الفاظ دیے ہیں اور بتایا ہے کہ کس طرح اُردُو، بھاشا سے دُور ہے اور پنجابی سے قریب تر۔ مثلاً پنجابی زبان کی یہ ضرب المثل خصوصیت سے لیجئے کہ تمام الفاظ جس میں ثانی حرف عِلّت ہو، یہ تخفیف حرفِ عِلّت تلفظ کیا جاتا ہے مثلاً کان اور ناک کو کن اور نک کہیں گے۔ اس قاعدے میں اُردو کبھی پنجابی کی اور کبھی بھاشا کی تقلید کرتی ہے۔ لیکن زیادہ میلان پنجابی کی اس اصلاحی کوشش کی طرف ہے:

بھاشا	پنجابی	اُردُو

باجنا	بجنا۔ وجنا	بجنا
ماچھر	مچھر	مچھر
ماٹی	مٹی	مٹی
سانچے	سچے	سچے
پاگ	پگ	پگڑی وغیرہ

''پگ'' بھاشا میں قدم کو کہتے ہیں جیسے ''پگ ڈنڈی''۔ مگر اُردو نے ''پگ'' کو اختیار کیا اور اس سے چھوٹی پگ (کیونکہ ذرا نازک بدن لوگ تھے) یعنی پگڑی بنا لی۔ لیکن امیر خسرو کے وقت میں وہی ''پگ'' تھی اور کئی حسین لٹ پٹے ''چیرے'' بھی پہنتے تھے:

اے دہلی والے بتانِ سادہ
پگ بستہ و چیرہ کج نہادہ

ضمنی بحثوں میں ''مسلمان اور ہندی زبانیں'' کا باب نہایت پُر از معلومات ہے۔ ''پرتھی راج راسا'' پر بھی ایک الگ باب ہے اور اندرونی شہادت سے ثابت کیا گیا ہے کہ یہ جعلی تصنیف ہے۔ ''خالق باری'' کا باب بھی معنی خیز ہے لیکن سب سے زیادہ تحقیقات آخری باب میں ہیں جس کی رعایت سے تمام کتاب کا نام ''پنجاب میں اُردُو'' ہے۔ فاضل مُحقق نے بجا فرمایا ہے کہ یہ اُردو زبان کی تاریخ کا ایک نیا باب ہے جس سے خود اہلِ پنجاب بھی عموماً بے خبر ہیں۔

میں جانتا ہوں کہ فاضل مصنف نے یہ مواد کن کن کوششوں سے حاصل کیا ہے اور پنجاب کے لوگوں نے ان کو مدد دینے میں کس قدر سہل انگاری سے کام لیا ہے۔ تعجب ہوتا ہے کہ شیرانی نے پنجابی نہ ہونے کے باوجود لغت اور حالات کے متعلق کس قدر صحت برتی ہے کہ سی حرفی اور بارہ ماہ آج کل بالکل متروک ہے لیکن ظاہر ہے کہ اس کا اصل بحث سے کوئی تعلق نہیں اور میں نے اس اختلاف کا اظہار محض اتفاق رائے

کی وسعت جتانے کے لیے کیا ہے۔

یہ کتاب اسلامیہ کالج کی انجمن ترقی اُردو نے شائع کی ہے اور اسی پتے سے اڑھائی روپے میں مل سکتی ہے۔ یہ کتاب ہر پنجابی ہر اُردو دان، ہر اس شخص کے پاس ہونی چاہیے جو علمی تحقیق کے ذرائع سے واقف ہونا چاہتا ہے، عام اس سے کہ اس کو کتاب کے نقطۂ نظر سے اتفاق ہو یا اختلاف۔''

تاثیر کیمبرج سے انگریزی میں پی ایچ ڈی کی ڈِگری لے کر ہندوستان واپس آئے تو اُنھیں ایم اے او کالج امرتسر کا پرنسپل مقرر کر دیا گیا جہاں وہ تین برس تک فرائض انجام دیتے رہے۔ 1931ء میں وہ آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ ہو گئے جہاں ''برلن کی خبریں'' اور بچوں کے آرٹ کے موضوع پر تقریری سلسلہ نشر کرتے رہے: یہ دونوں پروگرام دُوسری جنگِ عظیم اور بچوں کی تعلیم و تربیت کے حوالے سے انتہائی مقبول تھے۔ شاعری اور نثر نگاری بھی ساتھ ساتھ چلتی رہی۔ اُن کے تحقیقی مضامین مختلف جرائد کا حصہ بنتے رہے۔ تاثیر کسی طرح بھی انگریز اور انگلستان سے متاثر نہ تھے اور وہ اپنے آپ کو ہندوستانی پنجابی ماننے میں فخر محسوس کرتے تھے جبکہ آج آزادی کے اِکہتر برس گزر جانے کے بعد بھی پاکستانیوں اور ہندوستانیوں کی ایک بڑی تعداد اسی احساسِ کمتری مبتلا ہے۔ تاثیر فنونِ لطیفہ کی کئی اَصناف کا ماخذ ہندوستان ہی کی سرزمین کو مانتے تھے۔ اس حوالے سے اُن کی ایک تحریر بعنوان نیرنگِ خیال میں شائع ہوئی تھی، اُس میں سے یہ اقتباس قابلِ غور ہے:

''یورپ کے بڑے بڑے ملکوں میں تین چار سو سال نہیں تو ہزار سال سے مُصوری جاری ہوگی۔ یونان وغیرہ میں دو ہزار سال پہلے یہ کام ہو رہا تھا۔ مگر ہندوستان میں آریوں کے آنے سے بھی پہلے تصویریں بنائی جاتی تھیں اور اب تک بنائی جا رہی ہیں۔ باہر سے دُشمن آئے، اندر فساد ہوئے۔ اُوپر آسمان سے طوفان اُترے، نیچے زمین سے زلزلے پُھوٹے، مگر ہماری مُصوری کی روایات اب تک چلی جا رہی ہیں۔ یہ نہیں کہ مصوری پر ان حادثوں کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ مُصور آخر اِسی دُنیا

کا رہنے والا ہے۔ اپنے اردگرد کے حالات میں بنتا بگڑتا ہے۔ یہیں کے لوگوں کو یہیں کی باتیں رنگوں خطوں میں سناتا ہے۔ عام لوگوں سے شاید زیادہ حساس ہوتا ہے۔ اس لیے بھی حالات سے زیادہ اثر پذیر ہوتا ہے اور ہندوستان کی مختلف وقتوں کی مُصوری اس اَثر پذیری کی صاف گواہی دیتی ہے مگر ہندوستانی مُصور کچھ ایسا سخت جان واقع ہوا ہے کہ وہ ان آفتوں کے باوجود سسک سسک کر رینگ رینگ کر گرتا پڑتا چلا جارہا ہے۔ بقولِ اقبالؒ:

آساں نہیں مٹانا نام و نشاں ہمارا

ہمارے ملک میں مُصوری کے اولیں نشانات ہڑپا اور موہنجوداڑو کی کھدائیوں میں ملتے ہیں۔ آثارِ قدیمہ کے ماہروں نے ثابت کر دیا ہے کہ یہاں مُصوری آریاؤں کے آنے سے پہلے بھی موجود تھی۔ سر جان مارشل کے مطابق موہنجوداڑو کی تین بستیاں، تین ہزار تین سو سال، تین ہزار سال اور دو ہزار سات سال قبل مسیح کی ہیں۔ ان میں دیواروں کی سطح کے اندر کھود کھود کر تصویریں بنائی گئی تھیں لیکن یہ تصویریں تاریخی حیثیت رکھتی ہیں۔ البتہ جنوبی ہندوستان میں جو ان سے بھی پہلے کی تصویریں نربدا کی وادیوں میں کھدائی سے دریافت ہو رہی ہیں، وہ واقعی تصویریں ہیں۔ حسین و جمیل زندگی سے بھرپور۔ لیکن یہ پرانی روایتیں کچھ آگے نہ چل سکیں۔ ان دنوں لوگ گروہ گروہ، قبیلہ قبیلہ رہتے تھے اور ان کے فنون بھی محدود رہ گئے۔

البتہ بُدھ مت کی ترویج سے مُصوری کا فن چار طرف پھیل گیا اور ہندوستانی مُصوری کی تاریخ بھی اسی عہد سے شروع ہوتی ہے۔

بُدھ مت کی تعلیم آپ جانتے ہی ہیں کیا ہے۔ آپ بُدھ کی اپنی کہانی بھی جانتے ہیں۔ کس طرح اُنھوں نے شاہی اور عیش و آرام کو تیاگ دیا اور ساری زندگی دھیان گیان میں گزار دی۔ اُن کی تعلیم شانتی،

ایکانت، مکتی، نروان کی تعلیم ہے۔ بہت لفاظی کیوں کریں۔ سرناتھ میں سنگِ سرخ کی بُدھ مورتی دیکھیے، اصل نہیں تو فوٹو سہی۔ شانتی، ایکانت، دانش مندی کی مورت۔ یہ دھرم چکر کا مجسمہ ہے۔ دھیان مدر کی مورت میں اس سے بھی زیادہ طمانیت کا اظہار ہوتا ہے۔ چوکڑی ہاتھ آغوش میں، ہتھیلیاں اُوپر کو اُلٹی۔ ہندوستانی آرٹ میں بیٹھک (آسن) اور انگلیوں کے انداز مدر خاص معنی رکھتے ہیں۔ اُبھایا مدر میں بے خوفی اور اعتماد کے اظہار کے لیے ہاتھ زانوؤں کی سطح پر کھلے، ہتھیلیاں اُوپر اور انگلیاں پھیلی ہوئی ہوتی ہیں۔ دھرم چکر جو تبلیغ کا انداز ہے، اس میں انگلیاں انگوٹھے سے قوس بنا کر مل جاتی ہیں۔ مگر یہ سب دھرم اور رُوحانیت کے مجسمے ہیں۔ آہستہ آہستہ دُنیا نے بھی دخل دینا شروع کر دیا اور ایجنٹا کے غاروں کی تصویروں میں دھرم اور رُوحانیت کے ساتھ ساتھ روزمرہ کی ضروریات کا بھی عکس نظر آتا ہے۔

رہبانیت سے دبے ہوئے جذبات پھوٹ پھوٹ کر نکلتے نظر آتے ہیں۔ سینے کا اُبھار مبالغہ آمیز ہو جاتا ہے، کمر کی باریکی سے سرین کی گولائی نمایاں تر کر دی جاتی ہے۔ مُصّور جسم کے ہر حصّے کی ٹھہر ٹھہر کر، مزے لے لے کر نگارش کرتا ہے۔

بُدھ آرٹ اپنے پورے جوبن پر تیسری صدی قبل از مسیح اور ساتویں صدی بعد از مسیح میں رہا۔ گپتا عہد میں اسے پورا کمال حاصل تھا۔ چوتھی صدی میں برہمن مت کا زور شروع ہوگیا اور ذہنوں اور دلوں کی تبدیلی سے فنونِ جمیلہ میں بھی تبدیلی ظاہر ہونے لگی۔ اس عہد کا بہترین نمونہ برنجی کانٹ راجا ہے۔ شِو جی کا البیلا ناچ، زندگی کا ناچ، پانچ قوتوں (پنچ کرتی) کا اظہار، پیدائش، تربیت، تباہی، تجسیم اور نجات، یہ ہیں پانچ راہِ عمل، کبیر نے ایک گیت میں اس کا اظہار خوب کیا ہے۔ کہتا ہے:

''ناچ اے خوشی کے متوالے دل! ناچ۔ محبت کے گیت دِن کے پھیلاؤ

میں، رات کی ایکانت میں گونج رہے ہیں اور دُنیا خاموش ہمہ تن گوش ان راگوں کو سن رہی ہے۔ خوشی سے سرمست زندگی اور موت دونوں اس گیت سے ہم آہنگ ہو کر ناچ رہی ہیں۔ پہاڑ اور سمندر، دھرتی اور آکاش، سب اس لے میں ناچ رہے ہیں اور آہوں اور قہقہوں کے چھچھوں میں دھرتی کے سارے پاس ناچے جا رہے ہیں۔''

شِو جی کا ناچ زندگی کو لبیک کہنے کی پکار ہے۔ زندگی کی ہر حالت سے رضا جوئی ہے۔ خوشی سے، غم و غصہ سے، موت سے۔ یہ عقیدہ نیک و بد کی تمیز سے بے نیاز ہے۔ یاسیت اور رجائیت دونوں سے بالا ہے۔ یاسیت ہے تو شجاعانہ کہ دیوتا لاشوں پر ناچ رہا ہے۔ رجائیت ہے تو اس زندگی سے بلند اور فوق الانسان کہ موت اور تباہی سے ایک مُہیب خوشی پیدا ہوتی ہے۔ مادے کے غیر فانی ہونے کی خوشی، مرمر کر زندہ ہونے کی خوشی۔ نٹ راجا کا چکر زندگی کا چکر ہے، ابدیت کا چکر ہے، تناسخ کا چکر ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ تعلیم بُدھ مت سے بالکل الگ ہے اور یہ فرق مجسموں ہی میں نہیں بلکہ مُصوری میں بھی نمایاں نظر آتا ہے۔ مثلاً اجنتا اور باغ کی تصویروں میں اجنتا کے غاروں کی برہنہ دیواری تصویروں سے نزاکت اور طمانیت برستی ہے۔ یہ بُدھ عہد کی تصویریں ہیں۔ رنگ محل کی برہنہ تصویریں طاقت اور سرمستی سے سرشار ہیں۔ دونوں مختلف دُنیاؤں کی باسی معلوم ہوتی ہیں۔ ایک بُدھ مت کی، ایک برہمن مت کی۔ آپ نے اندازہ کر لیا ہوگا کہ یہ آرٹ تمام تر مذہبی تھا۔ رائج الوقت عقیدوں اور توہمات کی تصویر کشی مگر مذہبیت کے باوجود اس میں زندگی جوش زن تھی کیونکہ اس کی بنیاد اپنے وقت کے زندہ عقائد پر تھی۔ عقائد جن پر لوگوں کی زندگی اور موت کا انحصار تھا، جن پر ان کا دل و جان سے یقین تھا، جنھیں وہ سچا صحیح سچ مانتے تھے۔ روزمرہ کی اقتصادی ضروریات تک ان عقائد سے وابستہ تھیں۔ فصل،

اولاد، دولت، دھن سب دیوتاؤں کی دَین سمجھی جاتی تھیں مگر آج اُنھیں روایات کو تصویروں کا موضوع بنانا زندگی کا منہ چڑانا ہے۔ آج ہمارے مسائل اور ہیں، ہماری ضروریات اور ہیں، ہمارے خیالات اور ہیں۔ جو مُصور آج اجنتا باغ اور مغل روایات کو زندہ کرنا چاہتے ہیں، وہ زندگی سے گھبرا کر زندگی سے دُور بھاگ رہے ہیں۔''

(ہندوستانی مُصّوری، مشمولہ نیرنگ خیال، جنوری 1937ء)

1940ء میں تاثیر سری پرتاب کالج سری نگر کے پرنسپل مقرر ہوئے، لیکن کچھ عرصہ بعد انگریز سرکار کی نوکری اختیار کر لی جو قیامِ پاکستان کے بعد تک جاری رہی۔ تاثیر اسلامی تعلیمات کا گہرا مشاہدہ اور مطالعہ رکھتے تھے اَور نسوانی حقوق کے بھی علمبردار تھے۔ اس حوالے سے اُنھوں نے ایک مضمون ''کسبِ معاش'' کے عنوان سے تحریر کیا جو ذیل میں درج کیا جارہا ہے:

''چند دن ہوئے، ایک صاحب اپنی بیٹی کی تعلیم کے متعلق مجھ سے مشورہ کرنے کے لیے تشریف لائے۔ اُن کا خیال تھا کہ وہ بچی کو لیڈی ڈاکٹر بنائیں مگر محلے کی مسجد کے امام نے ان سے فرمایا کہ ''اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا کیونکہ اس سے بے پردگی لازم آتی ہے۔'' وغیرہ وغیرہ۔ نہ جانے یہ فتویٰ مولوی صاحب نے کس بِنا پر دیا۔ اس سلسلے میں چند معروضات پیش کرتا ہوں:

لڑکیوں کی تعلیم کا مسئلہ بہت اہمیت حاصل کر رہا ہے۔ اُسی طرح جس طرح آج سے ستر اسی سال پہلے لڑکوں کی تعلیم کا مسئلہ تھا۔ اُس وقت مسلمانوں نے کوتاہی کی اور ہم آج تک اس کی سزا بھگت رہے ہیں۔ اب لڑکیوں کی تعلیم کا وہی حال ہے۔ اگر ہم اس دوڑ میں پیچھے رہ گئے تو اس کی تلافی کرنا مشکل ہو جائے گا۔

عام تعلیمی اداروں کو دیکھیے۔ انجمن حمایت اسلام کے زنانہ کالج کی پرنسپل غیر مسلم عورت ہے۔ سرکاری کالجوں اور سکولوں میں معلمہ اور پروفیسر عورتیں بیشتر غیر مسلم ہیں۔ ان حالات میں مسلمان طالبات کی

تربیت تسلی بخش طریقے سے نہیں ہوسکتی۔ کسی تعصب یا فرقہ واری کی وجہ سے نہیں بلکہ غیر ارادی طور پر — اور نصابِ تعلیم کے تو کیا کہنے — بلاتمیز مذہب نادرست ہے۔

یہ تو تعلیم کی حالت ہے۔ زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی مسلمان بہت پس ماندہ ہیں۔ عورتوں کی حالت مردوں سے زیادہ ناقص ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ مسلمان عورتیں آزادانہ کسبِ معاش کی مجاز ہیں یا نہیں۔

عہدِ نبوی میں مسلمان عورتیں مردوں کی رفیق تھیں، خدمت گار یا کھلونے کی حیثیت نہیں رکھتی تھیں۔ زندگی کا کوئی شعبہ نہ تھا جس میں عورتیں مردوں کے پہلو بہ پہلو نظر نہ آتی تھیں۔

سب سے زیادہ مردانہ کام جنگ کا ہے۔ رُوس کے علاوہ یورپ میں کہیں بھی عورتیں دست بدست جنگ میں حصہ لیتی نظر نہیں آتیں حالانکہ یورپ میں عورتوں کی آزادی کا سب سے زیادہ چرچا ہے۔

مگر رسولِ پاکؐ کے عہد میں عورتیں ایک دو نہیں، اور ایک دو مواقع پر نہیں، بہت سی اور جابجا شریکِ کارنظر آتی ہیں۔ نسیبہؓ ہی کے واقعاتِ حیات پر غور کیجئے (آپ اپنی کنیت اُمِ عمارہؓ سے زیادہ مشہور ہیں) غزوۂ اُحد میں بڑے بڑے مرد صحابی پسپا ہوگئے مگر یہ عورت ذات پامردی سے لڑتی رہی۔ کفار رسولِ پاکؐ پر تیر وتلوار سے حملے کرتے تھے۔ دندان مبارک شہید ہوگئے۔ اُم عمارہؓ رسولِ پاکؐ اور دُشمنانِ اسلام کے درمیان دیوار بن کر سینہ سپر ڈٹ گئیں۔ جب ابن عبید مسلمانوں کی صفیں چیرتا ہوا آنحضرتؐ کے پاس پہنچ گیا تو اُمِ عمارہؓ نے بڑھ کر تلوار کا ایک ایسا وار کیا کہ اُس کے قدم وہیں رُک گئے اور اگر اس نے ہری زرہ پہنی ہوئی نہ ہوتی تو وہیں ختم ہو جاتا۔ خود آنحضرتؐ کا بیان ہے کہ میں نے اُحد میں اُمِ عمارہؓ کو اپنے داہنے اور

بائیں لڑتے دیکھا۔
آپ خیبر میں بھی شریکِ جنگ تھیں اور جنگ یمامہ میں جب مسیلمہ کذاب نے عرب کے بہت سے قبائل کو مُرتد کر کے اپنے ساتھ ملا لیا اور اسلام سخت خطرے میں پڑ گیا تو آپ نے اس شدت سے جہاد کیا کہ بارہ زخم کھائے اور ایک ہاتھ کٹ گیا۔ اسی طرح اور کئی صحابیات شریکِ جہاد ہوتی تھیں اور تو اور جب عہدِ عثمانی میں قبرص کے جزیرے پر حملہ ہوا تو اس بحری جنگ میں اُمِ حرامؓ بھی شامل تھیں۔ اُن کا مزار سائپرس (قبرص) ہی میں ہے۔ اُم حرامؓ رسولِ پاکؐ کی خالہ تھیں۔
زخمیوں کی مرہم پٹی کرنا، تیروں کی بوچھار میں شہدا کی لاشیں اور زخمیوں کو کاندھوں پر اُٹھا کر لے جانا اور گورکنی وغیرہ سب کام مسلمان عورتیں کرتی تھیں۔
صحیح بخاری (جلد سوم) میں حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ میں نے عائشہؓ اور اُمِ سلیمؓ کو دیکھا کہ پائنچے چڑھائے ہوئے مشکیں بھر بھر کر لاتی تھیں اور زخمیوں کو پانی پلاتی تھیں۔ جنگِ حنین میں اُمِ سلیمؓ خنجر نکال کر مُشرکین کے مقابلے کے لیے تیار تھیں۔
یہ تھا عہدِ نبویؐ کا زمانہ اور آج کہا جاتا ہے کہ عورتوں کو ڈاکٹر بنانا غیر اسلامی حرکت ہے۔ شاید کہا جائے کہ جنگ کی اور بات ہے۔ غیر معمولی حالات میں غیر معمولی اُمور کی اجازت دی جاسکتی ہے۔ اوّل تو یہ بات ہی غلط ہے۔ عہدِ نبویؐ میں تو مسلمانوں کی تعداد کم تھی۔ عہدِ عثمانی میں یہ مجبوری نہ تھی اور پھر غیر معمولی اجازت اور اس کو منسوخ کرنے کے لیے سند درکار ہے۔ نہ یہ اجازت غیر معمولی تھی اور نہ کبھی اسے منسوخ کِیا گیا۔ یوں بھی نہ سہی، تو عہدِ نبویؐ میں صلح و امن کے زمانے میں عورتوں کا جراحت و طبابت کا پیشہ اختیار کرنا مسلمہ امر ہے۔ رفیدہ کا جراح خانہ خاص مسجدِ نبویؐ کے پاس تھا۔

غرض اکتسابِ ہُنر اور اس کے ذریعے سے آزاد اقتصادی زندگی بسر کرنا عورتوں کا اسلامی حق ہے۔ معترض اس پر بھی کہہ سکتا ہے کہ طبابت اور جراحت بھی ایک طرح سے جنگی کام ہیں۔ ان سے عام قومی مفاد کی خدمت ہوتی ہے۔ ان سے عورتوں کو جنگی خدمت کے لیے تربیت دینا مقصود ہوگا۔ یہ ایسے قیاسات ہیں کہ اگر کوئی غیر مولوی ایسی بات کہے تو کسی سخت فتوے کا مستوجب قرار دیا جائے مگر اپنے ڈھکوسلوں کو سہارا دینے کے لیے کئی مولوی صاحبان اس قسم کی موشگافیاں کرنا اصلِ دِین سمجھتے ہیں۔ اوّل تو ہر اچھے کام کو خدمت مُفادِ ملی کہا جاتا ہے اور پھر ہمارا مقصد اوّل تو یہ ظاہر کرنا تھا کہ ڈاکٹری کا پیشہ عورتوں کے لیے ہر طرح روا ہے اور اس سے یہ نتیجہ نکالا تھا کہ عورتیں آزادانہ طور پر کسبِ معاش کر سکتی ہیں۔ طبابت و جراحت کر سکتی ہیں تو اور کام بھی کر سکتی ہیں اور اِسی طرح اپنی روزی آپ کما سکتی ہیں اور جو یہ واقعات بھی کافی نہیں تو اور سہی— عہدِ نبویؐ کو لیجئے۔ صحابیات کی ہی زندگی کا مثالوں پر غور کیجئے۔

1۔ صحابیات وسیع پیمانے پر تجارت کرتی تھیں۔ حضرت خدیجہؓ کا کاروبار شام تک پھیلا ہوا تھا۔

2۔ مؤلدؓ، ملیکہؓ، ثقیفہؓ بنت مخربہؓ عطر بناتی اور بیچتی تھیں۔

3۔ حضرت سودہؓ کھالیں تیار کرتی تھیں۔

باغبانی، کاشتکاری، خیاطی، دستکاری کون سا ایسا ہُنر تھا جس میں صحابیات کو مہارت حاصل نہ تھی۔ مسلمان مرد یا عورت کو اس لیے ہر جائز طریقے سے کسبِ معاش کی اجازت ہے کہ قرآن پاک میں کسبِ معاش کو بار بار فضل اللہ کہا گیا ہے اور اللہ کا فضل مرد اور عورت دونوں پر یکساں ہے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ ضروریات زمانہ کے مطابق مسلمانوں کے لیے وسعتیں پیدا کی جاتیں، جس طرح خلفائے راشدین کے وقت میں ہوا، مگر آج کل کے تنگ نظر خود ساختہ ائمۂ دِین، جنھیں علومِ متعارفہ سے کوئی

واقفیت نہیں، مسلمانوں کے سامنے اسلام کی ایسی مسخ شدہ صورت پیش کرتے ہیں کہ اس سے کئی قسم کے خطرات پیدا ہو رہے ہیں۔

مُسلمانانِ ہند پر روزگار کے دروازے بند ہیں۔ چند ملازمتیں اور ایک آدھ تجارت، یہ ہے اس کثیر التعداد قوم کی پونجی! کاشتکاری کے علاوہ— ''اس بے کار قوم'' کا نصف بہتر نظر بند ہے۔ اس ہمت شکن اور اخلاق سوز افلاس کو دُور کرنے کے لیے عورتوں کی مدد طلب نہ کرنا قومی جرم ہے۔ بالخصوص جب عورتوں کے لیے مواقع زیادہ ہیں اور غیر مسلم عورتیں ان پر متمکن ہو رہی ہیں۔

یہ کسبِ معاش کا مسئلہ تو بہت بنیادی چیز ہے۔ آرائش اور سنگار کے معاملوں میں بھی مولوی لوگ فتویٰ بازی شروع کر دیتے ہیں۔ میں نے ایک صاحب کو رُخسار پر سرخی لگانے کے خلاف اظہارِ غضب کرتے سنا ہے۔ اسی طرح گانے اور تالی کے ساتھ اُچھلنے کودنے کے خلاف فتویٰ بازی کی جاتی ہے۔ ان اُمور کو غیر اسلامی کہا جاتا ہے۔ حالی نے سچ کہا ہے:

دِی ہے واعظ نے کن آداب کی تکلیف، نہ پُوچھ
اتنے اُلجھاوٴ ترے کاکلِ پیچاں میں نہیں

اسلام تو دِینِ فطرت ہے۔ اس میں اتنے اُلجھاوٴ اور ایسی تکلیف مالا یطاق کہاں!''

کسبِ معاش، مشمولہ تہذیبِ نسواں، 10 مئی 1941ء

خواتین ہی کے حقوق کے حوالے سے اُن کی ایک تحریر ''ایک شام'' کے نام سے ملتی ہے، اس میں سے ایک اقتباس دیکھئے:

''کل ایک صاحب، جو میرے نام اور کام سے آشنا تھے مگر اس سے پہلے اُن سے ملاقات نہ ہوئی تھی، رسمی طور پر غریب خانے پر تشریف فرما ہوئے۔ شاعر سمجھ کر شعر و ادب پر گفتگو کرنے لگے۔ جدید انگریزی

ادب سے بھی واقف تھے۔ اس لیے وقت خوب کٹا۔ ادبیات کے علاوہ سماج کے نئے رُجحانات پر بھی باتیں ہوتی رہیں۔ اُن کا خیال تھا کہ ہندوستانی عورت کو بہت جلد، بہت زیادہ آزادی مل گئی ہے اور وہ اس کا صحیح استعمال نہیں کر رہی اور یہ کہ شادی کی منڈی میں یا تو تیتریاں ملتی ہیں، جو گھر کے کام کاج سے بے تعلق ہوتی ہیں اور یا ماما ئیں، کہ چولھا پھونکنے کے سوا اور کچھ نہیں جانتیں۔

مجھے کچھ اختلاف تھا۔ عرض کیا کہ ہندوستان میں اکثریت غریب عورتوں کی ہے اور وہ پردے وغیرہ کے بندھنوں سے باقتضائے حالاتِ اقتصادی آزاد ہیں۔ اُمراء کے طبقے میں عورتیں نہ پہلے کام کاج کرتی تھیں نہ اب۔ اس لیے نئی تہذیب سے کیا فرق پڑا۔ البتہ سفید پوش طبقے کی عورتوں کے لیے دوراہا آ گیا ہے۔ پہلے وہ گھر کی چار دیواری میں بند تھیں جو لازماً چولھے ایندھن کا خیال رکھتی تھیں۔ اب اُن کے ہاتھ پاؤں کُھلے ہیں تو اُنھیں اور مصروفیتوں کا بھی علم ہوا ہے۔ کچھ لڑکیوں نے ملازمت اختیار کی ہے، کچھ بیکار ہیں۔ اب تیتری یا ماما کا خطاب ان بے کار تعلیم یافتہ سفید پوش لڑکیوں کے لیے ہی مختص ہوسکتا ہے۔ اس لیے یہ ایسا عالمگیر اور اندوہناک مسئلہ نہیں جیسا کہ لیڈرانِ قوم سمجھتے ہیں۔

اُنھوں نے فرمایا کہ نئی لڑکیاں بس پاوَڈر اور لپ سٹک اور بالوں کے فیشن میں اُلجھی ہوئی ہیں۔ یہ بھی مغربی تہذیب کی خرابی ہے۔ میں نے عرض کی کہ سولہ سنگار تو ہماری پرانی تہذیب کی خصوصیات میں سے ہے۔

چوں کہ ہم ادبی لوگ تھے اس لیے بحث کا ادبی پہلو بھی پیشِ نظر رہا۔ اُنھوں نے پوچھا کہ یہ سولہ سنگار کیا ہوئے؟ میں نے عرض کی کہ محاورہ تو ''بارہ ابھرن سولہ سنگار'' ہے۔ ابھرن کو ابرن بھی کہتے ہیں بغیر ہائے دوچشمی کے بمعنی زیور، اور سنگار کے سولہ مرحلے یہ ہیں۔ (1) غسل (2) تیل ملنا (3) سر گوندھنا (4) سر کو زیور سے سجانا

(5) چندن بھرنا (6) لباس (7) قشقہ کھینچنا (8) کاجل لگانا (9) گوشارہ لٹکانا (10) ناک میں موتی آراستہ کرنا (11) پھولوں سے آراستہ کرنا گلے اور سر کو (12) گلے میں زیور پہننا (13) مہندی (14) کمر بند لگانا (15) پاؤں کے زیور (16) پان۔ اور پھر ان میں سے ہر مرحلے کی مختلف منازل ہیں۔ سنگار دان کی منزل ہی لیجئے۔ یہ ہر صاحبِ حیثیت عورت کے لوازمات میں سے تھا۔ اس سنگار دان کو سہاگ پٹارا بھی کہا جاتا ہے۔ دہلی میں اسے مقابہ کہتے ہیں اور اس میں کیا کچھ نہیں ہوتا تھا، پاؤڈر انگریزی لفظ ہے۔ غازہ، گلال، بھرڈل پہلے سے رائج ہیں اور پھر آنکھ میں سرمئی تحریر، ماتھے پر افشاں، ہونٹوں پر دھڑی اور لاکھا، ابروؤں میں بندی اور کنگھی چوٹی کے لوازمات الگ۔ موباف ہی نہیں تیل گیری اور دست مال اور زانو پوش کے استعمال سے اس عمل کی پیچیدگی کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ اور بالوں کے فیشن کوئی ایک طرح کے تھوڑے تھے۔ محمد شاہی پٹیوں سے سر گوندھنا گویا ہفت خواں طے کرنا تھا۔ کس کس بناؤ سے چاند بری جمائی جاتی تھی۔ میں کہتا ہوں آج کل کی لڑکیاں تو منٹوں میں بن ٹھن کر تیار ہو جاتی ہیں۔ پرانی تہذیب والیوں کو گھنٹے لگتے تھے۔ اس کے علاوہ اور کوئی مصروفیت بھی نہیں تھی۔ اسی طرح میں خالص زباں دانی کی بحث کو گھیر کر پھر سماجی دائرے میں لے آیا۔

اُنھوں نے کہا کہ مانا کہ اگلے وقتوں میں تضیعِ اوقات زیادہ تھی مگر آج کل تو برق رفتاری کا دور ہے، اس لیے فضول کاری نہیں چاہیے۔

میں نے عرض کی کہ یہ برق رفتاری مغرب میں زیادہ ہے اور آپ بناؤ سنگار کو بھی مغربی چلن بنا رہے تھے، تو پھر کیا عیب ہے۔''

(ایک شام مشمولہ تہذیب نسواں، 8 اپریل 1944ء)

تاثیر فنِ تنقید کے تمام رُموز سے بخوبی آشنا تھا۔ وہ ''تنقید'' اور ''تنقیص'' کے فرق کو بخوبی جانتے

تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اُنھیں اپنے وقت کے مُستند تنقید نگاروں میں شمار کیا جاتا تھا۔ کرشن چندر جو اُردو کے اعلیٰ پائے کے افسانہ نگاروں میں گنے جاتے ہیں، اُن کا پہلا ناول ''شکست'' کے عنوان سے چھپا۔ اس پر تاثیر نے تبصرہ تحریر کیا جو ''ادبی دُنیا'' میں شائع ہوا۔ اس تبصرے میں اُنھوں نے ناول کی خُوبیوں اور خامیوں کا بھرپور تجزیہ کیا۔ یہ تبصرہ بھی ''مقالاتِ تاثیر'' میں شامل ہے۔ قارئین کے لئے یہاں بھی نقل کیا جا رہا ہے:

کرشن چندر (ایم اے) اُردو کے مختصر افسانہ نویسوں کی صفِ اول میں شمار کیے جاتے ہیں۔ اُن کے پہلے مجموعہ کے متعلق عموماً بہت ہمت افزا الفاظ استعمال کیے گئے مگر بعد کی کہانیوں کے متعلق یہ شکایت سننے میں آتی رہی کہ ان میں کہانی کم اور وعظ زیادہ ہوتا ہے۔ چونکہ مجھے ان کے افسانوں کے مطالعہ کا موقع نہیں ملا، اس لیے میں محض سنی سنائی بات کر رہا ہوں۔ ذاتی رائے کا اظہار نہیں کر رہا۔

''شکست'' (ایک ناول) اُن کی پہلی تصنیف ہے، جو میری نظر سے گزری ہے۔ یہ ناول 22x69 (چھوٹے بغلی سائز) کے قریباً 288 صفحوں پر مشتمل ہے۔

کہانی کے پہلے صفحے پر بھی شیام اور آخری صفحے پر بھی شیام ہی نظر آتا ہے۔ آغاز میں ونتی "بجلی کے کوَندے'' کی طرح لپکتی ہوئی دِکھائی دیتی ہے۔ تو گویا اس ناول کا ہیرو (لڑکا) شیام ہے اور ہیروئن (لڑکی) ونتی ہے۔ ''شکست'' ان دونوں کے عشق اور شکست کی داستان ہے۔ شیام ''پاگل ہو جاتا ہے'' اور ونتی یکا یک مر جاتی ہے (غالباً دل کی حرکت بند ہو جانے سے، غمِ عشق کی وجہ سے)۔

مگر ونتی اور شیام کا واقعہ ناول کے بیس تیس صفحوں میں آ جاتا ہے۔ باقی اڑھائی سو پونے تین سو صفحات تقریروں، ویاکھیانوں اور غیر متعلقہ افراد کے واقعاتِ زندگی کے متعلق ہیں۔

تقریروں کا حال یہ ہے کہ پہلی تقریر صفحہ 38 سے شروع ہوتی ہے۔ علی

جو نائب تحصیلدار پرانے طرزِ حکومت اور امن کا نئی سیاسی ہلچل سے مقابلہ کرتا ہے اور صفحہ 41 پر خاموش ہوتا ہے۔ وہاں شیام اسی موضوع پر سوچنا شروع کرتا ہے اور اس کی خاموش تقریر صفحہ 43 پر ختم ہوتی ہے۔ اس طویل ''جواب مضمون'' کا فلسفیانہ سبق یہ نکالا گیا ہے کہ ''حکومت جبر کے بغیر'' ناممکن ہے۔ پھر صفحہ 60 سے شیام شادی اور سماج کے متعلق سوچنا شروع کرتا ہے اور سوچتا چلا جاتا ہے پھر صفحہ 74 سے علی جُسو ذات پات اور حسب ونسب کی عظمت کے متعلق دو تین صفحوں تک تقریر کرتا رہتا ہے۔ پھر صفحہ 103 سے صفحہ 104 تک شیام شعرا کے تصورِ حُسن کے متعلق سوچتا رہتا ہے اور غالباً جوش ملیح آبادی کی جو پتھر کوٹنے والی مزدور لڑکی کے متعلق نظم ہے، اُس پر پھبتی کستا ہے کہ ''اگر مزدور عورت پتھر کوٹتی ہوتی تو بھی اس کے ہاتھ حنائی ہوتے۔'' یہ ادبی تنقید بھی سب کی سب سوچ بچار میں شامل ہے۔ پھر صفحہ 151 سے صفحہ 153 تک علی جُسو اور شیام ہندو مسلم مسئلہ پر بحث کرتے ہیں۔ یہ پہلی اور آخری بار ہے کہ شیام کسی مسئلہ پر گفتگو کرتا ہے۔ ورنہ علی جُسو تقریر کرتا ہے اور شیام گھر آ کر سوچتا ہے۔ (علی جُسو کا تمام ناول میں فقط اتنا کام ہے کہ وہ تقریر کرے تا کہ شیام سوچ سکے۔ اگر اس کا وجود ناول سے غائب کر دیا جائے تو کہانی جُوں کی تُوں رہتی ہے) جب علی جُسو اور شیام کی بحث ختم ہوتی ہے تو شیام پھر سوچنا شروع کرتا ہے اور اس کا ماحصل صفحہ 153 سے 155 تک بیان کیا جاتا ہے۔ کوئی پانچ چھ صفحے کا مسلسل ''جواب مضمون'' ہے۔ پھر صفحہ 194 سے صفحہ 196 تک ایک اور جواب مضمون چلتا ہے۔ ویدک عہد کے علوم پر برہمنوں کی مبالغہ آمیزی اور شیام کی طنزیہ سوچ بچار—
جواب مضمون اور فلسفہ طرازی نہایت سطحی ہیں اور از حد غیر دلچسپ!—
تقریروں کے علاوہ دوسرے لوگوں کی کہانیاں اور عشق بازیاں ہیں

مثلاً چندرا اور موہن سنگھ کی کہانی! یہ بذات خود ایک ''ناول'' ہے۔ ونتی اور شیام کے قصّے سے بہت زیادہ صفحات اور زیادہ طوفانی واقعات پر حامل ہے، اگر ونتی اور شیام کے تعلقات سے متعلق صفحات کاٹ دیے جائیں تو ناول کے تسلسل میں کوئی فرق نہیں پڑتا بلکہ شاید ایک قسم کی وحدانیت اور یگانگت پیدا ہو جائے۔ شیام خود اور تمام گاؤں چندرا اور موہن کی کہانی سے زیادہ مربوط ہیں اور ونتی کے قصّے سے غیر متعلق ہیں! چندرا اور موہن کا قصّہ اور کردار زیادہ جاندار ہیں۔ موہن سنگھ جاں بلب ہو کر ہسپتال میں آتا ہے۔ چندرا سماج کے علی الرغم ''کم ذات'' ہونے کے باوجود اس کی تیمارداری کرتی ہے۔ دونوں ''مردانہ وار'' عشق کرتے ہیں۔ برہمن سازش کر کے اس تیمارداری کی اجازت کے خلاف مسلمان ڈاکٹر پر کمیشن بٹھا دیتے ہیں۔ موہن سنگھ ایک گستاخ حریف کو قتل کر ڈالتا ہے۔ چندرا دیوانی ہو جاتی ہے۔ غرض خوب زور کے ہنگامے ہوتے ہیں۔ کشمکش ہے، سماج اور افراد کی، ہندوؤں اور مسلمانوں کی، حکومت اور رعایا کی۔ ہسپتال اور جیل کے سین بھی ہیں۔ غرض چندرا اور موہن کے واقعات اور کردار زیادہ جاذب توجہ ہیں مگر ناول شیام اور ونتی کے متعلق ہے!

ان کے علاوہ اور بھی کئی قصّے پہلو بہ پہلو جاری ہیں، جن کا اصل کہانی سے کوئی علاقہ نہیں۔ ونتی اور شیام اپنی جگہ، چندرا اور موہن اپنی جگہ، دوسرے لوگ اپنی اپنی جگہ، سب الگ الگ چلے جاتے ہیں— بے ربط اور بے آہنگ!

یہ تو ہوا کہانی کا انداز۔ کردار سازی کا یہ حال ہے کہ شیام اور ونتی دونوں ناممکن قسم کے اشخاص ہیں۔ بے جان، ناقابل یقین۔ شیام کے عشق کی اشاعت کا یہ عالم ہے کہ یہ ''پاگل ہو جاتا ہے'' مگر اتنا نہیں کہ اپنی جبری سگائی کو ملتوی کرا دے۔ ماں سے ایک انکاری فقرہ کہتا ہے

اور یُونہی وہ ذرا ٹسوے بہاتی ہے تو یہ ماں کا لاڈلا کراہتا ہوا راضی بہ تقدیر ہو جاتا ہے۔ ’’اس کا سارا عزم آنسوؤں کی گرمی سے پگھل گیا‘‘ شیام کالج سے گرمی کی چھٹیوں میں گاؤں آیا ہوا ہے۔ اگر یہ عشق محض تعشق ہوتا۔ گرمی کی چھٹیوں کا اُبال ہوتا، تو اور بات تھی مگر نوبت پاگل پن تک آ جاتی ہے۔ ونتی کا کردار شیام سے بھی زیادہ ناممکن ہے۔ اس خالص دیہاتی ناخواندہ لڑکی کا اندازِ تعشق بالکل کالج کی لڑکیوں کے مزعومہ انداز کی طرح ہے۔ نُوراں، سیداں، چندرا اور خود ونتی کی ماں چھایا زندہ کردار نہ سہی، مگر ان میں ناممکن قسم کے شہری تیور نہیں۔ ونتی یُونہی بے جان سی چھوئی موئی ہے اور چونکہ ونتی اور شیام دونوں بے جان کردار ہیں، اس لیے اُن کا عشق (اور اس ناول میں ان کی باہمی زندگی کا محض یہی پہلو دِکھایا گیا ہے) بھی بے بنیاد معلوم ہوتا ہے۔ بس یُونہی ہو جاتا ہے۔ نہ ہوتا تو تعجب نہ ہوتا اور جو ہو گیا ہے تو ہو گیا ہے۔ مگر نتائج ایسے مہلک بتائے گئے ہیں جیسے واقعی بڑے معرکے کا عشق ہو۔ ان نتائج کا پیش رفتہ واقعات سے کسی طرح اندازہ نہیں ہوسکتا بالکل آن ہونے معلوم ہوتے ہیں۔

دوسرے کردار بھی کھوکھلے ہیں۔ تدریجی ترقی تو کیا ہوتی ہے، مصنف نے چند ایک کو واضح کرنے کے لیے ان کے ذمے مختلف تکیۂ کلام قسم کے فقرے لگا دیے ہیں مثلاً علی جُسو بار بار ’’بات دراصل یہ ہے‘‘ کا استعمال کرتا ہے۔ مصنف نے اس تکیۂ کلام پر اتنا زور دیا ہے کہ اسے بے ساختہ شیام کے منہ سے بھی نکلوایا ہے اور پھر شیام کو اس نقالی سے چوکنا کر کے ہمیں گویا جھنجھوڑ کر اس تکیۂ کلام کی طرف متوجہ کیا ہے تاکہ خوب ذہن نشین ہو جائے۔ اسی طرح بام دیو کا تکیۂ کلام ماں بہن کی گالی ہے، جو ہر جگہ بے تکلف استعمال ہوتی ہے اور وہ جو پرانا فرسودہ لطیفہ ہے کہ اس قسم کی گالی دینے والا اپنے آپ کو بھی یہ گالی دے ڈالتا

ہے، اس کا بھی اعادہ کیا گیا ہے۔ غرض زنگ خوردہ ہتھیاروں سے کردار تراشی کی کوشش کی گئی ہے۔

کہانی میں ربط اور وحدانیت مفقود ہے۔ لمبی لمبی بے محل تقریریں، واقعات، ہنگامہ خیز اخباری قسم کے (قتل، دیوانگی، فوری موت) یعنی نفسیاتی اور داخلی تقدیر سے نہیں بلکہ حادثات اور خارجی تقدیر سے اُلجھنوں کو سُلجھایا گیا ہے اور کردار بے جان پُتلیوں کی طرح ہیں۔

تو پھر ناول میں اور کیا رہ گیا ہے۔ کئی دفعہ کہانی میں محض قوت بیان سے دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ مشاہدہ بہت واضح اور صحیح ہو۔ یا یہ بات کہ وقت کا گزران صحیح ہو۔ ماضی، حال اور مستقبل کا جوڑ صحیح ہو۔ اس طرح کہ جو ہو چکا ہے، جو ہو رہا ہے اور جو ہوگا، اُن کا ربط واضح ہو اور اس کی وجہ سے توجہ قائم رہے۔ یہ ناول کے ادنیٰ مراتب ہیں مگر یہ بھی سہی!

مشاہدہ کی صحت اور وضاحت کی یہ صورت ہے کہ شروع ہی میں شکار کا سین ہے۔ اوّل تو یہ سین ہی بے تعلق سا ہے کیونکہ شیام اس میں کوئی اہم حصہ نہیں لیتا۔ اس میں گلے کا ایک دردناک واقعہ بیان کیا جاتا ہے اور یہ واقعہ اپنی جگہ پر ایک الگ کہانی ہے۔ گلا اپنی آپ بیتی بیان کر کے اس ناول سے غائب ہو جاتا ہے اور پھر دوبارہ کہیں نظر نہیں آتا۔ مگر یہ شکار کا واقعہ بذاتہٖ ایسا مضحکہ خیز ہے کہ اگر اس کا ناول سے کوئی تعلق بھی ہو، تو بھی مصنف کی خفت میں کمی واقع نہیں ہوتی۔ جھاڑیوں سے دو تیتر اڑاتے ہیں۔ گلا ان پر فائر کرتا ہے اور ایک کے پیٹ کو چھرے...... چھید کو پار ہو گئے — چھرے! پھر لکھا ہے ”گلا چلتے چلتے رک گیا۔ رائفل زمین پر کھڑی کر کے بولا...... ”رائفل!— یہ عجیب قسم کی رائفل ہے کہ جس میں گولیوں کی جگہ چھرے چلائے جاتے ہیں اور یہ حیرت ناک شکار ہے، جس میں بے چارے تیتروں

اور رائفل سے وار کیا جاتا ہے اور اگر ان معمولی تفصیلات سے آگاہی نہ تھی تو شکار گاہ کا نقشہ کھینچنے کی کیا ضرورت تھی۔''

یہ مشاہدے کی کمزوری اور نادُرستی دِیگر مقامات پر بھی نمایاں ہے۔ پہلا سین ہی لیجئے۔ کتاب کا پہلا فقرہ ہے''آفتاب مغرب میں غروب ہوگا'' پھر قریباً تین صفحوں میں شفق کا منظر بیان ہوتا ہے۔ اور پھر ''چاروں طرف اندھیرا چھا گیا۔''

لیکن اس اندھیرے میں شیام ''خچر کو ایڑی دکھا کر ہوا ہوگیا'' وہ بھی پہاڑی پگڈنڈی پر۔ چلو یہ شہسواری کی شان سہی لیکن اس ''گھپ اندھیرے'' میں شیام بھاگتے ہوئے خچر پر سے مُڑ کر دیکھتا ہے تو اس ہوا کے سوار کو ''چندرا کی صورت'' دھندلی ہوتی ہوئی دِکھائی دیتی رہتی ہے۔ تاریکی میں دُھندلکا اور ہوا کی طرح اُڑتے ہوئے بھی ایک صورت کا نظر آتے رہنا کچھ کم طلسماتی عمل نہیں مگر یہ اندھیرا، جس میں سب کچھ نظر آتا رہتا ہے، دوسرے سین میں بھی طاری وساری ہے اور شیام کی بوم صفت آنکھوں کو پھولوں کے رنگ اور نازک جزئیات تک سب واضح دکھائی دیتے رہتے ہیں— کیا دیکھتا ہے کہ ''ایک لڑکی بھینس کے تھنوں سے دودھ دوہ رہی ہے'' کالی یا بھوری بھینس کے تھن، جن کو دوہا جا رہا ہے، تاریک رات میں شیام ہی کو نظر آسکتے تھے، اور پھر کیا دیکھتا ہے کہ ''ایک بچھیا پیشاب کر رہی ہے۔'' اور وہیں ''ایک لالہ ننگی کھاٹ پر حقہ پی رہا ہے''۔ پھر اسے نیل دھاری کی بیلیں اور زرد چنبیلی کے پھول بھی دکھائی دے رہے ہیں اور یہ لالہ جی اور وہ بڑھیا جو آٹا گوندھ کر ''چولھے میں لکڑیاں لگا رہی تھی'' یہ تمام لوگ رات کے وقت ''جنگل میں منگل'' کر رہے تھے۔ گاؤں کا کوئی آثار نہیں۔ ٹیلے پر فقط ایک مکان ہے اور چاروں طرف کھیت!—اور نہ کوئی دِیا ٹمٹا رہا ہے اور نہ کوئی بجلی کی لائن پاس سے گزر رہی ہے!—

مگر شیام کو سب کچھ نظر آ رہا ہے۔

اگر مشاہدہ ایسا ناقص ہے، تو اتنا ہی ہو کہ دوسری شرط پوری ہو جائے کہ وقت کا گزران صحیح ہو۔ ماضی، حال اور مستقبل کا جوڑ دُرست ہو۔ گنگو نے برات میں سارے سرکاری عہدے داروں کو مدعو کیا تھا۔ ''درست! ''پھر!! برات کی شان تو اِنہی سرکاری عہدہ داروں سے دوبالا ہوتی تھی اور شادی کے برسوں بعد مسٹر گنگو فخریہ لہجے میں کہا کرتے تھے'' ظاہر ہے کہ دوبالا ہوتی تھی'' کی بجائے ''دوبالا ہوتی ہے'' ہونا چاہیے اور جب شادی اب ہو رہی ہے تو پھر مسٹر گنگو کے متعلق یہ کہنا کہ وہ شادی کے برسوں بعد کہا کرتے تھے، کس طرح درست ہوسکتا ہے؟ مُستقبل کو ماضی میں کس طرح تبدیل کر دیا گیا؟ ''کہا کرتے تھے'' کی جگہ ''کہا کریں گے'' ہو اور تمام فقروں کو بدلا جائے تو شاید بات بن جائے۔ یہ گڑبڑ جو شاید صیغوں کے غلط استعمال سے پیدا ہوئی ہے، محض لفظی نہیں۔ مصنف وقت کے گزران کو وضاحت سے تصور میں نہیں لا سکا اور اس لیے اس کا بیان اُکھڑا اُکھڑا ہے۔ کتاب کے آخری بائیس صفحات میں جہاں ونتی اور شیام کے عشق کا انجام بیان ہوتا ہے، یہ گڑبڑ بہت زیادہ نمایاں ہے۔

صفحہ 266 پر موہن سنگھ کی موت کا حال ختم ہوتا ہے اور صفحہ 267 پر ابتدائی فقرے یہ ہیں ''کالج کی چھٹیاں ختم ہوچکی تھیں اور اب وہ واپس لاہور جا رہا تھا''—اس سے پہلے ہمیں فقط اتنا معلوم ہے کہ شیام ونتی کو کسی اور کا نہیں ہونے دے گا۔ اب یہ واپسی کا سفر ہے اور صفحہ 269 پر اسی واپسی کی فضا کا بیان ہے اور پھر پچھلے دو ہفتوں کے واقعات اُجاگر ہونے لگے۔ اگلے اُنیس صفحوں میں ونتی کا درگا داس سے بیاہ، شیام کی کسی اور سے سگائی، ونتی کا وفورِ غم سے مر جانا، شیام کا سودائی سا ہو جانا (پاگل ہو جانا استعارہ لکھا ہے)، یہ سب واقعات

شیام کی یاد میں اُجاگر ہوتے ہیں مگر ان کو بیان اس طرح کیا ہے، جیسے کوئی قِصّہ بیان کر رہا ہو۔ باقی ناول کی طرح، اس طرح کہ ''بسنت کشن اب روبصحت تھا۔ چندرا کا کوئی پتا نہ چلتا تھا.....'' اگر گزشتہ واقعات شیام کے دماغ میں اس طرح اُجاگر ہوئے اور اس حالت میں کہ ''داخلی اذیت سے بے قرار ہوکر اس کی کنپٹیوں کی رگیں تڑپنے لگیں''— اور پھر بھی بسنت کشن اور چندرا کی صحت اور زندگی کا خیال مقدم رہا، تو ان تمام واقعات کو واپسی کے بیان کے بعد کیوں پیش کیا گیا— پیچھے کے واقعات کو آگے کیوں رکھا گیا۔ اگر طرزِ بیان وہی مسلسل داستان گوئی کا رکھنا تھا!— اس تقدیم و تاخیر کی ضرورت تو جب ثابت ہوتی کہ ان واقعات کو واقعی جس طرح ایسے واقعات کسی دردمند کے دل و دماغ میں اُجاگر ہوتے ہیں، بیان کیا جاتا— آتشیں تصورات، بھٹکتے ہوئے خیالات، وحشیانہ طور سے! نہ یہ کہ مسلسل داستان گوئی! غرض بیان کا یہ پہلو بھی مایوس کن ہے۔

ناول ادب کے اور صیغوں کی طرح الفاظ کے مواد سے ساخت کیا جاتا ہے۔ اس لیے اور کچھ نہیں تو الفاظ کا استعمال ہی برمحل ہوتا۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ محاورے وغیرہ مرحوم دہلی یا لکھنؤ کی بول چال کے مطابق ہوں۔ اس بول چال کے مطابق جو غدر سے پہلے یا پچھلی صدی کے اواخر تک رائج تھی کیونکہ آج کل تو دہلی ہو یا لکھنؤ وہ پرانی اُردو بہت کم سنائی دیتی ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اگر ''مکھن'' کا لفظ استعمال کیا جائے تو اس سے مصنف کی مراد بندوق ہو۔ مثلاً صفحہ 60 پر لکھا ہے (جہاں ہندوستانی شادی پر تقریر کی گئی ہے) کہ کسی کو کیا حق ہے، یوں اسے کسی کے پلے باندھ دے، جیسے وہ کوئی بھیڑ بکری یا غلام ہو۔ دراصل اس قسم کی شادی غلامی ہی کا رواج تھا۔ ورنہ آزاد ملکوں میں تو اس قسم کی شادی کو بدعت سمجھا جاتا تھا۔ پھر وہ سوچنے لگا

''اگر بدعت تھی تو اس نظام زندگی کی ایک ''ضروری بدعت تھی'' میں صیغوں کے غلط استعمال پر نکتہ چینی نہیں کر رہا۔ بدعت کا لفظ تین چار بار پے بہ پے آیا ہے۔ مصنف نے بدعت کے معنی ''گناہ'' یا ''برائی'' سمجھے ہیں۔ حالانکہ ''بدعت'' میں برائی یا گناہ نہیں، بلکہ ایک بری جدت، اور نیا فعل ہے۔ اس لیے قدیم طرز کی ہندوستانی شادی کو آزاد مُلکوں میں مذموم تو سمجھا جا سکتا ہے مگر بدعت نہیں سمجھا جا سکتا! ایک اور مثال ہے، پہلے سین میں شیام چندرا کو ''سر پر گاگر اُٹھائے'' دیکھتا ہے۔ چندرا صحت مند دیہاتی حُسن کا اعلیٰ نمونہ ہے، مگر مصنف اس حُسن کو اس طرح بیان کرتا ہے: ''لانبا، کمان کی طرح خمیدہ جسم'' اور دوسرے صفحے پر پھر چندرا'' خمیدہ کمان ابھی وہیں ساکن و جامد تھی۔'' یہ خمیدہ خم کھایا ہوا، کبڑا جسم کسی بڑھیا کا ہو تو ہو، چندرا تو راست قامت ہوگی۔ غالباً کمان کی طرح تنا ہوا جسم مدعا تھا، لکھ دیا ''خمیدہ''!—

ایک اور مثال عرض ہے۔ صفحہ 78 پر ارتقا پر چھوٹی سی تقریر ہے۔ لکھتے ہیں ''مذہب کے پیغمبر کیا باغی نہ تھے؟ کیا اُنھوں نے سماج سے انحراف نہ کیا تھا، کیا وہ اپنے وقت میں دہریے نہ سمجھے جاتے تھے؟'' یہ باغی ہوئے اور انحراف کرنے کی بات تو سمجھ میں آ گئی۔ ''دہریہ'' کا مفہوم نہیں سمجھا گیا۔ ہر باغی، ہر منحرف لازماً دہریہ نہیں ہوتا۔ شاید ہی کسی معروف پیغمبر پر دہریت کا الزام لگایا گیا ہو۔ ''دہریت'' اور بغاوت مترادف نہیں مثلاً گاندھی جی کو باغی کہا گیا ہے مگر ''دہریہ'' نہیں۔ اہلِ حدیث حضرات ہندوستانی سماج کے رسم و رواج سے انحراف کرتے ہیں مگر ان کو دہریہ کوئی نہیں کہتا۔ پیغمبروں کی تو بات ہی اور ہے! غرض اسی طرح سمجھے بغیر عربی، فارسی، انگریزی کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔

عام گفتگو اور مکالمہ کا بھی یہی حال ہے۔ بڑے بڑے الفاظ ہیں مگر

کردار کی ''حیثیت'' سے غیر مناسب! مثلاً ایک دیہاتی لڑکا گٹھے بنا رہا ہے۔ شیام اس سے پوچھتا ہے ''یہ منو کے درخت پر گھاس جمع کر دینے سے کیا فائدہ ہوگا؟'' وہ بولا (اور ذرا اس گنوار لڑکے کی عبارت اور اس کے الفاظ پر غور کیجئے) ''اس طرح سے گھاس کی حفاظت بہترین طریق پر ہوسکتی ہے۔ اگر بارش آ جائے تو گھاس مرطوب زمین سے بچی رہتی ہے۔'' یہ ''مرطوب'' اور ''بہترین طریق'' تو شاید دیوبند میں رہنے والے لڑکے بھی گٹھے باندھتے ہوئے نہ بولتے ہوں گے۔ خیر گزری کہ اس گاؤں میں ایک ''آپریشن گھر'' والا ہسپتال موجود ہے۔ مگر سکول یا مدرسہ نہیں (عجب قسم کا علاقہ ہوگا) ورنہ لڑکے اور کیا کچھ نہ بولتے۔ خود شیام کی زبان پر ''سُبحان اللہ! کیا حسین لسانیاتی تصرف ہے'' خلافِ حیثیت معلوم ہوتا ہے۔

مدعا یہ کہ ''شکست'' ہر اعتبار سے ناکام ہے اور یہ جو مصنف نے کوشش کی ہے کہ اس ''عامیانہ'' کہانی کو ونتی اور شیام کی نامرادی کو ''سماج کے آہنی ہاتھوں'' اور ظلم کا نتیجہ قرار دے، تو یہ محض ''ترقی پسندی'' کی لاج رکھنے کے لیے ہے۔ تقریروں کا بھی یہی حال ہے۔ ونتی اور شیام کی شادی کے درمیان سماج کی آہنی دیوار حائل نہ تھیں۔ محض چند لوگوں کی ذاتی خواہشات تھیں۔ اگر ونتی کی شادی گاؤں کے سب سے زیادہ باعظمت، طاقتور ر دولت مند برہمن کے بیٹے کے ساتھ ہوسکتی تھی، تو شیام سے شادی ہو جانے میں سماج کا کون سا قانون حائل تھا۔ محض سماج کے تذکرے سے ناول سماجی یا ترقی پسند نہیں ہو جاتا۔

ساری کتاب میں کہیں کہیں کچھ منظر واضح نظر آتے ہیں اور ایک آدھ قِصّہ دلچسپ ہے۔ ناول سے الگ قائم بالذات اور ان کی یہ منفرد کامیابی ناول کو اور زیادہ ناکام بناتی ہے۔

کرشن چندر اگر یہ ناول اس حالت میں شائع نہ کرتے تو بہتر ہوتا۔

اُنھیں ابھی ناول لکھنے کا انداز نہیں آیا۔ مختصر افسانوں کی طرف توجہ رہے تو دونوں اصنافِ ادب کو فائدہ پہنچے گا۔ ناول کو بھی اور مختصر افسانوں کو بھی۔

(کرشن چندر کی ''شکست'' مشمولہ ادبی دُنیا، اگست 1933ء)

تاثیر کو اُن کے قریبی رُفقا نے کس طرح دیکھا۔ اس حوالے سے ایک انتہائی دلچسپ مضمون سیّد عابد علی عابد نے اُن کی وفات کے بعد تحریر کیا۔ اس مضمون میں تاثیر کے کئی مخفی پہلو بھی اُجاگر ہو کر سامنے آتے ہیں۔ وہ مضمون نقوش میں شائع ہوا تھا۔ اِس میں سے ایک اقتباس درجِ ذیل ہے:

''میں لاء کالج میں تھا اور تاثیر ایم اے میں کہ ہم دونوں کی ملاقات ہوئی۔ جموں کے اس مشہور مشاعرے میں ہم دونوں ہی موجود تھے جو غالباً 1924ء یا 1925ء میں ہوا تھا اور جس کی صدارت رام راجپال سنگھ شیدا نے کی تھی۔ اس کا ذکر میں تفصیلاً اور جگہ کر آیا ہوں۔ جب تاثیر مُعلمی کی طرف مائل ہوئے اور میں وکالت کی طرف جھکا تو ہمارے درمیان بُعدِ مکانی اور بُعدِ زمانی قائم ہوا۔ لیکن اس قیامِ بُعد سے پہلے ہم ایک دوسرے کے قریب آ چکے تھے۔ درمیانی کڑی حکیم یُوسف حسن مدیرِ نیرنگِ خیال تھے جن کے لیے میں بھی لکھتا تھا اور تاثیر بھی۔ تاثیر کبھی اپنے نام سے لکھتے تھے اور کبھی قلمی نقاب اوڑھ لیتے تھے مثلاً نظامی قدوسی ایم اے۔ اسی زمانے میں حُسنِ اتفاق سے یاس، سیماب، ساغر، جگر اور اصغر بھی لاہور آ گئے اور نیرنگِ خیال میں خوب قلمی معرکہ آرائیاں رہیں۔

عبدالرحمن چغتائی جو پاکستان کے مایۂ ناز مُصور ہیں، پہلی بار تاثیر ہی کی وساطت سے عام طور پر لوگوں سے رُوشناس ہوئے۔ اُن کی مُصوری کے نمونے نیرنگ خیال میں شائع ہوئے اور تاثیر نے اُن پر نوٹ

لکھے۔ یہ نوٹ بڑے خیال انگیز تھے اور ظاہر کرتے تھے کہ تاثیر تمام رُموز سے آشنا ہے۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ مجی حفیظ کو یہ بات یاد ہوگی کہ نہیں کہ شملہ میں وہ تاثیر سے میری ہی وساطت سے ملے۔ وہاں بڑے زوروں کا مشاعرہ تھا اور حفیظ، تاثیر، نظیر لدھیانوی، تاجور، اختر شیرانی اور ان کے رُفقا موجود تھے۔ ہم لوگ مسلم ہوٹل میں ٹھہرائے گئے۔ عندلیب شادانی پہلے ہی سے مقیم تھے۔ وہ مشاعرے سے ایک ماہ پہلے آ گئے تھے۔ اُن کا اپنا شعر ہے ؎

آ ہی پہنچے زراہِ نادانی　　　حضرتِ عندلیب شادانی

یہیں تاثیر اور حفیظ کی ملاقات ہوئی اور یہیں گویا ذہناً طے ہوا کہ نیاز مندانِ لاہور علمی ادبی محاذ پر پنجاب کے شاعروں اور انشا پردازوں کی حمایت کرنے کے سلسلے میں حفیظ کو ملحوظ خاطر رکھیں گے۔ چنانچہ اُن کے مجموعۂ کلام پر مرحوم بخاری نے دِیباچہ لکھا اور وہ جو حفیظ کے ذہن میں قدیم رنگ اور جدید رنگ کے متضاد رُجحانات کی کشمکش تھی، اُس کی طرف ان لفظوں میں اشارہ کیا ''عاشق کہ نظر باز''۔

جب تاثیر اسلامیہ کالج میں آئے تو ان کا گھر لاہور کے ذہین ادیبوں، نئے لکھنے والوں اور انشا پردازوں کا ملجا و ماویٰ بن گیا۔ وہ ہر ایک کو ایسا مشورہ دیتے تھے اور ان کی اصابت رائے کی ایسی دُھوم تھی کہ جو شخص وہاں جاتا تھا وہ ان کا مُعتقد اور مداح ہو کر آتا تھا۔

شعر وہ فارسی میں بھی کہتے تھے اور اُردو میں بھی۔ اُردو میں اُن کی نظمیں ''رس بھرے ہونٹ''، ''یدِ بیضا''، ''دیوداسی''، ''اگلے وقتوں کے شاعرانِ کرام'' بہت مشہور ہیں۔ غزلوں میں آپ یہ غزل اکثر ریڈیو پر سنتے ہوں گے:

میری وفائیں یاد کروگے　　　روؤگے فریاد کروگے

محفل کی محفل ہے رنگیں　　　کس کس کا دل شاد کروگے
ختم ہوئی دشنام طرازی　　　یا کچھ اور ارشاد کروگے

اُن کا یہ شعر بھی زبان زدِ خاص و عام ہے:

دل نے آنکھوں سے کہی آنکھوں نے اُن سے کہہ دی
بات چل نکلی ہے اب دیکھیں کہاں تک پہنچے

بات یہ ہے کہ اصلاً تاثیر غزل کے شاعر نہ تھے۔ یہ تو مشقِ سخن تھی۔ اُن کی منظومات ان کی بقائے دوام کی ضامن ہیں۔ تاہم ایک غزل ایسی ہے جس نے اُردو میں ایک نئی روایت کا دروازہ کھولا، اس غزل کا بنیادی خیال یہ ہے کہ بیسویں صدی میں ایسی عورت بھی ہے جو دِلکش اور دِلربا ہے، چاہتی ہے کہ آپ اسے چاہیں۔ مسکراتی بھی ہے لیکن آپ کو چاہتی نہیں۔ یعنی تاثیر نے بہ الفاظِ دِیگر یہ کہا کہ جس طرح میں عشق کرنے پر مجبور ہوں، محبوبہ بھی اپنے افعال کی مختار ہے۔ ضروری نہیں کہ میں اسے عشق کروں تو وہ بھی مجھ سے عشق کرے۔ یہ غزل طویل ہے۔ میں اطناب سے بچنے کے لیے ایک شعر نقل کرتا ہوں:

یہ دلیلِ خوش دلی ہے، مرے واسطے نہیں ہے
یہ دہن کہ ہے شگفتہ یہ جبیں کہ ہے کشادہ

تاثیر کا مقام اُردو ادب میں جبھی متعین ہوسکتا ہے کہ اس کی تمام تحریریں ہمارے سامنے آئیں۔ ''آتش کدہ'' اور ''کنول'' کی اشاعت سے صرف اس بات کا سراغ ملتا ہے کہ اس کے ذہن کی جودت اور ندرت کی کیا کیفیت تھی۔ اگرچہ وہ انگریزی کا متخصص تھا لیکن جب یہ سوال پیدا ہوا کہ وہ اُردو ایم اے کو تعلیم دے سکتا ہے کہ نہیں تو وائس چانسلر اور حکومت نے بطورِ خاص اپنی منظوری عطا فرمائی۔ بخاری اور راقم الحروف کے سلسلے میں بھی یہی ہوا۔ غالباً حمید احمد خاں صاحب کو بھی بطورِ خاص منظوری دی گئی۔

میں اور تاثیر ایک دوسرے کو اپنی غزلیں اور اپنے مضمون دِکھا لیتے تھے اور خواہش کرتے تھے کہ ان پر کڑا انتقاد کیا جائے۔ باہمی استفادہ بھی جاری تھا۔ ان کی ذکاوتِ طبع اور ذہانت کی ایک عجیب و غریب مثال میرے ذہن میں ہے۔ میں غزل کہہ رہا تھا:

حدِ افق تک پھیلا ہوا تھا دشتِ غمِ دل
رک رک کے مجھ کو چلنا پڑا تھا منزل بہ منزل

میں نے مصرع کا ٹکڑا کہا:

تصویرِ لیلیٰ ہودج نشیں تھی؟

اور دوسرا مصرع کہا ؎

ذوقِ تماشا کیا جھانکتا تھا— محمل بہ محمل

مجھے پہلے مصرع کا ٹکڑا کسی طرح نہ سُوجھا۔ تاثیر کو شعر سنایا۔ اس نے کہا اس ٹکڑے کے الفاظ تو ازل سے معین اور مقدر ہیں یعنی— ''لیلیٰ نہیں تھی'' اب شعر کہ یہ صورت نکلی ؎

تصویرِ لیلیٰ ہودج نشیں تھی— لیلیٰ نہیں تھی
ذوقِ تماشا کیا جھانکتا تھا— محمل بہ محمل

اس طرح کے کئی واقعات یاد ہیں لیکن یہ مختصر مضمون ان کا متحمل نہ ہو سکے گا۔ یہاں ختم کلام کرتا ہوں کہ تاثیر کا جو بلند ادبی مقام تھا اور اسے لاہور میں جو ادبی سرداری حاصل تھی، اس کے پیشِ نظر بہت ضروری ہے کہ اس کے تمام مقامات مُرتب و مدون کیے جائیں اور شائع ہوں۔ بیگم تاثیر کو فرصت نہیں لیکن آنکھیں آفتاب احمد، امجد حسین اور حمید شیخ کی طرف اُٹھتی ہیں کہ وہ اپنے فرائض پہچانیں اور ادا کریں۔ مجھ سے جو کچھ بن پڑے گا اس سے کوتاہی نہ ہوگی۔ لاہور کے ادبی حلقوں کا جانشین اللہ کو پیارا ہو جائے اور اس کی تحریریں منظم نہ ہوں، کتنے افسوس کی بات ہے۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ تاثیر کا ہر نوشتہ کتابی

صورت میں شائع ہو۔ یہاں تک کہ چراغ حسن حسرت سے معرکہ آرائی بھی شائع ہو جائے اس جنگ کی رُوداد میں نہایت حسین چیزیں ملیں گی، حسرت کی بھی اور تاثیر کی بھی۔ اگر ایسی ہی بات ہو جو بہت تیز ہوتو وہ شعر حذف کر دیے جائیں۔ اگرچہ میں شخصاً اس کے حق میں نہیں۔"

(نقوش لاہور نمبر، صفحہ 1085)

1936ء میں تاثیر نے انگلستان کی ایک خاتون سے شادی کی اور ان کا نام مسلمان ہونے کے بعد بلقیس تاثیر رکھا گیا۔ قارئین کے لیے یہ بات دلچسپی کا باعث ہوگی کہ بلقیس ہی کی بہن کے ساتھ فیض صاحب کی شادی ہوئی، لیکن فیض صاحب نے ایلس کا نام تبدیل نہ کیا۔ تاثیر کی شادی کا ایک اور دلچسپ پہلو اُن کا نکاح نامہ بھی ہے۔ اُن کا نکاح نامہ علامہ اقبالؒ نے لاہور کے کئی عالم فاضل وکلا سے مشورہ کرنے کے بعد خود تیار کیا اور اس نکاح نامے پر اقبالؒ کے اپنے دستخط بھی موجود تھے۔ اُن کی گھریلو، ادبی، سیاسی زندگی اور دوستوں کی محافل کو اُن کی اہلیہ بلقیس تاثیر نے کس طرح دیکھا، ان امور کی جانکاری اُنھیں کے تحریر کردہ ایک مضمون سے ملتی ہے جس میں سے چند قاشیں درجِ ذیل ہیں:

"تاثیر کی شخصیت کے دو نمایاں پہلو اور بھی ہیں۔ اُن کی شوخی اور اُن کی بدحواس کر دینے والی صاف گوئی۔ کبھی کبھی اس کے نتائج اچھے خاصے پریشان کن ہوتے تھے۔ اکتوبر 1936ء میں ہماری شادی کے بعد ہی جب وہ ایم اے او کالج کے پرنسپل تھے، مقامی روٹری کلب نے ان سے کلب کے اجلاس میں ایک مقالہ پڑھنے کی فرمائش کی۔ تاثیر نے کیمبرج یونیورسٹی سے "انگریزی ادب میں ہندوستان اور مشرق بعید" پر مقالہ لِکھ کر پی ایچ ڈی کی نئی ڈگری لی تھی۔ اس کے علاوہ وہ حال ہی میں انگلستان سے واپس آئے تھے اس لیے اُنھیں اپنے ملک کی سیاسی محکومی کا بھی شدید احساس تھا۔ اُن کا ارادہ تھا کہ وہ روٹری کلب کے لیے "انگریزی ناول نگار اور ہندوستان کے متعلق ان

کا نظریہ'' کے موضوع پر مقالہ لکھیں۔ چنانچہ اس میں سفید فاموں، برطانوی سامراج، انگریزوں کی ملک گیری، اینگلو انڈین طبقہ، بابوؤں کی انگریزی اور ایسی ہی دوسری باتوں کا بھی لامحالہ تذکرہ کیا گیا۔ حاضرین میں انگریز بھی تھے اور ہندوستانی افسر بھی۔ تاثیر نے جیسے ہی مقالہ شروع کیا، سب کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ کسی کو اتنی جرات بھی نہ ہوئی کہ وہ اپنے ساتھی کو کن انکھیوں ہی سے دیکھ لے یا اپنی پلیٹ سے نظریں ہٹا لے۔ مقالہ ختم ہوا تو مجمع پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اس کے بعد کلب کے ہندوستانی صدر نے اعلان کیا کہ اس مقالے پر کوئی بحث نہیں ہوگی۔ اس وقت اس کے چہرے کی جو کیفیت تھی، اسے بیان کرنا ناممکن ہے۔ کچھ عرصہ بعد ہمیں معلوم ہوا کہ روٹری کلب نے اپنے دوسرے اجلاس میں فیصلہ کیا کہ کلب میں جو مقالے پڑھے جائیں وہ پہلے سیکرٹری کو دِکھائے جائیں۔

انگلستان میں تاثیر سے ملاقاتوں کے دوران میں نے شروع ہی میں یہ محسوس کر لیا تھا کہ اُنھیں اپنی ثقافت اور روایات پر بڑا ناز تھا اور وہ اپنے ملک کی سیاسی محکومی پر بڑے آزردہ تھے۔ اُنھیں اپنے مسلمان اور پنجابی ہونے پر فخر تھا۔ ادب، شاعری اور موسیقی میں مسلمانوں کی میراث پر فخر تھا، اپنے آباو اجداد کے کشمیری ہونے پر فخر تھا۔ اسی لیے وہ جہاں بھی گئے اُنھوں نے لوگوں کے دلوں میں اپنے اور اپنے مُلک کے لیے عزت اور دلچسپی پیدا کر لی۔ لندن اور یورپ میں رہنے والے ہندوستانی نسلی تعصّبات اور یورپی اقوام کے نامناسب برتاؤ کے سخت شاکی تھے لیکن تاثیر کے ساتھ ایسا سلوک کبھی نہیں کیا گیا۔ اُنھیں اپنی اصلیت پر فخر تھا اور اپنی روایات اور اپنے ہم وطنوں سے والہانہ وابستگی تھی، اس لیے ان کے ساتھ کوئی ناروا سلوک کرنے کی جرأت ہی نہ کر سکتا تھا۔

میں نے اپنی ازدواجی زندگی کے آغاز میں اپنے اندر سب سے پہلے یہ تبدیلی پیدا کرنے کی ضرورت محسوس کی کہ میں تاثیر کی دوست پرستی کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھوں کیونکہ اُنھیں اپنے دوستوں سے باتیں کرنے، بحث کرنے اور شعر و ادب پر گفتگو کرنے سے خاص شغف تھا۔ میں نے جیسے ہی یہ سمجھ لیا کہ یہ چیز تاثیر کی فطرتِ ثانیہ بن گئی ہے اور اس کے بغیر وہ رہ نہیں سکتے تو میں نے اپنے آپ کو اُنھیں کے رنگ میں ڈھال لینے کا فیصلہ کرلیا۔ تاثیر کو انسانوں سے اتنی محبت تھی اُنھیں اپنے ہم جلیسوں کے مفاد اور مسائل سے اتنی دلچسپی تھی اور وہ ان کے دلوں کوٹٹولنے اور ان کا بھید پالینے کا اتنا ملکہ رکھتے تھے کہ ہمارا گھر ہر وقت طرح طرح کے لوگوں سے بھرا رہتا تھا۔ تاثیر کی ہمدردیاں سب کے لیے اتنی ہمہ گیر تھیں کہ اُن کے دوستوں میں مسلم لیگی، رضا کار، مولوی، جماعت اسلامی کے ارکان، کمیونسٹ، احرار، سوشلسٹ اور کانگریسی سبھی شامل تھے۔ اُن کے دل اور گھر کے دروازے ان سب کے لیے ہمیشہ کھلے رہتے تھے۔ وہ ہر شخص کی بات بڑے غور سے سنتے، ہر شخص کی مشکل کو اپنی مشکل سمجھتے اور اسے ہمیشہ مفید مشورے دیتے۔ ہر شعبۂ حیات سے تعلق رکھنے والے اُن کے دوست تھے۔ اُن میں وزیر بھی تھے اور چٹھی رساں بھی۔ اعلیٰ سرکاری عہدیدار بھی تھے اور معمولی کلرک بھی، دُکھی بیویاں بھی اور خوش باش جوڑے بھی۔ تاثیر کسی امتیاز کے بغیر ان سب کا انتہائی تپاک سے خیر مقدم کرتے تھے۔ وہ دوستی میں مرتبے اور منصب کے قائل نہ تھے اور کبھی کوئی ملازم ناواقفیت کی بنا پر ان کے کسی دوست یا ملاقاتی کی ظاہری وضع قطع دیکھ کر اس کی تعظیم وتکریم نہ کرتا تو وہ اُس پر بری طرح برس پڑتے۔ کھانے کے وقت کسی ملاقاتی کو میز کرسی پر بیٹھ کر کھانا کھانے میں تکلف ہوتا تو ہم سب کو اس کے ساتھ فرش پر بیٹھ کر کھانا

پڑتا۔ لیکن تاثیر جب اپنے دوستوں کے ساتھ قالین پر بیٹھے ہوتے اور شعر و سخن کی محفل گرم ہوتی تو دُنیا کی بڑی سے بڑی ہستی کو اُن کے ساتھ وہیں بیٹھنا ہوتا تھا اور اس میں شاید ہی کبھی کسی کو تکلف ہوا ہو۔ تاثیر کسی کے القاب یا جائیداد کی نہیں اس کی ذات کی عزت کرتے تھے۔ ایک بار موسلا دھار بارش میں وہ رات گئے پرانی دہلی سے نئی دہلی آئے اور آتے ہی اُنھوں نے پہلا کام یہ کیا کہ کشتی میں کھانا رکھ کر خود تانگے والے کو دے آئے تب جا کر اُنھوں نے کھانا کھایا۔''

(نقوش، شخصیات نمبر، صفحہ 591)

تاثیر نے تمام عمر بے پناہ علمی اور تحقیقی کام کیا لیکن زندگی میں اُن کی کوئی کتاب شائع نہ ہوئی۔ ایک تو وہ خود اپنی ذات کے بادشاہ تھے۔ دوسرے پاکستان بننے کے بعد جو کچھ ہوا، زمانے بھر کے سامنے تھا۔ شعوری طور پر ثقافت، زبان اور فنونِ لطیفہ کو سماج سے باہر کر دیا گیا۔ تاثیر کے کام کی کسی بھی طور اس طرح پذیرائی نہ ہوئی جس معیار اور درجے کا اُن کا کام تھا۔ اُن کا ایک ناول ''کنول'' کے نام سے شائع ہوا جو آج ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتا۔ یہی وجہ ہے کہ نئی نسل ان کے نام تک سے نابلد ہے۔ اُن کے خطوط کا ایک مجموعہ ''عزیزم کے نام'' سے ادارہ فروغِ اُردو نے شائع کیا۔ انگریزی میں ایک کتاب علامہ اقبالؒ کے حوالے سے "Iqbal the Universal Poet" کے نام سے ملتی ہے۔ فیض صاحب نے حقِ دوستی نبھایا اور اُن کی نثر کا کچھ کام ''نثرِ تاثیر'' کے عنوان سے شائع کرایا۔ سب سے اہم ترین کام ممتاز مرزا صاحب نے کیا۔ اُنھوں نے احمد ندیم قاسمی کی ہدایت پر ''مقالاتِ تاثیر'' مُرتب کی اور یہ کتاب مجلسِ ترقیِ ادب لاہور نے 1978ء میں شائع کی۔ ''تاثیر ہادی'' نام کی چارٹرڈ کمپنی اُن کی اولاد ہی کی تھی، لیکن سیاسی گدیوں پر براجمان اُن کی اَولاد نے اُن کے کام کو منظرِ عام پر لانے کی کبھی کوشش نہ کی۔ سرکاری سطح پر بھی اِس طرف کوئی دھیان نہ دیا گیا... اِس سے بڑی بدقسمتی اَور کیا ہوگی! عام لوگ تو ایک جانب، ہمارا پڑھا لکھا طبقہ بھی محمد دِین تاثیر کے نام سے واقف نہیں۔ اُنھیں قبرستان میانی صاحب لاہور میں دفنایا گیا۔ قبر کا کتبہ اِس طرح ہے:

بسم اللہ الرحمن الرحمن
لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللہِ
مرقد ڈاکٹر محمد دِین تاثیر
تاریخ وفات 30 نومبر 1950ء
آج میں دُور بہت دُور نکل آیا ہوں
شاہراہوں سے پرے دُور گزرگاہوں سے
بے طلب بے تگ ودو
ہوسِ خام نہ سودائے تمام
یونہی چلتا ہوا چلتا ہوا آ پہنچا ہوں
پے بہ پے گام بہ گام
کس قدر، دُور بہت، دُور نکل آیا ہوں
تاثیر
یادگارِ محبت: نصب کردہ بیگم تاثیر، سلمیٰ تاثیر، مریم تاثیر،
سلمان تاثیر

مولانا چراغ حسن حسرت

1904ء-1955ء

غیروں سے کہا تم نے غیروں سے سنا تم نے
کچھ ہم سے کہا ہوتا کچھ ہم سے سنا ہوتا
حسرت

چراغ حسن حسرت اپنے نام کے مانند دُنیا بھر میں روشن ہوئے۔ حسرت کو رب تعالیٰ نے بیک وقت کئی خوبیوں سے نوازا تھا۔ اِن خوبیوں کو بخوبی استعمال کرتے ہوئے اُنھوں نے کئی شعبوں اور اَصناف پر ملکہ حاصل کیا۔ وہ بیک وقت شاعر، ادیب، کالم نگار، افسانہ نگار اور ایک منجھے ہوئے صحافی تھے۔ اُردو زبان کے اتہاس میں کئی عظیم مزاح نگاروں کی قلم کاریاں دِکھائی دیتی ہیں۔ ان میں سے بہت کم مزاح نگار ایسے تھے جو مزاح میں طنز کی صفت کو بدرجہ اُتم استعمال کرنے کا فن جانتے تھے۔ چراغ حسن حسرت مزاح نگاری میں طنز کے نشتر استعمال کرنے کے ماہر تھے۔

حسرت کے آباؤ اجداد ایک معتبر کشمیری گھرانے میں سے تھے۔ اُن کی پیدائش بارہ مولہ میں 1904ء میں ہوئی۔ اُردُو، فارسی کی بنیادی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ 1924ء میں بی اے کیا۔ اس کے بعد درس وتدریس سے منسلک ہو گئے۔ چونکہ بنیادی طور پر ایک صحافی کا مزاج رکھتے تھے، اس لیے تعلیم کے شعبے میں دل نہ لگا اور اندر کے صحافی نے پر پھیلانا شروع کر دیے اور کلکتہ چلے گئے جہاں 1925ء میں اُنھوں نے باقاعدہ صحافتی زندگی کا آغاز ''عصرِ جدید'' میں سب ایڈیٹر کی حیثیت سے کیا۔ مزاج میں محنت اور آگے بڑھنے کے جنون کے باعث تبدیلی کا جذبہ دل میں موجزن تھا۔ اس لیے کچھ ہی عرصے میں اپنا

ذاتی ادبی جریدہ ''آفتاب'' کے نام سے شروع کر دیا۔لیکن مالی مشکلات کی وجہ سے یہ جریدہ زیادہ عرصے تک چل نہ سکا۔ پھر اُنھوں نے بحیثیتِ کالم نگار ''نئی دُنیا'' میں کام شروع کیا اور اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔حسرت نے ''کُوچہ گرد'' اور ''کلکتے کی باتیں'' کے عنوان سے کالم تحریر کیے۔ ان کالموں میں چھیڑے گئے موضوعات اور طرزِ تحریر نے ہندوستان بھر میں اُن کے فن کی دھوم مچا دی۔ یہاں تک کہ اُن کے مداحوں میں مولانا آزاد، مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی جوہر اور آغا حشر کاشمیری جیسے عظیم لوگ بھی شامل تھے۔صحافت کی دُنیا میں اُنھیں مولانا ابوالکلام آزاد سے خاص اُنس اور عقیدت تھی۔ جب مولانا نے ''پیغام'' جاری کیا تو حسرت فوراً اس سے منسلک ہو گئے۔ کچھ عرصہ مولانا کی سنگت میں کام کیا۔ 1928ء میں مولانا ظفر علی خاں اُنھیں لاہور لے آئے۔ اُن کے ساتھ اُن کی شہرت بھی آئی جس کے باعث اُنھیں یہاں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔سب سے پہلے روزنامہ ''زمیندار'' میں کام کیا۔ کچھ عرصہ بعد چند دِیگر ادبی جرائد میں کام کیا، جن میں ''انصاف''، ''پھول'' اور ''تہذیبِ نسواں'' نمایاں ہیں۔ بعد ازاں ''احسان'' اور ''شہباز'' کی ادارت کی۔ کچھ عرصہ آل انڈیا ریڈیو سے بھی منسلک رہے اور اس کے بعد روزنامہ ''پنچایت'' میں کام کیا۔

یہ حسرت کی مقناطیسی شخصیت کا کمال تھا کہ اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور کے قریب، ایک تیسرے درجے کا ریسٹورنٹ ''عرب ہوٹل'' لاہور کے تمام بڑے ادیبوں کی آماج گاہ بن گیا۔ اُن کے انتہائی قریبی دوست سعادت حسن منٹو نے بھی اپنی تحریروں میں کئی جگہ عرب ہوٹل کا تذکرہ کیا۔ اُن کے صحافت کے تجربے کی قدردان انگریز سرکار بھی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ دو فوجی اخبارات کی ادارت کے لیے اُنھیں فوج میں ملازمت ملی اور وہ میجر کے عہدے تک پہنچے۔ نوکری کی سختیاں بھی اُنھیں طنز و مزاح نگاری سے باز نہ رکھ سکیں۔نقوش کے طنز و مزاح نمبر میں حسرت کے حالاتِ زندگی پر ایک مضمون شامل ہے جس میں سے ایک اقتباس درج ذیل ہے:

> ''اُنھوں نے ۱۹۲۴ء میں لاہور آ کر بی اے کا امتحان دیا اور مُعلّمی کا پیشہ اختیار کر لیا، لیکن کچھ دنوں بعد کلکتہ جا کر اخبار نویسی شروع کر دی اور عصرِ جدید، نئی دُنیا، جمہور، استقلال اور پیغام وغیرہ میں ادارت کے فرائض انجام دیتے ہوئے۔ اُنھوں نے کولمبس کے نام سے مزاحیہ

کالم لکھے۔ ۱۹۲۸ء میں مولانا ظفر علی خان اُنھیں لاہور لے آئے اور یہاں حسرت نے زمیندار، انصاف، احسان، احرار، شہباز، شیرازہ، تہذیبِ نسواں اور دِیگر اخبارات کے اداروں میں کام کیا اور سند باد جہازی کے نام سے مزاحیہ کالم لکھے۔

دوسری جنگ کے شروع میں فوجی اخبار کے ایڈیٹر ہوکر برما اور ملایا گئے مگر واپس آکر روزنامہ امروز کی ادارت سنبھالی، ۱۰ جنوری ۱۹۵۱ء کو یہاں سے مستعفی ہوکر ریڈیو پاکستان میں قومی پروگرام مُرتب کرنے پر ملازم ہو گئے۔ مگر پھر لاہور آگئے اور نوائے وقت میں ''سرِ راہے'' کے نام سے کالم لکھنے لگے اس دوران میں آپ کو دل کا عارضہ ہو گیا اور آپ ۲۶ جون ۱۹۵۵ء کو ہمیشہ کی نیند سو گئے۔

حسرت ایک قادرالکلام شاعر ہونے کے علاوہ بے مثال مزاح نویس اور طنز نگار بھی تھے۔ اُن کی معلومات کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ سیاست کے نشیب و فراز سے بھی اچھی طرح واقف تھے۔ اس لیے ملک کے بدلتے ہوئے حالات اور نت نئی سیاسی تحریکات پر اپنے مخصوص مزاحیہ انداز میں خوب روشنی ڈالتے اور سیاسی شخصیتوں کے بظاہر سنجیدہ مگر چھپے ہوئے مضحک پہلو نمایاں کرنے میں کمال دِکھاتے تھے۔ اس سلسلے میں آپ نے مندرجہ ذیل تصنیفات اپنی یادگار چھوڑی ہیں:

جغرافیہ پنجابِ جدید، مردم دیدہ، دو ڈاکٹر، کیلے کا چھلکا، زرنخ کے خطوط اور مطائبات وغیرہ۔ پربت کی بیٹی، اقبالؒ اور سرگزشتِ اسلام بھی آپ کی چند قابلِ ذِکر کتابیں ہیں۔

حسرت طنز و مزاح کی تخلیق میں مبالغہ، موازنہ، واقعہ، بذلہ سنجی، جگت بازی، تحریف وتصرف اور لفظی اُلٹ پھیر وغیرہ تمام ہتھیاروں سے کام لیتے اور ٹکسالی زبان استعمال کرتے تھے، اس لیے اُن کے طنز و مزاح میں ہر قسم کے رنگ ملتے ہیں۔ وہ زیادہ تر تو نثر ہی میں لکھتے

تھے۔ لیکن جب کبھی موج میں آتے تھے، تو اُن کے مزاحیہ کالم میں اشعار بھی ٹپک پڑتے تھے۔''

(نقوش طنز و مزاح نمبر، صفحہ 814)

تقسیم کے بعد جب روز نامہ امروز جاری ہوا تو اُس کی ادارت کا اعزاز بھی حسرت کو ملا۔ محمد دِین تاثیر سے اُن کی گہری دوستی تھی۔ لیکن ایک دوسرے کے ساتھ قلمی طنز بھی چلتا رہتا تھا۔ جب تاثیر وفات پا گئے تو جو رنج و الم حسرت نے برداشت کیا وہ شاید ہی کسی اَور نے سہا ہو۔ اس تناظر میں نقوش میں سے یہ اقتباس دیکھیے:

''تاثیر مرحوم حسرت صاحب کے عزیز دوستوں میں سے تھے۔ مگر بعض اُمور پر اختلاف ہو گیا اور روز نامہ ''مغربی پاکستان'' اور امروز پر شعروں کی ''جنگ'' چھڑ گئی۔ سنگلاخ زمینوں میں طبع آزمائی ہونے لگی۔ ایک دوسرے کے نظریات پر چوٹیں ہوئیں۔ ادب دوست حلقے اس ''جنگ'' سے خوب لطف اندوز ہوئے۔ اسی زمانے میں یہ احساس ہوا کہ شعر کے معاملے میں بھی حسرت صاحب کی طبیعت میں کتنی روانی ہے اور وہ کس سلیقے سے اپنی بات کہنے پر قادر ہیں۔ اُنھوں نے دوسری اخباری ذمہ داریوں کے باوجود دن میں دو دو نظمیں کہیں۔ اس جنگ میں حسرت صاحب کا پلہ بھاری رہا۔ مگر عرصہ بعد تاثیر صاحب کا اچانک انتقال ہو گیا اور یہ تفریحی ''لڑائی'' بھی حسرت صاحب کے لیے رنج کا باعث بن گئی۔ دوست کی دائمی جدائی کے علاوہ اُنھیں یہ دُکھ بھی تھا کہ اُنھوں نے ایک عزیز دوست سے یہ لڑائی کیوں مول لی اور اگر یہ گلے پڑ بھی گئی تھی تو اس کے بعد وہ تاثیر مرحوم سے ملے کیوں نہیں۔ تاثیر کے جنازے پر اُن کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ ''امروز'' میں تاثیر مرحوم کے انتقال پر سب سے زیادہ سوگ منایا گیا۔ حسرت صاحب نے جی کھول کر اُنھیں خراجِ عقیدت پیش کیا۔''

(نقوش، شخصیات نمبر، صفحہ 639)

1951ء میں حسرت ریڈیو پاکستان نیشنل پروگرام کے ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔ پھر کچھ عرصہ بعد خرابی صحت کے باعث یہ عہدہ چھوڑ دیا اُور روزنامہ ’نوائے وقت‘‘ میں ’’سرِ راہے‘‘ کے عنوان سے کالم تحریر کرنا شروع کر دیا۔ سعادت حسن منٹو کا بھی حسرت سے گہرا یارانہ تھا۔ منٹو نے اپنی کتاب ’’لاؤڈ سپیکر‘‘ آپ کے نام منسوب کی اور اس میں ایک مضمون حسرت کے نام سے تحریر کیا جس میں از راہِ مذاق یہ بات لکھی کہ حسرت ہمیشہ اُن کے سامنے رہیں گے اُور اس دُنیا سے جانے میں پہلی باری منٹو کی ہوگی۔ پھر قسمت کا کرنا ہوا بھی کچھ ایسا ہی کہ پہلے منٹو نے ۷ جنوری ۱۹۵۵ء کو وفات پائی اور اس کے کچھ ماہ بعد حسرت بھی اس دُنیا سے کوچ کر گئے۔ منٹو نے جو مضمون تحریر کیا تھا، اُس میں سے ایک اقتباس ملاحظہ فرمایئے:

’’میں حسرت صاحب کی طرح فارسی اور عربی کا عالم نہیں۔ بہر حال کفارے کے طور پر جو دُعا میری زبان پر آئی ہے یہاں لکھے دیتا ہوں۔ خداوند......نہ تو کھاتا ہے نہ پانی پیتا ہے......تیرا وجود ہے بھی اور نہیں بھی ہے......یہ کیا مصیبت ہے تیری دُنیا میں ہم کھاتے بھی ہیں اور پیتے بھی......پانی بھی اور شراب بھی......تیرا ایک بندہ چراغ حسن حسرت ہے جو صحافت کا چراغ ہے۔ اس کو پینے پلانے کی لت ہے۔ جس طرح مجھے ہے۔ ہم دونوں بُرے آدمی ہیں۔ مطلب یہ ہے ......لیکن مطلب بیان کرنے کی کیا ضرورت ہے، تُو سب باتیں جانتا ہے...... پھر یہ کیا ظلم ہے کہ آئے دن تُو ہمیں بیمار کر دیتا ہے......خدا کی قسم یہ اچھی بات نہیں......میں نے تیری ہی قسم کھائی ہے، اگر کسی اور کی کھائی ہوتی تو تُو میرا بیرق کر دیتا، نماز کبھی میں نے پڑھی ہے، نہ میرے محترم دوست حسرت صاحب نے، بہرحال ہم تیرے قائل ضرور ہیں، اس لیے کہ تو ہمیں شدید طور پر بیماری میں مبتلا کر کے پھر اچھا کر دیتا ہے۔ لیکن یہ سلسلہ ٹھیک نہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ تُو ہمیں حیاتِ جاوداں عنایت فرما۔ میری صرف یہ درخواست ہے کہ تو مجھے ایک سال کے اندر اندر مار دے، لیکن حسرت صاحب کو کم از کم بیس

برس اور زندہ رکھ، تا کہ وہ اس دوران بھی لوگوں کو یقین دلاتے رہیں کہ اُنھیں دخترِ رز سے کوئی واسطہ نہیں۔

حسرت صاحب کو اگر تُو نے بیس برس اور زندگی عطا فرمادی، تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ وہ تیرا جغرافیہ لکھ دیں گے، جو تُو اپنے آسمانوں کے سکولوں میں نصاب مقرر کر سکتا ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ رائلٹی مجھے ملے۔ تو عالم الغیب ہے...... میری سفارش کے متعلق تو اچھی طرح سمجھ سکتا ہے، اس سے زیادہ میں اور کچھ کہنا نہیں چاہتا، اس لیے کہ شاید تو میرا اسی وقت ٹینٹوا دبا دے، جس کو دبانے کی حسرت، حسرت صاحب کو اب تک رہی ہے۔''

حسرت ان لوگوں میں سے ہیں جن پر اُن کی حیات اور بعد از حیات بہت کچھ تحریر ہوا۔ درسی کتب میں آپ کی تحریریں شائع ہوئیں۔ کئی ادبی جریدوں میں اُن کے کام پر تنقید و تعریف کے مضامین تحریر ہوئے۔ مقالے لکھے گئے، ڈگریاں دی گئیں۔ ظہیر بابر کے تحریر کردہ مضمون میں سے ایک اقتباس درج ذیل ہے:

''حسرت صاحب کی بعض کمزوریاں بڑی دلچسپ ہیں۔ جس روز حسرت صاحب کا موڈ خراب ہوتا یا وہ کسی بات پر برہم ہوتے تو ادارتی عملے کی میٹنگ میں اُنھیں بطور حربہ استعمال کرتے۔ مثلاً میٹنگ کے باقاعدہ آغاز سے قبل کوئی ملایا کا ذکر لے بیٹھا کیونکہ حسرت صاحب ملایا کے بڑے مداح ہیں۔ بات نہ چلی تو دوسرے نے کشمیر کی گل پوش وادیوں کی بات چھیڑ دی۔ اگر ناکامی ہوئی تو کسی نے کلکتہ یا مولانا آزاد کا نام لے لیا۔ حسرت صاحب نے توجہ نہ دی۔ اس روز سے حرف و حکایت کے کسی دلچسپ حصے کے متعلق کسی محفل کی رائے پیش کر دی۔ اگر یہ تمام حربے بے سود ثابت ہوئے تو ہر ایک ہوشیار ہو گیا کہ آج کچھ سننا ہی پڑے گا۔ بعض اوقات کوئی خاص بات ہی نہ ہوتی۔ لیکن عموماً حسرت صاحب کسی بہت بڑی کوتاہی پر ہی ٹوکتے۔ بات ہو یا نہ ہو، ہر فرد اسے

سُننے پر مجبور تھا۔ محض اس لیے نہیں کہ حسرت صاحب ایڈیٹر تھے بلکہ اس لیے کہ وہ بزرگ، مددگار اور صحیح معنوں میں انسان ہیں۔ اُن کی برہمی ہمیشہ عارضی ہوتی۔ تھوڑی دیر بعد محفل اپنے اصل رنگ پر آجاتی۔ چائے کی پیالیاں بج رہی ہیں۔ سگریٹ پر سگریٹ پھونکے جا رہے ہیں۔ چٹکلے اور لطیفے ہو رہے ہیں۔ حسرت صاحب اپنے دلچسپ تجربات دُہرا رہے ہیں اور ادارتی میٹنگ ''حرف و حکایت'' کے کالم کی تصویر بنی ہوئی ہے نہ کسی کی گستاخی سے حسرت صاحب کا دل میلا ہوا نہ حسرت صاحب کی سرزنش کسی کو یاد رہی۔

پچھلے دنوں حسرت صاحب اچانک بیمار پڑ گئے۔ اُن کے دوستوں، مداحوں اور عقیدت مندوں کی پریشانی کی وجہ تو سمجھ میں آتی تھی مگر حیرت تو اس بات پر ہے کہ اُن کے نکتہ چین بھی اُداس تھے۔ صحافتی اور ادبی حلقوں میں اُن کی علالت پر تشویش ظاہر کی جارہی تھی۔ اس کی وجہ محض اُن کی بذلہ سنجی اور علمیت نہیں بلکہ اِس میں خود اُن کی شخصیت کا سب سے زیادہ ہاتھ ہے۔ اُن کے نظریات سے بہتیروں کو اختلاف ہوگا، مگر اُن کی ذات سے وہی نفرت کرسکتا ہے جو اُنھیں سمجھنے کی صلاحیت ہی نہ رکھتا ہو یا جس کے دل میں کسی کے لیے بھی جگہ موجود نہ ہو۔ خدا کا شکر ہے کہ اُن کی صحت بحال ہوگئی۔ بہر حال مجھے نہ جانے کیوں اُس وقت بھی جب ڈاکٹر بھی تشویش کا اظہار کر رہے تھے، یہ یقین تھا کہ زندگی اتنی بڑی دولت سے آسانی کے ساتھ دستبردار نہیں ہوسکتی۔''

(نقوش، شخصیات نمبر، صفحہ 640)

ظہیر بابر نے جو اپنے جذبات کا اظہار کیا وہ اپنی جگہ مسلم ہے لیکن حسرت بھی اُن سے محبت میں کم نہ رہے۔ 1951ء میں جب بہت سے اخبار نویسوں کو سرکاری حکم کے تحت گرفتار کر لیا گیا تو اُن میں ظہیر بابر تھے۔ آپ اُن کی اہلیہ کو کس قدر حوصلہ دیتے رہے اور دیگر معاملات کو کس طرح سنبھالتے رہے۔ اس حوالے سے ذیل میں حسرت کا تحریر کردہ ایک خط نقل کیا جارہا ہے:

’’30 جون 1951ء

عزیزہ محترمہ تسلیم!

آپ کے خط سے عزیزم ظہیر بابر کے حالات معلوم ہوئے۔ میں خود بھی اُن کے حالات پوچھتا رہتا ہوں۔ مجھے یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ وہ بخیر و عافیت ہیں۔

سگریٹوں کا شکریہ ادا کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ مجھے ندامت ہے کہ اُس وقت میرے پاس زیادہ پیسے نہیں تھے۔ اِس لیے بہت تھوڑے سگریٹ بھجوا سکا۔ بہر حال آپ فکر نہ کیجیے۔ اُنھیں سگریٹ اور دوسری ضرورت کی چیزیں پہنچتی رہیں گی۔

افسوس ہے کہ میں آپ لوگوں کے لیے کچھ نہ کر سکا۔ بہ ایں ہمہ اگر آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو بے تکلّفی سے لکھ دیجیے۔ میں کئی مہینوں سے قلب کے عارضے میں مبتلا ہوں۔ دفتر اس لیے چلا آتا ہوں کہ میرے رُفقا کو میری ضرورت ہے۔ آپ لوگوں سے بھی اس لیے نہیں مل سکا کہ پچھلے دو تین مہینوں سے میرے بھی رُفقا اور عزیزوں کو جن پریشانیوں سے دو چار ہونا پڑا ہے، اُن پر غور کرتا ہوں تو سخت وحشت اور اذیت ہوتی ہے۔

خدا پر بھروسا کیجیے۔ ھوالمستعان وعلیہ التکلان۔ انشاء اللہ مصائب کے یہ بادل خود بخود چھٹ جائیں گے۔

عزیزہ ہاجرہ صاحبہ کو میرا اسلام کہہ دیجئے۔

نیاز مند

حسرت‘‘

اگر یہاں سند باد جہازی کے نام سے لکھے گئے ایک کالم میں سے چند قاشیں پیش کر دی جائیں تو بے جا نہ ہوگا:

’’جدید جغرافیہ پنجاب۔ پہاڑ، دریا، نہریں وغیرہ

پنجاب کی قدرتی تقسیم کے تذکرہ میں ہم مختصر طور پر پنجاب کے بڑے بڑے کوہستانی سلسلوں کا ذکر کر چکے ہیں۔ اِن میں سب سے بڑا کوہستانی سلسلہ جسے سدِّ سکندری کہتے ہیں اتحادی سطح مرتفع میں پھیلا ہوا ہے۔ کہتے ہیں جہاں آج کل سدِّ سکندری واقع ہے، وہاں زمانہ قبل از تاریخ میں ہر طرف بنجر میدان اور ریگستان پھیلے ہوئے تھے جن میں سینکڑوں میلوں تک روئیدگی کا نام ونشان نظر نہیں آتا تھا۔ پھر زمین کے اندرونی طبقات میں کچھ ایسی تبدیلیاں رُونما ہوئیں کہ پہاڑوں کے ایک عظیم الشان سلسلہ نے اِس کی جگہ لے لی۔ ماہرینِ علمِ طبقات الارض کا خیال ہے کہ کچھ عرصہ کے بعد یہ کوہستانی سلسلہ پھر غائب ہو جائے گا اور جہاں آج یہ پہاڑ کھڑے ہیں وہاں کفِ دست میدان کے سوا کچھ نظر نہیں آئے گا لیکن بعض اتحادی مُحقق اس خیال کی تردید کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ سدِّ سکندری سنگِ خارا کی چٹانوں کا مستحکم پہاڑ ہے جسے زمین کے اندرونی تغیرات لاکھوں برس تک اپنی جگہ سے نہیں ہلا سکتے۔ سدِّ سکندری کی سب سے اُونچی چوٹی سکندر مونٹ ہے جو اِس سلسلۂ کوہ کے مغربی سِرے پر واقع ہے۔ اس پر ہمیشہ سپید برف جمی رہتی ہے جو دُور دُور سے نظر آتی ہے اور بہت خوشنما معلوم ہوتی ہے۔ اِس کے آس پاس اور بہت سی چھوٹی چھوٹی چوٹیاں ہیں جن کے برفانی عمامے دُو رسے بہت بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ پنجاب کے کسان کھیتوں میں ہل چلاتے ہوئے اِن چوٹیوں کو دیکھ دیکھ کر بہت خوش ہوتے ہیں۔ اُن میں یہ خیال عام ہے کہ اگر خُدانخواستہ اِن پہاڑوں پر برف نہ رہے تو پنجاب کے دیہات خشک سالی کی وجہ سے وِیران ہو جائیں۔

ہر مذہب وملت کے لوگ سکندر مونٹ پر اپنا حق جتاتے ہیں۔ چنانچہ ساہوکار کہتے ہیں کہ کیلاش پربت کی طرح یہ پہاڑ بھی مقدس ہے

کیونکہ یہاں مدت تک شری ساورکر نے کٹیا ڈال رکھی تھی۔ اور شری
گاندھی جی مہاراج بھی اسے اشیرواد دے چکے ہیں۔ یہ اور بات ہے
کہ اب ملیچھوں نے اسے بھرشٹ کر دیا ہے۔"

حسرت کو افسانہ نگاری پر بھی کمال حاصل تھا اور ایک شاعر کی حیثیت سے بھی اُنھیں خاص مقام حاصل تھا۔ اُن کا بہت سا کلام کئی گلوکاروں نے گایا۔

حسرت کو ترپین برس کی عمر میں دل کا عارضہ لاحق ہو گیا تھا۔ شاید یہ تاثیر اور منٹو کی موت کا اثر تھا۔ یہی مرض اُن کی وفات کا سبب بنا۔ وہ 26 جون 1955ء کو انتقال کر گئے۔ اُنھیں قبرستان میانی صاحب لاہور میں دفنایا گیا۔ آپ کی قبر کی لوح پر حافظ یُوسف سدیدی کی خطاطی میں یہ عبارت درج ہے:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ

آخری آرامگاہ

مولانا چراغ حسن حسرت کاشمیری مرحوم

تاریخ وفات ۵ ذی قعد ۱۳۷۴ھ

مطابق ۲۶ جون ۱۹۵۵ء

قطعہ

حفیظ ہوشیار پوری

آج حسرت داغِ حسرت دے کے رخصت ہو گیا
دل میں اب روشن رہے گا رخصتِ حسرت کا داغ
بجھ گئی بزمِ صحافت میں صفِ ماتم حفیظ
گل ہوا ہے آج اک بزمِ صحافت کا چراغ

۱۹۵۵ء

الھم اغفر لہ

اختر شیرانی

1948ء-1905ء

مے خانے کے ہنگامے ہیں کچھ دیر کے مہماں
ہے صبح قریب اختر دیوانہ پیے جا

اختر

جس طرح آغا حشر کو انڈین شیکسپیئر کہا جاتا تھا، اُسی طرح اختر شیرانی کو انڈین کیٹس کہا گیا۔ کبھی شیلے کہا گیا تو کبھی بائرن۔ میں نہیں جانتا کہ ایک الگ عہد اور دوسری زبان کے شعرا کا تقابلی جائزہ کس حد تک درست ہے۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ برصغیر میں جب انگریز سرکار کا عروج ہوا تو کسی مقامی شاعر کی انگریزی زبان کے شعرا سے مماثلت ڈھونڈنا اعزاز سے کم نہیں تھا۔

اختر شیرانی کا اصلی نام محمد داؤد خان تھا۔ اُن کا جنم 4 مئی 1905ء کو ٹونک (راجستھان، متحدہ ہندوستان) میں حافظ محمود شیرانی کے گھر ہوا۔ حافظ محمود شیرانی اپنے وقت کے ایک عظیم دانشور، اُستاد اور مُفکر تھے۔ اُنھوں نے فارسی علم و ادب، تنقید علمِ عروض، تاریخ اور خصوصاً اُردو زبان و ادب کی تاریخ اور ارتقا پر اہم نظریات پیش کیے۔ حافظ صاحب نے اپنے اکلوتے بیٹے کا نام داؤد تجویز کیا اور جب داؤد نے شعر کہنا شروع کیے تو تخلص اختر اختیار کیا۔ اُن کا سلسلۂ نسب افغان قبیلے شیران سے ملتا تھا۔ اسی وجہ سے آپ اپنے والد حافظ محمود شیرانی کے مانند اختر شیرانی کہلائے۔ حافظ صاحب ایک ممتاز عالم تھے اور اپنی قابلیت کے باعث انگریز سرکار کے عہد میں ولایت تک سفر کر آئے۔ اُنھوں نے اختر کی ابتدائی تعلیم و تربیت کے لیے مختلف اساتذہ مقرر کیے جن میں فارسی زبان کے ماہر اُستاد

مولوی صابر علی شاکر بھی شامل تھے۔ مولوی صاحب کی خاص توجہ اور تعلیمات کا اثر تھا کہ اختر شیرانی نے چھوٹی عمر ہی میں شعر کہنا شروع کر دیے تھے۔ فنِ خطاطی اور خوش نویسی کے لیے الگ سے ایک اُستاد مقرر ہوئے۔ جسمانی تربیت کے لیے قیوم خان نامی پہلوان کو ذِمے داری سونپی گئی۔

1920ء میں حافظ محمود شیرانی اپنا وطن چھوڑ کر لاہور تشریف لے آئے۔ بے پناہ علمی مہارت کے باعث اُنھیں اورینٹل کالج لاہور میں اُستاد مقرر کیا گیا حالانکہ اُن کے پاس ایم اے کی ڈگری نہیں تھی۔ اختر شیرانی نے سولہ برس کی عمر میں منشی فاضل کا امتحان پاس کیا۔ اُس وقت تک وہ فارسی اور اُردو ادب کے ساتھ عربی اور انگریزی ادب میں بھی ایک خاص حد تک جانکاری حاصل کر چکے تھے۔ 1924ء میں جب اُن کی عمر محض اُنیس برس تھی اُن کی ایک نظم ''جوگن'' چھپی جس نے ادبی حلقوں میں تہلکہ مچا دیا۔ یہ وہ وقت تھا جب انگریز سرکار کی سرپرستی میں اُردو زبان کی کئی ادبی تنظیمیں اور ادارے کام کر رہے تھے اور برِصغیر کے ادبی اُفق پر کئی مشاہیر اُبھر رہے تھے۔ خاص طور پر علامہ اقبالؒ جیسے بڑے نام کی موجودگی میں کسی شاعر کا تمام ہندوستان میں شُہرت حاصل کر جانا کسی بھی بڑے واقعے سے کم نہیں تھا۔ ایسے میں اختر شیرانی نے اُردُو شاعری کو ایک خاص جِدّت اور مقام دلوایا۔ یہ اختر کا اُردو زبان پر احسانِ عظیم ہے کہ اُنھوں نے شاعری کی صنف ''نظم'' کے محض جلسے جلوسوں میں پڑھے جانے کے تاثر کو ختم کر کے اُسے رُومان اور کومل پن سے آشنا کیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے، جن کا ادب اور شاعری کے حوالے سے ایک خاص معیار تھا، اختر کی کئی نظمیں اپنے ادبی جریدے ''الہلال'' میں شائع کیں۔ اِس حوالے سے حکیم نیر واسطی کے مضمون میں سے ایک اقتباس:

> ''اختر اس عہد کے اہل قلم میں ابوالکلام اور آغا حشر سے متاثر تھے اور آغا حشر بھی اختر سے اس قدر متاثر تھے کہ ایک مرتبہ اُنھوں نے کہا کہ:
>
> کہو زاہد سے، کیوں ہے اس قدر فردوس پر نازاں
> ہزاروں جنتیں آباد ہیں تخئیل اختر میں
>
> مولانا ابوالکلام آزاد نے 1926ء میں جب دوبارہ الہلال جاری کیا تو اُس میں اختر کی نظمیں شائع ہوئیں۔ انگریزی ادب میں

اختر پر آسکر وائلڈ کا گہرا اثر تھا۔ بعض دوستوں کا خیال ہے کہ اُن کی زندگی بعد میں اسی کے اسلوب میں ڈھلتی گئی۔

رسائل و مجلّات کی اِدارت میں بھی اختر کو خاص مقام حاصل تھا۔ ابتدا میں "ہمایوں" کی ادارت کے فرائض انجام دیے۔ برسوں ماہنامہ ''سہیلی'' کی ادارت فرمائی اور آخر میں مولانا تاجور نے جب ''شاہکار'' نکالاتواس کے ادارتی فرائض میں بھی آپ شریک تھے، نیز مولانا چراغ حسن حسرت کے ''شیرازہ'' کی ترتیب وتزئین میں بھی اُن کا حصہ تھا۔

اختر نے سب سے پہلے 1925ء میں ''انتخاب'' کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا۔ ایک عرصے کے بعد اس کا نام تبدیل کر کے ''بہارستان'' رکھ دیا۔ ''بہارستان'' کے بند ہونے کے بعد 1928ء میں ''خیالستان'' کا اِجرا کیا لیکن یہ بھی زیادہ دیر تک جاری نہ رہ سکا...... اور اب کاروباری زندگی سے بےتعلّقی کی وجہ سے وہ ارادہ کر چکے تھے کہ آئندہ کوئی رسالہ شائع نہیں کریں گے، تاہم احباب کا اصرار غالب آیا اور اُنھوں نے غالباً ۱۹۳۱ء میں ''رومان'' کے نام سے رسالہ جاری کیا اور اس موقع پر کہا:

میں کہاں اخذِ متاعِ عالم فانی کہاں
طائرِ سدرہ نہیں تنکے اُٹھانے کے لیے
لیکن اہلِ دل کی بزم آرائیوں کا کیا کروں
چاہیے ہنگامہ جن کا دل لبھانے کے لیے

(نقوش شخصیات نمبر، صفحہ 886)

زبانِ خلق کے ساتھ اختر خود بھی کہا کرتے تھے۔ کہ اُن کا کوئی رسالہ زیادہ دیر تک نہیں چل سکتا۔ لیکن اس کے باوجود شوقِ مشتاقانِ اختر کا یہ عالم تھا کہ جب بھی وہ کوئی نیا رسالہ جاری کرتے، خریداروں کا حلقہ فوری طور پر مہیا ہو جاتا۔

نقوش لاہور نمبر میں احمد ندیم قاسمی کے تحریر کردہ مضمون میں سے ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

''اُردو شاعری میں نظم کا آغاز اصلاحی اور منظری نظموں سے ہوا۔ حالی اور آزاد سے لے کر ایک عرصے تک نظم پر یہی کیفیت طاری رہی۔ اقبال نے آ کر نظم کو سیاسی اور مذہبی موضوعات مہیا کیے لیکن وہ جذبہ جس نے شاعری کو جنم دیا ہے، وہ حسنِ صورت اور حسنِ خیال جن کے دم سے زندگی اپنی گوناگوں کلفتوں کے باوجود زندہ رہنے کے قابل رہتی ہے، عشق و محبت اور حسن و جمال کا وہ احساسِ لطیف جو شاعر کو شاعر بناتا ہے، اقبالؒ کے ابتدائی دور تک بھی صرف اُردو غزل کا موضوع رہا اور نظم صرف مسدّسِ حالی کے معنوں میں نظم سمجھی جاتی رہی۔ اُردو پر یہ اختر شیرانی کا احسان ہے کہ اُس نے نظم کو صرف جلسہ گاہوں کے لیے وقف ہونے سے بچا لیا اور حُسن و عشق کے موضوعات پر ایسی ایسی نظمیں لکھیں کہ اُردو شاعری کا دامن یکایک بے حد وسیع نظر آنے لگا۔ یقینا بعد میں اقبالؒ کی فِکری نظموں اور اقبالؒ سے بعد کے شاعروں کی ہمہ گیر اور ہمہ رنگ نظموں سے اُردو نظم کہیں سے کہیں جا پہنچی۔ اس کے باوجود اختر شیرانی کی خصوصیات اس وقت تک فراموش نہیں کی جاسکتیں جب تک اُردو نظم زندہ ہے۔

مشکل کام ہمیشہ کسی کام کا آغاز ہی ہوتا ہے۔ ولی نے جب فارسی غزل کی روایات سے اُردو غزل کو سجانے اور نکھارنے کا آغاز کیا تھا تو اُسے اپنے معاصرین سے نہ جانے کیا کچھ سننا پڑا ہوگا۔ غالب نے جب اُردو غزل کو قلبی واردات کے علاوہ ذہنی واردات کا بھی آئینہ بنانا چاہا تو اُس کے ساتھ خود اُس کے زمانے نے جو برتاؤ کیا، اس کے اعادے کی ضرورت نہیں۔ حالی نے جب اعلان کیا کہ اُردو غزل ایک مرض میں مبتلا ہے مگر اسے اپنے مرض کا احساس ہی نہیں ہے تو ظاہر

ہے کہ روایتی غزل نگاروں نے اُس کی مخالفت کی مگر یہ ولی، غالب اور
ایسے ہی دوسرے شاعروں کی پامردی، عالی حوصلگی اور عظمت تھی کہ
اُنھوں نے رسم، روایت اور فیشن کے برعکس ایک کام کا آغاز کیا اور
اُردو شاعری کو وہ کچھ بنا گئے جو کچھ وہ اب ہے۔ اختر شیرانی کا شمار بھی
ایسے ہی شاعروں میں ہونا چاہیے۔ اختر نے بھی اس دور میں جب اُردو
نظم پندوموعظت کے حصار میں گھری جا رہی تھی، اُردو شاعری کو اُن
موضوعات سے رُوشناس کرایا جو بظاہر اجنبی تھے مگر دراصل عام
انسانوں کے دلوں کی دھڑکنوں، اُن کے خوابوں، اُن کی اُمیدوں اور
تمناؤں کے ترجمان تھے۔''

اختر شیرانی نے اپنی زندگی میں جہاں بہت سے ادبی جرائد کی ادارت کی، وہاں اُن کا ذاتی ادبی رسالہ ''رومان'' آج بھی ادبی حلقوں میں ایک خاص پہچان رکھتا ہے۔ اسی رسالے میں احمد ندیم قاسمی کا پہلا افسانہ ''بدنصیب بُت تراش'' شائع ہوا تھا۔ ''رومان'' کے حوالے سے اختر کا ایک خط جو اُنھوں نے ڈاکٹر سیّد عبداللہ کو تحریر کیا تھا درج ذیل ہے:

مہندی باغ۔ ٹونک راج

برادرم محترم، تسلیم

محبت نامہ پہنچا

ممنون ہوں۔ ''پرواز'' اب ''رومان'' ہی کے نام سے نکلے گا۔

ڈائری فوراً بھجوایئے

والسلام

آپ کا

اختر

۴۵ء

اگرچہ اختر شیرانی کی پہچان شاعری تھی، لیکن اُن کی نثر نگاری بھی اُردو ادب کا ایک سرمایہ ہے۔ اُن کی تصنیف و تالیف اور ترجمے کی تفصیلات ڈاکٹر یونس حسن نے اپنے ایک مضمون

میں اس طرح بیان کی ہیں۔

(1) ضحاک (سامی بے کے تُرکی ڈرامے کا ترجمہ)

(2) آئینہ خانے میں (افسانوی خاکے)

(3) جوامع الحکایات ولوامع الروایات (ترجمہ ومقدمہ)

(4) دھڑکتے دل (افسانے)

(5) وہ بھی دیکھا یہ بھی دیکھا (ڈرامے)

(6) اختر وسلمیٰ کے خطوط (مکاتیب) 1957ء

ذیل میں ایک اقتباس ''مقدمۂ ادبستان'' میں سے رقم ہے جس سے ہم اختر کی نثر نگاری اور زبان دانی کی عظمت کا اندازہ بخوبی لگا سکتے ہیں:

> ادب ایک آسمانی دوشیزہ ہے جو زمیں پر تمام انسانی برائیوں کو مٹانے اور منتر پھونکنے کے لیے اُتر آئی ہے۔
>
> برنارڈی سن پیرے نے جب ادب کے باب میں یہ شاعرانہ قلم بندی کی ہوگی تو اس میں شک نہیں کہ اس کا دل و دماغ معنویاتِ ادب کے غیر معمولی اثرات سے لبریز ہوگا...... اس قدر کہ ''سرمستیِ سخن'' کے عالم میں بے اختیار زبانِ قلم سے چھلک پڑنے والی اس ترنگ کو بعض اصحاب کسی پُرانے مشرقی شاعر کے شعر سے کچھ کم مبالغہ آمیز نہ سمجھیں گے! مگر ساتھ ہی یہ حقیقت بھی بجائے خود ناقابلِ فراموش ہے کہ دُنیا میں جس طرح حسن وعشق، مصوری و نقاشی، موسیقی و شاعری اور دوسرے فنونِ لطیفہ کے تاثرات کا تجزیہ، اُن کی تعریفات کے بارے میں گونا گوں نظریات اور اُن کی تسلیم و قبول پر اربابِ فکر ونظر کا مشترکہ طور پر اتفاقِ رائے نہیں ہوا ہے۔ اسی طرح ان میں سے ایک اور بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ ان تمام پر چھا جانے والی چیز ادب بھی ہے......
>
> اس لحاظ سے ادب کے اثرات کی مختلف النوع اور مختلف المقدار حیثیات پر محض ان کی اختلافی حدود کا تعین کرنے میں اپنی حیرتِ

دماغی کا صَرف کرنا مناسب نہیں، بلکہ قوائے آخذہ کے مراتب کا فرق ملحوظ رکھتے ہوئے محض اپنی انفعالیت واثر پردازی کی قوتوں کو بروئے کار لانا ضروری ہے:

آنکھ کو چاہیے ہر رنگ میں وا ہو جانا

آفتاب کی رنگین شعاع، بذاتہٖ ایک ہی رنگ سے لبریز ہوتی ہے مگر مختلف قسم کے شیشوں کے پردوں میں مختلف عکس اور رنگ چھڑکتی ہے...... چاند کی مستانہ روشنی ایک ہی قسم کی کرنیں برساتی ہے مگر وسیع میدانی زمینوں پر اس کا پھیلاؤ، کچھ اور لطف بخشتا ہے اور باغوں میں گھنیرے درختوں کے بیچ میں سے چھنتے ہوئے اس کے نورانی نقش ونگار کچھ اور بہار دیتے ہیں!...... اسی طرح ادب ایک ہی حسین حقیقت کا نام ہے (اور حقیقت بہرحال ایک حسن ہے!) لیکن مے گسارانِ مجاز کے ظرف، اس کی کیفیت وکمیت کے ذمے دار ہوتے ہیں...... اور چوں کہ غالب کا ''فتویٰ مستی'':

دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر!

رُسوائی عام حاصل کر چکا ہے، اس لیے اگر آج ادبستان کی شان دار حیثیت پر بطور مقدمہ وتقریب، مجھے کچھ لکھنے کی خوش وقتی ومسرت حاصل ہوتی ہے تو کیوں کر ممکن ہے کہ میں اپنے خیالات کو حیرت کی اُلجھنوں میں گھرا ہوا نہ پاؤں گا......؟ بالخصوص اس میں جب کہ:

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جاست!

کی حقیقتِ شعری، قدم قدم پر دعوتِ لغزش دے رہی ہو!

میرے لیے بہت آسان تھا کہ میں بھی ادب کو ایک ''بہشت'' اور ادبستان کو ایک حور کہہ کر، جو افکارِ انسانی کی تاریک وادیوں کو مُعطر وروشن کرنے کے لیے دُنیا میں اُتر آئی ہے، یا پھر ادب کو ایک آسمان اور ادبستان

کو ایک نوطلوع حسین ''ستارہ'' قرار دے کر جو ہماری روحی و معنوی زندگی میں، ایک طوفانِ نکہت و نُور بپا کرنے کو، اس خاک دانِ ہستی میں آ گرا ہے...... ادبستان کے حسین اثرات اور ان اثرات کی جراحت سامانیوں کا، بیک جنبشِ لب اعتراف کر لیتا ہے......مگر مجھے اندیشہ ہے کہ ''اہلِ بزم'' کی تشنگیِ ذوق میرے اس اقرارِ بے خودی کو کافی نہ سمجھے گی! اس لیے ان کے مذاق، سوز و ساز کا احترام مدِ نظر رکھتے ہوئے عرضِ تفصیل سے انکار کرنا:

حدیثِ دل کش و افسانہ از افسانہ می خیزد

کی روحِ معنویت وافسانویت کا خون کرنا ہے۔ لہٰذا مجھے ادبستان کے شگفتہ وشاداب پھولوں کے تجزیۂ رنگ و بو میں گھر کر ایک فوری لغزشِ مستانہ کا گناہ اپنے سر نہیں لینا چاہیے، بلکہ یہ فرض کئی لغزشوں کی صورت میں ٹھہر ٹھہر کر، اور مزے لے لے کر ادا ہو تو زیادہ خوبصورت ہوگا:

چلے جیسے کوئی پی کر شراب آہستہ آہستہ!!

نظم کے حوالے سے سے اختر شیرانی کو اس صنف کے بنیاد گزاروں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ اور غزل کے حوالے سے اُن کا کسی بھی بڑے غزل گو شاعر کے ساتھ موازنہ کیا جا سکتا ہے۔ اپنی غزل کے مقام کو اختر خود بھی جانتے تھے:

آج آئے ہو تو سنتے جاؤ یہ تازہ غزل
ورنہ اختر پھر کہاں، یہ شعر خوانی پھر کہاں

اختر کی زندگی کا اہم ترین موڑ اکیس برس کی عمر میں آیا جب اُنھیں ایک خاتون کا تعریفی خط موصول ہوا۔ بعد ازاں وہ خط اور اس سے آگے بڑھنے والے ایک سلسلے میں سے سلمیٰ نامی ایک کردار نے جنم لیا۔ اختر نے اس خاتون کے اصل نام کی جگہ سلمیٰ ہی اپنی شاعری میں استعمال کیا۔ گزرتے دنوں کے ساتھ ساتھ اُن کی زندگی اُس دور کے مشہور ناول ''دیوداس'' کے مرکزی کردار دیوداس کی شکل اختیار کر گئی۔ وہ تمام عمر مے اور عشق میں آخری لمحے تک گرفتار رہے۔ سلمیٰ اُن کی زندگی میں دیوداس کے ایک کردار پارو کے مانند آئی جو تمام عمر

اختر کی نسبت سے جانی گئی۔ سلمیٰ کے بعد عذرا نامی ایک خاتون بھی اختر کی زندگی میں آئیں جن سے معاشقے کے چرچے زبانِ خاص و عام پر رہے۔ لیکن سلمیٰ کی حیثیت آخری روز تک مُسلّم اور قائم دائم رہی۔ سلمیٰ کے کردار کے بارے میں نیر واسطی کے مضمون میں سے ایک اقتباس:

''جہاں تک لفظِ سلمیٰ کا تعلق ہے، یہ لفظ فارسی اور عربی ادب میں محبوبہ کے لیے استعمال ہوا ہے۔ حافظ کہتا ہے۔

قاصدِ حضرتِ سلمیٰ کہ سلامت بادا
چہ شود گر بسلامے دلِ ماشاد کند
منزل سلمیٰ کہ بادش ہر دم از ماصد سلام
بر صدائے سارباں بینی و آہنگ جرس

ما بسلمیٰ ومن بذی سلم
این جیراننا و کیف الحال

امن انکرتنی عن حبِ سلمیٰ
غریق العشق فی بحر الودادی

اور حاجی کہتا ہے کہ:

امن شوقاً الیٰ دیارِ لقیت فیھا جمالِ سلمیٰ
کہ مے رساند از اں نواحی نوید لطفے بجانب ما

لیکن اختر کی شاعری میں سلمیٰ سے مُراد ایک مُعین شخصیت تھی۔

سلمیٰ کا حقیقی وجود لوگوں کی نگاہوں سے اس لیے بھی مخفی رہا کہ اختر اس راز سے پردہ اُٹھانا نہیں چاہتے تھے اور جو لوگ واقف تھے، اُنھیں اِس کی اجازت نہیں دی گئی۔ وہ آخر عمر تک اس راز کو چھپاتے رہے اور جو لوگ پوچھتے اُنھیں بہ لطائف الحیل ٹال دیتے اور جہاں تک میں

سمجھتا ہوں اُن کا یہ طریقِ کار صحیح بھی تھا۔ آخر ایک شریف خاتون کو رُسوا کرنے کا فائدہ!

قُدرتاً سلمٰی کی بھی یہ خواہش تھی کہ کسی طرح اُن کا نام منظرِ عام پر نہ آئے اور جب اُنھیں ایک دو مرتبہ یہ محسوس ہوا کہ شاعر بہک کر کچھ خاص قسم کے اشارات کرنے لگا ہے تو اُنھیں ایک خط میں اختر کو خاص طور سے تنبیہہ کرنی پڑی جس کے جواب میں اختر نے ایک غزل میں کہا:

شعر میں ذِکر کسی کا دل ناکام نہ کر
اس نے لکھا ہے کہ تُو یوں ہمیں بد نام نہ کر
غیرتِ حسن کو منظور نہیں رُسوائی
ضبط اے عشق اس افسانے کو یوں عام نہ کر

اور اس کے بعد اس حد تک اخفا کی کوشش کی گئی کہ اختر نے اپنے اور سلمٰی کے خطوط کا اس وقت جو مجموعہ مُرتب کیا، اس میں اپنے لیے بھی اختر کی جگہ ''کوکب'' کا لفظ اختیار فرمایا۔ یہ مجموعہ مکاتیب اُن دنوں بہت سے دوستوں کے یہاں چکر لگاتا رہا۔ چند روز میرے پاس بھی رہا لیکن اس وقت مجھے اس کو نقل کرنے کا خیال نہ آیا۔ آہ اس وقت کسے خبر تھی کہ:

ہے آج جو سرگزشت اپنی
کل اس کی کہانیاں بنیں گی

مجھے معلوم ہوا ہے کہ اس کی ایک ایک نقل آغا خادم حسین بٹالوی اور سلیم کے پاس موجود ہے۔

بہر کیف احباب کی اطلاع کے لیے اس قدر عرض کر دینا کافی ہے کہ سلمٰی جن کا اصل نام اور ہے، ایک مُعین شخصیت کا نام ہے اور وہ آج بھی بقیدِ حیات ہیں۔

سلمٰی سے اختر کے معاشقہ کی ابتدا 1926ء میں ہوئی جبکہ پہلے پہل

سلمٰی کا ایک مکتوب اُن کے نام پہنچا اور اُسے پڑھ کر اُنھوں نے وہ مشہور غزل کہی جس کا مطلع یہ ہے:

لے آئے انقلابِ سپہرِ بریں کہاں
اللہ میں کہاں وہ ثُریا جبیں کہاں

اس کے بعد جب درِ جاناں پر طلبی ہوئی تو اختر یوں نغمہ سنج ہوا کہ:

کِتنی شاداب ہے دُنیا کی فضا آج کی رات
کِتنی سرشار ہے گلشن کی ہوا آج کی رات
کِتنی فیاض ہے رحمت کی گھٹا آج کی رات
کس قدر خوش ہے خدائی سے خدا آج کی رات''

(نقوش شخصیات نمبر، صفحہ 894)

سعادت حسن منٹو کا ایک مضمون ''اختر شیرانی سے چند مُلاقاتیں'' اُن کی کتاب ''گنجے فرشتے'' میں شامل ہے، اُس میں سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''چونکہ اب میں کسی حد تک ادب سے رُوشناس ہو چکا تھا، اس لیے میں نے اختر شیرانی کے کلام کو ایک نئے زاویے سے دیکھنا شروع کیا۔ اُس کی شاعری ہلکی پھلکی اور رومانی تھی۔ میں اب غور کرتا ہوں تو اختر شیرانی مجھے کالج کے لڑکوں کا شاعر معلوم ہوتا ہے۔ ایک خاص عمر کے نوجوانوں کا شاعر، جن کے دل و دماغ پر ہر وقت رومان کی مکڑی مہین مہین جالے تنتی رہتی ہے۔ مجھے اس وادی میں قدم رکھے زیادہ دیر نہ ہوئی تھی کہ ایک دوست سے معلوم ہوا، اختر شیرانی آئے ہوئے ہیں اور شیراز ہوٹل، میں ٹھہرے ہیں۔ اسی وقت وہاں پہنچا مگر معلوم ہوا کہ وہ جیجے کے ساتھ کہیں باہر گئے ہوئے ہیں۔ دیر تک ہوٹل میں بیٹھا انتظار کرتا رہا۔ مگر یہ لوگ واپس نہ آئے۔

شام کو پہنچا تو ہوٹل کے سِندھی باروچی نے کہا کہ سب اُوپر کوٹھے پر بیٹھے ہیں۔ دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ میں اُوپر گیا۔ چھڑکاؤ کر کے

چارپائیاں بچھائی گئی تھیں۔ کچھ کرسیاں بھی تھیں۔ دیسی شراب کا دور چل رہا تھا۔ دس بارہ آدمی بیٹھے تھے جو میرے جانے پہچانے تھے۔ صرف ایک صورت اجنبی تھی اور وہ اختر شیرانی کی تھی، چپٹا چہرہ، سپاٹ پیشانی، موٹی ناک، موٹے ہونٹ، گہرا سانولا رنگ، چھدرے بال، آنکھیں بڑی بڑی اور پُرکشش، اُن میں تھوڑی سی اُداسی بھی تھی۔ بڑی شستہ ورفتہ اُردو میں حاضرین سے گفتگو کررہے تھے۔

میں پاس پہنچا تو بالے نے اُن سے میرا تعارف کرایا۔ بڑی خندہ پیشانی سے پیش آئے۔ اور مجھ سے بیٹھنے کے لیے کہا۔ میں چارپائی کے پاس کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کے بعد اختر صاحب جیجے سے مخاطب ہوئے ''عزیز (میری طرف اشارہ کرکے) اِن کے لیے گلاس منگواؤ۔''

گلاس آیا تو اختر صاحب نے مجھے ایک پیگ بنا کر دیا جو میں نے شُکریے کے ساتھ قبول کیا۔ دو تین دور ہوئے تو کسی نے اختر صاحب سے اپنا کلام سنانے کی فرمائش کی اس پر اُنھوں نے کہا کہ ''نہیں بھائی میں کچھ نہیں سناؤں گا۔ میں سنوں گا'' پھر جیجے سے مخاطب ہوئے ''عزیز سناؤ'' رسیلی انکھڑیوں سے نیند برساتے ہوئے آ'' یہ کہا اور ایک ٹھنڈا سانس لیا۔ جیسے بیتے ہوئے لمحات یاد آ گئے ہیں۔ جیجے کو انکار نہیں تھا۔ گلا صاف کیا اور اختر صاحب کی ایک مشہور غزل گانا شروع کر دی۔ سُرتال سب ٹھیک۔ مگر آواز پھٹی پھٹی سی تھی۔ پھر بھی رنگ جم گیا۔ اختر صاحب پیتے رہے اور جُھومتے رہے۔''

اختر شیرانی کی زندگی میں دِیگر شخصیات بھی اپنی جگہ مُصمم حیثیت رکھتی تھیں۔ سلمیٰ اور عذرا سے عشق اپنی جگہ، لیکن اِن کے ساتھ ساتھ اُن کا اپنے دِیگر اقربا کے ساتھ ایک خاص قسم کا لگاؤ رہا۔ اس حوالے سے سب سے پہلے اُن کے والد صاحب حافظ محمود شیرانی کا تذکرہ کیا جانا ضروری سمجھتا ہوں۔ حافظ صاحب نے بہت کوشش کی اختر اُن مصروفیات کو ترک کر دے جن کے باعث اُس کی زندگی شدید ترین خطرات سے لاحق تھی۔ دوسری جانب اختر کو نہ

ہی بدلنا تھا اور نہ ہی وہ بدلے۔لیکن وہ تمام عمر اپنے والد صاحب کا احترام کرتے رہے۔ جب حافظ صاحب کا جنازہ لے جایا جا رہا تھا تو اُن لوگوں نے جو اختر پر شدید تنقید کرتے تھے کہ وہ اپنے والد کے احترام سے بے بہرہ ہے۔ جب باپ کے جنازے پر اکلوتے بیٹے کی مرثیہ خوانی سنی تو اُن کی آنکھیں بھر آئیں۔

اختر کی کئی لوگوں سے گہری دوستی تھی اور خصوصاً ان لوگوں سے جو آپ کے ہم نوالہ و ہم پیالہ تھے۔ اُن دوستوں میں شیون کا نام سرِ فہرست ہے۔شیون نے اپنی زندگی کے ناساز گار حالات کے باعث خودکشی کر لی۔اس موقعے پر اختر نے کہا:

شیون کو کوئی خلدِ بریں میں یہ خبر دے
دُنیا میں اب اختر بھی ہے مہماں کوئی دن اور

کچھ عرصے کے بعد اختر بھی اس دُنیا سے کوچ کر گئے۔سعادت حسن منٹو نے اُن کی زندگی کے آخری لمحات کو اپنے مضمون ''اختر شیرانی سے چند ملاقاتیں'' میں کچھ اس طرح قلم بند کیا ہے:

> ''اس کے بعد اختر صاحب سے آخری ملاقات میوہسپتال میں ہوئی۔ میں پرویز پروڈکشنز لمیٹڈ کے لیے ایک فلمی کہانی لکھنے میں مصروف تھا کہ احمد ندیم قاسمی آئے۔آپ نے بتایا میں نے کسی سے سنا ہے کہ اختر صاحب دو تین روز سے خطرناک طور پر علیل ہیں۔اور میوہسپتال میں پڑے ہیں بڑی کسمپرسی کی حالت میں۔کیا ہم اُن کی کوئی مدد کر سکتے ہیں؟''
>
> ہم سب نے آپس میں مشورہ کیا۔مسعود پرویز نے ایک راہ نکالی جو یہ تھی کہ ان کی دو تین غزلیں یا نظمیں فلم کے لیے لے لی جائیں اور پرویز پروڈکشنز کی طرف سے پانچ سو روپے بطور معاوضے کے اُن کو دے دیے جائیں۔بات معقول تھی چنانچہ ہم اسی وقت موٹر میں بیٹھ کر میوہسپتال پہنچے۔
>
> مریضوں سے ملنے کے لیے ہسپتال میں خاص اوقات مقرر ہیں، اس

لیے ہمیں وارڈ میں جانے کی اجازت نہ ملی۔ ڈیوٹی پر اس وقت جو ڈاکٹر مقرر تھے۔ اُن سے ملے۔ جب آپ کو معلوم ہوا کہ ہم اختر شیرانی سے ملنا چاہتے ہیں تو آپ نے بڑے افسوسناک لہجے میں کہا ''ان سے ملاقات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔''

میں نے پوچھا ''کیوں؟''

ڈاکٹر صاحب نے اسی لہجے میں جواب دیا: ''وہ بیہوش ہیں۔ جب سے یہاں آئے ہیں اُن پر غشی طاری ہے یعنی الکو ملک کوما۔''

یہ سن کر ہمیں اختر صاحب کو دیکھنے کا اور زیادہ اشتیاق پیدا ہوا۔ ہم نے اس کا اظہار کر دیا۔ ڈاکٹر صاحب اُٹھے اور ہمیں وہاں لے گئے جہاں ہمارا رومانی شاعر، سلمیٰ اور عذرا کا خالق بے ہوش پڑا تھا۔ بیڈ کے ارد گرد کپڑا تنا تھا۔ ہم نے دیکھا اختر صاحب آنکھیں بند کیے پڑے ہیں۔ لمبے لمبے ناہموار سانس لے رہے ہیں۔ ہونٹ آواز کے ساتھ کھلتے اور بند ہوتے تھے۔ ہم تینوں اُن کو اس حالت میں دیکھ کر پژمردہ ہو گئے۔

میں نے ڈاکٹر صاحب سے کہا ''کیا ہم ان کی کوئی مدد کر سکتے ہیں؟''

ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا ''ہم امکان بھر کوشش کر چکے ہیں۔ انتڑیاں بھی جواب دے چکی ہیں۔ ایک صرف دل اچھی حالت میں ہے۔ گُھپ اندھیرے میں اُمید کی بس یہی ایک چھوٹی سی کرن ہے!''

جب ہم نے خواہش ظاہر کی کہ اختر صاحب کے اس وقت میں کسی نہ کسی طرح کام آنا چاہتے ہیں تو ڈاکٹر صاحب نے کہا ''اچھا تو میں آپ کو ایک دوا کا نام بتاتا ہوں آپ اسے حاصل کرنے کی کوشش کیجیے۔ یہاں پاکستان میں تو بالکل نایاب ہے، ممکن ہے بھارت میں مل جائے۔''

ڈاکٹر صاحب سے دوا کا نام لِکھوا کر میں فیض صاحب کے پاس پہنچا اور اُن کو ساری بات بتائی۔ آپ نے اسی وقت امرتسر ٹیلیفون کرایا اور

اپنے اخبار کے ایجنٹ سے کہا کہ وہ دوا حاصل کر کے فوراً لاہور بھجوا دے۔لیکن افسوس دوا نہ ملی۔مسعود پرویز نے دِلّی فون کیا، وہاں سے ابھی جواب نہیں آیا تھا کہ اختر صاحب بے ہوشی کے عالم میں اپنی سلمیٰ اور عذرا کو پیارے ہو گئے۔''

اختر شیرانی کے آخری الفاظ اور جنازے کے بارے میں نیر واسطی کے مضمون میں سے ایک اقتباس کچھ یوں ہے:

''لیل و نہار اسی طرح گزر رہے تھے کہ ایک دن آپ پر ردِعمل کی کیفیت زیادہ طاری ہوگئی، جس کے نتیجہ میں غثیان وتہوع کی حالت بڑھ گئی۔قبض شدید ہو گیا۔جگر نے جواب دے دیا اور آنکھوں پر زردی چھا گئی۔ مجبوراً میں نے اُنھیں میوہسپتال میں داخل کرایا۔ وہاں پہلے تو چند روز ٹھیک رہے۔لیکن اچانک ایک دن طبیعت زیادہ بگڑ گئی......اور بالآخر 43 سال کی عمر ہی میں 9 ستمبر 1948ء کی دوپہر کو آپ نے وقت سے پہلے زندگی کی دشوار گزار راہوں کا سفر ختم کر لِیا......آہ

میں میکدے کی راہ سے ہو کر گزر گیا
ورنہ سفر حیات کا بے حد طویل تھا

مرنے سے پہلے اختر کے ہونٹوں پر یہ مصرع تھا:

ہو گئی بزمِ میکدہ خاموش

شاعر نے یہ کہا اور بزمِ میکدہ سُونی ہوگئی۔

11 ستمبر کی صبح کو آپ کا تابوت ہسپتال سے نیر منزل لایا گیا اور یہاں سے وہ تدفین کے لیے گورستان لے جایا جا رہا تھا کہ اختر کی بھولنے والی کو اختر یاد آیا۔ راستہ میں ایک برقع پوش خاتون نے تابوت رکوا کر اُس کا آخری دیدار کیا......اور اس کے بعد شہرستانِ علم و ادب کی یہ عظیم دولت گورستان میانی میں ہمیشہ کے لیے سپردِ خاک کر

دی گئی۔''

اختر صاحب کی عائلی زندگی، بچوں اور داماد کے حوالے سے دُکھوں سے بھری ہوئی تھی۔ اُن کی وفات کے بعد اُن کے چاہنے والوں نے اُنھیں بھرپور خراجِ عقیدت پیش کیا۔ ان میں نیر واسطی کے مضامین ''سلمیٰ و اختر'' اور ''اختر شیرانی'' کے عنوانات سے چھپے۔ نیرنگِ خیال لاہور نے نومبر 1950ء کو ''اختر شیرانی نمبر'' شائع کیا جس میں اُن کے چاہنے والوں نے اُن کی زندگی کے کئی گوشوں کو موضوعِ بحث بنایا۔ ادبی دُنیا 1960ء میں عاشق حسن بٹالوی کا تنقیدی مقالہ ''اختر شیرانی کے نام'' کے عنوان سے چھپا۔ 1960ء ہی میں نقوش ادبِ عالیہ نمبر شائع ہوا جس میں آل احمد سرور کا ایک سیر حاصل مضمون ''اختر شیرانی کے نام'' چھپا۔

آئینۂ ادب لاہور 1964ء میں سیّد اختر جعفری کا مضمون شائع ہوا۔ اُسی برس بھارت میں ڈاکٹر قیصر جہاں کا مضمون ''اختر شیرانی کی جنسی اور رومانوی شاعری'' چھپا۔ اُردو کے دِیگر مشاہیر کے مانند اختر شیرانی پر بھی طالب علموں کو اعلیٰ ترین ڈگریوں سے نوازا گیا۔ اس حوالے سے ڈاکٹر یونس حسنی کا پی ایچ ڈی کا مقالہ ''اختر شیرانی اور جدید اُردو ادب'' انجمنِ ترقیِ اُردو پاکستان کراچی نے 1976ء میں شائع کیا۔ 2001ء میں صحیفہ لاہور میں اختر شیرانی کے بیٹے ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی کا مقالہ ''اختر شیرانی، ایک باغ و بہار شخصیت'' کے عنوان سے چھپا۔ اکتوبر 2003ء میں اختر شیرانی میموریل سوسائٹی نے ''مجلہ اختر شیرانی'' شائع کیا۔

30 جون 2005ء کو محکمۂ ڈاک پاکستان کی جانب سے اختر شیرانی کے جنم دن پر 5 روپے کا اعزازی ٹکٹ جاری کیا گیا جس کے حوالے سے یہ تحریر ملتی ہے:

> To pay tribute and honour to Akhtar Shairani, a commemorative postage stamp of Rs. 5/_ denomination, in the series of Poets of Pakistan is being issued by Pakistan Post Office on June 30, 2005.

جنوری 1997ء کو ایوان اُردو شمالی ناظم آباد کراچی نے یومِ اختر شیرانی منایا۔

ہندوستان میں راجستھان اُردو اکادمی جے پور نے ''اختر شیرانی فن اور شخصیت'' کے موضوع پر 10,9 اکتوبر 1999ء کو دو روزہ کل ہند سیمینار مُنعقد کیا۔ اس کے بعد آج تک ہندوستان اور پاکستان میں اختر شیرانی کے حوالے سے مختلف ادبی اور صحافتی ادارے تقریبات مُنعقد کرتے رہے ہیں۔ کئی نشریاتی ادارے بھی اس سلسلے میں پیش پیش رہے۔ 2005ء میں اسلامیہ کالج سول لائنز لاہور کے ادبی نمبر فاران کی تقریب میں خاص طور پر اختر شیرانی کو موضوعِ بحث بنایا گیا جس میں اُن کے بیٹے ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی بھی تشریف لائے اور بہت سی باتیں اپنے والد کی بتائیں۔ چونکہ ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی شیخوپورہ میں رہائش پذیر ہیں، اس لیے وہاں کے کئی ادبی جریدے اور ادبی تنظیمیں آئے دن اختر شیرانی کے حوالے سے تقریبات مُنعقد کرتی رہتی ہیں۔

اختر صاحب کو ان کی وفات کے بعد قبرستان میانی صاحب لاہور میں دفن کیا گیا۔ اُن کی قبر کے کچھ فاصلے پر منٹو صاحب کی قبر بھی موجود ہے۔ قبر کی لوح پر یہ عبارت درج ہے:

خواب گاہ حضرت ابوالمعانی اختر شیرانی مرحوم

دامان خرابہ زار میں ہے

اک شاعر نوجوان کی تربت

9 ستمبر 1948ء

لوح کے باہر کی جانب یہ عبارت رقم ہے:

مرقد

شاعر رومان ابوالمعانی

اختر شیرانی

و ما الحیٰوۃ الدنیا اہ

متاع الغرور

خورشید رقم 1948ء

سیّد عابد علی عابد

1906ء-1971ء

دمِ رُخصت وہ چپ رہے عابد
آنکھ میں پھیلتا گیا کاجل

عابد

سیّد عابد علی عابد برِصغیر پاک و ہند کے اُن چند مشاہیر میں سے ہیں جن کا نام زریں حروف میں لکھنے کے قابل ہے۔ وہ ایک بہترین اُستاد، ماہرِ قانون، مایۂ ناز مترجم، بلند پایہ ادیب، تنقید نگار، شاعر، مدیر، فلم نویس، ڈراما نویس اور ماہرِ موسیقی تھے۔

سید عابد علی عابد کے آباواجداد ضلع لدھیانہ (موجودہ ہندوستان) کے نواحی علاقے تلونڈی کے خاندانِ سادات سے تعلق رکھتے تھے۔ آج سے قریباً سوا صدی قبل اُن کے دادا اور والد لاہور آن بسے تھے۔ خان بہادر ارسطو جاہ مولانا سیّد رجب علی شاہ آپ کے پردادا تھے۔ اور آپ کے دادا کا نام سیّد حسن شاہ تھا جو انگریز سرکار کے عہد میں سپرنٹنڈنٹ پولیس ریٹائر ہوئے اور عربی اور فارسی میں مہارت رکھنے والے چند اشخاص میں سے ایک تھے۔ سید عابد علی عابد کے والد کا نام سیّد غلام عباس تھا، وہ بھی انگریز سرکار کے عہد میں فوج میں ملازمت کرتے تھے اور رسالدار میجر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ آپ کی والدہ کا نام اقبال بیگم تھا۔ عابد صاحب کی تاریخِ پیدائش کے حوالے سے شیخ محمد اسماعیل پانی پتی کے مضمون میں سے ایک اقتباس درجِ ذیل ہے:

''میں نے ایک مرتبہ عابد صاحب سے اُن کی ولادت کی صحیح تاریخ

پوچھی تو اُنھوں نے 12 ستمبر 1906ء بتائی تھی (بڑا عجیب اتفاق ہے کہ پردادا اور پرپوتے کے سنہ ولادت میں پورے ایک سو سال کا فرق ہے۔ سیّد رجب علی 1806ء میں پیدا ہوئے اور سیّد عابد علی 1906ء میں)''۔

(صحیفہ، عابد علی عابد نمبر، صفحہ 216)

فوج میں ہونے کے باعث اُن کے والد صاحب کی تعیناتی مختلف اضلاع میں ہوئی، اس لیے اُنھوں نے اپنے بچپن ہی میں ہندوستان کی بہت ساری جگہیں دیکھ لی تھیں۔ اُنھوں نے چھٹی جماعت تک ڈیرہ اسماعیل خان میں تعلیم حاصل کی، اس کے بعد اُن کے دادا اُنھیں لاہور لے آئے۔ اُن کے چچا سیّد نثار علی شاہ انگریزی کے اُستاد تھے۔ دادا اور چچا کے علاوہ اُنھوں نے مولوی محمد حیات سے بھی کسبِ فیض کیا۔ عابد صاحب کے دونوں بزرگ علمی اور ادبی ذوق رکھتے تھے۔ ان کی سنگت کا نتیجہ تھا کہ چھوٹی عمر ہی میں عابد صاحب کا ادبی اور شعری رُجحان اُبھر کر سامنے آ گیا۔ دو برس بعد اُنھیں آٹھویں جماعت میں مشن ہائی سکول رنگ محل میں داخل کروا دیا گیا۔ شاہ جہانی عہد کی عمارت میں انگریز سرکار کی طرف سے بنائے گئے اِس سکول میں لاہور کی کئی عہد ساز شخصیات نے تعلیم حاصل کی۔ عابد صاحب کی زندگی پر، دادا اور چچا کی رفاقت کا ایسا گہرا اثر ہوا کہ اُنھیں چھوٹی عمر ہی میں کتابیں جمع کرنے کا شوق پیدا ہو گیا۔ اُن جمع شدہ کتب میں زیادہ تر تعداد بچوں کی کتب کی تھی۔ بارہویں جماعت کا امتحان پاس کیا تو آپ کے مضامین اور نظمیں ''ہزار داستان'' اور ''نونہال'' میں چھپنا شروع ہو گئیں۔ 1923ء میں پنجاب یونیورسٹی سے بی اے کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد کچھ عرصہ ''ہزار داستان'' کی ادارت بھی کی۔ پھر اپنے والد کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے لا کالج لاہور سے ایل ایل بی کا امتحان پاس کیا اور گجرات میں وکالت شروع کی مگر وکالت کا شعبہ مزاج سے میل نہ کھاتا تھا؛ چنانچہ آپ لاہور آ گئے اور یہاں کچھ عرصے کے لیے ''ادبی دُنیا'' کے ایڈیٹر رہے۔

پھر اُنھوں نے ایم اے فارسی کے لیے اورینٹل کالج لاہور میں داخلہ لیا۔ اس کالج میں اُنھیں حافظ محمود شیرانی اور شاداں بلگرامی جیسے اساتذہ ملے۔ جن کی رفاقت میں اُنھوں نے

اُردُو، عربی اور فارسی کا عمیق مطالعہ کیا۔ 1934ء میں عابد صاحب نے بطور لیکچرار ایف سی کالج لاہور میں ملازمت اختیار کر لی لیکن وہاں سے بھی دل بھر گیا۔ دو برس ایف سی کالج میں گزارنے کے بعد وہ بمبئی کی ایک فلم کمپنی فلمستان میں چلے گئے جہاں اُنھوں نے مشہورِ زمانہ فلم پوِتر گنگا کے مکالمے تحریر کیے۔ اس سے پہلے اُنھوں نے 1931ء میں پنجابی فلم ''ہیر رانجھا'' کی کہانی بھی لکھی تھی۔ بمبئی میں گزرا وقت عابد صاحب کی زندگی کا بہترین دور تھا مگر حالات نے کچھ ایسا پلٹا کھایا کہ اُنھیں بمبئی چھوڑ کر لاہور آنا پڑا۔ یہاں دیال سنگھ کالج میں فارسی کے اُستاد مقرر ہوئے۔ کچھ ہی عرصے کے بعد ملک تقسیم ہو گیا تو دیال سنگھ کالج کے ہندو ٹرسٹی، جاتے وقت عابد صاحب کو کالج کا پرنسپل مقرر کر گئے۔ زیادہ وقت نہ گزرا تھا کہ کالج کے نئے ٹرسٹیز کے ساتھ اُن کے اختلافات شروع ہو گئے اور پھر ٹرسٹیز کی ریشہ دوانیوں کے باعث 1954ء میں عابد صاحب کو کالج کے پرنسپل کے عہدے سے الگ ہونا پڑا۔ پھر چار برس کی طویل مقدمہ بازی کے بعد کالج کی جانب سے ملے مکان سے بھی عابد صاحب کو بے دخل ہونا پڑا اور وہ تمام عمر اپنا ذاتی مکان نہ بنا سکے۔ اس کے بعد وہ مجلسِ ترقیِ ادب اور اُس کے ادبی جریدے ''صحیفہ'' سے منسلک ہو گئے۔

عابد صاحب نے تین شادیاں کیں لیکن اولاد پہلی بیوی ہی سے ہوئی۔ جن سے آپ کی سات بیٹیاں اور اکلوتا فرزند سیّد منوچہر ہے۔ پہلی دو بیویوں سے تعلقات کبھی اچھے نہ رہے۔ اُنھوں نے زندگی کے آخری ایام اپنی تیسری بیوی کے ساتھ گزارے۔ لاہور کے دبستان اور ریڈیو سے بھی آپ کا گہرا تعلق رہا۔ ریڈیو مشاعروں اور ادبی سنگتوں کو عابد صاحب کی اپنی اور اُن پر لکھی گئی تحریروں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اُن کے ایک مضمون ''لاہور کا ایک دور'' میں سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> میری ادبی زندگی کا آغاز 1919ء- 1920ء کے لگ بھگ ہو گیا تھا، شاید ایک آدھ سال کا فرق ہو لیکن اس تحقیقات میں اس وقت میں نہیں اُلجھنا چاہتا۔ اُس وقت سے لے کر آج تک بہت سے ادیبوں سے واسطہ پڑا ہے۔ کچھ ایسے تھے جنھیں میں دوست کہتا تھا اور دوست سمجھتا تھا، کچھ واقعی میرے دوست تھے۔ کچھ ایسے تھے جن سے نیاز مندی

اور عقیدت کے تعلقات قائم تھے اور ہیں۔ کچھ نوجوان معاصر تھے، جو اب چالیس سے لے کر پچاس تک کے پیٹے میں ہیں۔ ان میں نقاد تھے، نکتہ طراز تھے، سخن ساز تھے، گفتگو باز تھے......اور آپ کے کان میں کہنے کی بات کچھ مادر پدر آزاد تھے، افسانہ نگار تھے، مکالمہ نویس تھے، شاعر تھے اور شعر گو تھے، خود فریب تھے، خودنگر تھے، انشا پرداز تھے، منشی تھے، اخبار نویس تھے، مُحقق تھے، بعض دوستوں پر یہ اصطلاح دونوں معنی میں صادق آتی تھی۔ علمی تحقیق بھی کرتے تھے اور حُقّے کا دم بھی بھرتے تھے۔ مختصر یہ ہے کہ 20ء سے لے کر 54ء تک کے قریب قریب ربع صدی ہوتی ہے، میں نے جو کچھ دیکھا ہے سنا ہے، اس کی داستان بیان کروں تو طلسم ہوش رُبا کا آٹھواں دفتر مُرتب ہوتا ہے۔ خود جو میرے کارنامے ہیں وہ بھی اس ضمن میں شنیدنی ہیں۔ اُن کے متعلق یادداشتیں مُرتب کر رہا ہوں۔ اُمید ہے کچھ زندگی میں چھپ جائیں گی۔ وہ سرمۂ چشمِ بصیرت اور نورِ دیدۂ عبرت ہوں گی۔ کچھ مرنے کے بعد شائع ہوں گی اور پرانی کتابوں کے جو اشتہار دیے جاتے تھے اُن کے الفاظ میں "حیرت افزائے ناظرینِ باتمکین" ہوں گی۔

آج کی صحبت میں ایسے ادیبوں کا ذکر کرتا ہوں جو اللہ کو پیارے ہو گئے۔ آپ ضرور کہیں گے کہ زندوں کا تذکرہ اس لیے نہیں چھیڑا کہ اُن سے ڈرتا ہوں۔ چلیے شخصیات نمبر میں ایک ڈرپوک مضمون نگار ہی سہی۔ جن لوگوں کا مجھے ذکر کرنا ہے، اُن میں کچھ تو ایسے ہیں کہ کچھ عرصے کے لیے لاہور کے ادبی اُفق پر طلوع ہوئے، فروزاں رہے اور پھر یہاں سے رُخصت ہو گئے۔ ایک آدھ ایسے بزرگ ہیں کہ لاہور کے نہ تھے لیکن یہاں آئے اور یہیں کے ہو رہے اور یہیں پیوندِ خاک ہوئے۔ ان سب کا ذِکر تاریخی تسلسل سے کرنے لگوں تو بات کسی طرح ختم نہ ہوگی، اس لیے فرداً فرداً اُن کے ذکر سے اپنے عالم خیال کی

تصویروں کے خطوط گویا از سرِ نو واضح کرتا ہوں۔‘‘

(نقوش، شخصیات نمبر، صفحہ 512)

عابد علی عابد کی افسانہ نگاری کا اسلوب دیکھنے کے لئے اُن کے افسانے ’’لیلیٰ‘‘ میں سے ایک اِقتباس:

’’لیلیٰ بظاہر دوپٹے کے ایک شکن کو دُرست کرتے ہوئے مگر حقیقت میں اپنے دھڑکتے ہوئے دل کو دونوں ہاتھوں سے سنبھالتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی۔

سب نے سر اٹھا کر نو وارد کی طرف ایک خاص نگاہ ڈالی اور پھر آنکھیں جھکا لیں۔ لیلیٰ نے تھوڑا عرصہ بیٹھ کر اپنے پیش خدمت کو ایسے اندازِ تحکمانہ اور شان رعونت سے آواز دی اور ایسی دھیمی اور سُریلی آواز میں پانی لانے کا حکم دیا کہ طوائفوں نے حقارت آمیز نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔ لیکن اب لیلیٰ کا بے پناہ اور سحر ساز حسن ایک ایشائی لمپ کی لطیف روشنی میں اپنی پوری خیرہ کن عریانی میں ظاہر ہو رہا تھا۔ اُن کی آنکھوں میں رقابت کی چمک اور چہروں پر انفعال کی سُرخی دوڑ گئی، لیلیٰ نے اپنی اس بے باکانہ فتح کو دیکھ کر دل میں طمانیت کی ایک گہری سانس لی، مگر ظاہر میں ایک بے پروائی کے انداز میں آنکھیں جھکا لیں، وہ مسرور تھی، کہ وہ اپنے حسن سے اپنی ہم جنسوں تک کو مرعوب کر رہی ہے۔ اور اب اس کے لیے ایک کام باقی تھا۔ سردار کو بھی اپنے حسن سے مغلوب کرنا۔

تمام محفل گرم تھی۔ لیکن سردار شیر علی کا دل سرد تھا۔ وہ خیمہ کے آخری سرے پر دو مخملی گاؤ تکیوں کے سہارے خاموش اس منظر کو دیکھ رہا تھا، ایسی گہری سوچ میں کہ اس کی آنکھیں بغیر کسی شے کا جائزہ لیے ہوئے گویا خیمہ کے پردوں میں سے نکل کر دُور کسی اور منظر میں مصروف تھیں۔ وہ ایک کریہہ المنظر شخص تھا، ہر ایک سپاہی منش خصلت سے

ممیز، جس کے بازو اور طبیعت کئی لڑائیوں میں کام آ آ کر فولاد کی طرح سخت ہو گئے تھے۔ وہ اسی حالت میں تھا کہ ایک تین چار سال کا بچہ خیمہ کا پچھلا پردہ اٹھا کر داخل ہوا۔ لیکن وہ اس شیطانی ہجوم سے کچھ گھبرا گیا۔ کیونکہ اس نے شیر علی کے دائیں بازو کو اپنی ننھی انگلیوں سے پکڑتے ہوئے توتلی زبان میں کہا، ''ابا! ابا'' شیر علی اس کی آواز سن کر اس طرح چونکا جس طرح اچانک کسی شخص کا پاؤں ایک زہریلے سانپ پر جا پڑے۔ اُس نے مڑ کر دیکھا اور اس کی آنکھیں دفعتاً پُر آب ہو گئیں۔ بچے کو گود میں اٹھا کر وہ اسے پیار کرنے لگا۔ بچے نے اپنی معصوم نگاہوں سے شیر علی کی طرف پیار سے دیکھنا شروع کیا۔''

نقوش کے شخصیات نمبر کی تیاری کے لئے بڑی شخصیات پر کئی مضامین تحریر کیے گئے۔ کچھ مضامین عابد علی عابد نے بھی لکھے۔ جب عابد علی عابد پر مضمون لکھنے کی بات ہوئی تو اس کا بیڑا خود مدیرِ نقوش محمد طفیل نے اُٹھایا اور ''عابد صاحب'' کے عنوان سے ایک انتہائی مُفصّل مضمون تحریر کیا جس میں سے ایک اقتباس درجِ ذیل ہے:

''جب میں نے سیّد عابد علی صاحب سے یہ کہا کہ میں آپ پر فلاں صاحب سے مضمون لکھوا رہا ہوں تو سیّد صاحب نے فرمایا...... ''یہ مجھ پر ظلم ہوگا۔''

اپنی طرف سے میں نے بڑے صحیح لکھنے والے کا انتخاب کیا تھا۔ ادب میں اُن کا بڑا مقام ہے اور سیّد صاحب سے ان کے صرف دیرینہ ہی نہیں بلکہ دوستانہ تعلقات تھے۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے قدرے جھنجھلا کر کہا ''تو پھر آپ پر کس سے لکھواؤں۔''

میرا خیال تھا کہ جواب میں اب مجھے یہ سننا پڑے گا کہ مجھ پر ابوالکلام سے لِکھواؤ یا ڈاکٹر عبدالحق سے، لیکن اُنھوں نے جو جواب دیا، وہ میری توقعات کے بالکل برعکس تھا۔ فرمایا: ''اوّل تو مجھ پر مضمون چھاپنے کی ضرورت نہیں ہے اور اگر چھاپنا ہی چاہتے ہو تو خود لکھو۔''

میں اِس جواب پر بوکھلا سا گیا۔ اس لیے کہ اُن کے قریباً تمام بڑی بڑی ادبی شخصیتوں سے برادرانہ تعلقات تھے اور وہ مضمون کے لیے منتخب مجھے کر رہے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ معاً خیال آیا کہ یا تو مجھے بنا رہے ہیں یا شدید بیماری کی وجہ سے اُن کی قوتِ فیصلہ جواب دے چکی ہے۔ دونوں صورتیں میرے لیے تکلیف دہ تھیں۔ لیکن اُنھوں نے مجھے اُسی وقت بہ خلوصِ تمام یہ یقین دلایا کہ میں یہ فرمائش بہ قائمی ہوش وحواس کر رہا ہوں۔ اور اس کے بعد جو اُنھوں نے میری سکیچ نگاری کی تعریفیں کیں، وہ میں آپ سے کیا کہوں۔ اگر اُن میں سے کوئی بات میرے نزدیک بھی سچی ہوتی تو یہاں لِکھ دیتا۔ ایک شرمندگی کا احساس اُس وقت بھی تھا اور اِس وقت بھی ہے جب یہ سطریں لِکھ رہا ہوں۔

اگر اُن پر کوئی اور مضمون لِکھتا تو بقول سیّد صاحب اُن پر ظلم ہوتا۔ اب وہ ظلم مجھ پر ہو رہا ہے۔ اس لیے کہ میں سمجھتا ہوں کہ اُن کی رنگا رنگ شخصیت کو قلم کے سحر سے کاغذ پر نہ لا سکوں گا۔ اس احساس سے اس مضمون کو شروع کر رہا ہوں۔ خدا آبرو رکھے۔

میں نے سیّد صاحب کو کئی ادبی محفلوں میں دیکھا اور سنا تھا۔ اور یہ بھی علم تھا کہ یہ دیال سنگھ کالج کے پرنسپل ہیں...... بڑے وجیہہ، خوش شکل، خوش پوشاک اور خوش آواز! لیکن میرا اُن سے کوئی باقاعدہ تعارف نہ تھا۔ جی بھی چاہتا تھا کہ اُن سے راہ و رسم بڑھے۔ لیکن تعارف کا کوئی آبرومندانہ موقع ہی نہیں ملا تھا۔ خواہ مخواہ کے تعارف کے لیے میرا دل کبھی راضی نہیں ہوا۔ ورنہ تعارف کا یہ طریقہ بڑا آسان تھا کہ یہ کسی مشاعرے سے شعر پڑھ کر نکلتے اور میں سلام جھاڑ کر اُن کے دو چار شعروں کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیتا۔ چلیے تعارف ہو گیا......شاعر بیچارے کی یہ بڑی کمزوری ہے کہ اسے روٹی نہ ملے تو

گزارہ کر لیتا ہے، لیکن شعروں کی داد نہ ملے تو جیتے جی مر جاتا ہے۔
اور جب بلا وجہ داد ملے تو تعارف چھوڑ دوستیاں تک ہو جاتی ہیں۔''
(نقوش، شخصیات نمبر، صفحہ 345)

عابد صاحب کی تیسری اہلیہ، محبوب عابد علی، جو کالج میں اُن کی شاگرد تھیں، اُن کے آخری ایام میں اُن کے ساتھ تھیں۔ اُن کی بیماری سے قبل وہ خود بھی کافی بیمار رہیں اور عابد صاحب اُن کی تیمارداری کرتے رہے۔ جب عابد صاحب خود بیمار ہوئے تو اِس بیگم نے یہ فریضہ بخوبی انجام دیا۔ سید عابد علی عابد کی وفات کے بعد جب صحیفہ کا عابد نمبر چھپا تو اس میں ایک مضمون محبوب عابد علی نے بھی تحریر کیا جس میں سے ایک اقتباس پیشِ خدمت ہے:

''دل قابو میں نہ تھا، میری زندگی کے رفیق نے صرف بارہ برس میرا ساتھ دیا۔ میری اماں تو اپنی پینتالیس سالہ بیاہتا زندگی پر فخر کیا کرتی تھیں۔ اُن کی اکلوتی بیٹی ایسی بدنصیب نکلی کہ صرف بارہ ہی برس کی بیاہتا زندگی کے بعد اس کے دوپٹوں کے رنگ اُڑ گئے، اُس کے سہاگ کی چوڑیاں ٹوٹ گئیں۔ شاہ صاحب کے ساتھ بسر کیے ہوئے لمحوں کی یادیں نشتر کی نوک بن کر دل میں چُبھ رہی تھیں۔ بذل حق کی باتوں سے درد نے کروٹیں لیں اور میں نے سوچا کہ آج میں نہ صرف اپنے چاہنے والے عظیم شوہر ہی سے بچھڑ گئی ہوں بلکہ اپنے بے نظیر اُستادِ گرامی سے بھی محروم ہو گئی ہوں۔ شاہ صاحب کا یہ شاگرد اس طرح پھوٹ پھوٹ کر رویا کہ صحن میں موجود سب خواتین آہوں اور سسکیوں میں ڈوب گئیں اور پھر یہ ڈگمگاتے قدموں سے باہر چلا گیا۔''

''دسمبر ۱۹۷۰ء کی بیس پچیس تاریخ تک شاہ صاحب اپنے قدموں سے چل کر بازار میں آتے جاتے رہے ہیں۔ اُن کے دائیں کُولھے پر بگڑا ہوا ٹیکا تکلیف کا باعث ضرور تھا لیکن تشویش ناک نہیں تھا۔ ان کے دوست معالج ڈاکٹر سیّد ممتاز حسین نے پچاسوں ٹیکے Seclopan اور Crytopon کے ملا کر لگوائے، Anti Philogistine کی پلٹس

کی بیسیوں شیشیاں کولھے میں لیپ کروائیں۔ وہ ذرا سی جگہ، جو دیکھنے میں پنگ پانگ کے بال کے نصف دائرے کے برابر سوج کر اور سرخ ہو کر اُبھر آئی تھی، پھیلنا شروع ہو گئی۔ اب ان کے معالج کے برادر خورد ڈاکٹر اکرام حسین عشرت کا مشورہ بھی شامل ہو گیا۔ کئی قسم کے کیپسول تجویز ہوئے، استعمال کروائے گئے لیکن:

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

سُوجی ہوئی ذرا سی جگہ کُولھے سے ران تک (گھٹنے سے ذرا اوپر) پھیل گئی۔ ران کا دایاں نِصف حصہ اُوپر سے نیچے تک سرخ ہو گیا۔ ران پر پلٹس باندھتے ہوئے یہ ہیبت ناک سرخ اور چمکتا ہوا حصہ دیکھ کر میرا دل ڈوبنے لگا تھا۔ تکلیف کے باعث وہ لات کو پھیلا نہ سکتے تھے بلکہ گھٹنے کے نیچے گاؤ تکیہ رکھ کر نصّف دائرے کی شکل میں رکھتے تھے۔ ۲۵ دسمبر کے بعد سے وہ پلنگ پر کروٹ بھی نہیں بدل سکے۔ میں روزانہ صبح کو بستر بدلواتی، کپڑے تبدیل کرواتی، ہاتھ منہ اور دانت صاف کرواتی اور کمر پر سپرٹ لگا کر خشک ہونے پر ٹالکم چھڑک کر ہاتھ سے کمر پر ہلکی ہلکی مالش کرتی رہتی، اُن کی جلد بڑی نرم و نازک اور لطیف تھی، اتنی احتیاط کے باوجود اُن کی کمر پر بیڈ سور ہو گیا۔ ہمارے پھانس بھی لگتی ہے تو تڑپ اُٹھتے ہیں، شاہ صاحب کو حد درجہ تکلیف میں بھی میں نے کراہتے نہیں دیکھا۔ لیمپ شب و روز اُن کے سرھانے میز پر روشن رہتا اور وہ دونوں ہاتھوں میں کتاب تھامے محوِ مطالعہ رہتے۔ بیماری کے دوران میں اُن کی بھوک کم ہو گئی تھی، وہ روایتی اور مرغن کھانے کبھی پسند نہیں کرتے تھے، ہلکے پھلکے انگریزی قسم کے کھانے اُنھیں پسند تھے۔ علالت میں اُن کے پسندیدہ کھانے تیار کرواتی، اُن کے پسندیدہ پھل منگوا کے رکھتی، پاس بیٹھ کر اپنے ہاتھ سے اُنھیں کھلاتی لیکن کچھ لقمے کھانے کے بعد مجھے روک دیتے۔

میرے زیادہ اصرار پر کہتے میری جان! مجھے بھوک نہیں ہے، تنگ نہ کرو۔ اُن کی بڑھتی ہوئی تکلیف سے میں پریشان تھی۔ جب بھی ہسپتال چلنے کو کہتی، جواب دیتے کہ سوچ کر بتاؤں گا۔ ان کے معالجین ان کی تکلیف رفع کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے۔

13۔ جنوری 1971ء کو حسبِ معمول مَیں نے اُنھیں پھر ہسپتال چلنے کو کہا۔ کہنے لگے ''اچھا لے چلو، دیکھتے ہیں ہسپتال والے کیا علاج کرتے ہیں۔'' 13 جنوری کو ہسپتال میں داخل ہوئے۔ 14 کی صبح کو اُن کی ران کا آپریشن ہوا، 15 کی صبح کو اُن کی ڈریسنگ میرے سامنے ہوئی۔''

(صفحہ 169-170)

عابد صاحب کی وفات 19 اور 20 جنوری کی درمیانی شب 1971ء میں ہوئی۔ محبوب عابد علی ہی کے مضمون میں سے اس حوالے سے ایک اقتباس:

''یہ عالمانہ صحبتیں جاری تھیں، شب و روز معمول کے مطابق گزر رہے تھے۔ کیا خبر تھی کہ 19 جنوری کی رات کو میں سُہاگن سوؤں گی اور جب اگلی رات آئے گی تو میرا سُہاگ لُٹ چُکا ہوگا۔ شاہ صاحب کی ایک غزل کا مقطع ہے:

فریب دل کا نہ کھانا کہ وقت پر عابد
بتا دیا ہے کہ بے اعتبار ٹھہرے گا

20 جنوری کی صبح طلوع ہوئی تو یہی ہوا۔ اُن کا دل اُنھیں فریب دے گیا اور ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگیا:

اُلٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیمارئ دل نے آخر کام تمام کیا''

عابد صاحب کی تمام عمر تصنیفات اَور تراجم میں گزری۔ اُن کی طبع شدہ کتب کی تفصیل ہمیں شیخ محمد اسماعیل کے مضمون سے ملتی ہے۔ یہ مضمون صحیفہ نمبر میں چھپا:

تصنیفات، تالیفات اور تراجم

ذیل میں ان کی مؤلفہ، مصنفہ اور مُرتبہ کتابوں کے نام لکھے جاتے ہیں (جس قدر معلوم ہو سکے)۔ اگر ہر ایک کتاب کی تفصیل بیان کی جائے تو مضمون بہت طویل ہو جائے۔ میں نے یہ فہرست آسانی کی غرض سے حروفِ تہجی کے لحاظ سے مرتب کی ہے:

۱۔ آتشِ نمرود
۲۔ انتقاد
۳۔ اُردو کا تنقیدی سرمایہ
۴۔ ایرانِ قدیم
۵۔ اُصولِ انتقادِ ادبیات
۶۔ بشر ہے کیا کہیے
۷۔ بچوں کو ذمہ دار کیسے بنایا جائے؟
۸۔ بچوں کو نظم وضبط کا خوگر بنائیے
۹۔ بن ماں یا باپ کا کنبہ
۱۰۔ بڑے گھر کی بیٹی
۱۱۔ تلمیحاتِ اقبالؒ
۱۲۔ تعلیم کا عمل
۱۳۔ تنقیدی مضامین
۱۴۔ جوانی کی پہلی رات
۱۵۔ جہاں آرا
۱۶۔ چاندنی
۱۷۔ حجابِ زندگی
۱۸۔ دُکھ سُکھ اور سُہاگ
۱۹۔ داستانِ فلسفہ
۲۰۔ داستان (پیرالوئی کی ایفرا ڈائٹ کا ترجمہ)
۲۱۔ داغِ ناتمام
۲۲۔ روپ متی اور باز بہادر
۲۳۔ سینما کی شام
۲۴۔ شہباز خاں
۲۵۔ شمع
۲۶۔ شعرِ اقبالؒ
۲۷۔ شبابِ تازہ
۲۸۔ شامِ غریباں
۲۹۔ طلسمات
۳۰۔ عمر خیام
۳۱۔ عظیم الشان کی موت
۳۲۔ فنونِ لطیفہ اور انسان
۳۳۔ فردوسی
۳۴۔ قسمت

۳۵۔ قیامت کی رات	۳۶۔ گل ہائے بہار
۳۷۔ میراثِ ایران	۳۸۔ موتی کرن کپور
۳۹۔ محبت کی ایک شام	۴۰۔ نیرنگ
۴۱۔ ہماری موسیقی	۴۲۔ یدِ بیضا
۴۳۔ یہ ہے شمالی افریقہ	

مندرجہ ذیل کتابیں آپ نے ایڈٹ کیں، ان پر مُفید حواشی اور مبسوط ریویو لکھے:

۴۴۔ سوانح مولانا روم، مؤلفۂ مولانا شبلی ۴۵۔ موازنۂ اَنیس و دبیر مؤلفہ مولانا شبلی

۴۶۔ قصائدِ خاقانی ۴۷۔ شکوہ اور جوابِ شکوہ، مصنفہ ڈاکٹر اقبالؒ

مندرجہ ذیل ادبی شاہکاروں پر آپ نے نہایت فاضلانہ، محققانہ اور ناقدانہ مقدمے لکھے:

۴۸۔ ذوق دہلوی از ڈاکٹر تنویر احمد علوی ۴۹۔ مہتابِ داغ

۵۰۔ کُلیاتِ غالب فارسی ۵۱۔ آرائشِ محفل، از شیر علی افسوس

۵۲۔ خرد افروز، از حفیظ الدین احمد ۵۳۔ بی اے کے نصابِ فارسی کی ترتیب

آپ کی نظموں اور غزلوں کے مندرجہ ذیل دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں:

۵۴۔ شبِ نگار بنداں، ابتدائی کلام جو ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا

۵۵۔ بریشمِ عود، بعد کا کلام جو ۱۹۶۶ء میں چھپا

علاوہ ازیں بعض ایسی کتابوں کے مسوّدات بھی ہیں جو آپ مُرتب کر رہے تھے، مثلاً اسلوب، البیان، البدیع، موسیقی، غزلوں کا انتخاب، دیوان صبا لکھنوی، اسالیب کا تنقیدی مطالعہ وغیرہ۔ خبر نہیں اور کن کن کتابوں، مقالوں اور مضامین کے خاکے مرحوم کے ذہن میں ہوں گے جو اُن کے ساتھ ہی ہمیشہ کے لیے دفن ہو گئے۔ ایک اکیلے عابد صاحب کے ساتھ ہی نہیں، قریباً ہر ادیب، ہر انشا پرداز، ہر مصنف اور ہر مؤلف کے ساتھ ایسا ہی ہوتا رہا ہے اور ایسا ہی ہوتا رہے گا۔"

عابد صاحب کی وفات پر قطعۂ تاریخ وفات قمر نقوی نے تحریر کیا۔ جو درجِ ذیل ہے:

قطعۂ تاریخِ وفات

بسکہ عابد علی عابد سا ہوا کم عابد
آپ کے بعد ہے ویرانی کا عالم عابد
نہ گلوں میں ہے وہ بو باس نہ غنچوں پہ نکھار
اب گل و برگ پہ رخشندہ نہ شبنم عابد

۲۸۸ ۱۲۱۴ ۴۶۹ =۱۹۷۱ء

اُنھیں قبرستان مومن پورہ میں دفن کیا گیا۔قبر کے کتبے کی تفصیلات پروفیسر اسلم نے اپنی کتاب خفتگان خاکِ لاہور میں صفحہ 307 پر یوں بیان کی ہیں:

بسم اللہ الرحمن الرحیم
مرقد
سیّد عابد علی عابد
تاریخِ وفات ۲۰ جنوری ۱۹۷۱ء
ہم زباں چپ ہو گئے ہم داستاں چپ ہو گئے
کیسے کیسے محفل آرا ناگہاں چپ ہو گئے

نوٹ: قبر کی تختی آدھی سے زیادہ اندر کو دھنس چکی ہے اور تختی پر صرف ''سید عابد علی عابد'' کے الفاظ دکھائی دیتے ہیں۔

سیّد عبدالحمید عدم
1910ء-1981ء

زمانہ جب تری رفتار کی تعریف کرتا ہے
مجھے اپنی طبیعت کی روانی یاد آتی ہے
عدم

سیّد عبدالحمید عدم، جو زمانے بھر میں عدم کے نام سے معروف ہیں، کا جنم 10اپریل 1910ءکو گوجرانوالہ (پنجاب۔مشترکہ ہندوستان) کے ایک قصبے موسیٰ خان میں ہوا۔ خفتگانِ خاکِ لاہور میں پروفیسر اسلم نے بھی جائے پیدائش قصبہ موسیٰ خان ہی بتلائی ہے، لیکن اگر فنون غزل نمبر مطبوعہ 1969ء میں اُن کے ''سوانحی اشارے'' پر عدم صاحب کی اپنی تحریر دیکھیں تو وہ کچھ یوں ہے:

''سیّد عبدالحمید عدم

نام: سید عبدالحمید عدم تاریخ پیدائش:10اپریل1910ء
آبائی وطن، تلونڈی موسیٰ خان، تحصیل وضلع گجرات، اپریل 1910ء میں والد صاحب چونکہ کاروبار کے سلسلے میں عارضی طور پر لائل پور میں اقامت پذیر تھے، اس لیے راقم الحروف کی تشریف آوری وہیں ہوئی۔ تعلیم کچھ گوجرانوالہ میں اور کچھ لاہور میں مکمل ہوئی۔ تعلیم سے فراغت کے بعد ملٹری اکاؤنٹس ڈیپارٹمنٹ کے مقابلہ میں کامیاب ہو کر اسی محکمے سے منسلک ہو گیا۔ 1941ء میں محکمے کا بلند ترین امتحان (ایس اے ایس) اعزاز کے ساتھ پاس کیا۔ 1948ء میں ڈپٹی اسسٹنٹ

کنٹرولر کے عہدے سے عقد ہو گیا اور اپریل 1966ء میں عہدے
سے پنشن پر رخصتی ہوئی۔''

درج بالا اشاریہ اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ چھوٹی عمر ہی میں ملازمت اختیار کر لی اور محکمہ جاتی امتحان پاس کر کے ایک خاص درجے تک کی ترقی بھی حاصل کی۔ اس کے ساتھ ساتھ جواں عمری میں دو عناصر آپ کی ذات کا مستقل حصہ بن گئے: ایک مے نوشی اور دوسرا شعر گوئی۔ جن لوگوں کو آپ کی قُربت میسر رہی، اُن کا یہی کہنا تھا کہ اتنی کثیر تعداد میں شعر کم ہی کسی نے کہے ہوں گے اور آپ جیسا بلانوش انسان بھی کم ہی اس دُنیا پر آیا ہوگا۔ ذیل کے شعر اُن کی زندگی کی غمازی کرتے ہیں:

کیوں ذِکرِ حادثات کو کیجے عدم پسند
کیوں شاہد و شراب کی باتیں نہ چھیڑیئے

اے شیخ کیوں عدم سے اُلجھتا ہے بے سبب
کمبخت ہر مزاج کی پہچان چاہیے

کہتے ہیں عُمرِ رفتہ کبھی لوٹتی نہیں
جا مے کدے سے میری جوانی اُٹھا کے لا

عدم کی مے نوشی میں گُندھی غزلوں نے تقسیم سے قبل ہی ہندوستان بھر میں دُھوم مچا رکھی تھی اور تقسیم کے بعد جب اُن کی کوئی کتاب یہاں شائع ہوتی، تو وہ چند ہی روز میں ہندوستان کے بازاروں میں بھی دستیاب ہوتی۔ آپ اپنی طبیعت میں ہنستے مسکراتے، معصوم، سیدھے سادے اور صاف گو انسان تھے اور آپ کی ذات میں موجود یہ اوصاف اُن کی شاعری میں بھی بدرجہ اُتم دِکھائی دیتے ہیں۔

اُن کی شاعری میں سیدھے سادے الفاظِ حُسن وعشق، مے نوشی اور موسموں کے تغیر وتبدل کی داستانیں سناتے ملتے ہیں۔

اُن کی ذاتی زندگی اور شاعری کے بارے میں ایک مضمون شاد امرتسری نے تحریر کیا تھا۔ اس میں سے ایک اقتباس پیشِ خدمت ہے:

''عدم صاحب کا مزاج بالکل بچوں کا سا ہے۔ وہ بچوں کی طرح ضد بھی کرتے ہیں مگر جھٹ مان بھی جاتے ہیں۔ اُنھیں جھوٹ بولنا آتا نہیں۔ یہ میں بالکل مبالغہ نہیں کر رہا۔ وہ اگر کبھی کبھار جھوٹ بولنے کی کوشش بھی کریں تو اُن کے چہرے سے اس طرح عیاں ہو جاتا ہے جس طرح ایک ڈرپوک بچے کو جُھوٹ بولتے وقت چہرے کے بدلتے ہوئے رنگ پر قابو نہیں رہتا۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ شاید انِھیں فِطری اخلاقی خوبیوں کی وجہ سے اُن کے شعروں میں صداقتِ احساس اور خلوصِ اظہار ہوتا ہے۔ وگرنہ اُن کی زندگی کا تجرباتی میدان بہت محدود ہے۔ وہ زندگی میں فقط تین کام کرتے ہیں۔ دفتر جاتے ہیں، شعر کہتے ہیں اور شراب پیتے ہیں۔ یہی اُن کی زندگی اور کل کائنات ہے۔ زندگی کے بے شمار متنوع پہلوؤں کا مطالعہ کرنا اُن کے بس کا روگ نہیں۔ وہ ریاکاری، سیاست بازی اور گروہ بندی سے اس طرح ناآشنا ہیں جس طرح آج کا کوئی انسان نہیں ہوتا۔ وہ فریب کھا سکتے ہیں، دے نہیں سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کسی خاص مکتبِ خیال کے مقلدّ نہیں۔ اُن کی آزادیِ طبع اور آزادی فکر کسی ضابطے کی مُتحمل نہیں اور شاید کبھی ہو بھی نہیں سکتی۔ اس آزادی بلکہ آزادہ روی کی وجہ، اُن کا طبعی لااُبالی پن ہے۔ میں نے اکثر غور کرنے کی کوشش کی کہ اُنھوں نے شراب نوشی کو اس طرح اپنے آپ پر کیوں سوار کر رکھا ہے مگر کوئی خاص وجہ سمجھ میں نہیں آئی، سوائے اس کے کہ یہ بھی زندگی کے ساتھ اُن کے غیر سنجیدہ سلوک کی آئینہ دار ہے۔ وہ کسی مسئلے پر بھی سنجیدگی سے غور نہیں کرتے۔ ایک عجیب قسم کی بے راہ روی اور لااُبالی پن ہر وقت اُن کو اپنے دام میں پھنسائے رکھتا ہے۔ یہ بے راہ روی اور لااُبالی پن اس طرح مستقل صورت اختیار کر

چکا ہے کہ عدم صاحب اس کے اثر سے محفوظ ہی نہیں رہ سکتے۔ مجھے کئی بار خیال آیا کہ عدم صاحب نے کہیں یہ ایک مصنوعی لبادہ تو نہیں اوڑھ رکھا یعنی کیا یہ بے راہ روی اُن کی زندگی اور اُن کے فن کا نمائشی پہلو تو نہیں، مگر ہر بار مجھ پر یہ عیاں ہوا کہ ایسی بات نہیں۔ یہ لااُبالی پن اور ایک فنکارانہ وارفتگی اُن کی شخصیت کا ایک فِطری جُزو ہے۔ یہ محض سونا ہے اُس پر سہاگا نہیں۔ یہ کوئی ملمع نہیں بلکہ اصل ہے۔ مجھ پر یہ حقیقت کچھ اور یوں بھی واضح ہوئی جب میں نے اُن کے تصورِ عشق پر غور کیا۔ غور کرنے پر مجھے حیرت ہوئی کہ اُنھوں نے زندگی میں کبھی عشق نہیں کیا۔ عشق سے میری مُراد بالکل وہی مجنوں اور فرہاد کا عشق نہیں بلکہ زندگی کا وہ ایک اور فقط ایک یادگار جذباتی واقعہ ہے جو اکثر اوقات فن اور جذبات و احساسات میں ایک دائمی گداز پیدا کرتا ہے۔ کسی سے شدید قسم کا عشق نہ کرنے کا سبب اُن کی وہی فطری بے راہ روی اور طبعی لااُبالی پن ہے۔ عدم صاحب نے کسی سے بھی عشق نہیں کیا مگر پھر بھی وہ ہر حسین چیز کے عاشق و پجاری ہیں اور یہ احساس اکثر اوقات ہنگامی ہوتا ہے۔ یہ حُسن پرستی اگرچہ ایک معمولی قسم کے حسّاس انسان کی حُسن پرستی نہیں تاہم اس حُسن پرستی میں وہ تڑپ اور وہ دائمی گداز بھی نہیں جو زندگی میں صحیح عشق کرنے سے پیدا ہوتا ہے اور جس سے ایک گہرا غم، ایک دردمندی اور ایک ابدی دل سوزی پیدا ہوتی ہے، جس کی دِھیمی دِھیمی آنچ میں گوہرِ مُراد آبدار ہوتا ہے۔ مگر اس دردمندی اور کیفیتِ غم کی غیر موجودگی نے عدم صاحب کو زیادہ نقصان نہیں پہنچایا۔ اُنھوں نے اپنے آپ کو آتشِ سیّال کی بھٹی میں ڈال کر کندن بنانے کی کوشش کی ہے جس میں وہ بڑی حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔''

(نقوش، شخصیات نمبر، صفحہ 1139)

آپ کے طبع شدہ مجموعۂ کلام میں خرابات بہت زیادہ مقبول رہا:

عدم عقل کی جستجو کا تصور
خرابات میں منتقل ہو رہا ہے

عدم نے ابتدا میں نظمیں زیادہ کہیں۔ اُنہی دنوں میں اُن کا ایک مجموعہ کلام ''نقشِ دوام'' کے نام سے چھپ گیا تھا۔ اُس میں زیادہ تر نظمیں ہی تھیں۔ لیکن اُس میں نثر بھی ملتی ہے جسے انھوں نے پیش لفظ کے طور پر ''سطورِ اوّلیں'' کے عنوان سے تحریر کیا۔ اُس میں سے ایک اقتباس ملاحظہ فرمایئے:

> ''آرٹ زندگی کا ترجمان ہے اور زندگی ہمیشہ نئی اور تازہ ہے۔ کہتے ہیں کہ شاعری ایک جنون ہے، یونہی سہی! لیکن اس میں شعر کو اپنے ذوق ونظر کی ترجمانی کرنی چاہیے اور خوامخواہ بے معنی ''درسِ عمل'' دینے اور ''کوشش کرو، ہمت کرو'' کی رٹ لگانے سے احتراز کرنا چاہیے، کیونکہ ان کے یہ کارنامے اپنی جگہ پر ہوں، شاعری سے اُن کا دُور کا تعلق بھی نہیں اور آرٹ کا مقام اس سطح سے بہت بلند ہے۔''

نقشِ دوام کا دیباچہ مولانا نیاز فتح پوری نے ''اعتزار و اعتراف'' کے عنوان سے تحریر کیا تھا۔ مولانا اس وقت لکھنؤ میں ''نگار'' کے ایڈیٹر تھے۔ اُس دیباچے میں سے ایک اقتباس:

> ''عدم کے کلام کی وہ خصوصیت جس نے مجھے ہمیشہ متاثر کیا، جذبات کی بلندی اور زبان کی حلاوت ہے۔ غزل ہو یا نظم، وہ ہر چیز کو خاص نظر سے دیکھتے ہیں اور ایسے خاص انداز میں بیان کرتے ہیں کہ سننے والے کے لیے یہ امتیاز دُشوار ہو جاتا ہے کہ وہ شاعر کے خیال سے لطف اُٹھا رہا ہے یا اُس کی زبان سے۔ عدم صاحب کو فخر کرنا چاہیے کہ اُن کی جگہ اُنھیں فطری شعرا کی صف میں ہے۔ نظمیں مختلف عنوانوں پر لکھی گئی ہیں اور ہر عنوان کی پوری رعایت کا اُنھوں نے لحاظ رکھا ہے۔ اصل مقصود سے غیر متوازن خیالات اُنھوں نے کسی ایک جگہ بھی پیش نہیں کیے اور نظم کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ خیال و زبان

دونوں مربوط و مسلسل ہوں۔ اُن کی غزل میں غالب، مومن اور میر
تینوں کا رنگ ملا ہوا ہے اور ظاہر ہے کہ اس سے زیادہ کامیابی ایک
غزل گو شاعر کی اور کیا ہوسکتی ہے۔''

اب کچھ ذِکر اُس کلام کا جو مختلف اوقات میں مختلف گویوں نے گایا۔ خاص طور پر ایک قطعہ زمانے بھر میں مشہور ہوا جو آپ کے ایک مجموعۂ کلام ''گردشِ جام'' میں موجود ہے:

گُلستانوں میں گھوم لیتا ہوں
بادہ خانوں میں جھوم لیتا ہوں
زندگی جس جگہ بھی مل جائے
اُس کے ہاتھوں کو چوم لیتا ہوں

اسی طرح ایک اور غزل زمانے بھر میں مشہور ہوئی:

مے کُدہ تھا چاندنی تھی، میں نہ تھا
اِک مُجسّم بے خودی تھی، میں نہ تھا

1990ء کی دہائی کے اواخر میں ایک ممتاز پاکستانی گائیک اُستاد سلامت علی خان اور مشہور مُغنیہ عذرا جہاں نے آپ کے ایک مجموعۂ کلام ''عکسِ جام'' میں سے ایک غزل گائی جو بہت مشہور ہوئی:

دن گزر جائیں گے سرکار کوئی بات نہیں
زخم بھر جائیں گے سرکار کوئی بات نہیں

آپ کا شہر اگر بار سمجھتا ہے ہمیں
کوچ کر جائیں گے سرکار کوئی بات نہیں

''ساز وصدف'' میں سے یہ شعر دیکھیے:

ساز آتے ہیں جام آتے ہیں
کیسے کیسے مقام آتے ہیں
تم نہ آئے تو کوئی بات نہیں

لوگ لوگوں کے کام آتے ہیں

ایک اور جگہ کچھ یوں کہتے ہیں:

ستارے اُترتے ہوئے میکدے میں
عدم واقعہ ہے کہانی نہیں

''گردشِ جام'' میں کچھ گیت بھی شامل ہیں۔ایک گیت کے بول اس طرح تھے:

سکھیوں نے ڈالے جھولے لیکن جیسے اگنی چھو لے
وہ سرسوں کیسے پھولے ہم کس کو حال سنائیں
مرجائیں

دیگر غزلوں کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

دیکھنا کیا دادِ کافر ماجرائی دے گئے
دے کے اِک جھوٹی تسلی سب خدائی دے گئے

گردش ایّام سے فرصت ملے تو ایک دن
کھول کر دِل گردشِ ایام کی باتیں کریں

شام ہے آ وَ لبِ جُو بیٹھ کر اِک دو گھڑی
کچھ پئیں، کچھ گردشِ ایام کی باتیں کریں

موسیقیت اور رمزیت اُن کی شاعری کی خاص خوبیاں ہیں۔یہی وجہ ہے کہ اُن کا کلام اُن کے عہد کے تمام بڑے غزل گائیکوں (حضرات اور خواتین) نے گایا۔اُن کی وفات کے بعد بھی اُن کا کلام بڑی لگن سے گایا گیا۔ ہندوستان میں انوپ جلوٹا، وِجے سنگھ، جگجیت سنگھ اور خصوصاً پنکج اُدھاس نے بڑی محبت سے گایا۔اُنھوں نے 1980ء کی دہائی کے اواخر میں کچھ غزلیں ''شرابی غزلیں'' کے عنوان سے سنگیت پریمیوں کے حوالے کیں تو عدم کو ایک بار پھر نئی زندگی ملی۔لیکن یہ کتنی بدقسمتی ہے کہ عصرِ حاضر کی نوجوان نسل کو عدم کے نام تک کا پتا نہیں۔ میں نے ایک کالج کے سو سے زائد طلبا سے عدم کے بارے میں پوچھا۔صرف ایک

لڑکی نے اتنا کہا کہ شاید وہ کوئی ہندوستانی شاعر ہیں۔ باقی تمام عدم سے کوئی واقفیت نہیں رکھتے تھے۔

اُن کی زندگی کے آخری ایّام کے بارے میں ایک اقتباس اے حمید کی کتاب ''چاند چہرے'' میں سے:

''ان دنوں عدم صاحب مُلازمت سے ریٹائر ہوکر اپنی چھاؤنی والی نئی کوٹھی میں رہ رہے تھے۔ جب یہ کوٹھی بن کر تیار ہوئی تھی تو عدم صاحب مجھے اپنے ساتھ وہاں لے گئے۔ بڑی خوبصورت کوٹھی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے عدم صاحب پر ایک یہ کرم بھی کیا تھا کہ اُنھیں نہایت وفا شعار، دُور اندیش اور صابر بیوی اور ہونہار اولاد عطا کر دی تھی۔ بیگم صاحبہ نے جس بردباری، تحمل اور صبر شکر اور دانشمندی کے ساتھ عدم صاحب کا ساتھ نبھایا اور اولاد کی پرورش کی، یہ اُن ہی کا حصہ ہے۔ بچوں کو اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم دلائی۔ اُنھیں لائق بنایا اور وہ اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوئے اور چھاؤنی میں اپنی عالی شان کوٹھی بنوائی۔

وقت گزرتا چلا گیا۔ عدم صاحب کے درِ میکدہ پر پھیرے کم سے کم ہوتے چلے گئے۔ کبھی کبھار کسی ادبی محفل میں اُن سے ملاقات ہو جاتی تو اُنھیں صوفی حالت میں دیکھ کر بڑی خوشی ہوتی کیوں کہ میں خود بھی تائب ہو چکا تھا۔ اُن کی سانس کی تکلیف عمر کے ساتھ بڑھ گئی تھی۔ معلوم ہوا کہ عدم صاحب نے بھی شراب نوشی ترک کر دی ہے۔ وہ بیمار رہنے لگے تھے۔ ایک بار ہم اُن کی عیادت کو ان کے ہاں گئے ۔ وہ دُبلے ہو گئے تھے اور اُنھوں نے ڈاڑھی بڑھا لی تھی۔ کچھ وقت اور گزر گیا۔

لاہور ٹی وی پر عدم صاحب کا ایک انٹرویو نشر ہوا۔ انٹرویو یوسف کامران لے رہے تھے۔ عدم صاحب کے چہرے پر گہری سنجیدگی طاری تھی۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ یہ وہ عدم صاحب ہیں جو رندِ شراب تھے اور جن

کے قہقہے گونجا کرتے تھے۔ یوسف کامران کی ہر بات کا جواب بڑی متانت اور سنجیدگی سے دے رہے تھے۔ کسی کسی بات پر ذرا سا مسکرا دیتے تھے۔ اُن کی مسکراہٹ اُن کے مزاج کی طرح بالکل بچوں ایسی تھی۔ اس کے بعد ایک روز یہ حسرت ناک خبر سنی کہ لاہور میں طویل علالت کے بعد عدم صاحب کا انتقال ہو گیا ہے۔

مری اجل بھی عدم اِک حسیں بہانا ہے
غمِ حیات سے آزاد ہو گیا ہوں میں

وہ چلتی پھرتی سادگی اور معصومیت کا پیکر عدم لاہور کی محفلوں سے اُٹھ گیا۔ شعر اور زندگی میں عدم کی مثال ایک غیر منافق اور سچے انسان کی مثال تھی۔ ایک لمبی مدت میں نے اُن کے ساتھ گزاری ہے۔ اُنھیں ہر حالت میں دیکھا ہے۔ دریا کے اُوپر بھی دیکھا ہے اور اُن کے ساتھ غوطہ لگا کر اُنھیں دریا کے اندر بھی دیکھا ہے۔ لوگ عدم صاحب کو دھوکا دے جاتے تھے۔ اُنھوں نے کبھی کسی کو دھوکا نہیں دیا تھا۔ جیسا اُن کا دل بے ریا اور معصوم تھا ویسی ہی اُن کی شخصیت ریاکاری اور منافقت سے پاک تھی۔"

(صفحہ 167)

عدم صاحب نے تمام زندگی بے پناہ شعر کہے۔ اُس کی ایک وجہ اُن کا بلانوش ہونا بھی ہے۔ کئی بار وہ چند روپوں کے عوض اپنا مجموعہ کلام ناشر کو بیچ دیتے تھے۔ اُن کے شائع شدہ شعری مجموعے درج ذیل ہیں:

(1) نقشِ دوام ((2خرابات (3) زُلف پریشان (4) گردشِ جام
(5) مکتبِ عشق (6) ساز وصدف (7) پیچ وخم (8) قول وقرار
(9) شہرِ فرہاد (10) قصرِ شیریں (11) گُلنار (12) بطِ مے
(13) شہرِ خوباں (14) نوکِ زباں (15) آبِ زمزم (16) خمِ آبرو
(17) عکسِ جام (18) داستان ہیر (19) باغ و بہار (20) دو جام

(21) دردو درماں (22) رنگ و آہنگ (23) بربط و جام

(24) نصابِ دل (25) بالِ ہما (26) جنسِ گراں (27) رمِ آہو

(28) نشانِ راہ (29) آبِ زر (30) آبِ رواں (31) ذکرِ یار

(32) رُسوائی نقاب (33) جھوٹ سچ (34) سرو وسمن

(35) سُندر بن (36) زکاتِ حُسن (37) دستورِ وفا (38) خم کدہ

(39) چارۂ درد (40) بہتے موتی (41) دولتِ بیدار

(42) جُوئے شِیر (43) چاک پیراہن (44) نگارخانہ

(45) دردِ محبت (46) دہانِ خم (47) مُورتیں (48) نادانیاں۔

درج بالا کلام میں سے زیادہ تر شعری مجموعے مکتبۂ کارواں کچہری روڈ لاہور نے شائع کیے۔ 2009ء میں الحمد پبلی کیشنز نے اُن کے مجموعے، کلیاتِ عدم کے عنوان سے شائع کیے۔ 1966ء میں نوکری سے ریٹائر ہونے والے عدم مے نوشی سے ریٹائر نہ ہو سکے۔ چونکہ بنیادی طور پر بھاری بھرکم جسامت کے مالک تھے اس لیے آخری ایام میں ذہن کے کچھ حصوں نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا جس کے باعث دونوں گھٹنے آپس میں جڑ گئے تھے۔ وفات سے کچھ عرصہ قبل اُن کی شریکِ حیات بھی دنیا چھوڑ گئیں، جنھوں نے تمام عمر اُنھیں سنبھالا تھا۔ اُنھوں نے 10 مارچ 1981ء کو انتقال کیا۔ آپ کو لاہور ڈرائی پورٹ سے ملحقہ قبرستان میں دفن کیا گیا۔

جو یہاں اپنی ہی دُھن میں غرق ہے مدہوش ہے
اُس کی ہستی غم زدہ دُنیا کو بار دوش ہے

آخر میں احمد ندیم قاسمی کے الفاظ رقم کیے جاتے ہیں جو اُنھوں نے عدم کے لیے تحریر کیے تھے:

''دورِ حاضر کے غزل نگاروں میں سے صرف عدم کی غزل میں ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ایک ندی میدان میں داخل ہو کر ایک پُرسکون بہاؤ کے ساتھ دِھیمے دِھیمے گنگنا رہی ہے۔ عدم شدّتِ احساس کے علاوہ شدتِ اظہار کا شاعر ہے۔ جو بھی جذبہ اُس کے ذہن میں پیدا

ہوگا، وہ شعر کی صورت اختیار کر لے گا۔ اس اظہار سے نہ قدیم روایت
کی حدبندیاں اُسے روک سکتی ہیں اور نہ وہ جدید معاشرے کے
مُطالبات کا احتساب قبول کرنے کو تیار ہے۔ عدم کے ہاں الفاظ اور
تراکیب کا اتنا خوبصورت استعمال نظر آتا ہے کہ مُستقبل کا نقاد حیران
رہ جائے گا۔''

عبدالحمید عدم کی قبر ''قبرستان انجمنِ اسلامیہ'' میں ہے۔ یہ لاہور کینٹ کا بھی قبرستان کہلاتا ہے۔ یہ لاہور کے کئی دِیگر قبرستانوں کی نسبت زیادہ بہتر حالت میں موجود ہے۔ قبرستان میں کئی جگہوں پر بینچ بھی موجود ہیں جو لاہور کے کسی قبرستان میں دِکھائی نہیں دیتے۔ پچھلے پچاس برس سے زائد کے عرصے میں تمام قبرستان کی حفاظت اور دِیگر انتظامات کی ذِمے داری پرانے گورکن ''گوگا جی'' کے پاس ہے۔ عبدالحمید عدم کی قبر، مزار حافظ عطا محمد کی شمالی سیدھ میں ہے۔ ایک چوکھٹے پر چھے اکٹھی قبریں ہیں۔ درمیانی قبر عبدالحمید عدم کی، دائیں جانب کی قبر اُن کی اہلیہ شریفاں بیگم کی، بائیں جانب کی قبر اُن کے بیٹے سیّد خالد حسن کی۔ اُن کے قدموں میں اُن کے بیٹے یعنی عدم صاحب کے پوتے سیّد شاہد حسن کی، اُس کے ساتھ اُن کی بیٹی کی قبر ہے جس پر کوئی کتبہ نہیں۔ اور اُس کے ساتھ عدم صاحب کی دوسری بیٹی سائرہ گُل کی قبر ہے۔ عدم صاحب کی قبر کا کتبہ یوں ہے:

یااللہ　　　　یامحمد

بسم اللہ الرحمن الرحیم

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللہِ

سیّد عبدالحمید عدم

تاریخ وفات

10 مارچ 1981ء

موت کتنی بھی سنگدل ہو عدم
زندگی سے تو مہرباں ہو گی

فیض احمد فیض

1911ء-1984ء

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں اُنگلیاں میں نے
زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے
فیض

فیض احمد فیض صاحب پر مضمون لکھنا کوئی آسان کام نہیں، نہ صرف میرے لیے بلکہ فیض کے کسی بھی معتقد کے لیے۔ سنگیت کی دُنیا میں جب بھی گلوکار رفیع کا کسی نے تذکرہ کیا تو اُنھیں رفیع صاحب کہہ کر پکارا۔ اِسی طرح فیض کو بھی ہمیشہ فیض صاحب کہا گیا۔ فیض صاحب پر لکھنے بیٹھیں تو قلم لڑکھڑا جاتا ہے۔ اس حوالے سے کچھ اقتباسات ''زندان نامہ'' کے دیباچے میں سے نقل کیے جا رہے ہیں جو فیض کے ایک رفیق میجر محمد اسحاق نے لکھا تھا؛

''فیض صاحب کی کسی تصنیف کا دیباچہ لکھنے کی سعادت ایک خزانہ پانے سے کم کیا ہوسکتی ہے۔ لیکن اس کی دِقتوں کا احساس مجھے اس وقت ہوا جب لکھنے بیٹھا۔ کہتے ہیں پرانے زمانے کے راجے مہاراجے جب کسی برگشتہ بخت سفید پوش کی پریشاں حالیوں میں اضافہ کرنا چاہتے تھے تو اسے ایک عدد ہاتھی بخش دیا کرتے تھے۔ معاملہ بعینہٖ ایسا تو نہیں ہے لیکن ایک سیدھے سادے فوجی آدمی کے لیے فیض کے بارے میں کچھ لکھنا کافی پریشانی کا باعث ہوسکتا ہے اور پھر ایک

کسان اور خاص کر نو آبادیاتی ملک کے کسان کے بیٹے کی تربیت ہی کیا ہوتی ہے۔ دیہاتی سکولوں کی تعلیم اور وہ بھی توہم پرستی اور جہالت کے گھناؤنے سایوں تلے، ایسے ماحول میں جس میں غربت و ناداری کے طفیل پڑھنے لکھنے کی نسبت ہل کی لکیر سیدھی رکھنا، ڈھور ڈنگر کی نگہبانی کرنا اور بیلوں کے لیے چارا لانا زیادہ قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، جہاں ہر نئی شے اور ہر نئے خیال کا حقارت آمیز تمسخر اڑایا جاتا ہے۔ جہاں دُنیا کا بلند ترین خیال اور پاکیزہ ترین جذبہ دو بیگھا زمین کے پیمانے سے ناپا جاتا ہے؛ میرا تعلیمی پس منظر ایسا ہی تھا۔ فنونِ لطیفہ میرے اساتذہ کے بس کی بات نہیں تھی۔ میرا ان سے مَس کیا ہوتا۔ کتابیں زندگی کا حصہ نہیں تھیں، صرف امتحان پاس کرنے کا ذریعہ تھیں۔ لائبریریاں، علماء کی محفلیں، علمی مباحثے، مشاعرے، ڈرامے، موسیقی، رقص، آرٹ گیلریاں، میوزیم سب مفقود اور چاروں طرف سامراجیوں اور اُن کے ملکی ایجنٹوں کے اقتصادی بوجھ تلے کراہتی ہوئی مخلوق!

ایسی روکھی پھیکی تعلیم کے بعد آٹھ دس سال کی فوج کی ''صاحب بہادری'' نے رہی سہی کسر نکال دی۔ وہاں کا تو باوا آدم ہی نرالا تھا۔ اور ''کالا لوگ'' کی دوسری زبانوں کو اپنے دیس میں ہی دیس نکالا ملا ہوا تھا یا اُن کی حیثیت انگریزی زبان کی لونڈیوں، باندیوں کی سی تھی۔ جیل کے چار سال اس لحاظ سے مفید رہے کہ یکسوئی سے مطالعہ کا موقع مل گیا۔ سونے پر سہاگا یہ ہوا کہ دو ایک پروفیسر بھی ساتھ ہی قابو آ گئے تھے۔ ''زنداں نامہ'' کا دیباچہ لکھنے کے بہانے میں اپنی سوانح عُمری لکھنے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ کسی مشاہدے کی صحیح جانچ اُسی وقت ہو سکتی ہے جب شاہد کے مقام اور اس کی صلاحیتوں کا پورا پورا تعین کر لیا جائے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ میں کچھ مہینے کم چار سال دن

رات فیض کے ساتھ رہا ہوں۔ یہ طویل عرصہ ہم نے جیل کے ایک ہی احاطے میں مُلحقہ کوٹھڑیوں میں گزارا ہے، سینکڑوں مرتبہ صبح سویرے سب سے پہلے ایک دوسرے کے منہ لگے ہیں، اپنی خوشیاں اور غم باہم بانٹنے پر مجبور رہے۔ جیل کے باہر آدمی سینکڑوں لوگوں کو روزانہ ملتا ہے —— ملتا نہ بھی ہو تو دیکھ ضرور لیتا ہے۔ کئی قسم کی آوازیں سنتا ہے، بیسیوں مناظر سے واسطہ پڑتا ہے۔ کسی سے نفرت ہے تو کنی کترا کے نکل سکتا ہے۔ کسی سے محبت ہے تو ملاقات کی راہیں ڈھونڈ لیتا ہے یا اُن کی تلاش میں جی بہلا لیتا ہے۔ جیل میں آدمی کی مرضی اس سے چھین لی جاتی ہے اور اس کی نقل و حرکت محدود کر دی جاتی ہے۔ وہاں کی کائنات دو چار قیدی، دو چار پہرے دار کچھ کوٹھڑیاں اور کچھ دیواریں، ایک آدھ درخت، ایک دو گلہریاں، نصف درجن کے قریب چھپکلیاں اور کچھ کوّے اور دوسرے پرندے ہوتے ہیں، جن میں مہینوں بلکہ سالوں تک تبدیلی نہیں آتی۔ مجھے اس چھوٹی سی دُنیا میں فیض صاحب کے ساتھ مسلسل چار سال تک رہنے کا موقع ملا ہے، لیکن اس طویل قُرب کے باوجود ضروری نہیں ہے کہ میں اپنے موضوع سے پورا انصاف کر سکوں۔ ایک اندھا کائنات کی رنگا رنگی میں عمر گزار کر بھی رنگوں کا اندازہ نہیں کر سکتا۔ کئی لوگ اچھی بھلی نظر رکھتے ہوئے بھی بعض رنگوں کو نہیں پہچان سکتے۔ ریڈیو پروگرام سننے کے لیے طاقت ور ریڈیو سٹیشن ہی نہیں ریسیونگ سیٹ بھی نقائص سے پاک ہونا چاہیے۔

یہاں پر ’’زنداں نامہ‘‘ کی نظموں اور غزلوں پر تنقید و تبصرہ اگرچہ میرا مقصود نہیں، پھر بھی شاعر کے بیان میں ان کا ذکر ناگزیر ہے۔ فیض کی لطافت کا بیان میرے بس کی بات نہیں ہے۔ اثرؔ لکھنوی کی زبان میں فیض احمد فیض کی شاعری ترقی کے مدراج طے کر کے اب اُس نقطۂ عروج پر ہے جس تک شاید ہی کسی دوسرے ترقی پسند شاعر کی رسائی

ہوئی ہو۔تخئیل نے صناعت کے جوہر دکھائے ہیں اور معصوم جذبات کو حسین پیکر بخشتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پریوں کا ایک غول، ایک طِلسمی فضا میں اس طرح مستِ پرواز ہے کہ ایک پرِایک کی چھوٹ پڑ رہی ہے اور قوسِ قزح کے عکاس بادلوں سے ست رنگی بارش ہو رہی ہے......'' ہر کوئی بقدرِظرف اِس لطافت سے بہرہ اندوز ہوسکتا ہے۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ اپنے فہم کے مطابق، چیدہ چیدہ نظموں کا پس منظر بیان کر دوں۔ اتنا خیال رہے کہ صحیح ادب اپنے پس منظر کی حدود و قیود کو توڑ کر بہت آگے نکل جاتا ہے۔فیض کی شاعری کو اُس کے پس منظر کے سانچے میں محدود کر کے دیکھنا ظلم ہے۔ اس لیے میری کاوشوں کو ایک سائن بورڈ سے زیادہ حیثیت نہیں دینی چاہیے۔آگے راستہ سب کا اپنا اپنا ہے اور اپنی اپنی ہمت۔

فیض صاحب 9 مارچ 1951ء کو قید ہوئے اور اپریل 1955ء میں رہا ہوئے۔اس طرح اُن کی اسیری کے دن کچھ اوپر چار سال بنتے ہیں۔ اس عرصہ میں وہ پہلے تین مہینے سرگودھا اور لائل پور جیلوں میں قید تنہائی میں رہے۔اس کے بعد جولائی 1953ء تک حیدر آباد (سندھ) جیل میں راولپنڈی سازش کیس کے باقی اسیروں کے ساتھ رہے۔ جولائی 1953ء میں ہم سب کو چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں بانٹ کر لاہور، منٹگمری، مچھ (بلوچستان) اور حیدر آباد کی جیلوں میں بھیج دیا گیا۔فیض صاحب کے لیے میرے اور کیپٹن خضر حیات کے ہمراہ منٹگمری سنٹرل جیل کا انتخاب کیا گیا،لیکن وہ چونکہ بغرضِ علاج کراچی چلے گئے تھے، اس لیے کہیں 1953ء میں جا کر ہمارے پاس منٹگمری پہنچے۔ یہاں سے ہم اکٹھے رہا ہوئے۔''

فیض صاحب کی علمی اور سیاسی زندگی کی کچھ جھلکیاں درج بالا تحریر میں بیان ہوئیں۔فیض صاحب نے کمروں اور مشاعروں میں اپنے افکار بیان نہیں کیے تھے بلکہ عملی طور

پر آگے بڑھ کر پوری ذمے داری قبول کی۔

فیض صاحب 13 فروری 1911ء کو نارووال کے قریب موضع کالا قادر (پنجاب، متحدہ ہندوستان) میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد کا نام خان بہادر سُلطان محمد خان تھا جو اُس وقت کے ایک نامور وکیل تھے اور ساتھ ہی ڈسٹرکٹ بورڈ کے چیئرمین بھی تھے۔ فیض صاحب نے اپنی ابتدائی تعلیم اُس وقت کے مروجہ نظامِ تعلیم کے تحت مسجد مدرسہ سے حاصل کی۔ جہاں اُنھوں نے مولوی محمد ابراہیم سیالکوٹی سے قرآن شریف اور عربی کی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد اُن کے والد نے اُنھیں سکاچ مشن ہائی سکول بھجوا دیا۔ اِسی سکول سے اُنھوں نے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ مرے کالج سیالکوٹ سے انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کیا۔ مزید تعلیم کے لیے لاہور کا رخ کیا جہاں اَور وہاں اورینٹل کالج اَور گورنمنٹ کالج سے ایم اے کی ڈگریاں حاصل کِیں۔ اس دورانِ میں فیض، شمس العلما سیّد میر حسن سے بہت متاثر رہے۔ سیّد میر حسن، اقبالؒ کے بھی اُستاد رہے تھے۔ یوں سیّد میر حسن کو یہ بھی اعزاز حاصل ہے کہ وہ میرزا غالب کے بعد اُردو کے دو عظیم شعرا، اقبالؒ اور فیض کے اُستاد رہے۔ فیض نے گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے انگریزی کی ڈِگری حاصل کی۔ فیض صاحب کی انگریزی زبان پر دسترس سے متعلق ایک واقعہ شیر محمد حمید کی یادداشتوں میں محفوظ ہے:

> ''وہ زمانہ گورنمنٹ کالج کا سنہری دور تھا۔ بڑے بڑے نامور اساتذہ مختلف شعبوں کے سربراہ تھے۔ پروفیسر لینگ ہارن صدرِ شعبہ (انگریزی) تھے۔ تھرڈ ایئر کے امتحان میں اُنھوں نے ہمارے انگریزی کے پرچے دیکھے۔ پرچے واپس ملے تو فیض کے پرچے پر ایک سو پینسٹھ نمبر درج تھے۔ کسی طالب علم نے پروفیسر صاحب سے پوچھا، ان کو ڈیڑھ سو میں سے ایک سو پینسٹھ نمبر کیسے مل گئے؟ جواب ملا Because I could not give more فیض کی انگریزی دانی کے متعلق ایک نامور انگریز اُستاد کے یہ الفاظ کتنے سند رہیں گے!''
>
> (نسخہ ہائے وفا، صفحہ 498)

انگریزی ادب کے بعد اُنھوں نے عربی میں ایم اے اورینٹل کالج سے کیا۔ فیض

نے 1935ء میں ایم اے او کالج امرتسر میں پڑھانا شروع کیا اور یہیں وہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے ارکان میں شامل ہوئے۔فیض صاحب کے اس عہد سے پنڈی سازش کیس تک کے اَدوار کو بھی شیر محمد صاحب نے قلم بند کیا:

''فیض نے انگریزی اور عربی میں ایم اے کر لینے کے بعد ایم اے او کالج میں انگریزی کے اُستاد کی حیثیت سے کام شروع کیا۔ وہاں ڈاکٹر تاثیر بطور پرنسپل اور صاحب زادہ محمود الظفر بطور وائس پرنسپل آ گئے۔صاحب زادہ کی معروف رفیقۂ حیات ڈاکٹر رشید جہاں اور ان کے زمرہ کے دوسرے لوگوں سے میل جول بڑھا تو فکر و نظر کو اور وسعت ملی۔ترقی پسند مصنفین کی انجمن کا اجرا اُنھیں دنوں ہوا۔فیض اُس کے بانی رکن ہیں۔اب وہ غمِ جاناں اور غمِ روزگار سے گزر کر غمِ وطن اور غمِ جہاں کی سنگلاخ راہوں پر چل نکلے۔اپنی ذات کا دُکھ عالمگیر دُکھ کے سامنے ہیچ اور اس آفاقی دُکھ کا ایک معمولی حصہ نظر آیا۔ فیض وطن دوستی اور انسان دوستی کی جس راہ پر گامزن ہوئے، اس میں ہزار آفتوں کا سامنا تھا، جسم و جان کی قربانیاں درکار تھیں۔الحمدللہ کہ فیض کسی مصیبت کا سامنا کرنے سے نہیں ہچکچایا۔نگارِ وطن کی حُرمت، آزادی اور پھر تزئین و تجمیل کے شوق نے جس جس قربانی کا تقاضا کیا، پیش کر دی۔ یہ راہ طویل بھی ہے اور کٹھن بھی، لیکن راہرو عشق کے قدموں میں نہ لغزش آئی اور نہ تھکن محسوس کی......

تحریکِ آزادی کا یہ جیالا تحریکِ پاکستان کے معرکوں میں بھی ہراوّل رہا۔ پاکستان ٹائمز کے اِجرا پر مدیرِ اعلیٰ مقرر ہوا تو صحافتی محاذ پر قلمی جہاد کے معرکے سر کرتا رہا۔ پاکستان معرضِ وجود میں آیا تو تعمیرِ وطن کے مراحل سامنے آئے۔جس پاکستان کے خواب دیکھے تھے اُن کی تعبیر حسبِ مُراد نظر نہ آئی تو احتجاج کی صدا بلند کی اور اربابِ اقتدار کو یہ طرزِ نوا پسند نہ آئی تو سازش کیس میں دھر لیے گئے اور قید و بند کے

مصائب جھیلنا پڑے۔ سازش کیس کا مُعمّا کیا تھا؟ اس کے متعلق نہ کبھی ہم نے دریافت کیا اور نہ ہی فیض نے بتایا۔ معلوم یہی ہوتا ہے کہ:

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات اُن کو بہت ناگوار گزری ہے'

ایم اے او کالج امرتسر میں پڑھانے کے بعد فیض صاحب ہیلے کالج لاہور میں پڑھاتے رہے۔ اُن کا پہلا شعری مجموعہ 'نقشِ فریادی' کے نام سے شائع ہوا۔ اس مجموعے نے ہندوستان بھر میں دھوم مچا دی۔ اسی شعری مجموعے میں اُن کی ایک نمائندہ نظم ''مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ'' نے ادبی حلقوں کے ساتھ فلمی اور سنگیت کے حلقوں میں بھی اپنا گہرا اثر چھوڑا۔ یہ نظم ملکۂ ترنم نُور جہان نے گائی جسے فیض نے اپنی زندگی ہی میں اُن کے نام کر دیا تھا۔ وہ نظم یوں تھی:

مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ!

میں نے سمجھا تھا کہ تُو ہے تو درخشاں ہے حیات
تیرا غم ہے تو غمِ دہر کا جھگڑا کیا ہے
تیری صُورت سے ہے عالم میں بہاروں کو ثبات
تیری آنکھوں کے سوا دُنیا میں رکھا کیا ہے
تُو جو مِل جائے تو تقدیر نِگوں ہو جائے
یوں نہ تھا، میں نے فقط چاہا تھا یوں ہو جائے
اور بھی دُکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
اَن گنت صدیوں کے تاریک بہیمانہ طلسم
ریشم و اطلس و کمخواب میں بنوائے ہوئے
جابجا بکتے ہُوئے کوچہ و بازار میں جسم
خاک میں لتھڑے ہُوئے خون میں نہلائے ہُوئے

لوٹ جاتی ہے اُدھر کو بھی نظر کیا کیجے
اب بھی دلکش ہے ترا حسن، مگر کیا کیجے
اور بھی دُکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ
(نقش فریادی، صفحہ 54)

فلمی حلقوں کے حوالے سے میں ساحر لدھیانوی کا ذکر کروں گا کہ اس نظم نے اُن پر کیا اثرات چھوڑے۔ ساحر لدھیانوی بلاشبہ فلمی شاعروں میں صفِ اوّل کے شاعر تھے۔ اُن پر ایک نمبر ''سپوتنک'' نے جولائی 1993ء میں شائع کیا۔ اس نمبر میں ایک مضمون اُن کے ایک دوست فیض الحسن چودھری نے تحریر کیا۔ اُس میں سے ایک اقتباس درج ذیل ہے:

''اُنھیں دنوں ساحر پر ایک اور بجلی گری اور وہ تھی فیض احمد فیض کی پہلی معرکۃ الارا نظم ''مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ۔''

ایک رات میں ذرا جلدی چھٹی لے کر اپنے گھر آ کر سو گیا۔ رات کے قریباً تین بجے ساحر نے میرے گھر کا مین گیٹ کھٹکھٹایا۔ نیچے پہنچ کر میں نے دروازہ کھولا تو ساحر 'ادبِ لطیف' کا تازہ ترین شمارہ ہاتھ میں لیے کھڑا نظر آیا۔ وہ بوکھلایا ہوا تھا۔ میں اسے اندر لایا اور ہم لوگ گھر کے بیرونی حصّے کے ایک چوبارے میں بیٹھ گئے۔ ساحر نے بتایا کہ وہ ابھی ابھی یہ پرچہ سٹیشن کے سٹال سے خرید کر لایا ہے۔ اِسی میں فیض کی نظم ''مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ'' چھپی تھی۔ غالباً فیض کی یہ پہلی شاہکار نظم تھی لیکن خدا معلوم ساحر کیوں اس قدر گھبرایا ہوا تھا۔ میں نے نظم پڑھ کر کہا کہ یہ نظم واقعی بم ہے۔ خدا معلوم آئندہ یہ شاعر اس طرح کے کتنے اور ''بم'' چھوڑے گا۔

چند دنوں بعد ہم سب دوستوں نے اَندازہ لگا لیا کہ ساحر، فیض احمد فیض سے بری طرح خائف ہو چکا تھا۔ اب تک ساحر اپنے ہم عمر نوجوان

شعرا میں اپنی برتری اور لیڈری کے خواب بُن رہا تھا اور اس خصوصی میدان میں کسی کو ''ساحر'' کا ہم پلہ نہیں سمجھتا تھا، لیکن اس میدان میں فیض صاحب کی آمد اس کے لیے دیوارِ چین بن کر کھڑی ہوگئی۔ میں نے نہایت پیار اور ہمدردی سے سمجھایا کہ میاں شاعری اور خصوصاً ترقی پسند شاعری کسی کے باپ کی میراث نہیں ہے اور نہ ہی انسانی آرٹ کی کوئی حدود ہیں۔ لہٰذا تم اس طرز پر سوچنا چھوڑ دو اور اپنی منفرد تخلیقی خوبیوں کو اُبھرنے دو۔ اُن کی اگر صحیح آبیاری کرو گے تو تم بھی اس میدان میں اپنا ایک ایوان تعمیر کر جاؤ گے۔

اس کے بعد فیض صاحب کی کئی اور نظمیں اور غزلیں شائع ہوئیں اور فیض کی ہر نئی نظم ساحر پر ایٹم بم بن کر گرنے لگی۔ میں نے سمجھایا کہ میاں تم کچھ عرصہ پہلے اس میدان میں صرف اپنے آپ کو ببر شیر سمجھتے تھے۔ بہتر یہی ہے کہ اب تم یہ خیال چھوڑ دو۔ اب اس میں اصلی ببر شیر نمودار ہو چکا ہے۔ لہٰذا تم اپنے صحیح مقام پر ہی قناعت کرو کہ یہ بھی بڑا مقام ہے، لیکن ساحر اپنے موقف پر بضد رہا۔ وہ ساری عمر فیض احمد فیض کو اپنا حریف سمجھتا رہا۔''

اِسی مضمون میں فیض الحسن نے آگے جا کر فیض صاحب اور ساحر کی اس ذہنی کشمکش کے بارے میں یوں تحریر کیا:

''اِس وقت میرے ذہن میں فیض احمد فیض جن کے ساتھ بہ حیثیتِ شاعر وہ اکثر اپنا مقابلہ کیا کرتا تھا، آ رہے ہیں۔ فیض یقیناً ہمارے دور کے، بلکہ میں اکثر سوچتا ہوں کہ میرزا غالب کے بعد اُردو زبان کے عظیم ترین شاعر ہیں۔ یہاں ایک دلچسپ چٹکلا یاد آیا۔ ایک ملاقات میں یہ بات میں نے سردار جعفری کی موجودگی میں کہی تو جعفری جوشِ عقیدت میں چلا اُٹھے اور کہا ''بھئی بات تو آپ نے بہت صحیح کی ہے لیکن ایک گزارش ہے کہ آپ میرا نام تو درمیان میں سے بے شک کاٹ دیں

لیکن خدارا غالب اور فیض کے درمیان میں ڈاکٹر اقبالؒ کو ضرور رکھ لیں۔'' میں نے جواب میں کہا ''چلو آپ کے کہنے اور سفارش پر رکھ لیتے ہیں'' لیکن اپنے دل میں سوچ رہا تھا کہ سردار صاحب کو ڈاکٹر اقبالؒ کا جنون تو خیر ہمیشہ سے ہے۔ اُن دنوں چونکہ وہ ڈاکٹر صاحب کا صد سالہ یومِ ولادت منانے کے کام میں مصروف تھے، اس لیے اُنھیں یہ خیال آیا ہوگا۔

ہاں تو فیض صاحب کے رُتبے اور درجے کو سمجھنے کے لیے اُن کی اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے علاوہ اُن کی تعلیم، ماحول، نشوونما، خاندانی پس منظر اور اُن کے حلقۂ احباب کو ہرگز فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ ہمارا دوست ساحر بھی محض فلمی نغمہ نگاری کو منزلِ مقصود بنانے کی بجائے اگر اپنی نِگاہ کو بلند رکھتا تو اس بلندی پر پہنچنا اس کے لیے کوئی مشکل کام نہ تھا۔''

1941ء میں فیض کی ایک انگریز خاتون ایلس سے دوستی ہوئی جو گورنمنٹ کالج میں ایک طالب علم کی حیثیت سے پڑھتی تھیں اور فیض صاحب اُدھر شاعری پڑھاتے تھے۔ روایت کے مطابق ایلس کی بڑی بہن ڈاکٹر محمد دین تاثیر کی اہلیہ تھیں اور ایلس انگلینڈ کی کیمونسٹ پارٹی کی ایک رکن بھی تھیں۔ ایلس کی فیض صاحب سے شادی ہوگئی اور پھر تمام عمر ایلس فیض صاحب کی جدوجہد میں شانہ بشانہ رہیں۔ 1942ء میں فیض نے برٹش انڈین آرمی میں بطور کیپٹن کمیشن حاصل کیا۔ اُن کی یونٹ کی کمانڈ اکبر خان کے پاس تھی۔ اِس یونٹ نے جنگِ عظیم دوم میں کوئی حصہ نہ لیا۔ 1943ء میں فیض کو ISPR نیو دہلی میں تعینات کر دیا گیا۔ فیض اپنے کام اور قابلیت کے باعث پہلے میجر اور بعدازاں 1944ء میں کرنل کے عہدے تک پہنچے۔ 1947ء میں کشمیر کے محاذِ جنگ کے دوران میں فیض نے فوج کی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ اسی برس فیض ''پاکستان ٹائمز'' کے ایڈیٹر بنے۔ 1948ء میں فیض اپنے مارکسی نظریات کے باعث پاکستان ٹریڈ یونین کے وائس پریذیڈنٹ منتخب ہوئے۔ 1948ء سے 1950ء تک ورلڈ پیس کونسل کے انتہائی فعال ممبر رہے اور اُنھوں نے وزیرِاعظم لیاقت علی خان کے ساتھ امریکہ کا دورہ بھی کیا۔ فیض نے تقسیم کے فوراً بعد سجاد ظہیر اور جلال الدین عبدالرحیم

کے ساتھ مل کر پاکستان کیمونسٹ پارٹی کی بنیاد بھی رکھی۔ 1951ء میں اُنھیں پنڈی سازش کیس میں گرفتار کرلیا گیا۔ اس کیس میں اُنھیں چار برس کی قید ہوئی۔ قید کے دوران میں اُن کے دوشعری مجموعے ''دستِ صبا'' اور ''زنداں نامہ'' منظر عام پر آئے۔ جیل سے خط کتابت کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ درج ذیل خطوط اُنھوں نے ایلس اور خدیجہ مستور کو تحریر کیے:

4 جون 1950ء

جانم!

مجھے اُمید ہے کہ میرا پچھلا خط تمھیں مل گیا ہوگا۔ اِن خطوط کو اتنے سارے ہاتھوں سے گزرنا پڑتا ہے کہ اُن کے پہنچنے میں تاخیر ناگزیر ہے۔ اس لیے اگر تمھیں کافی عرصہ تک میرا کوئی خط نہ ملے تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ طویل عرصہ کی تنہائی اور بے کاری کے باعث انسان چند موضوعات پر کچھ عجیب انداز میں سوچنے لگتا ہے اور غالباً میرا پچھلا خط اس کیفیت کا حامل تھا، لیکن تمھیں اس پر کوئی خاص توجہ دینے کی ضرورت نہیں، اس سے تو صرف اس حقیقت کی نشان دہی ہوتی ہے کہ دل باتیں کرنے کو چاہتا ہے، ایسی باتیں جو ہم نے کافی مدّت سے نہیں کی ہیں۔ اس سے قطع نظر کہ یہ باتیں مجبوراً برسرِ عام کی جارہی ہیں۔

قید ہونے کے بعد سے میں نے اپنی چھٹی نظم مکمل کر لی ہے، جس کا یہ مطلب ہوا کہ میں نے پچھلے تین ماہ میں تقریباً اتنا ہی لکھا ہے جتنا پچھلے تین سالوں میں لکھا تھا، لیکن یہ شاعرانہ جذبہ بھی اب اپنے اختتام پر پہنچا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ یہاں ہمارے اردگرد اس قدر شور، گہما گہمی اور ہنسی مذاق ہے کہ اس عالم میں سوچ بچار ممکن ہی نہیں۔ اس کے علاوہ ہم مقدمہ کی تیاری بھی کر رہے ہیں۔ اس لیے خود اپنی ذات کے متعلق کچھ کرنے دھرنے کی گنجائش نہیں، البتہ میں نے اپنی کھوئی ہوئی حِس کا کچھ حصہ واپس حاصل کر لیا ہے اور مجھے امید ہے کہ جب یہ ہنگامہ ختم ہوجائے گا تو میں پھر لکھنے کی جانب متوجہ ہوجاؤں گا۔

یہاں موسم گرم ہونے لگا ہے لیکن ہوا چلتی رہتی ہے۔ اس لیے ناقابلِ برداشت نہیں۔ لاہور تو تپ رہا ہوگا۔ بچوں کا کیا حال ہے؟ تم کیسی ہو؟ کیا تم نے خرچ کا حساب متوازن کرلیا ہے؟ میں جانتا ہوں کہ تم پریشانیوں میں گھری ہوگی لیکن ہم اس سے بڑی

پریشانیاں بھی جھیل چکے ہیں اور مجھے امید ہے کہ یہ وقت بھی گزر جائے گا۔ جیسا کہ میں تمھیں بتا چکا ہوں تمھاری فکر کرنے کے علاوہ قانع اور خوش وخُرم ہوں۔ اب تو ہم شطرنج اور ٹینس بھی کھیلتے ہیں اور کھانے پینے کی چیزیں بھی وافر ہیں۔ مجھے ابھی تک تمھارا خط نہیں ملا، اس لیے جلد خط لکھو۔ منیزی اور شمی کو میری جانب سے پیار کرلو اور اگر فرصت ہوتو میری امی کی ڈھارس بندھانے کی کوشش کرو۔

تمھارا فیض

بنام خدیجہ مستور

سنٹرل جیل حیدرآباد، 24 اگست 1951ء

عزیزہ!

مجھے افسوس ہے، آپ لوگوں کے دورانِ ابتلا میں آپ سے اظہارِ ہمدردی نہیں کرسکا، بہرصورت اب چونکہ صُبح کے گئے شام کو گھر لوٹ چکے ہیں اس لیے گزشتہ ہمدردی اور موجودہ حسرت دونوں قبول کیجیے، یہاں پہ تو صبح وشام کا امتیاز مدت سے مِٹ چکا ہے اور وقت کے ٹھہرے ہوئے پانی میں دوستوں اور عزیزوں کی یاد کے علاوہ کوئی لہر نہیں اُٹھتی، شاید یہ بات بھی بالکل صحیح نہیں اس لیے کہ یہاں کے روز وشام دیس سے مختلف ہیں، یہاں چاند نکلتا ہے تو چاندنی میں لارنس باغ کے سبز وسیاہ سایے، شہر کی خاموش اور خوابیدہ گلیاں یا شاہی مسجد اور مقبرہ جہانگیر کے محوِ خیال مینار تصور میں نہیں آتے، یہاں کی چاندنی کے ''پردہ فلم'' پہ ان مانوس نقوش کے لق ودق صحرا، ریت کے گداز ٹیلوں میں گزرتے ہوئے اونٹوں کی قطاریں اور ان اونٹوں پر اجنبی شہزادیوں کے رنگین محمل دِکھائی دیتے ہیں، اِسی طرح یہاں کی صُبحوں میں شبنم اور سمن وگلاب کی باس نہیں ہے، نہ خواب آلود حسیناؤں کی بیداری کا والہانہ پن، اس کے بجائے ان میں نادار کسانوں کی آنکھوں کی بے رونقی ہے اور ویرانوں کی تپتی ہوئی دھوپ میں کسی شجرِ سایہ دار کی افسردہ ٹھنڈک!

یوں ''گوشے میں قفس کے'' عافیت بھی بہت ہے، خوب کھاتے ہیں، خوب سوتے ہیں، زیادہ نہیں تو اس عارضی وفات نے کچھ عرصہ کے لیے بہت سی ذاتی الجھنوں سے دل کو (اور شاید چند دوستوں کی الجھنوں سے اُن کو) نجات دلا دی ہے۔

حُسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد
بارے آرام سے ہیں اہلِ جفا میرے بعد

ہاجرہ، احمد علی، قاسمی اور اپنے میاں کو میرا پیار پہنچا دیجیے۔

مخلص
فیض

جیل میں فیض صاحب کے ساتھ کچھ بہت دلچسپ واقعات پیش آئے، جن میں سے کچھ واقعات درجِ ذیل ہیں:

(1) جیل میں مَیں نے درسِ قرآن و حدیث کا سبق دینا شروع کر دیا۔ ایک نوجوان کرنل جو وجیہہ بھی تھا اور شکیل بھی، اور جو مجھ کو دہریہ سمجھتا تھا، یہ تھیٹر دیکھ کر پریشان ہوگیا۔ ایک دن اس نے مجھے الگ لے جا کر پوچھا ''آپ کا مذہب کیا ہے؟'' میں نے اسے بتایا کہ میرا مذہب وہی ہے جو مولانا روم کا تھا۔ کرنل صاحب مولانا کا نام سن کر مطمئن ہوئے اور خوش ہو کر کہنے لگے، پھر ہم مسلمان بھائی ہیں۔ آپ اچھا درس دیتے ہیں۔ جیل سے رہائی کے برسوں بعد جب اکٹھے ہوئے تو کرنل صاحب کو میرے مذہب نے پھر اُکسایا، پوچھا ''فیض صاحب، مولانا روم کا مذہب کیا تھا؟''
میں نے کہا ''جو میرا ہے''۔

(2) فیض صاحب لاہور سینٹرل جیل میں تھے۔ ایک دن دردِ دل کی جگہ ان کے دانت میں بے پناہ درد اٹھا، کہنے لگے ''صبح ہمیں پولیس کی گاڑی میں گارڈ کے ساتھ ڈینٹل اسپتال لایا گیا۔ لاہور شہر کے گلی کوچوں سے گزرے، تازہ ہوا کو بار بار (Inhale) کیا۔ خوانچے والے، تانگے والے، ریڑھے، بیل گاڑیاں سب بچھڑے ہوئے یاروں کی طرح میرے قریب سے گزرے، بہت مزہ آیا، پھر یہ معمول ہوگیا، ڈاکٹر صاحب روزانہ بلا لیتے۔ ہمارے دانت میں کوئی دوا لگا دیتے اور

دوسرے دن پھر بلوا لیتے۔

ایک دن نہ جانے کیوں جیل والوں کے پاس گاڑی نہیں تھی۔ جیلر نے معذرت کی، آج گاڑی نہیں ہے۔ ہم بضد کہ ہمیں ڈاکٹر کے پاس جانا ہے۔ جیلر نے کہا: فیض صاحب، پھر صورت یہی ہے کہ آپ تانگے میں جائیں مگر آپ کو ہتھکڑی پہننی ہوگی۔ میں نے کہا منظور۔ میں تانگے میں سوار، ہتھکڑی تو خیر نہیں پہنائی گئی لیکن پولیس والے سنگین تانے دونوں طرف یوں بیٹھ گئے کہ جیسے میں ابھی جست لگا کر یہ گیا وہ گیا۔ عجب منظر تھا۔ ہم لاہور کی جانی پہچانی سڑکوں سے گزر رہے تھے۔ لاہور ہمارا تماشا دیکھ رہا تھا، پھر لوگوں نے ہمیں پہچان لیا، بازار میں ہمارا تانگہ رواں تھا اور اس کے اردگرد یارانِ باوفا کا ہجوم۔ اس میں نانبائیوں سے لے کر مُقتدر صحافیوں تک سب ہی شامل تھے، بالکل جلوس کی سی شکل بن گئی۔ میں نے زندگی میں ایسا دِلکش جلوس نہیں دیکھا۔ بھئی اسی کے بعد تو نظم ہوئی تھی۔

''آج بازار میں پابجولاں چلو''

(3) فیض کلاس میں حاضری لے رہے تھے۔ پیچھے سے آواز آئی ''ذرا ایدھر وِی ویکھو سرکار، اساں وِی فیساں بھریاں ہوئیاں نیں''۔ شرمیلے فیض نے جس کا دل پہلی محبت کی ناکامی سے فگار تھا اور جو مونس و غم خوار تلاش کر رہا تھا، آنکھیں اُٹھائیں اور کلاس کے بعد اس سے ملنے کو کہا، پھر دوستی ہوگئی، فیض بہت بڑے شاعر ہوگئے، کرنل ہوگئے اور وہ بدمعاش ہوگیا۔ وقت کی بات ہے، راولپنڈی سازش کیس میں فیض جیل چلے گئے اور وہی بدمعاش وہاں موجود فیض کو دیکھ کر حیران پریشان ''اوئے تُسی ایتھے کیہ کرن آئے او سرکاراں، اسیں تے قاتل تے وارداتی، تُسیں کیہ واردات کیتی اے؟''

فیض نے کہا ''ہمیں کیا معلوم پکڑ کر لے آئے ہیں، ہم چلے آئے، کہتے

ہیں ہم نے کوئی سازش کی ہے۔''

''بکواس کر دے نیں۔ میں ایہناں دِیاں ساریاں چالاں جان دا آں، ایہہ ایہناں نیں خود سازش کیتی اے تے تہانوں اندر کر دِتا اے، میں ایہناں نوں سمجھ لواں گا۔ اوئے پیچھے اوئے ملے، اوئے اُلو دے چرخیو، دیکھو اج ساڈا اُستاد آیا اے، اج ساڈے گھر دولتاں آئیاں نیں، جشن مناؤ، اج دے دن تے ہتھ ملاؤ اج دے دن۔''

فیض جیل میں دُولھا بنے ہوئے تھے، کہاں کہاں اس شخص کا مقابلہ کرو گے اے نکتہ ورو۔''

جیل سے سزا بھگتنے کے بعد اُن کے ادبی مضامین کا ایک مجموعہ ''میزان'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ 1959ء میں آپ پاکستان آرٹس کونسل کے سیکرٹری مقرر ہوئے اور 1962ء تک کام کیا۔ اس کے بعد فیض لندن چلے گئے۔ 1963ء میں اُنھیں لینن پیس ایوارڈ اور ایچ آر سی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ یاد رہے کہ فیض کو 1946ء میں ایم بی اِی اور 1953ء میں نگار ایوارڈ مِل چُکا تھا۔ 1964ء میں وطن واپس آئے اور کراچی میں عبداللہ ہارون کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ 1965ء میں اُن کا ایک اور شعری مجموعہ ''دستِ تہِ سنگ'' شائع ہوا۔ لینن ایوارڈ کے بعد فیض کا سوویت یونین آنا جانا لگا رہا۔ 1967ء میں سوویت ادیبوں کی کانگریس میں دُنیا کے کئی دِیگر ممالک سے شاعر اور ادیب حضرات کو مدعو کیا گیا تھا۔ پاکستان سے فیض صاحب اور ہندوستان سے کرشن چندر کو بلایا گیا تھا۔ اس کانگرس میں کرشن چندر نے اپنی فیض کے ساتھ ملاقات کا احوال یوں درج کیا:

''یہ کانگریس 1965ء کی ہند پاک جنگ کے بعد مُنعقد ہوئی تھی۔ اس پس منظر کو ذہن میں رکھیے حالانکہ میرے وہم وگمان میں یہ بات نہ تھی مگر ممکن ہے منتظمین کے ذہن میں یہ بات رہی ہو، میں اور فیض دونوں ہوٹل مسکوا میں ٹھہرے ہوئے تھے، مگر ایک دوسرے سے ملاقات کی نوبت نہ آئی تھی۔ پہلی شام جب میں مسکوا ہوٹل کے وسیع وعریض ڈائننگ ہال میں کھانے کے لیے گیا تو دیکھا کہ ہر ملک کے مندوبین

کے لیے ایک میز الگ سجی ہوئی ہے اور اسی میز پر اس ملک کا ایک چھوٹا سا جھنڈا لہرا رہا ہے۔ میں نے دیکھا تو کہیں آس پاس پاکستان کی میز اور ہندوستان کی میز میں کم سے کم تیس اور میزوں کا فاصلہ تھا۔ میں مسکرا کر چُپ رہا اور اپنی میز پر بیٹھ گیا۔ فیض ابھی میز پر آئے نہ تھے۔ پہلے پندرہ بیس منٹ مشروب پینے میں گزرے۔ اتنے میں مَیں نے دیکھا کہ فیض کسی دوسرے دروازے سے داخل ہو کر اپنی میز کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ کرسی پر بیٹھ کر اُنھوں نے میری طرح چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ غالباً اُنھیں بھی کسی دوسری میز کی تلاش تھی۔ یکا یک میری اور فیض کی آنکھیں چار ہوئیں وہ فوراً اپنی کرسی سے اُٹھ کھڑے ہوئے، میں اپنی کرسی سے۔ اس وقت سارا ہال ہم دونوں کی طرف عجیب نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

پھر ہوا یہ کہ میں اپنی میز سے ہندوستان کا فلیگ لیے اٹھا اور فیض اپنی میز سے پاکستان کا فلیگ لیے اٹھا اور ہم دونوں ایک دوسرے کی طرف بڑھتے ہوئے میز پار کرتے ہوئے بیچ کسی میز پر آ کر رک گئے۔ اُس میز پر ہم دونوں نے ہندوستان اور پاکستان کا جھنڈا ساتھ ساتھ لہرا دیا اور ایک دوسرے سے بغل گیر ہو گئے۔

سارا ہال تالی پیٹنے لگا۔

یہ تالی اس وقت تک بجتی رہی جب تک فیض اور اُس کی ترجمان میں اور سلمیٰ اور ہماری ترجمان ایرینا اس میز کے چاروں طرف بیٹھ نہ گئے۔

''کیا سمجھتے ہیں یہ لوگ؟ ہم لوگ بھی کیا متعصب سیاست دانوں کی طرح ایک دوسرے کے دُشمن ہیں؟ ادب میں یہ دُشمنی نہیں چلتی اور کاش کہیں بھی نہ چلے۔''

میں نے کہا ''مگر اس بدقسمتی کو کیا کہیے کہ تمھاری میری ملاقات اب نہ ہندوستان

میں ہوتی ہے نہ پاکستان میں، اور ہوتی ہے تو صرف ماسکو میں!''

''ان لوگوں کو چاہیے......''فیض نے ہنس کر کہا ''اپنے روسی ادیبوں کی کانگریس ہر سال مُنعقد کیا کریں، اسی بہانے مل لیا کریں گے''۔ میری طرف جُھک کر پوچھا ''تمھاری ترجمان تو بڑی خوبصورت ہے، کہاں سے اینٹھی؟''

میں نے کہا ''بدل لو مگر یاد رکھنا یہ یہودن ہے۔''

ہم سب ہنسنے لگے پھر جام سے جام ٹکرانے لگے۔ دو جھنڈے ساتھ لہرانے لگے۔ اتنے میں جنوبی افریقہ کے مشہور ناول نگار ایلکسی لاگونا ہاتھ میں کافی کا ایک جام اُٹھائے ٹوسٹ پیش کرنے کے لیے ہماری میز پر آ گئے۔ پھر کہیں سے رسول گم زادے کی نظر ہم پر پڑ گئی۔ رسول گم زادے کا شمار سوویت شاعروں کی پہلی صف میں ہوتا ہے۔ ہندوستان آ چکے ہیں اور اُردو کے صرف دو لفظ جانتے ہیں ''مشہور شاعر''۔ چنانچہ ہم سے مصافحہ کرتے ہوئے اور منہ چومتے ہوئے بولے ''مشہور شاعر فیض احمد فیض'' ''مشہور شاعر کرشن چندر'' ''مشہور شاعر سلمٰی صدیقی'' پھر ہماری ترجمان کی طرف شوخ نگاہوں سے تاکتے ہوئے پوچھنے لگے ''مشہور شاعر؟''

میں نے کہا ''ایرینا''۔

''ایری نچکا'' رسول گم زادے نے اس نام کو اور بھی پیار سے لیا اور اس کے قریب کرسی گھسیٹ لی۔

پھر اور لوگ آتے گئے، تھوڑی دیر میں ہمارے میز پر پانچ سات جھنڈے جمع ہو گئے تھے۔

اس کے بعد جتنے بھی دن ہم ہوٹل مسکوا میں رہے، میری اور فیض کی میز ایک ہی رہی، ہندوستان اور پاکستان ایک ہی میز پر کھانا کھاتے رہے۔''

جدائی کی گھڑی آ پہنچی، دوسرے دن فیض کو وِیانا جانا تھا اور مجھے اور

سلمٰی کو آذر بائیجان، ہم دونوں یوکرائینا ہوٹل کے وسیع وعریض لاؤنج میں ایک دوسرے سے اس شدّت سے بغلگیر ہوئے اور اتنی دیر تک بغلگیر رہے کہ جب صدیوں کی طرح کبھی ختم نہ ہونے والے عرصے کے بعد ایک دوسرے سے بادلِ نخواستہ جدا ہوئے تو ہمارے اردگرد کوئی ساٹھ ستر دوسرے ملکوں کے ادیبوں کا گروہ اکٹھا ہوچُکا تھا اور گو میری اور فیض کی آنکھوں میں آنسو نہ تھے لیکن ہمارے اردگرد ہر آنکھ پرنم تھی، شاید اس وقت بہت سے ملکوں کے دانشوروں کو احساس ہوا تھا کہ گو ہم ایک دوسرے سے جدا ہوچکے ہیں لیکن اندر سے ہمارا جو اتنا پرانا رشتہ تھا وہ کسی طرح ٹوٹ نہیں سکتا۔ فیض نے اپنی جیب سے کاغذ کے دو پرزے نکال کر مجھے دیے اور کہا: یہ دونوں نظمیں کہیں نہیں چھپیں ہیں، پاکستان میں بھی نہیں، میں نے ماسکو میں کہی ہیں۔ پھر آخری بار زور سے مصافحہ کیا اور بڑے مضبوط لہجہ میں بولے ''یہ جدائی عارضی ہے دوست، ہم پھر ملیں گے۔''

1971ء کی روسی ادیبوں کی پانچویں کانگریس میں فیض نہیں آئے۔ ہم نے اُن کا بہت انتظار کیا۔ ایک تار بھی آیا کہ وہ آرہے ہیں مگر فیض نہیں آئے۔ اس دن یوکرائنا کی آخری ملاقات کے بعد میں اُن سے کبھی نہیں ملا، مگر اب لگتا ہے وہ جدائی عارضی تھی مِلن کی گھڑی آن پہنچی ہے کیونکہ گزشتہ چوبیس برس نفرت اور جنگ و جدل کے باوجود کوئی ایک تار ہے دلوں کے اندر جو نہیں ٹوٹا ہے اور ٹوٹ بھی نہیں سکتا۔ ہندوستان اور پاکستان میں محبت پھر اُبھرے گی، کوئی مانے نہ مانے مگر یہ وقت کا تقاضا ہے، اس لیے لوحِ تقدیر ہے۔''

فیض نے تمام عمر اُردو زبان میں شاعری کی۔ بہت قلیل سا کلام اُن کی مادری زبان پنجابی میں بھی ملتا ہے۔ پنجابی زبان سے اُن کو خاص قسم کا اُنس تھا اور وہ اس زبان کی تاریخی اور ادبی حیثیت سے بھی مکمل طور پر آشنا تھے۔ پنجابی زبان کے حوالے سے ایک جگہ فیض نے

خود اعتراف کیا:

''میں بہت دنوں سے سوچ رہا ہوں کہ کیوں نہ پنجابی میں لکھنا شروع کر دوں اور دیکھوں کہ اپنی مادری زبان میں کیسا لکھا جاتا ہے۔ اُردو ایسی مرصع زبان ہے کہ کچھ سمجھ ہی نہیں آتا۔ اسے اپنے عوام تک پہنچانے کے لیے کس ڈھب سے لکھیں۔ مجھے معلوم ہے کہ تم جیسے پنجابی کے مخالف اس پر برہم ہوں گے۔ لیکن زبان کے بارے میں تنگ نظری اور تعصب بہت غیر معقول بات ہے۔''

اسی طرح ایک اور جگہ پنجابی کلاسیکی ادب کی بڑائی یوں بیان کی ہے:

''ہم نے سوچا کہ اتنا پڑھنے لکھنے اور ریاضت کے بعد ہم شاید غالب جیسا ایک آدھ شعر کہہ لیں گے۔ لیکن اگر ساری عمر بھی لگے رہیں تو بُلھے شاہ اور وارث شاہ جیسا ایک شعر بھی نہیں کہہ سکتے۔ یہ بہت بڑے شاعر ہیں۔''

خالد حسن نے اپنے مضمون میں فیض صاحب کا پنجابی زبان سے عشق کا ایک واقعہ یوں بیان کیا ہے:

''آکسفورڈ کے اس پریشان کُن راستے میں مَیں نے تاج ملتانی کی گائی ہوئی خواجہ فرید کی کافیاں کیسٹ پلییئر میں لگا دیں، ہم کافیاں سنتے رہے اور برف گرا کی، اچانک فیض صاحب نے کہا ''یہ اعلیٰ درجہ کی شاعری ہے'' جی ہاں اس میں ایک مصرع ہے ''عشق ہے اِی سدا پیر'' میں نے کہا:

فیض بہت متاثر تھے، میں نے ٹیپ دوبارہ لگایا ''غور سے سنو'' فیض صاحب نے کہا، تم کو پتا چلے گا کہ پنجاب کے اس عظیم شاعر نے عربی اور فارسی الفاظ کس افراط سے استعمال کیے ہیں۔ اِس نکتے کو نجم حسین سیّد قسم کے لوگ نظر انداز کر دیتے ہیں اور پنجابی زبان کی تطہیر پر مُصر ہیں، اُن کو اِن اُستادوں کا کلام پڑھنا چاہیے۔''

میں نے کہا ''خواجہ فرید نے اپنی ایک کافی میں ایک انگریزی لفظ کا بھی استعمال کیا تھا۔ ''دکھن دی اپیل اے'' یہی تو بات ہے ساری''

فیض نے جواب دیا: شاعر کے لیے اہم ترین شے شاعری ہے، وہ نہ گرامر کا ماہر ہے نہ فرہنگ نویس ہے۔

زبان اس کےلیے اوزار ہے، ایک مسالہ جسے وہ اپنی تخلیق کےلئے استعمال میں لاتا ہے، زبان اس کے زیرِ نگیں ہے، وہ زبان کا غلام نہیں۔''

فیض صاحب اور اقبالؒ کو پنجاب سے جانتے ہوئے قُرۃ العین حیدر نے فیض صاحب پر ایک مضمون ''سرودِ شبانہ'' تحریر کیا۔ اس میں سے ایک اقتباس درجِ ذیل ہے:

''لیکن اہلِ لکھنؤ اقبالؒ کی زبان پر معترض رہے۔ جس زمانے میں یوپی کے اُردو والوں کو غمِ روزگار لاحق نہ تھا، وہ اور نیاز مندانِ لاہور ایک دوسرے سے بکثرت چونکھی لڑا کرتے تھے۔ اب یوپی میں خود اُردو کی جان کے لالے پڑے ہیں۔ وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں! پنجاب میں زبان اور فوک اور قبائلی کلچر تقریباً یکساں تھی (پنجابی ہندو اور سِکھ آج تک خدا کو رب اور ربا کہتا ہے، یوپی کا عام ہندو رب کہتا ہوا نہیں پایا جائے گا۔ 1957ء کے بعد اُردو نے ان تینوں فرقوں کو مزید ایک لڑی میں پرو دیا، صورتِ حال کا ایک بنیادی تضاد یہ تھا کہ کٹر فرقہ وارانہ رُجحانات آریہ سماج اور مسلم فرقہ پرستی نے بھی پنجاب ہی میں زور پکڑا گو سارا آریہ سماجی پریس اُردو میں تھا۔ آریہ سماجی اور سناتن دھرم دونوں لٹریچر اُردو میں شائع ہوتے تھے۔ آج تک ہردوار کی دُکانوں میں پنجابی زائرین کےلیے زیادہ تر دھارمک کتابیں اُردو رسم الخط میں چھپی ہوئی ملتی ہیں)۔

ایک اُردو داں پنجابی ہندو اور سکھ جس طرح اقبالؒ اور فیض پر سر دُھنتا ہے، اس میں لاشعوری طور پر قبائلی تھرو بیک بھی کارفرما ہے جس طرح اہلِ پنجاب ہندو مسلم اور سِکھ فیض صاحب کے شیدائی ہیں۔ یوپی اور بہار اور دِلّی

کے مسلمان اور ہندو اکٹھے ہو کر کسی واحد ادبی شخصیت کے لیے اس طرح کی والہانہ قیادت کا اظہار نہ کریں گے کیونکہ وادیِ گنگ وجمن کی لسانی اور تہذیبی شنویت میں اس قسم کی مشترکہ پرستش کی گنجائش نہیں۔ اس کی ایک مثال پریم چند کا معاملہ ہے جس کے متعلق ہندو اور اُردو والے مستقل ایک دوسرے سے رسا کشی میں مصروف ہیں۔''

1971ء میں فیض کا ایک مجموعۂ کلام ''سرِ وادیِ سینا'' شائع ہوا۔ 1979ء میں ''شامِ شہرِ یاراں'' شائع ہوا اور اس کے بعد ''شام شہر یاراں'' اور ''مرے دِل مرے مسافر'' دونوں میں پنجابی کلام بھی موجود ہے۔ کچھ کلام ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

گیت

کِدھرے نہ پیندیاں دسّاں
وے پردیسیا
تیریاں

کاگ اُڑاواں، شگن مناواں
وَگدی وا دے ترلے پاواں
تیری یاد پوے تے روواں
تیرا ذکر کراں تاں ہساں
کِدھرے نہ پیندیاں دسّاں
وے پردیسیا
تیریاں

درد نہ دسّاں گھلدی جاواں
راز نہ کھولاں مکدی جاواں
کس نوں دِل دے داغ وکھاواں

کس در اَگے جھولی ڈاہواں
وے میں کس دا دامن کھسّاں
کدھرے نہ پینڈیاں دساں
وے پردیسیا
تیریاں

شام اُڈیکاں فجر اُڈیکاں
آکھیں تے ساری عمر اُڈیکاں
آنڈھ گوانڈھی دِیوے بلدے
ربا ساڈا چانن گھلدے
جگ وسدا اے میں وی وسّاں
کِدھرے نہ پینڈیاں دسّاں
کِدھرے نہ پینڈیاں دسّاں
وے پردیسیا
تیریاں

میری ڈولی شوہ دریا

(1974ء کے سیلاب زدوں کے امدادی فنڈ کے لیے لکھی گئی)

کل تائیں سانوں بابلا
تُوں رکھیا ہِک نال لا
سَت خیراں ساڈیاں منگیاں
جَد جُھلّی تتّی وا
اَج کیکن ویڑھیوں ٹوریا
کِویں لاہے نی میرے چاہ

مرے گہنے نیل ہتھ پیر دے
مری ڈولی شوہ دریا
اَج لتھّے سارے چاہ
مری ڈولی شوہ دریا،
نال رُڑھدیاں رُڑھ گیاں سدّھراں
نال روندیاں رُل گئے نیر
نال ہُونج ہُونج کے لے گئے
مرے ہتھ وِی لیکھ لکیر
مری چُنّی ٹِک سواہ دی
مرا چولا لیر ولیر
لج پالن بوہڑے بھَین دی
کوئی کرماں والے وِیر
مرے کرماں والے وِیر
مرا چولا لیر ولیر
مرے لتّھے سارے چاہ
مری ڈولی شوہ دریا
سسّی مر کے جنتن ہوگئی
میں ترَ کے اَونتر حال
سن ہاڑے اس مسکین دے
ربّا پورا کر سوال
مری جھوک وسّے، میرا وِیر وسّے
فیر تیری رحمت نال
کوئی پورا کرے سوال ربّا
تیری رحمت نال،
مرے لتّھے سارے چاہ

رَبّا سچیّا

ربّا سچیّا تُوں تے آکھیا سی
جا اوئے بندیا جگ دا شاہ ہیں تُوں
ساڈیاں نعمتاں تیریاں دولتاں نیں
ساڈا نیب تے عالیجاہ ہیں تُوں
ایس لارے تے ٹور کد پُچھیا ای
کیہ ایس نمانے تے بیتیاں نیں
کدی سار وِی لئی او ربّ سائیاں
ترے شاہ نال جگ کیہ کِیتیاں نیں
کِتے دھونس پولیس سرکار دِی اے
کِتے دھاندلی مال پٹوار دِی اے
ایویں ہڈّاں وِچ کلپے جان میری
جویں پھاہی چ کُونج کُرلاوندی اے
چنگا شاہ بنایا اِی رب سائیاں
پَولے کھاندیاں وار نہ آوندی اے

مَینوں شاہی نہیں چاہیدی ربّ میرے
مَیں تے عزّت دا ٹکّر منگناں ہاں
مینوں تانگھ نہیں، محلاں ماڑیاں دِی
مَیں تے جیویں دِی نکّر منگنا ہاں
مری مَنیں تے تیریاں مَیں مَنّاں
تیری سونہہ جے اِک وِی گل موڑاں
جے ایہہ مانگ نہیں پُجدی تیں ربا

فیر جاواں تے ربّ کوئی ہور لوڑاں

۱۹۷۴ء

قطعہ

اَج رات اِک رات دی رات جی کے

اَساں جگ ہزاراں جی لِتّا اے

اَج رات امرت دے جام وانگوں

ایہناں ہتّھاں نے یارنوں پی لِتّا اے

فیض صاحب نے اُردو شاعری کی مختلف اَصناف میں شاعری کی۔ اُنھوں نے غزل اورنظم کے علاوہ حمد، نعت، گیت، ترانے، قطعات اور مرثیے بھی کہے۔ اُنھوں نے نذرِعقیدت کی شکل میں کئی عظیم شخصیات کو گُلہائے عقیدت بھی پیش کیے۔ اُن کے کلام کو اپنے وقت کے عظیم گائیک حضرات نے گایا جن میں اُستاد امانت علی خان، اُستاد فتح علی خان، ملکۂ ترنم نُور جہاں، مہدی حسن، غلام علی نمایاں ہیں۔ تین گلوکارائیں ایسی ہیں جن کی پہچان ہی فیض صاحب کا کلام بنا۔ اُن میں اقبالؔ بانو، نیرہ نُور اور ٹینا ثانی کے نام شامل ہیں۔ اُن کی ایک نظم ''یاد'' کو اقبال بانو اور ٹینا ثانی نے گایا۔ یہ نظم کئی ڈراموں اور ڈاکومنٹری فلموں میں پلے بیک کے طور پر استعمال ہوئی۔ نظم ''یاد'' درج ذیل ہے:

یاد

دشتِ تنہائی میں اے جانِ جہاں، لرزاں ہیں

تیری آواز کے سایے، ترے ہونٹوں کے سراب

دشتِ تنہائی میں، دُوری کے خس و خاک تلے

کھِل رہے ہیں ترے پہلو کے سمن اور گلاب

اُٹھ رہی ہے کہیں قربت سے تری سانس کی آنچ

اپنی خوشبو میں سلگتی ہوئی مدھم مدھم
دُور اُفق پار چمکتی ہوئی قطرہ قطرہ
گر رہی ہے تری دِلدار نظر کی شبنم
اس قدر پیار سے اے جانِ جہاں رکھا ہے
دل کے رُخسار پہ اس وقت تری یاد نے ہات
یوں گماں ہوتا ہے، گرچہ ہے ابھی صبحِ فراق
ڈھل گیا ہجر کا دن، آ بھی گئی وصل کی رات

فیض صاحب کا آخری مجموعۂ کلام ''غبارِ ایام'' کے عنوان سے چھپا۔ اس کے بعد 1984ء میں فیض صاحب کے تمام شعری مجموعے ''نسخہ ہائے وفا'' کی شکل میں شائع ہوئے۔ فیض صاحب کی زندگی میں بھی کئی مضامین اُن پر تحریر ہوئے۔ اُن کا تذکرہ نقوش لاہور نمبر اور نقوش شخصیات نمبر میں بھی ملتا ہے۔ وفات کے بعد 1990ء میں اُنھیں نشانِ امتیاز سے نوازا گیا۔ 2006ء میں اُنھیں ایوی سینا پرائز بھی ملا۔ اُن کی زندگی اور فن پر الیگزنڈر سرکوف، وی چی گیرئن، اشفاق احمد، قُرۃ العین حیدر، کرشن چندر، ڈاکٹر معصوم رضا، کنہیا لال کپور، ابراہیم جلیس، ملک راج آنند، فِکر تونسوی، خالد حسن، اختر جمال اور اُن کی رفیقۂ حیات ایلس فیض سمیت کئی نامور لوگوں نے مضامین تحریر کیے۔ بلاشبہ اُنھیں اُردو زبان کا صفِ اوّل کا انقلابی شاعر مانا جاتا ہے۔

ہم پرورشِ لوح وقلم کرتے رہیں گے
جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے
اسبابِ غمِ عشق بہم کرتے رہیں گے
ویرانیِ دوراں پہ کرم کرتے رہیں گے

اسی طرح ایک اور جگہ فرمایا:

فیض جب چاہا جو کچھ چاہا سدا مانگ لیا
ہاتھ پھیلا کے دلِ بے زر و دینار سے ہم

فیض صاحب 20 نومبر 1984ء کو اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ اُنھیں لاہور میں

قبرستان ماڈل ٹاؤن میں دفن کیا گیا۔ ایلس فیض کی قبر بھی اُن کی قبر کے ساتھ ہی ہے۔
اُن کے بارے میں پروفیسر اسلم نے اپنے مضمون کی آخری سطریوں تحریر کی:
''بلاشبہ فیض اپنے دور کے بہت بڑے شاعر ہیں۔ شاید سب سے بلند پایہ''
اُن کی وفات کے بعد حبیب جالب اور قتیل شفائی نے ان الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا۔

بیادِ فیض

حبیب جالب

فیض اور فیض کا غم بھولنے والا ہے کہیں
موت یہ تیرا ستم بھولنے والا ہے کہیں
ہم سے جس وقت نے وہ شاہِ سخن چھین لیا
ہم کو وہ وقتِ اَلم بھولنے والا ہے کہیں
تیرے اشک اور بھی چمکائیں گے یادیں اس کی
ہم کو وہ دِیدۂ نم بھولنے والا ہے کہیں
کبھی زنداں میں کبھی دُور وطن سے اے دوست
جو کیا اُس نے رقم بھولنے والا ہے کہیں
آخری بار اُسے دیکھ نہ پائے جالب
یہ مقدّر کا ستم بھولنے والا ہے کہیں

سپنوں کا بنجارا — فیض

قتیل شفائی

وہ ایک ایسا شخص تھا
جس کے لیے
بس ایک رائے سب کی تھی

''پیارا— بہت پیارا ہے وہ
سپنے سہانے پیار کے
بانٹے جو گاؤں گاؤں میں
اِک ایسا بنجارا ہے وہ''
''ساری زمیں جس کا وطن
سارا جہاں جس کا مکاں
سب لوگ جس کے ہم سخن
سب لوگ جس کے ہم زباں
جس نے تراشیں منزلیں
جس نے بنائے کارواں
چل کر دِلوں کی راہ سے
چھو لی ہے جس نے کہکشاں''

''وہ روشنی کی کھوج میں
چلتا رہا— چلتا رہا
چہرے پہ وہ گردِ سفر
ملتا رہا— ملتا رہا
وہ آندھیوں کے درمیاں
جلتا رہا— جلتا رہا
وہ زندگی کے حُسن میں
ڈھلتا رہا— ڈھلتا رہا''
وہ نغمہ خواں تھا پیار کا
وہ عشق کا ہم رقص تھا
وہ تنگدل واعظ نہ تھا

اس میں یہی اِک نقص تھا
کہتے رہے اُس کو برا دَیر وحرم
لیکن یہ رائے سب کی تھی اُس کے لیے
''پیارا— بہت پیارا ہے وہ
سپنوں کا بنجارا ہے وہ—''

فیض صاحب کا کلام دُنیا کی کئی زبانوں میں ترجمہ ہوا۔ 1970ء اور 1980ء کی دہائیوں میں دہشت گردی اور انتہا پسندی کی نشان دہی کرنے والے فیض صاحب کے تجزیات کتنے دُرست تھے، عصرِ حاضر کے حالات کو دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔قبرستان ماڈل ٹاؤن میں اُن کی اور ایلس فیض کی قبور پر کالا پتھر لگا ہوا ہے۔ یہ دونوں قبور قبرستان میں کالے پتھروں والی قبروں کے نام سے جانی جاتی ہیں۔ان کی قبر کا کتبہ اس طرح ہے:

بسم اللہ الرحمن الرحیم
لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ
فیض احمد فیض
تاریخ پیدائش 13 فروری 1911ء
تاریخ وفات 20 نومبر 1984ء

سعادت حسن منٹو

1912ء-1955ء

تشنگی نے سراب ہی لکھا
خواب دیکھا تھا خواب ہی لکھا
ہم نے لکھا نصابِ تیرہ شبی
اور بہ صد آب و تاب ہی لکھا
جون ایلیا

منٹو، ایک نام، ایک داستان، ایک حقیقت ہیں۔ لاہور کی تاریخ کے حوالے سے کام کرتے ہوئے میں نے کئی مضامین تحریر کیے، عمارتوں پر لکھا، شخصیات پر لکھنے کی جسارت کی۔ سعادت حسن منٹو اور فیض صاحب پر لکھنا کسی بھی طور کوئی آسان مرحلہ نہ تھا۔ کئی بار لکھنے کی نشست سنبھالی، کئی بار قلم کو حوصلہ دیا کہ لکھنا شروع کرو، بے شمار لوگوں نے ان شخصیات پر لکھا ہے لیکن ہر بار نہ صرف قلم لڑکھڑایا بلکہ قدم بھی ڈگمگاتے رہے۔ اب جو بھی لکھا گیا، اس جہدِ ناتواں کو قبول فرمایئے گا۔

میں نے بچپن ہی سے اپنے والد صاحب کے ساتھ کئی مساجد اور خانقاہیں دیکھی ہیں۔ لاہور کی گلیوں سے عشق کے باعث میں نے لوگوں کو مساجد میں قرآن شریف کی تلاوت کرتے دیکھا، نعتیں اور حمدیہ کلام پڑھتے سنا، عاشورہ میں مرثیے سنے، گرجا گھروں میں بائبل، گوردواروں میں گرنتھ کے پاٹھ جپتے دیکھا اور مندروں میں رامائن کو سنا۔ مزاروں اور خانقاہوں پر سماع کی محافل دیکھیں، صوفی شعرا بابا فریدؒ، سچل سرمستؒ، نوشو پاکؒ، شاہ حسینؒ اور بُلھے شاہؒ کے مزاروں پر اُن کا کلام سریلی آوازوں میں سنا۔ لیکن اُردو شاعری اور نثر کے حوالے

سے میں نے لوگوں کو صاحبِ قبر کا کلام، کسی کو پڑھتے یا گاتے نہ سنا، سوائے اس کے کہ ساغر صدیقی کی قبر پر اُن کا کلام گویے حضرات گاتے ہیں اور قدر دان پڑھتے ہیں، اور نثر کے حوالے سے صرف سعادت حسن منٹو کی قبر پر 1990ء کی دہائی تک اُن کے قدر دان روتے بھی رہے اور ان کے افسانوں کی قرأت بھی کرتے رہے۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ بعض انگریز، ہندو اور سِکھ مذہب سے تعلق رکھنے والے بیرونِ ملک سے آئے لوگ منٹو صاحب کی قبر پر بیٹھتے اور کچھ وقت خاموشی سے بسر کرکے چلے جاتے۔ اپنے کالج کے ایام میں میں بذاتِ خود اپنے دوستوں کے ساتھ کئی کئی گھنٹے منٹو صاحب کی قبر پر گزارتا، ہم قبر کے سرہانے بیٹھ کر اُن کے ڈرامے اور افسانے پڑھتے، وہاں سارا سال لوگوں کی اکثریت دکھائی دِیتی جو ''منٹوفوبیا'' کا شکار تھی۔

سعادت حسن منٹو 11 مئی 1912 کو سمبڑالہ ضلع لدھیانہ (پنجاب، متحدہ ہندوستان) میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد کا نام غلام حسن منٹو تھا جو کشمیری خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور قبولِ اسلام سے پہلے اُن کی پچھلی پیڑھیوں کا تعلق ہندو برہمن پنڈتوں سے تھا۔ غلام حسن منٹو امرتسر میں ایک جج تھے، عہدِ فرنگی میں اُن کا خاندان پورے ہندوستان میں اپنی قابلیت کا شہرہ رکھتا تھا اور یہ بیرسٹرز کا خاندان کہلاتا تھا۔ سعادت حسن منٹو کی والدہ کا نام سردار بیگم تھا جو اُن کے والد کی دوسری بیگم تھیں۔ پنجاب کے روایت پسند خاندانوں میں دوسری شادی کو کبھی اچھی نِگاہ سے نہیں دیکھا گیا، اسی وجہ سے منٹو کی والدہ کو امتیازی سلوک دیکھنا پڑا۔ سعادت حسن منٹو اور اُن کی اکلوتی بہن ناصرہ کو تمام عمر اپنے ددھیال اور سوتیلے بہن بھائیوں کے ناقدانہ رویے کا سامنا رہا۔ لیکن منٹو نے انتہائی تنگدستی کے عالم میں بھی عمر بھر اپنے امیر اور اعلیٰ عہدوں پر فائز بہن بھائیوں سے کبھی مدد طلب نہ کی۔ تمام خاندان منٹو کی جُوا بازی، مے نوشی اور فلمی دُنیا سے روابط کے باعث ہمیشہ اُن سے لاتعلق رہا۔ پھر وہ وقت آیا کہ بیرسٹرز کا خاندان اپنی تمام تر نیک نامیاں امرتسر ہی میں چھوڑ آیا اور آج اس خاندان کی پہچان صرف اور صرف سعادت حسن منٹو ہی ہیں جبکہ دیگر افراد کو کوئی نہیں جانتا۔

منٹو نے اپنی ابتدائی تعلیم مسلم ہائی سکول امرتسر سے حاصل کی۔ مزاج میں لا اُبالی پن کے باعث نصابی سرگرمیاں ہمیشہ دُور ہی رہیں۔ بچپن کھیل کود میں گزارا۔ میٹرک کے

امتحان میں وہ دو مرتبہ اُردو ہی کے مضمون میں فیل ہوئے اور تیسری مرتبہ اُنھیں رعائتی نمبر دے کر اس مضمون میں پاس کیا گیا اور یوں وہ دسویں کا امتحان پاس کر سکے۔ اُن کی زندگی کا سب سے اہم ترین دن 1933ء میں آیا جب اُن کی عمر صرف اکیس برس تھی۔ ایک روز اُن کی ملاقات عبدالباری علیگ سے ہوئی۔ جن کا شمار اُس عہد کے بہترین نثر نگاروں اور محققین میں ہوتا تھا۔ منٹو کی اُن سے پہلی ملاقات کے بارے میں ہمیں باری علیگ کے فرزند نے بتایا کہ منٹو صاحب امرتسر میں جوئے کی ایک نشست میں تھے تو وہاں پر پولیس کا چھاپا پڑ گیا۔ منٹو صاحب چھت پھلانگ کر باری صاحب کے دفتر آ گئے۔ باری صاحب اپنے کسی کام میں مصروف تھے۔ اُنھوں نے منٹو صاحب کی حالت دیکھ کر اُنھیں اپنے پاس پیار سے بٹھایا اور وہیں پر منٹو صاحب نے فرانسیسی اور رُوسی ادب کی کتب دیکھیں۔ باری صاحب کی حوصلہ افزائی کے باعث چند ماہ میں اُنھوں نے وکٹر ہیوگو کی ایک تحریر The Last Day of Condemned Man کا اُردو میں ترجمہ ''سرگزشتِ اسیر'' کے نام سے کیا جسے اُردو بک سٹال لاہور نے شائع کیا۔

باری صاحب کی رفاقت کا اثر تمام عمر منٹو پر رہا۔ اُن کے کہنے پر اُنھوں نے اُس عہد کے عظیم ڈراما نگاروں، افسانہ نگاروں اور کہانی کاروں کو نہ صرف پڑھا بلکہ ایک مترجم کی حیثیت سے اُنھوں نے وِکٹر ہیوگو، لارڈ لیٹن، گورکی، چیخوف، موپساں کی تحریروں کو اُردو میں بھی قلم بند کیا۔ اُن تراجم کے باعث اُن کی تحریروں میں فرانسیسی اور رُوسی رنگ نمایاں ہے لیکن اس کے باوجود منٹو کی کوئی تحریر کسی دوسرے مصنف کا چربہ کبھی معلوم نہ ہوئی۔

منٹو چوبیس برس کی عمر میں ہندوستان کی فلم کمپنی فلمستان سے وابستہ ہو گئے۔ یہی وجہ ہے کہ فلم نگر کے کئی بڑے نام منٹو کے قریبی دوستوں میں تھے۔ نرگس اور کشور کمار جیسے عظیم نام بھی اِسی فہرست کا حصہ رہے ہیں۔ اُنھوں نے کئی فلموں کے اسکرپٹ اور مکالمے تحریر کیے، جن میں کشن کنہیا، اپنی نگری، آٹھ دن، چل چل رے نوجوان اور میرزا غالب جیسی لازوال فلمیں شامل ہیں۔

منٹو کو اُن کے قریبی رُفقا نے علی گڑھ یونیورسٹی میں داخلے کے لیے کہا، اُنھوں نے فروری 1934ء کو وہیں داخلہ لے لیا اور پھر انڈین ترقی پسند مصنفین (IPWA) کے رُکن

بنے۔علی گڑھ میگزین میں اُن کی دوسری کہانی ''انقلاب پسند'' مارچ 1935ء میں شائع ہوئی، اور چوبیس برس کی عمر میں (یعنی 1936ء میں) اُن کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ ''آتش پارے'' شائع ہوا۔1936ء ہی میں اُنھوں نے ایک فلمی میگزین ''مصور'' کی ادارت کی۔26اپریل 1939ء کو، جب اُن کی عمر ستائیس برس تھی، منٹو کی شادی صفیہ نامی خاتون سے ہوئی۔محترمہ صفیہ نے منٹو کی اندرونی اور بیرونی مشکلات میں اُن کا تمام عمر بھرپور ساتھ دیا۔اس بات کا احساس منٹو صاحب کو خود بھی آخری ایام میں بہت تھا کہ اُنھوں نے اپنی بچیوں کے ساتھ بہت زیادتی کی۔ باری صاحب کے بیٹے مسعود باری علیگ نے ہمیں یہ بھی بتایا کہ منٹو صاحب کا ایک بیٹا بھی تھا جو محض ایک برس کی عمر میں فوت ہوگیا۔منٹو پر تحقیق کرنے والے پرویز انجم صاحب کا کہنا ہے کہ منٹو تمام عمر غالب سے بے انتہا متاثر رہے اور اُنھوں نے غالب کے بیٹے کے نام کی نسبت سے اپنے بیٹے کا نام عارف رکھا جو اپنی پہلی سالگرہ سے صِرف دو روز قبل وفات پا گیا۔اُس کی وفات کا دُکھ بھی منٹو صاحب کے ساتھ ہی رہا۔منٹو تمام عمر مدو جزر کا شکار رہے۔ اس حوالے سے ان کا ایک خط ملاحظہ فرمایئے جو اُنھوں نے مدیرِ ''نقوش'' محمد طفیل کو تحریر کیا:

منٹو کا ایک خط

برادرم، السلام علیکم!

مجھے یہاں آئے ہوئے ساڑھے تین مہینے گزر چکے ہیں لیکن میں تمھیں خیریت کا خط تک نہ لکھ سکا۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ماحول میرے لیے نیا تھا، بہرحال اُس ماحول سے یقینا بہتر ہے جس میں، مَیں نے بیالیس برس تک جھک ماری تھی- وہاں جب تک رہا، سولی پر لٹکتا رہا۔

جب سے یہاں آیا ہوں نہ صفیہ نے مجھ سے کوئی فرمائش کی ہے اور نہ ہی نگہت، نزہت اور نصرت میں سے کسی نے، ورنہ اکثر یہ ہوتا تھا: ابا فلاں چیز لا دو، فلاں چیز لا دو، تمھیں تو علم ہے کہ مجھے اپنی بچیوں سے بے انتہا محبت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب اُن کی فرمائش اپنی تنگدستی کی بنا پر پوری نہیں کر پاتا تھا تو خون کے آنسو رویا کرتا تھا۔حتیٰ کہ بعض

منحوس سال ایسے بھی آئے تھے کہ بچی کی سالگرہ تھی اور جیب میں پھوٹی کوڑی نہیں۔

ایسے ماحول میں میں کب تک رہ سکتا تھا۔ قدرت تو مجھے ایسے انسان کُش ماحول میں اور رکھنا چاہتی تھی لیکن میں نے خود ایسے وسائل اختیار کر لیے تھے کہ اُس جہنم زار سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔

میں جب تک وہاں رہا۔ آپ لوگوں ہی کے غموں میں گھلتا رہا۔ نہ صرف گھلتا رہا بلکہ آہستہ آہستہ معدوم ہی ہو رہا تھا۔ میں بھی تمھارے دُکھوں اور غموں کو اس لیے رقم کر آیا ہوں تا کہ آنے والی نسلیں تم سب کو مظلوم کی حیثیت سے یاد رکھ سکیں۔

میں یہاں ہر وقت یہی دُعا کیا کرتا ہوں کہ یہ زندگی میرے تمام ہمعصر افسانہ نگاروں کو جلد نصیب ہو۔ اس لیے کہ وہاں رہ کر میں نے جیسی اُن کی زندگی بسر ہوتے دیکھی تھی، وہ تو مجھ سے بھی بدتر تھی جب مجھی کو وہاں سے آنا پڑا، تو نہ جانے وہ کیوں ٹکے ہوئے ہیں۔

آپ کے تمام لکھنے والوں سے تعلقات ہیں جو لاہور میں موجود ہیں، ان سے زبانی کہہ دیں جو لاہور سے باہر ہیں، اُنھیں بذریعہ خط مطلع کر دیں کہ وہ سب کے سب بیوی بچوں سمیت میرے پاس آ جائیں۔ میں نے یہاں تمام ابتدائی معاملات طے کر لیے ہیں۔ اس لیے کسی کو کوئی تکلیف نہ ہوگی۔

زمانے نے نہ میری قدر کی اور نہ دوسرے اہل قلم کی، تمھیں علم ہے۔ اگر ہم لوگ تمھارے ہاں نہ ہوتے تو سوائے علم، ادب اور آرٹ کے سب کچھ ہوتا۔

یہاں جو بھی پہنچ گیا ہے، مزے میں ہے۔ اکثر قلمکاروں سے ملاقات رہتی ہے۔ سب میری ہی طرح پھولے بیٹھے ہیں۔ بعض نے تو تمھارے نمائش آباد کی شان میں ایسی ایسی ہجویات سپردِ قلم کی ہیں کہ

جب تک کلیجا دونوں ہاتھوں سے نہ تھام لیا جائے سنی ہی نہیں جا سکتیں۔ اگر وہ چھپ گئیں تو تمھارے ہاں کے بعض سر پھرے سرِ بازار پٹیں گے۔

بہرحال ہجویات کا وہ مجموعہ جب بھی شائع ہوا۔ تمھیں اُس کا ایک نسخہ ضرور بھیجوں گا۔ نقوش میں اس کا تبصرہ کر دینا۔

تمھارے ہاں کے ادیب اور تمھارے پڑوسی ملک کے ادیب اپنے اپنے ناخداؤں سے جو بڑی خوشگوار قسم کی اُمیدیں وابستہ کِیے بیٹھے ہیں، وہ سراسر حماقت ہے۔ ان خوشگوار قسم کی اُمیدوں کے پیٹ میں تو صرف بہن خوش فہمی لمبی تانے سو رہی ہے۔

تمھارے ہاں کی سیاست تو بڑی دھڑن تختہ قسم کی ہے۔ آج کوئی وزیر ہے تو کل جیل میں ہے۔ اگر کوئی چند دن پہلے جیل میں تھا اور ساتھ ہی غدارِ وطن بھی، تو آناً فاناً وزیر ہو جاتا ہے۔ یہاں پر میرے احباب جب تمھارے ہاں کی سیاست کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں تو یقین جاننا میں مارے شرم کے پانی پانی ہو جاتا ہوں۔

تمھیں علم ہے کہ مجھ پر آپ کے ہاں پانچ مقدمے صرف فحاشی کے جُرم میں چلے تھے حالانکہ میں نے کوئی فحش تحریر نہیں لکھی تھی۔ اس ضمن میں مجھ پر کیا کیا ستم نہیں ڈھائے گئے تھے۔ کبھی وارنٹ نِکلے، کبھی گرفتار ہوا، کبھی دوستوں سے اُدھار مانگ کر جرمانہ ادا کیا۔ اس کے باوجود میں نے انصاف زندہ باد کا نعرہ لگایا تھا۔ اگر میں کچھ دن اور وہاں رہ جاتا تو بہت ممکن تھا، مجھ پر قتل، ڈاکہ زنی اور زنا بالجبر کے جھوٹے مقدمے بنا دیے جاتے، جہاں ناکردہ گناہوں کی سزا ملتی ہو، وہاں کون مسخرہ رہے۔

اگر حکومت کے عتاب سے بچ جائیں تو نقاد پیچھا نہیں چھوڑتے۔ تم تو جانتے ہی ہو کہ میں ساری عمر نقادوں سے دُور بھاگا ہوں۔ یہ بھی صحیح

ہے کہ بعض نقاد بھی مجھ سے دُور بھاگتے ہیں۔ اصل میں یہ لوگ وہ ہیں جو بگڑے ہوئے افسانہ نویس اور بگڑے ہوئے شاعر ہوتے ہیں۔ یہ لوگ جب تخلیق کی قوت سے محروم ہوتے ہیں تو تنقید میں علامہ بن جاتے ہیں۔ مجھے ان سب سے خدا واسطے کا بیر رہا ہے۔ اس لیے کہ جب یہ قلم ہاتھ میں لے کر بیٹھتے ہیں تو اچھی بھلی چیز میں سو سو عیب نکالتے ہیں۔ لیکن ان حجام کو اپنی تحریر کے عیوب کا کچھ پتا نہیں ہوتا۔ خدا کے لیے مجھے اِن بے تحاشا لکھے پڑھوں سے بچانا۔ ایسا نہ ہو کہ میرے موجود نہ ہونے کی وجہ سے وہ اپنے اپنے قلم تیز کر لیں اور میرے فن کی دوشیزگی کا جھٹکا کر دیں۔

آج ادب جبھی ترقی کرے گا کہ جو نقاد کہے، اس کا اُلٹا کیا جائے۔ نقادوں کا منشا بھی یہی ہوتا ہے لیکن اسے میرے سوا سمجھا کوئی نہیں ہے۔

کاش مجھے یہاں کوئی نقاد مل جائے تا کہ میں اس سے تنقیدی بحث کر سکوں۔ تنقیدی بحث کرتے ہوئے اگر کسی نے ان تینوں لفظوں کا صحیح استعمال کر لیا تو سمجھ لیجیے بازی لے گیا۔ وہ تین الفاظ یہ ہیں اگر، مگر اور لیکن۔

جب تک نقاد تخلیق کی قوتوں سے مالا مال نہ ہوں گے، اُن کی تحریروں میں نہ توازن پیدا ہوگا اور نہ واقعات کے ساتھ خلوص، جب فن کار کے دل کے ساتھ نقاد کا بھی دل دھڑکے گا تو پھر جو کچھ لکھا جائے گا، اس پر ایمان لانا ہی پڑے گا۔

یہاں شرابِ طہور عام ہے۔ پانی نہ پیجیے، شرابِ طہور نوش کر لیجیے۔ تمھارے ہاں تو بڑی تھرڈ کلاس قسم کی شراب ملتی تھی اور اُس جگر پاش شراب کے لیے بھی مجھے کیا کیا جتن نہیں کرنے پڑتے تھے، بعض اوقات اِس نامُراد کے لیے ذلیل تک ہُوا، دوستوں میں میری عزت نہ

رہی۔ جدھر جاتا تھا، احباب منہ موڑ لیتے تھے۔ راستہ تک چھوڑ کر انجان بن جاتے تھے۔ اگر کسی سے مڈبھیڑ ہو جاتی تو وہ میرے منہ پر جھوٹی قسمیں کھا کھا کر کہتا تھا کہ میری جیب میں دھیلا تک نہیں ہے، حالانکہ میں جانتا تھا کہ اس کی جیب میں دھیلا چھوڑ اتنے روپے ہیں کہ وہ مجھے اس خانہ خراب کی کئی بوتلیں خرید کر دے سکتا ہے۔ میں نے شراب کو خانہ خراب اس لیے کہا ہے کہ اس کی بنا پر کئی بار خانہ میں خرابی پیدا ہوئی تھی۔

ایک بڑی خطرناک مگر راز کی بات کہتا ہوں۔ اس کا ذکر کسی سے نہ کرنا، ورنہ پٹو گے۔ یہاں جتنی لڑکیاں ہیں، وہ سب ہزاروں برس پرانی ہیں لیکن ان کم بختوں کا جسم اور بانکپن تقدّس توڑ ہے۔ اس مسئلہ پر تم سے بات کرنا قطعی حماقت ہے۔ اس لیے کہ تم اس مسئلے میں نرے چُغد واقع ہوئے ہو۔ تمھاری چُغدیت کا احترام کرنے کے باوجود میں یہ کہوں گا کہ ان سب میں ایسی کشش اور سپُردگی سی پائی جاتی ہے کہ تمھارے ہاں کی لڑکیاں اِن کے سامنے بالکل بکواس ہیں۔

یہاں ایسے ایسے جمال آور لڑکے بھی ہیں کہ تمھارے ہاں کا کوئی شاعر اور ادیب دیکھ لے تو اس کمبخت کے بے ہوش ہونے کے قطعی امکانات موجود ہیں، بہت ممکن ہے کہ جانبر ہی نہ ہو سکے۔

میں ساری عمر ادبی تخلیقات کے سلسلے میں اپنے ہمعصروں سے شرمندہ نہیں ہوا تھا۔ اس لیے بھی کہ میرے مقابلہ ہی کا کون تھا۔ لیکن یہاں آیا تو غالب نے بڑا پریشان کیا۔ بڑا پھبتی باز ہے کہنے لگا تُو تو میرا چور ہے، میرے شعروں سے تُونے اپنے افسانوں کے عنوان چنے۔ کتابوں کے نام تک جب نہ سوجھے تو میرے شعروں کو دھر رگڑا اور محسن کُشی ایسی کہ میرے بارے میں جو فلمی کہانی لکھی اُس میں بجائے میری شکر گزاری کے اظہار کے میری کسی خُوبی کا ذکر تک نہیں کیا بلکہ

اُلٹی میری کمزوریاں گنوا کے رکھ دیں کہ میں بڑا وہ تھا، رنڈی باز تھا جُوا کھیلتا تھا اور اس کی پاداش میں جیل تک ہوگئی تھی وغیرہ وغیرہ۔

تمھیں علم ہے کہ میں تمام لکھنے والوں میں صرف غالب ہی کو تو مانتا تھا۔ جب اس نے بھی مجھ سے ایسی ایسی باتیں کیں تو میں نے دل میں کہا لعنت ہو سعادت حسن منٹو تمھاری حقیقت نگاری پر۔

لیکن غالب ہے بڑا زندہ دل قسم کا انسان، میری اتنی زیادتی کے باوجود گاڑھی چھنتی ہے۔ ہم اکثر ایک ساتھ پیتے ہیں۔ اور پیتے ہی میں جب ہم حقیقت آشنا ہو جاتے ہیں اور ہماری انا بیدار ہوتی ہے تو غالب کہتا ہے میں تم سے بڑا افسانہ نگار ہوسکتا تھا۔ لیکن میں نے اسے فضول چیز سمجھ کر ہاتھ ہی نہیں لگایا تھا اور میں اس سے کہتا ہوں شعر کہنا کونسا کمال ہے میرزا صاحب، میری تو نثر کی ہر ہر سطر میں ایک شعر کیا پوری غزل کی غزل پنہاں ہوتی ہے — بات دونوں کی غلط ہے۔ اس کا علم اُسے بھی ہے اور مجھے بھی۔ لیکن ہم اپنی اپنی انا کا کیا کریں۔

چچا سام کا دبدبہ تو تمھارے ہاں دن دوگنی رات چوگنی ترقی کر رہا ہے۔ مبارک ہو!

بڑوں کی عزت ضرور کرنی چاہیے لیکن سعادت مندی کے معنی یہ بالکل نہیں ہیں کہ تم اپنی ننھی سی جان بھی خطرے میں ڈال دو۔ میں نے یہ خبر بھی سنی ہے کہ اب تو تمھارے ہاں کا سارا کام وہی کرتے ہیں اور تم سب الوؤں کی طرح ہاتھ پر ہاتھ رکھے اندھیرے کے منتظر ہو۔ اتنی تن آسانی اچھی نہیں، ورنہ پچھتاؤ گے حتیٰ کہ تم لوگوں نے اپنی خودداری تک کو قفل لگا کے الماریوں میں رکھ دیا ہے۔

مصیبت یہ ہے کہ میں یہاں سے چچا سام کے نام کوئی خط نہیں لکھ سکتا۔ ورنہ میں اس سے اپنی حدود میں رہنے کی درخواست ضرور کرتا۔ دُعا کرو کہ وہ خود ہی میرے پاس جلد سے جلد آجائیں تاکہ تمھاری جان

چھوٹے، میں تو اُن سے نمٹ ہی لوں گا۔فراڈ کو فراڈ ہی پچھاڑ سکتا ہے۔

میں نے یہ بھی سنا ہے کہ جب سے یہاں آیا ہوں تمھارے ہاں میرا بڑا سوگ منایا گیا۔ خدا کی قسم یہ سنتے ہی میرا دل کباب ہوگیا، اس لیے کہ جب تک میں وہاں رہا، سب نے مِل جُل کر مجھے اپنے ہاں سے دُور کرنا چاہا۔ جب یہاں کچھ دوسروں کی اور کچھ اپنی مرضی سے آ گیا ہوں تو ریڈیو پر اس ناچیز کی گُمشدگی کے اعلانات کیوں کیے جاتے ہیں۔ یہ وہی ریڈیو والے ہیں جو مجھے اپنے ہاں ناک تک صاف نہیں کرنے دیتے تھے۔ رسالے اور اخبار والے بھی میرے رُوپوش ہونے پر خصوصی ماتم کیوں کر رہے ہیں۔ اُن کا بھی میرے ساتھ یوسف کے بھائیوں جیسا سلوک تھا— اِن حالات میں تمھیں اپنے اس منافقانہ رویہ پر شرم آنی چاہیے۔

یہاں میرے کچھ قدر دان پیدا ہوگئے ہیں اور پچھلے دنوں اُنھوں نے میرے ذمہ یہ کام کیا تھا کہ میں یہاں کے بارے میں اپنی سہ ماہی رپورٹ پیش کروں، یہ فریضہ میرے سپرد اِس لیے ہوا تھا کہ اُن کے خیال کے مُطابق مجھ جیسا حقیقت نگار یہاں کوئی نہیں ہے۔ میں نے اپنی عادت کے مطابق سب کچھ لکھ دیا ہے۔ اس میں اپنے ایک دوست کی خوب ڈٹ کر مخالفت بھی کی ہے اور اس کا جو معاشقہ اندر ہی اندر چل رہا تھا، اُس کا بھی کچا چٹھا لِکھ دیا ہے۔

حتیٰ کہ میں نے رپورٹ میں یہ بھی لِکھ دیا ہے کہ یہاں جو ڈاڑھی نہ مُنڈوانے کا دستور ہے، وہ بعض نستعلیق قسم کی طبیعتوں پر گراں گزرتا ہے۔ اس لیے اس کی اجازت ہونی چاہیے کہ جس کا دل چاہے ڈاڑھی رکھے جس کا دل نہ چاہے نہ رکھے۔

اتنے بڑے حاکم کے سامنے اتنا کہہ دینا اور کسی قسم کی جھجک محسوس نہ

کرنا، خالہ جی کا گھر نہ تھا۔ تمھارے ہاں ایسی کوئی کھری بات کہہ دیتا تو میری زبان گُدی سے نکلوا دی جاتی۔

اطلاعاً عرض ہے، یہاں میری کتاب ''گنجے فرشتے'' کافی پسند کی گئی ہے— ہو سکے تو میرے بیوی بچوں کا خیال رکھنا۔

خاکسار

سعادت حسن منٹو

(بحوالہ نقوش منٹو نمبر صفحہ 39)

(یہ خط طفیل صاحب نے خود منجانب منٹو تحریر کیا۔)

1941ء میں منٹو نے آل انڈیا ریڈیو میں بطور ڈراما نویس اور سکرپٹ رائٹر ملازمت اختیار کر لی۔ یہ زمانہ منٹو کی زندگی کے بہترین ادوار میں سے ایک تھا۔ جس میں ان کے کئی ایک کہانیوں، افسانوں اور ڈراموں کے مجموعے شائع ہوئے۔ ریڈیو پر تقریباً دو برس کام کرنے کے بعد وہ ایک بار پھر فلمی دُنیا کی جانب بڑھے۔ مالی آسودگی اور ذہنی سکون کے اعتبار سے یہ دور تیزی کے ساتھ گزرتا گیا۔ بٹوارا ہو گیا، دورانِ تقسیم میں منٹو پاکستان جانے کو ذہنی طور پر تیار نہ تھے لیکن مسلم کُش فسادات کے باعث اُنھوں نے پاکستان ہی کو محفوظ پناہ گاہ جانا اور خود ہندوستان چھوڑنے سے قبل وہ اپنی بیگم اور بچیوں کو لاہور بھجوا چکے تھے۔ اُن کے انتہائی قریبی دوست اشوک کمار اُنھیں آخری وقت تک روکتے رہے۔ بدقسمتی سے جو کچھ منٹو کے ساتھ پاکستان میں ہوا، اُسے بھی زمانہ جانتا ہے۔ پاکستان آنے کے حوالے سے ایک شخصی خاکہ بعنوان ''اشوک کمار'' جو اُن کی کتاب گنجے فرشتے میں چھپا تھا۔ اس میں سے ایک اقتباس ملاحظہ فرمایئے:

''فسادات زوروں پر تھے، ایک دن میں اور اشوک بمبئی ٹاکیز سے واپس آ رہے تھے۔ راستے میں اس کے گھر دیر تک بیٹھے رہے۔ شام کو اس نے کہا: چلو میں تُمھیں چھوڑ آؤں— شارٹ کٹ کی خاطر وہ موٹر کو ایک خالص اسلامی محلّے میں لے گیا— سامنے سے ایک برات آ

رہی تھی۔ جب میں نے بینڈ کی آواز سنی تو میرے اوسان خطا ہو گئے۔
ایک دم اشوک کا ہاتھ پکڑ کر میں چلایا: ''دادامنی یہ تم کدھر آ نکلے!''
اشوک میرا مطلب سمجھ گیا۔ مسکرا کر اُس نے کہا: ''کوئی فکر نہ کرو۔''
میں کیونکر فکر نہ کرتا۔ موٹر ایسے اسلامی محلّے میں تھی، جہاں کسی ہندو کا گزر ہی نہیں ہوسکتا تھا اور اشوک کو کون نہیں پہچانتا تھا، کون نہیں جانتا تھا کہ وہ ہندو ہے — ایک بہت بڑا ہندو، جس کا قتل معرکہ خیز ہوتا — مجھے عربی زبان میں کوئی دُعا یاد نہیں تھی۔ قرآن کی کوئی موزوں و مناسب آیت بھی نہیں آتی تھی۔ دل ہی میں میں اپنے اوپر لعنتیں بھیج رہا تھا اور دھڑکتے ہوئے دل سے اپنی زبان میں بے جوڑ سی دُعا مانگ رہا تھا کہ اے خدا مجھے سُرخرو رکھیو — ایسا نہ ہو کہ کوئی مسلمان اشوک کو مار دے اور میں ساری عمر اس کا خون اپنی گردن پر محسوس کرتا رہوں۔ یہ گردن قوم کی نہیں، میری اپنی گردن تھی مگر یہ ایسی ذلیل حرکت کے لیے دوسری قوم کے سامنے ندامت کی وجہ سے جھکنا نہیں چاہتی۔
جب موٹر برات کے جلوس کے پاس پہنچی تو لوگوں نے چلانا شروع کر دیا۔ ''اشوک کمار — اشوک کمار'' میں بالکل یخ ہو گیا۔ اشوک سٹیرنگ پر ہاتھ رکھے خاموش تھا۔ میں خوف و ہراس کی یخ بستگی سے نکل کر ہجوم سے یہ کہنے والا تھا کہ دیکھو ہوش کرو۔ میں مسلمان ہوں۔ یہ مجھے میرے گھر چھوڑنے جا رہا ہے — کہ دو نوجوانوں نے آگے بڑھ کر بڑے آرام سے کہا: ''اشوک بھائی، آگے راستہ نہیں ملے گا، ادھر باجو کی گلی سے چلے جاؤ۔''
اشوک بھائی؟ اشوک اُن کا بھائی تھا۔ اور میں کون تھا؟ — میں نے دفعتاً اپنے لباس کی طرف دیکھا جو کھادی کا تھا — معلوم نہیں اُنھوں نے مجھے کیا سمجھا ہوگا مگر ہوسکتا ہے کہ اُنھوں نے اشوک کی موجودگی میں مجھے دیکھا نہ ہو۔

موٹر جب اُس اسلامی محلّے سے نکلی تو میری جان میں جان آئی میں نے اللہ کا شکر ادا کیا تو اشوک ہنسا۔تم خواہ مخواہ گھبرا گئے— آرٹسٹوں کو یہ لوگ کچھ نہیں کہا کرتے۔''

چند روز بعد بمبئے ٹاکیز میں نذیر اجمیری کی کہانی (جو ''بجنور'' کے نام سے فلم بند ہوئی) پر میں نے جب کڑی نکتہ چینی کی اور اُس میں کچھ تبدیلیاں کرنا چاہیں تو نذیر اجمیری نے اشوک اور واچا سے کہا: ''منٹو کو آپ ایسے مباحثوں کے دوران میں نہ بٹھایا کریں، وہ چونکہ خود افسانہ نویس ہے اس لیے متعصّب ہے۔

میں نے بہت غور کیا، کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ آخر میں نے اپنے آپ سے کہا: ''منٹو بھائی— آگے راستہ نہیں ملے گا— موٹر روک لو— ادھر باجو کی گلی سے چلے جاؤ۔''

اور میں چپ چاپ باجو کی گلی سے پاکستان چلا آیا جہاں میرے افسانے ''ٹھنڈا گوشت'' پر مقدمہ چلایا گیا۔''

تقسیم کے بعد منٹو پاکستان آ گئے۔ یہاں آتے ہی منٹو کئی دیگر ادیب حضرات کے لیے ایک خطرہ بن گئے۔ ان حضرات کو اپنی قابلیت اور منٹو کی عظمت دونوں کی بھرپور آگہی تھی۔ منٹو نے اِن معاملات سے نمٹنے کے لیے صحافت کو ذریعۂ روزگار بنانے کی کوشش کی۔ یہاں اُنھوں نے چشم زدن کے عنوان سے اخبار'' مغربی پاکستان'' میں کالم تحریر کیے لیکن یہ اخبار منٹو کے قلم کی بے باکی کا وزن اُٹھانے سے قاصر رہا۔ اس کے بعد اُنھوں نے'' آفاق'' میں کالم تحریر کرنا شروع کر دیا۔ وہ تمام تحریریں بعدازاں'' گنجے فرشتے'' کا حصہ بنیں۔ لاہور میں وہ وائے ایم سی اے کی تقریبات کا بھی حصہ بنے رہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مے نوشی کی عادت کے باعث اُن کے کئی ہم نوالہ و ہم پیالہ ایسے بھی تھے جن کا شمار اُس وقت کے انتہائی معتبر لوگوں میں ہوتا تھا۔ حالات اُن کے لیے موافق نہ تھے۔ مالی معاملات بگڑتے گئے۔ غربت جان کا وبال بنتی گئی۔ ہندوستان میں گزرے سہل برسوں کی عادتیں نہ چھوٹیں اور منٹو

قرضوں کے بوجھ تلے دبتے گئے۔ انتہا یہاں تک ہوئی کہ ایک روز اُن کی بیگم صفیہ نے بیٹی کے بخار میں مبتلا ہونے پر منٹو کو دوائی کے پیسے دیے اور منٹو نے وہ پیسے مے نوشی پر خرچ کر دیے۔ اِس واقعے کے بعد منٹو خود بھی کئی روز تک شدید رنجیدہ رہے۔ اُس دور میں بھی اُنھوں نے کئی ڈرامے اور افسانے تحریر کیے، اگرچہ وہ منٹو کے معیار کے نہ تھے لیکن پھر بھی اُنھیں اُردو کے عظیم فن پاروں میں شمار کیا گیا۔ پاکستان میں اُن پر جنس نگاری اور فحش گوئی کے الزامات لگے۔ کالی شلوار، دُھواں، اور ٹھنڈا گوشت پر مقدمات چلائے گئے۔ پاکستان میں اُن کی زندگی کے محض آٹھ برس گزرے۔ اِن آٹھ برسوں میں آخری دو برس مے نوشی اور ذہنی عارضے میں گزرے اور بقیہ چھے برسوں میں زیادہ تر عرصہ مقدمات کی پیروی اور مالی کسمپرسی میں گزرا۔ اُن پر جو مقدمات چلائے گئے اُن میں کسی طور بھی پختگی نہ تھی۔ اُن کے مخالفین بھی اس حقیقت سے آشنا تھے کہ منٹو صرف اس دور کے نہیں، ہر دور کے اُردو نثر نگاروں میں عظیم ہیں۔ اُنھوں نے ان معاملات کو صرف اس لیے اُچھالا کہ تاکہ منٹو اُلجھے رہیں اور ادبی سرگرمیوں میں حصہ نہ لے سکیں۔ تاہم مشکلات کے باوجود منٹو کی مزاحمتی طبیعت نے بہت سی حقیقت کے قریب تحریروں کو صفحۂ قرطاس پر اُبھارا جو اُس وقت کے بڑے اخباروں نے شائع بھی کیں۔ لیکن آہستہ آہستہ ان اخبارات کے مدیران نے بھی ہاتھ کھینچ لیا جس کی وجہ سے مالی معاملات شدید خراب ہو گئے۔ اس حوالے سے ایک خط درج ذیل ہے جو اُنھوں نے 12 اگست 1952ء کو روزنامہ ڈان کے غلام حسین مصطفیٰ کو تحریر کیا:

برادرم عزیز!

السلام وعلیکم! آپ کا خط ملا اور منی آرڈر مل گیا تھا۔ میں ان دنوں اس قدر پریشان ہوں کہ آپ کو اس کی رسید سے بھی مطلع نہ کر سکا۔ اُمید ہے آپ مجھے معاف فرما دیں گے۔

کچھ مقدموں اور کچھ مالی مشکلات نے اس قدر پریشان کر دیا ہے کہ میں اپنی حالت آپ پر اچھی طرح واضح نہیں کر سکتا۔

آپ کا منی آرڈر وصول ہوا تو اُس کے دوسرے روز صبح سویرے ایک سمن آ گیا۔ ہائی کورٹ کی طرف سے تھا کہ حاضر عدالت ہو کر وجہ

بیان کریں کہ کیوں نہ تمھارا افسانہ ''ٹھنڈا گوشت'' تلف کر دیا جائے۔
حاضرِ عدالت ہوا مگر اُس روز مقدمہ پیش نہ ہوا۔ چوتھے روز میری غیر حاضری میں فیصلہ سنا دیا گیا کہ ٹھنڈا گوشت تلف کر دیا جائے اور ٹھنڈا گوشت (کتاب) اس سے پندرہ روز پہلے دوسرے ایڈیشن کی صورت میں مارکیٹ میں آئی تھی۔ اب اس کی رائلٹی پبلشر سے وصول کرنی مشکل ہوگئی ہے۔

مجھے افسوس ہے بلکہ میں سخت نادم ہوں کہ میں ڈان کے لیے آپ کو افسانہ ابھی تک نہیں بھیج سکا۔ لیکن میں انشاءاللہ ایک ہفتے کے اندر اندر ضرور روانہ کر دوں گا۔

آپ کے خلوص اور آپ کی محبت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر ایک درخواست کرنا چاہتا ہوں، میں اِن دنوں بڑی مشکلات میں گرفتار ہوں۔ کیا آپ مجھے سو روپے روانہ فرما سکتے ہیں؟ میں عنقریب کراچی آنے والا ہوں۔ خُدا نے مجھے توفیق اور استطاعت دی تو آپ کا یہ قرض وہیں چکا دوں گا اور اپنے امتنان وتشکر کا ہدیہ بھی آپ کی خدمت میں پیش کر دوں گا۔ مگر خُدا کے لیے یہ بات آپ ہی تک رہے۔ اس لیے کہ میں جانتا ہوں، آپ سے کچھ مانگنے کا مجھے کوئی حق نہیں۔

خدا آپ کو خوش رکھے۔ خاکسار

سعادت حسن منٹو

کوئی بھی مقدمہ منٹو کو سزا نہ دِلوا سکا۔ ناقدین نے اُن کے افسانوں اور تحریروں کو جنس نگاری کا نام دے کر خوب اُچھالا مگر وہ سب ناکام ہی رہے کیونکہ وہ منٹو کی تحریروں تک پہنچ نہیں سکتے تھے۔ جنس نگاری اور عریانی کی کیا تعریف ہے، ادب میں اِسے کس طریقے سے پرکھا جائے، یہ سوال اپنی جگہ پر موجود ہیں۔ اس حوالے سے احمد ندیم قاسمی کے مضمون میں سے یہ اقتباس دیکھیے:

''منٹو کو جنس نگار قرار دیا جاتا ہے حالانکہ ''منٹو کے افسانے'' کے

موضوعات میں جو دلکشا تنوع ہے اس میں جنس کا عنصر صرف اتنا ہے کہ جتنا ہر باشعور افسانہ نگار میں ہوتا ہے اور ہونا چاہیے۔ زندگی کی اتنی بڑی حقیقت کو تو عبدالحلیم شرر اور آج کے تاریخی داستان طراز تک فراموش نہیں کر سکے۔ ان کے شمشیر بدست ہیرو کسی نہ کسی طرح محبت میں ضرور مبتلا ہوتے ہیں اور یہ محبت متصوفانہ نہیں ہوتی۔ خالص جنسی یعنی جسم کی پیکار ہوتی ہے البتہ بعد میں جب منٹو کو انگلستان کے افسانہ نگاروں اور ناول نویسوں (سمرسٹ مائم اور ڈی ایچ لارنس وغیرہ) کے مُطالعے کا موقع ملا تو جنس اس کی بیشتر کہانیوں کا محور قرار پا گئی۔ اس کے ساتھ ہی جنس کی طرف اس ہمہ گیر توجہ کا ایک اور سبب بھی تھا اور جو لوگ منٹو کے مزاج کو جانتے ہیں اُنھیں یہ سبب بے جان معلوم ہوگا۔''

(نقوش، لاہور نمبر، صفحہ 1098)

منٹو کو نہ صرف پنجابی زبان سے عشق تھا بلکہ وہ اسے دُنیا کی قدیم اور عظیم زبانوں میں شمار کرتے تھے۔ اُنھوں نے ہمیشہ اپنے پنجابی ہونے پر فخر کیا۔ لیکن چوں کہ اُردو پر سرکار انگریز کی چھتر چھایا تھی، روزی روٹی کے معاملات بھی اسی سے جڑے ہوئے تھے، اس لئے منٹو پنجابی زبان میں کچھ نہ لکھ سکے۔ منٹو کا اس وقت کے دیگر اُردو شعرا اور اُدبا سے یہ گلہ رہا کہ اُن کی مادری زبان پنجابی ہے اور اُنھیں پنجابی میں کچھ نہ کچھ ضرور لکھنا چاہیے۔ زبان کی اہمیت کو جانتے ہوئے وہ عام بول چال میں اُردو زبان سے اجتناب کرتے تھے۔ اس تناظر میں ان کے بھانجے محمد جلال کے مضمون میں سے یہ اقتباس ملاحظہ فرمایئے:

''منٹو میرے ماموں ہیں اور میں اُنھیں خالص پنجابی انداز میں سعادت ماما جی کہتا ہوں کیونکہ ہم آپس میں ہمیشہ پنجابی میں باتیں کرتے ہیں اور یہی ہمارے گھر کی بول چال کی زبان ہے۔ وہ صرف اپنے بچوں سے اُردو میں بات کرتے ہیں لیکن اُردو بولنے میں اُنھیں تکلّف ہوتا ہے اور وہ اُردو بولنے سے اتنا ہی گریز کرتے ہیں جتنا پنجابی میں لکھنے پڑھنے سے۔''

(نقوش، شخصیات نمبر، صفحہ 381)

منٹو ہمیشہ پنجابی لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کرتے رہے۔ احمد راہی کے ساتھ ان کا گہرا یارانہ تھا۔ احمد راہی کی پنجابی شاعری کی کتاب ''ترنجن'' منظر عام پر آئی تو اس کا فلیپ کرشن چندر کے علاوہ سعادت حسن منٹو نے بھی لکھا جو پنجابی زبان میں تھا۔ منٹو صاحب نے لکھا:

> ''ترِنجن'' دا ناں سُن دیاں اِی میرے دِماغ وِچ اِک ایہو جیہی جگہ دا تصور اُبھر آندا اے جیہڑی میں اَج تیکر نہیں ویکھی۔ پر جدوں وی کوئی ترِنجن دا ذِکر کرے تے میں اِک عجیب قِسم دِی مسرت محسوس کرنا آں۔ مینوں ایویں لگدائے جیویں میں وِی اِک کڑی آں، جو اپنیاں ہانیاں نال بیٹھی چرخا کت رہی اے— ایہنوں تُسیں پنجابی پنڈاں دِی فضا دا جادُو کہہ لَو و یاں ایہنوں کوئی ہور ناں دے دیو۔
>
> میرے یار احمد راہی نے ایہہ کتاب چھپوائی اے، جیہدا ناں اوس نے ''ترِنجن'' رکھیا اے۔ پنجابی شاعری دے مجموعے دا ایس توں ودھیا ناں ہور کیہ ہوسکدا اسی۔ ایس مجموعے وِچ دَمڑی دے سَک توں لے کے لکھّاں دے کاروبار دا ذِکر اے۔ لَونگ دے لِشکارے توں لے کے اوہناں بجلیاں دِیاں کہانیاں بیان کیتیاں گئیاں نیں جیہڑ یاں ہل واہندے جٹّاں نوں ہل ڈَک لین دِی بجائے ہور زیادہ محنت کرن اُتے اُکساندیاں نیں۔
>
> احمد راہی شاعری دِی ہِک وِچ جنگلی کبوتراں دے آہلنے نہیں پائے۔ اوس نے اوہناں آلہنیاں دا ذِکر کیتا اے، جیہناں وِچ غریب وَسدے نیں— ایہہ آہلنے خوبصورت تے گول مٹول تے پھڑکن والے نہیں، پر ایمان دِی گل اے کہ احمد راہی دِی زبانوں ایہناں دا ذِکر سن کے اِک واری تے کالجہ ہِل جاندا اے۔''

اُردو کا ہر جانب بول بالا تھا۔ اس کے باوجود ماں بولی کی تنزلی کا غم بھی دِل میں موجزن تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی کئی تحریروں میں اُنھوں نے پنجابی کا رنگ بھی دِکھلایا۔ اُن کی

تحریروں کا ایک مجموعہ ''منٹو کے مضامین'' کے عنوان سے چھپا۔ اس میں ایک بھرپور اور توانا مضمون ''دیہاتی بولیاں'' کے عنوان سے تھا۔ جس میں اُنھوں نے مختلف موقعوں پر بولی جانے والی پنجابی ضرب الامثال تحریر کیں اور اُن کی وضاحت بھی کی۔ اسی طرح اُن کے افسانوں میں بھی یہ بات کئی موقعوں پر دِکھائی دیتی ہے۔ اِس حوالے سے ایک اقتباس ان کے ایک افسانے ''شیرو'' میں سے درج ہے:

''اس کے نیچے ''علیم پینٹر'' لکھا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ نولیندہ کا نام ہوگا۔ یہی شعر کمرے کے ایک اور تختے پر لکھا تھا مگر زرد چاک سے اُس کے اُوپر تاریخ بھی لِکھ دی گئی تھی۔ ایک اور تختے پر یہ شعر مرقوم تھا:

مرے گھر آئے عنایت آپ نے مجھ پر یہ کی
مرے سر آنکھوں پر آؤ، تھی یہ کب قسمت مری

اس سے دُور ایک کونے میں مصرع لکھا تھا:

ایک ہی شب گور ہے لیکن گلوں میں ہم رہے

اس مصرع کے پاس ہی اس خط میں پنجابی کے یہ شعر مرقوم تھے:

تیرے باجھ نہ سی قرار دِل نُوں، جذبہ پریم والا بے پناہ رہے گا
لکھ اَکھیاں توں ہوسیں دُور بانو ایہہ پر دِلاں نوں دِلاں دا راہ رہے گا
تیرے میرے پیار دا رب جانے مگو نالے دا ایز گواہ رہے گا

ترجمہ:

تیرے بغیر میرے دل کو کبھی قرار نہیں آئے گا۔ جذ محبّت بے پناہ رہے گا
تُو لاکھ میری آنکھوں سے دُور ہو لیکن دِل کو دِل کی راہ رہے گی
اور میرے پریم کو صِرف خدا جانتا ہے لیکن مگو نالے کا پانی بھی گواہ رہے گا

میں نے اِن اشعار کو غور سے پڑھا۔ لیکن ایک بار نہیں کئی بار پڑھا۔ نہ معلوم اِن میں کیا جاذبیت تھی کہ پڑھتے پڑھتے میں نے ''ہیر'' کی دِلنواز دُھن میں اُنھیں گانا شروع کر دیا۔ لفظوں کا رُوکھا پن یوں بالکل دُور ہوگیا

اور مجھے یوں محسوس ہوا کہ لفظ پگھل کر اُس دُھن میں حل ہو گئے ہیں۔

اِسی طرح کا ایک اقتباس اُن کے افسانے ''ممی'' میں سے :

''پھر اُس نے بڑی رحم انگیز نظروں سے میری طرف دیکھا۔

''یار...... میں واقعی جذباتی ہو گیا ہوں...... ہاں...... وہ رنگ...... خُدا کی قسم لاجواب رنگ ہے...... وہ تم نے دیکھا ہے...... وہ جو مچھلیوں کے پیٹ پر ہوتا ہے...... نہیں نہیں ہر جگہ ہوتا ہے...... پومفریٹ مچھلی...... اُس کے وہ کیا ہوتے ہیں......؟ نہیں نہیں...... سانپوں کے وہ ننھے ننھے کھپرے...... ہاں کھپرے...... بس اُن کا رنگ...... کھپرے...... یہ لفظ مجھے ایک ہندستوڑے نے بتایا تھا...... اتنی خوبصورت چیز اور ایسا واہیات نام...... پنجابی میں ہم اُنھیں چانے کہتے ہیں۔ اس لفظ میں چنچناہٹ ہے...... وہی...... بالکل وہی جو اُس کے بالوں میں ہے...... لٹیں ننھی ننھی...... سنپولیاں معلوم ہوتی ہیں۔ جو لوٹ لگا رہی ہوں...... وہ ایک دَم اُٹھا۔''

پنجابی زبان ہی کے حوالے سے احمد ندیم قاسمی کے ایک مضمون ''سعادت حسن منٹو'' میں سے ایک اقتباس درج ذیل ہے۔ یہ مضمون قاسمی صاحب کی وفات کے بعد سہ ماہی مونتاج میں بھی چھپا تھا:

''اس وقت تک شاہد لطیف اور عصمت چغتائی کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ شاہد لطیف آیا۔ منٹو نے اسے ''مُصور'' کا اداریہ اور کالم لکھنے کے لیے الگ کمرے میں بٹھا دیا اور ہم دونوں اپنے اپنے کام میں لگ گئے۔ دو ایک گھنٹے کے بعد منٹو نے شاہد لطیف سے اس کے کام کی رفتار کا پوچھا تو وہ بولا ''یار منٹو! — مجھ سے تو ابھی ایک سطر تک نہیں لکھی جاسکی۔ میں نے اس طرح کا کام کبھی نہیں کیا نا'' منٹو نے ناگواری سے اُس کے سامنے سے کاغذات اٹھائے اور میرے حوالے کر دیے۔

میں نے دو ڈھائی گھنٹے کے اندر ''مُصور'' کا اداریہ اور ادارتی نوٹ اور مزاحیہ کالم ''بال کی کھال'' لِکھ کر منٹو کے حوالے کر دیے تو منٹو نے اس کے مطالعے کے بعد اعلان کیا کہ ''مزہ آ گیا'' پھر شاہد لطیف کو تنگ کرتا رہا کہ پنجابی ذہن کتنا الرٹ اور ترقی یافتہ ہے اور تم اُردو والے کولھو کے بیل ہو — شاہد سنتا رہا اور ہنستا رہا۔ دو روز کے بعد وہ واپس علی گڑھ چلا گیا۔

ایک اور موقع پر بھی منٹو کی پنجابیت کی رگ پھڑکی تھی۔ شاہد احمد دہلوی نے جب سنا کہ میں دہلی میں ہوں اور منٹو کے ہاں ٹھہرا ہوا ہوں تو اُنھوں نے ہم دونوں کو اپنے ہاں دعوت پر بلایا۔ اس دعوت میں دہلی کے ادوار کے سبھی قابلِ ذکر اہلِ قلم موجود تھے۔ ظاہر ہے شعر و ادب کے موضوعات پر اُردو میں گفتگو ہوتی رہی مگر جب منٹو اور میں آپس میں کوئی بات کرتے تھے تو پنجابی میں کرتے تھے۔ شاہد صاحب نے اس کا برا مانا۔ بولے ''آپ دونوں اُردو کے ادیب ہیں۔ ہم سے اُردو ہی میں بات چیت کر رہے ہیں مگر آپس میں پنجابی بول رہے ہیں — اُردو بولیے۔'' منٹو کو یہ بات بری لگی۔ شاہد احمد سے مخاطب ہو کر کہنے لگا ''شاہد صاحب! پنجابی، اُردو سے زیادہ قدیم زبان ہے اور اس کا ذخیرۂ الفاظ بھی اُردو سے زیادہ ہی ہوگا۔ مثال کے طور پر اگر میں ایلومونیم کا یہ کٹورا سیمنٹ کے فرش پر گراؤں تو پنجابی میں اسے ''چِب'' پڑ جائے گا۔ اُردو میں کیا پڑے گا؟'' — دوستوں نے اُردو کے ایک سے زیادہ الفاظ پیش کیے مگر سب ''چِب'' کے مقابلے میں ہار گئے اور منٹو اتنا خوش ہوا جیسے اس کے ہاتھ میں فتح کا جھنڈا آ گیا ہے اور وہ اُسے ادبائے دہلی کے سروں پر لہرا رہا ہے۔''

منٹو نے پنجابی زبان میں ایک کہانی بھی تحریر کی تھی۔ لیکن بدقسمتی سے وہ کہانی چھپ نہ سکی۔ اُس کہانی کے ساتھ کیا ہوا اِس کی تفصیل احمد ندیم قاسمی نے اپنے مضمون میں اس

طرح قلم بند کی:

''منٹو ایک روز ''امروز'' کے دفتر آیا اور بولا ''میں نے زندگی میں پہلی بار پنجابی زبان میں کہانی لکھی ہے۔ تم اپنے اخبار میں پنجابی صفحہ چھاپتے ہو، اس لیے یہ کہانی اس میں درج کر دو۔'' میں نے نہایت مسرت کا اظہار کیا اور مسودہ اُس سے لے لیا۔ پنسل سے لکھا ہوا یہ افسانہ میں نے پڑھا تو منٹو مجھے فن کے اُس اوج پر نظر آیا جس پر وہ برسوں پہلے پہنچ چُکا تھا۔ میں نے دفتر سے اُسے افسانے کا پیشگی معاوضہ دِلوا دیا اور یہ پروگرام بنایا کہ یہ افسانہ چھاپنے سے پہلے ''پنجابی زبان میں منٹو کی پہلی کہانی'' کے عنوان سے اُس کی خُوب تشہیر کروں گا مگر چند روز بعد ہی پولیس میرے دفتر کی تلاشی لینے آ دھمکی اور اُس نے مسودات اتنی بے رحمی سے اُلٹے پلٹے کہ منٹو کی کہانی غائب ہو گئی۔ میں جب تک ''امروز'' میں رہا، پرانی فائلوں میں اُسے تلاش کرتا رہا مگر وہ شاید پولیس کے ہتھے چڑھ کر پار ہو گئی تھی!''

تقسیم سے قبل اور بعد از تقسیم بھی منٹو صاحب ہندوستان اور پاکستان کے فلمستان سے کسی نہ کسی صورت منسلک رہے۔ اُن کی زندگی میں بھی اور بعد میں بھی کئی فلمیں منٹو صاحب کے افسانوں اور کہانیوں کی بنیاد پر بنائی گئیں۔ پاکستان کے سرکاری ٹی وی اور نجی پروڈکشن ہاؤسز نے ڈرامے تشکیل دیے۔ اُن کی کتب کے دُنیا کی کئی زبانوں میں تراجم ہوئے۔ اُن کے والد کے خاندان کی اگلی نسلوں کے کئی لوگ شاید بہت امیر یا بڑے عہدوں پر ہوں لیکن ان میں سے کوئی ایک بھی سعادت حسن منٹو نہیں۔ وہ منٹو جنھیں ان کے خاندان والوں نے کبھی قبول نہ کیا۔ اُن کی زندگی اور بعد از زندگی بھی بڑے بڑے افراد نے اُنھیں اپنی تحاریر کا حصہ بنایا۔ ایک جگہ فیض صاحب منٹو کے بارے میں لکھتے ہیں:

''بھئی منٹو اپنا شاگرد تھا۔ ایم اے او کالج امرتسر میں وہ میری کلاس میں تھا۔ پڑھتا وڑھتا نہیں تھا، بس شرارتی تھا۔ مجھ سے عمر میں کوئی دو تین مہینے جونیئر ہو گا، تھا ذہین کسی کو خاطر میں ہی نہ لاتا تھا۔

بس میری عزت کرتا تھا اور مجھے اُستاد مانتا تھا۔ میں نے اُسے گورمکھی کے افسانوں کا ترجمہ کرنے کو دیا۔ اس کے بعد اور ترجمے دیے، وہ لکھک بن گیا۔ اُس نے بہت عمدہ افسانے لکھے۔ لیکن 1950ء کے بعد وہ پٹڑی سے اُتر گیا۔ فلم والے اس سے ایک بوتل کے عوض جس قسم کی کہانی چاہتے تھے، لکھوا لیتے تھے۔ اس پر جب بھی فحاشی کے سلسلہ میں مقدمہ چلا، ہر دفعہ defence witness تو ہمیں تھے۔ کل چار مقدمے تھے۔ ''کالی شلوار''، ''ٹھنڈا گوشت''، ''کھول دو'' اور ''دُھواں'' پر تین بار ہم اُسے چھڑا لائے۔ چوتھے مقدمے سے پہلے سرکار نے ہمارا بندوبست کر دیا اور ہم جیل خانے چلے گئے اور منٹو کو قید ہوگئی۔ اللہ غریقِ رحمت کرے مولانا اختر علی خان اور شورش کاشمیری کو کہ اُن کی حسرت پوری ہوگئی۔''

اُردو زبان کے اِس عظیم نثر نگار نے انتہائی کرب اور کسمپُرسی کے عالم میں 18 جنوری 1955ء کو وفات پائی۔ اُن کی وفات کے بعد دُنیا بھر کے اخبارات اور رسائل میں اُن پر مضامین تحریر ہوئے۔ محمد طفیل نے نقوش کا ''منٹو نمبر'' شائع کیا۔ اسی طرح ماہنامہ سپوتنک کا ایک شمارہ منٹو کی زندگی اور فن پر شائع ہوا۔ ان تحریروں میں اُن کے چاہنے والوں نے دل کھول کر اُنھیں دادِ تحسین دی۔ وہ تمام قوتیں جو اُن کی زندگی میں مسلسل اُن کے خلاف رہیں، اُن کی اِس سے بڑی ناکامی کیا ہوگی کہ وہ لوگ اُن کی وفات کے بعد بھی اُن کے فن کی معراج کو نہ چھو سکے۔ اُن کے افسانوں اور ڈراموں کا ایک مجموعہ ''افسانے اور ڈرامے'' کے عنوان سے باقی بک ڈپو اُردو بازار دہلی نے چھاپا۔ اُس کے فلیپ پر مشاہیر کی آرا ملاحظہ فرمائیے:

''میں اُسے واحد ایسا ادیب اور افسانہ نگار سمجھتا رہا ہوں جس میں فن اور زبان کو برابر مانا جاتا ہے۔''

(راجندر سنگھ بیدی)

''منٹو...... خُدا تیرے قلم میں اور زہر بھر دے۔''

(کرشن چندر)

''اگر مُستقبل میں کوئی غیر جانبدار نقاد منٹو اور مشرقِ وَسطیٰ کے افسانہ نگاروں کی تخلیقات کا تجزیہ کرنے بیٹھے گا تو بخدا منٹو کو پاکستان اور ہندوستان ہی کا نہیں پورے مشرقِ وُسطیٰ کا سب سے بڑا فن کار قرار دینے پر مجبور ہوگا۔''

(رشید اختر ندوی)

''منٹو اپنے سوا کسی کو شاذ ہی مانتے تھے۔ وہ اپنے آپ کو برِصغیر کا سب سے بڑا افسانہ نگار مانتے تھے۔ اُن کا دعویٰ کسی حد تک درست تھا۔''

(آغا شورش کاشمیری)

''منٹو تو ادب کے علاوہ عمر بھر اپنی زندگی میں فنکاری کے شعبدے دکھاتا رہا۔ شراب بے تحاشا پیتا رہا۔ مقدمے اُس پر چلے، پاگل خانے تک جا پہنچا۔ برصغیر میں ادب کی جو''انڈر ورلڈ'' ہے، اس کا وہ عمدہ مصّور تھا۔ تعجب ہے کہ اس کو Toudaure-lautrec سے کیوں تشبیہ نہیں دی گئی۔''

(قرۃ العین حیدر)

''منٹو اگر الگ ہے تو کوئی جماعت لوگوں کی نظر میں ادیبوں کی نمائندہ نہیں بن سکتی۔''

(محمد حسن عسکری)

''منٹو اپنے پیچھے بہت کچھ چھوڑ گیا ہے جو ادبی دُنیا میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔''

(ممتاز شیریں)

منٹو صاحب جو کہ ایک زمانے میں فیض صاحب کے شاگرد بھی رہے، اُن کے بہت قریب تھے۔ جب فیض صاحب کو اُن کی موت کا پتا چلا تو اُنھوں نے اُن کی زندگی کے کچھ حصوں اور اُن کے فن کا تقابلی جائزہ ان الفاظ میں پیش کیا:

''منٹو کی وفات کا سن کر بہت دُکھ ہوا۔ سب کمزوریوں کے باوجود مجھے

نہایت عزیز تھے۔ خود اس بات پر مجھے کچھ فخر بھی ہے کہ وہ امرتسر میں میرے شاگرد تھے۔ اگرچہ یہ شاگردی کچھ برائے نام ہی تھی، اس لیے کہ وہ کلاس میں تو شاید ہی کبھی آتے ہوں۔ البتہ میرے گھر پر اکثر صحبت رہتی اور چیخوف، فرائڈ اور موپساں اور نہ جانے کس کس موضوع پر گرم مباحثے ہوتے تھے۔

بیس برس گزر چکے لیکن یوں لگتا ہے جیسے کل کی بات ہے۔ ہمارے شرفا جنھیں دورِ حاضر کے فنکار کی شکستِ دِل کا نہ احساس ہے اور نہ اس سے کوئی ہمدردی، غالباً یہی کہیں گے کہ منٹو مر گیا تو اس کا اپنا قصور ہے۔ بہت پیتا تھا۔ بہت بے قاعدہ زندگی بسر کرتا تھا۔ صحت کا ستیاناس کر لیا تھا وغیرہ وغیرہ۔ لیکن یہ کوئی نہیں سوچے گا کہ اس نے ایسا کیوں کیا تھا؟ ایسے ہی کیٹس نے بھی اپنے کو مار رکھا تھا۔ برنیز نے بھی، موزارٹ نے بھی، اور بھی کئی نام گنوائے جا سکتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ جب معاشرتی حالات کی وجہ سے فن اور زندگی ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہوں تو دونوں میں سے ایک کی قربانی دینی ہی پڑتی ہے۔ دوسری صورت تہ بازی کی ہے جس میں دونوں کا کچھ حصہ قربان کرنا پڑتا ہے اور تیسری صورت اِن دونوں کو یکجا کر کے جدوجہد کا مضمون پیدا کرنے کی ہے جو صرف عظیم فنکاروں کا حصہ ہے۔ منٹو عظیم نہیں تھا، لیکن بہت دیانت دار، بہت ہنرمند اور قطعی راست گو ضرور تھا۔''

منٹو نے اپنی ذاتی زندگی میں بھی تحریر کے معاملے پر کوئی لچک نہ دِکھائی۔ اُنھوں نے اپنی زندگی ہی میں اپنی قبر کے دو کتبے تحریر کیے۔ ایک کتبہ اُن کی اپنی تحریر میں ہے:

786

''کتبہ''

''یہاں سعادت حسن منٹو دفن ہے۔ اُس کے سینے میں فنِ افسانہ نگاری کے اسرار و رموز دفن ہیں۔ وہ اب بھی منوں مٹی کے نیچے سوچ رہا ہے کہ وہ بڑا افسانہ نگار ہے یا خُدا۔''

سعادت حسن منٹو، 18 اگست 1954ء

منٹو صاحب کی زندگی اور فن پر تو شاید کئی کتب درکار ہیں۔ میں اس مضمون کو محض ایک حاضری ہی جانتا ہوں۔ یہ بات بھی روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ اُردو ادب کی تاریخ میں منٹو صاحب کے طرزِ تحریر کا مالک نہ پہلے کوئی تھا اور نہ ان کی وفات کے ساٹھ برس بعد ان کی قدآوری میں کوئی برابر دِکھائی دیا۔ آج بھی کئی لکھنے والے اُن کے حق میں اور اُن کی مخالفت میں لِکھ اور بول کر اپنے قد کو بڑھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جس طرح میر، غالب، اقبال اور فیض دُنیا بھر میں اُردو شاعری کی پہچان ہیں۔ اُسی طرح اُردو افسانہ، کہانی اور ڈراما ہمیشہ منٹو صاحب کا مرہونِ منت رہے گا۔

مملکتِ خدادادِ پاکستان جہاں منٹو پر مقدمے چلے، اِسی ملک نے اُن کی وفات کے پچاس برس بعد منٹو کے نام کا اعزازی ڈاک ٹکٹ جاری کیا جس پر "A Man of Letters" تحریر تھا۔

اُن کی وفات کے بعد اُنھیں قبرستان میانی صاحب لاہور میں دفن کیا گیا۔ اُن کی قبر کے پاس بُوٹا پہلوان اور سُلطان ٹھیکے دار کی قبور ہیں۔ اُن کی قبر پر یہ کتبہ درج ہے:

786

میری قبر کا کتبہ

یہ

لوح

سعادت حسن منٹو کی قبر کی ہے

جو اب بھی سمجھتا ہے کہ اس کا نام

لوحِ جہاں پر

حرفِ مکرر نہیں تھا

(منٹو)

پیدائش 11 مئی 1912ء — وفات 8 جنوری 1955ء

احسان دانش

1914ء-1982ء

دانش، میں ہوں سیاستِ حاضر سے بے خبر
فرعون کی طرف ہوں کہ موسیٰ کا ساتھ دوں
دانش

''جہانِ دانش'' کے نام سے شہرۂ آفاق خود نوِشت کے مصنف احسان دانش کا اصلی نام قاضی احسان الحق کاندھلوی تھا۔ وہ ضلع مظفر نگر (اُتر پردیش) یوپی کے قریب کاندھلہ میں 1914ء میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والدِ گرامی کا نام قاضی دانش تھا جو ایک سلسلۂ تصوّف سے نسبت رکھنے والے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اُن کا سلسلۂ نسب شیخ حسن زنجانی سے ہوتا ہوا حضرت ابوبکر صدیقؓ سے جا ملتا ہے۔ احسان دانش نے انتہائی غربت میں بچپن گزارا، جس کے باعث وہ کسی سکول یا کالج سے باقاعدہ تعلیم حاصل نہ کر سکے۔ لیکن مذہبی گھرانہ ہونے کے باعث اُردو اَور عربی کی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی۔ 1928ء میں پرائمری کا امتحان پاس کیا اَور اُس کے بعد سلسلۂ روزگار سے جُڑ گئے۔ اپنی زندگی کے اِبتدائی ایام کاندھلہ میں گزارنے والے احسان دانش بھی حفیظ جالندھری اور ساغر صدیقی کی طرح کسی بڑی یونیورسٹی سے سند یافتہ نہ ہونے کے باوجود اُردو زبان کے عظیم شعرا اَور اُدبا میں شمار ہوتے ہیں۔

احسان دانش نے قرآن مجید کی تعلیم سیّد حافظ محمد مصطفیٰ جیسے زِیرک اُستاد سے حاصل کی۔ عربی اور اُردو سے شغف رکھنے کے باعث کچھ عرصہ منشی عبدالرحیم جلال آبادی کی شاگردی کی۔ شعر گوئی کی جانب طبیعت شروع ہی سے مائل تھی۔ اس لیے فنِ شعر گوئی کی باریکیوں کو جاننے کے لیے قدرت نے اُنھیں قاضی محمد ذکی اور خواجہ عزیز الحسن مجذوب جیسے عظیم

اساتذہ سے نوازا۔ تقسیم کے بعد اُن کی ادبی صلاحیتوں کو شمس العلما علامہ تاجور نجیب آبادی نے چار چاند لگا دیے۔ احسان دانش کے تقسیم تک کے سفر میں کئی نشیب و فراز تھے۔ بچپن کے ایام میں ایک خاص امر کتب کا مطالعہ تھا۔ کتب کے مطالعے کا سبب اُن کے والد صاحب کی نظر کا کمزور ہونا تھا۔ وہ اپنے والد کو کلاسیکی ادب کی کتب بہ آوازِ بلند پڑھ کر سناتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اُنھوں نے لڑکپن ہی میں فسانۂ آزاد، فسانۂ عجائب، آرائشِ محفل اور باغ و بہار جیسے کلاسیکی ادب کا مطالعہ کر لیا تھا۔ تمام دن محنت مزدوری کرتے، کتب پڑھتے اور شعر کہتے، احسان دانش کی یہی زندگی تھی۔ اُنھوں نے ابتدا میں نعتیہ اور حمدیہ کلام تحریر کیا۔ اس کے بعد کچھ عرصہ گل و بلبل کی شاعری کی، پھر محنت اور مزدوری کرنے کے باعث اُنھوں نے مزدوروں کے حق میں کلام تحریر کرنا شروع کیا تو اُنھیں ''شاعرِ مزدور'' کا نام دیا گیا۔ اُن کی خلقت سے جڑی شاعری نے ہمیشہ سننے والوں کے دل موہ لیے۔ یہی وجہ تھی کہ اُن کا موازنہ جوش ملیح آبادی سے بھی کیا جاتا رہا جو سامعین کو اپنے کلام کے سحر میں جکڑ لیتے تھے۔ اُن کے کلام کا کچھ نمونہ ملاحظہ فرمائیے:

☆

جو گزر رہی ہے دل پر کوئی ترجماں نہیں ہے — مرے دوستوں میں کوئی مرا چہرہ خواں نہیں ہے
مرے شقِ شب روی کا کوئی آسرا تو ہوتا — کوئی سبز فام تارا سرِ آسماں نہیں ہے
یہ یقین آ رہا ہے مجھے اب قدم قدم پر — مری یہ زمیں نہیں ہے، مرا یہ جہاں نہیں ہے
مرے ہم خیال قُدسی، مرا جبرئیل شاہد — ترے آستاں سے اُونچا کوئی آسماں نہیں ہے
مہ و آفتاب کِرنیں لیے ساتھ چل رہے ہیں — مرے سر پہ خار و خس کا کوئی سائباں نہیں ہے
ہیں قیادتِ جنوں میں مرے ساتھ صاف باطن — جو غلط قدم اُٹھائے مرا کارواں نہیں ہے
مرے سب حریف گلچیں، مرے گُل فروش دُشمن — میں چمن کا ماتمی ہوں، غمِ آشیاں نہیں ہے
وہ گئے تو لے گئے ہیں مرے غم کی شعلگی بھی — مرے اشک جم گئے ہیں، مرا دل تپاں نہیں ہے
مجھے ایک دن اچانک یہ ملال مار دے گا — مرے قافلے میں اب تک کوئی راہداں نہیں ہے
مجھے کیا خرد سے خطرہ، میں جنوں کے شہر میں ہوں — مری وہ زمیں ہے جس پر کوئی آسماں نہیں ہے
جسے حق کے راستے میں ہوں عزیز جان و دل بھی — وہ طلب طلب نہیں ہے، وہ لہو جواں نہیں ہے

ترے بیکراں کرم نے مری تشنگی بجھا دی　　کوئی فِکر کوئی کوشش مری رائگاں نہیں ہے
خدوخال سے سجا کر نہ اُتار ماہ و انجم!　　یہ زمیں مری زمیں ہے، ترا آسماں نہیں ہے
مرے نام سے جو اکثر اُنھیں خط لکھے گئے ہیں　　وہ مرا قلم نہیں ہے، وہ مری زباں نہیں ہے
کئی محفلوں نے دانش مجھے یہ خیال بخشا
سحرؔ ہے دوستوں کی، شبِ دوستاں نہیں ہے

☆

وہ نہیں تو ڈستا ہے بام و در کا سناٹا
اُف یہ دل کی ویرانی یہ نظر کا سناٹا
خوش خیال لوگوں کو بدگماں نہ کر ڈالے
کچھ اُدھر کی خاموشی، کچھ اِدھر کا سناٹا
عشق ایک ہے لیکن مختلف طبائع ہیں
ایک ہو نہیں سکتا دشت و در کا سناٹا
کاش کوئی پڑھ سکتا، کاش کوئی سن سکتا
شام کی شفق میں تھا رات بھر کا سناٹا
دوستی بڑی نازک چیز ہے زمانے میں
دے گیا ہے اِک لمحہ، عمر بھر کا سناٹا
اِختتامِ محفل پر کیوں سفر میں ہو تاخیر
یاد کر رہا ہوگا، میرے گھر کا سناٹا
وہ ابھی ابھی شاید اس طرف سے گزرے ہیں
کس قدر مُعطر ہے رہ گزر کا سناٹا
گونجتی ہے کانوں میں اِک اروپ جھینگر کی
نیم شب سے بڑھ کر ہے دوپہر کا سناٹا
رات بھر رہا میرا ہمقدم خموشی سے

چاند پر بھی تھا طاری، کچھ سفر کا سناٹا

جن کی کھڑکیوں میں کل ماہتاب ہنستے تھے

اب اُنھیں مکانوں میں ہے کھنڈر کا سناٹا

دل کو کیسے سمجھاؤں بھولتا نہیں دانش

اِک سفر کی کچھ باتیں اِک سفر کا سناٹا

☆

کُھل کر جو برس چکا ہے بادل — سبزے پہ لہک رہی ہے مخمل

جب لقمہ لیا تو دِل بھر آیا — اس طرح بھی ہو رہا ہے رن جل

ہاتھوں میں غلط سپاس نامے — سینوں میں مقاصدوں کی دَلدل

آنکھوں میں سُلگ رہے ہیں آنسو — گالوں پہ ڈھلک رہا ہے کاجل

ہر اِک کی الگ ہے فرد کردار — ہر شاخ میں ہے درخت کا پھل

ہر شخص خموش و تیز رفتار — جیسے ہے تمام شہر پاگل

ثابت ہے یہ انقلابِ نو سے — یہ خواب بھی ہوگیا مکمل

اخبار میں امن کے ہیں چرچے — بستی میں مچی ہوئی ہے ہلچل

اس دور کے صاحبانِ منصب — سونے کو سمجھ رہے ہیں پیتل

گردوں پہ جہاز اُڑ رہے ہیں — انسان زمین پر ہے پیدل

خشکی سے لبوں پہ پپڑیاں ہیں — اشکوں سے پلک پلک ہے بوجھل

کھیتوں میں تو خاک تشنہ لب ہے — دریا پہ برس رہا ہے بادل

شاید تری یاد کی ہے خوشبو — جیسے کہیں جل رہا ہو صندل

ہر زخم ہے اندمال دانش

ہر شہد سے جھانکتا ہے حنظل

☆

دُنیا کا دُوں، نہ خواہشِ دُنیا کا ساتھ دُوں — بس چل سکے تو اُن کی تمنا کا ساتھ دُوں

جس نے مری حیات کو بخشے مشاہدے　　کیوں کر نہ ایسے نام آرا کا ساتھ دُوں؟
آنکھیں یہ کہہ رہی ہیں، کناروں پہ گشت کر　　دل کا یہ فیصلہ ہے کہ دریا کا ساتھ دُوں
راہوں کے اختلاف سے منزل ہوئی ہے دُور　　امروز کو بچاؤں کہ فردا کا ساتھ دُوں؟
سو تجربوں سے آئی خرد اِس مقام پر　　دُنیا کا دُوں نہ طالبِ دُنیا کا ساتھ دُوں
یہ جا بجا حصولِ مناصب کی کشمکش　　کیا میں بھی اس قیامتِ صغریٰ کا ساتھ دُوں؟
اب دل یہ چاہتا ہے، قطاروں کو توڑ کر　　تنہا نکل چلوں، کسی تنہا کا ساتھ دُوں
منزل نہ کارواں، نہ خضر ہے نہ راہرو　　کچھ نقشِ پا ہیں، نقشِ کفِ پا کا ساتھ دُوں؟
دیوانہ ہوں یہ میری سرشتِ جنوں میں ہے　　خاکِ رہِ پیمبرِ صحرا کا ساتھ دُوں
تم میکدے میں رقصِ حسیناں پہ سَر دُھنو　　میں اُس سفیرِ عرشِ معلّیٰ کا ساتھ دُوں

دانش میں ہوں سیاستِ حاضر سے بے خبر!
فرعون کی طرف ہوں کہ موسیٰ کا ساتھ دُوں؟

☆

آمد

لالہ وگُل غم کے طاقوں میں سجانے آئے ہیں　　اس زمینِ شور کو کُندن بنانے آئے ہیں
جھکتے جھکتے رات دن کمریں کمانیں بن گئیں　　اب ہم ان سرکش مناروں کو جُھکانے آئے ہیں
اہلِ ایواں سن نہیں سکتے غریبوں کی پکار　　اس سیاسی بے شعوری کو مٹانے آئے ہیں
اب یہاں کوئی گراں گوشی کے چکر میں نہیں　　اس فضا سے دُھند کے پردے اُٹھانے آئے ہیں
جس سے مرجاتے ہیں پودے، جس سے جل جاتے ہیں پیڑ　　ہم اُنھیں بے رنگ شعلوں کو بُجھانے آئے ہیں
ہوگیا ثابت غلط ہے دینِ فطرت سے فرار　　ہم خدا کی بات بندوں کو بتانے آئے ہیں
غفلتوں نے دُور جا پھینکا تھا منزل سے ہمیں　　قوم کو آدابِ خودسازی سِکھانے آئے ہیں
شہد حنظل سے برآمد ہوگا، انگاروں سے پھول　　دار پر ہنسنے کی ترکیبیں سِکھانے آئے ہیں
قوم کو مدت میں آیا ہے شعورِ انقلاب　　سب کو یہ احساس ہے، ہوش اَب ٹھکانے آئے ہیں
سب نہیں کارِ سیاست میں زبوں حال وخراب　　وہ بھی ہیں، حِصّے میں جن کے کارخانے آئے ہیں
چلتی پھرتی قوتیں ہیں، ہم جنوں مندوں کے غول　　ہم چٹانیں توڑ کر رستے بنانے آئے ہیں

اب ہمارے فرض میں شامل ہے ترغیبِ جہاد   شاہبازوں سے مَمولوں کو لڑانے آئے ہیں
اب کوئی کھیتی نہ ہوگی خشک سالی کا شکار   اَبر کے بجرے ہواؤں پر چلانے آئے ہیں
رقص گاہیں یا چکلیں تعلیم گاہوں میں جواز   ان نئے سنگیں حصاروں کو گرانے آئے ہیں
ہم نقیبِ فکر و فن ہیں ہم امانت دارِ امن   اس کھنڈر کو اِک نئی بستی بنانے آئے ہیں
ہم میں خونِ گرم کی لہریں ابھی ہیں تازہ دم   ہم خیال و فکر کو آگے بڑھانے آئے ہیں
پی گئی ہے جو ہماری نسلِ نو کی روشنی   اُس اندھیری شب میں قندیلیں جلانے آئے ہیں

دانش اپنے ان سیاسی دوستوں کو کیا کہوں
جب بھی آئے ہیں مجھے مجرم بنانے آئے ہیں

احسان دانش اِبتدائی طور پر ادبی حلقوں میں احسان بن دانش کے نام سے جانے جاتے رہے اور بعد ازاں تمام عمر احسان دانش کے نام سے معروف رہے۔ اُنھوں نے اُس وقت کی مروجہ ہر قسم کی مزدوری کی۔ کھیتوں میں ہل چلائے، کنوؤں سے رہٹ کی مدد سے پانی نکالا، گاؤں کی چوکیداری کی۔ شہروں میں دفاتر میں چپراسی کے طور پر کام کیا، عمارتوں کی تعمیر میں ریت اور اینٹیں بھی ڈھوئیں، اپنے ہاتھ سے عمارتوں کو رنگ و روغن سے مُزیّن کیا، یہاں تک کہ لاہور میں شملہ پہاڑی پر مالی کی حیثیت سے بھی کام کیا۔ اپنے ہاتھ سے اس طرح کی مزدوری کرنا، کسی بھی شاعر اور ادیب کے لیے سوچنا بھی محال ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لاہور کے در و بام اُن کے من میں بسے رہے اَور ساتھ ساتھ شاعری بھی چلتی رہی۔ ''نور جہاں کے مزار پر'' کے عنوان سے اُن کی ایک نظم ہے:

شاہدرہ کی یہ زمیں یہ غم و عبرت کا دیار   ذرہ ذرہ ہے یہاں گردشِ دوراں کا شکار
خستگی بوڑھے خس و خار پہ ہے چھائی ہوئی   کہنگی بولتے ماحول پہ منڈلائی ہوئی
خشک مٹی پہ یہ سُوکھی ہوئی بوندوں کے نشاں   بیتتے وقت پہ دم توڑتے لمحوں کا گماں
نیلگوں دُھند کے دریا میں یہ ٹھنڈک کا رچاؤ   یہ اندھیروں کے مضافات، دُھندلکوں کے پڑاؤ
یہ زبوں حال فضا، نُور جہاں کا یہ مزار   جس کو ہر وقت ہے گھیرے ہوئے راہوں کا غبار

بے ضیا شمعِ جہانگیر اِسی خاک میں ہے

حُسن کیا، عشق کی تفسیر اِسی خاک میں ہے

یہ ابابیلوں کا مسکن یہ خموشی کا مقام وادیِ خواب میں شب رنگ اُجالوں کا قیام
لالہ و گل کا یہ مشہد یہ محبت کا حرم یہ تجلّی کے شوالے میں سیاہی کا صنم
جیسے اندوہ کی بستی غم و حرماں کا نگر رات کو جیسے کٹی فصل کے خرمن پہ نظر
واب شاہی خس و خاشاک پہ مجبورِ نیاز وقت کے غار میں یہ سنبل و ریحاں کا جہاز
رنگ و بو کا یہ جزیرہ غم و حرماں بکنار یہ حوادث کی کمیں گاہ یہ زندانِ بہار
زمزموں کا یہ بسیرا یہ خموشی کا محل سائے کی سطح یہ مغموم مصور کا عمل
سرد شعلوں کی گپھا، مردہ چراغوں کا وطن دامنِ دشت میں مہتاب کا بھرپور گہن
اُف یہ ظلمات کا ٹیلا، یہ سیاہی کی چٹان جیسے پانی سے جلے کھیت میں دہقاں کا مچان
ڈر سے سِمٹی ہوئی راتوں کی سواری جیسے شام کی پشت پہ کُہرے کی عماری جیسے
دُور پتوار سے محروم سفینے کی طرح مینہ کی بوچھار میں بیٹھے ہوئے زینے کی طرح

جانے یہ جہل افسوس ہے کہ دولت کا فراغ
آج اس قبر پہ گُل ہیں نہ مجاور نہ چراغ

سیج سے جس کی سِمٹتے تھے مہکتے ہوئے پھول اب کوئی پونچھنے والا نہیں تعویذ کی دُھول
اب مغنی کے ترانے نہ کنیزوں کی صدا سنسناتے ہوئے بے درد اَندھیرے کے سوا
دُور بستی کے چراغوں کا سماں کیا کہیے ننھے شعلوں پہ چٹانوں کا دُھواں کیا کہیے
اژدہاؤں کی طرح راستے بل کھائے ہوئے شپرکِ مہری ہر اک چاپ سے گھبرائے ہوئے

جس کو ہر صبح جگاتی تھی حسیں شہنائی
اُس کی تربت پہ مُسلّط ہے سیہ بینائی

ہر نفس دلِ مغموم پہ کرتا ہے سوال یہ ہے شاہی کا نتیجہ یہ ہے اِنساں کا مآل

یہ سکوتِ اَبدی اس پہ اَندھیرے کا جنوں
گم بیاباں میں محلات کے نغموں کا فسوں

خاک پر ڈھیر یہاں شوکتِ سلطانی ہے

خواب میں خواب کے احساس کی مہمانی ہے
''اک معما ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا''
(نقوش لاہورنمبر، صفحہ 1142)

لاہور کے گلی کُوچوں میں مزدوری کرنے والے احسان دانش کے کلام کی عظمت کے باعث اُن کے اپنے عہد کی کئی بڑی شخصیات سے گہرے مراسم تھے جن میں علامہ شبیراحمد عثمانی، علامہ سیّد سلمان ندوی، مولانا عبدالماجد دریا آبادی، مولانا نیاز فتح پوری اور مولانا ابو الاعلیٰ مودودی کا نام بھی شامل ہے۔ اُن کے نعتیہ اور حمدیہ کلام میں رُوحانیت اَور اَثرانگیزی کے عناصر نمایاں طور پر دِکھائی دیتے ہیں۔ اس حوالے سے ایک واقعہ بہت مشہور ہے۔ بہاولپور میں محفلِ سماع مُنعقد تھی جس میں ایک مشہور عالم دین مولانا احمد بہاولپوری بھی شریک تھے کہ قوالوں نے احسان دانش کی ایک شُہرۂ آفاق غزل شروع کردی جس کاایک شعر تھا:

زخم پہ زخم کھا کے جی، اَپنے لہو کے گھونٹ پی!
آہ نہ کر لبوں کو سی، عشق ہے دِل لگی نہیں

شعر جب موسیقیت سے موجزن ہوا تو مولانا صاحب پر وجد کی ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ اسی حالت میں اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

احسان دانش نے اپنی زندگی میں مختلف موضوعات پر سو سے زائد کتب تحریر کیں، جن میں اُن کی سوانحِ حیات، جہانِ دانش کے علاوہ جہانِ دِیگر، تذکرہ وتالیس، ابلاغِ دانش، تشریحِ غالب، آواز سے الفاظ تک، فعلِ سلاسل، زنجیرِ بہاراں، اُردو مترادفات، دردِ زندگی، حدیثِ ادب، لغت الاصلاح، ابرِ نیساں، میراثِ مومن جیسی بے مثال کتب بھی شامل ہیں۔ اُن کے تحریر کردہ کئی مضامین مختلف جرائد میں شائع ہوئے، وہ کسی بھی کتاب کا حصہ نہ بن سکے۔ اُن کے عہد کے بزرگ ادیبوں کا یہ بھی ماننا ہے کہ اُن کے کام کا ایک بڑا حصہ شائع ہی نہ ہوسکا۔ اُن کی خاکہ نگاری کے ضمن میں اُن کے ایک مضمون ''بشیر سے موجد تک'' میں سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ابھی چند دن ہوئے وقت گزرا ہے جب بشیر

دن رات محنت اور دیانت سے سرفراز آرٹسٹ کے پاس شاگرد کی حیثیت سے کام سیکھنے آیا تھا اور زرخرید کی حیثیت سے ناز برداری کرتا تھا، مجھے اس اُستادی و شاگردی سے جہاں افسوس ہوتا وہاں بشیر سے محبت آمیز ہمدردی بھی بڑھ رہی تھی، اُن دنوں میں علم قیافہ پر مطالعہ کر رہا تھا۔ میں جب سرفراز صاحب کے یہاں جاتا تو آہستہ آہستہ بشیر کے خدوخال پڑھا کرتا اور اپنے دل میں کہتا کہ نہ جانے کب اور کس طرح یہ لڑکا اس موجود دلدل سے نکلے گا اور عروج کب اسے آواز دے گا لیکن پھر خیال کرتا کہ خدا تو ہر شے پر قادر ہے، اُس کے یہاں کاہے کی کمی ہے وہ چاہے تو ذرے کو آفتاب بنا دے اور ممولے سے شاہین کو شکار کرا دے۔

دن سفید احرام باندھے گزرتے رہے اور راتیں کالا برقع اوڑھے آتی رہیں۔ ایک دن بشیر نے مجھ سے پوچھا میرا نام بڑا ہی عامیانہ ہے اس نام کے بے شمار آدمی دربدر ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں، میں اپنے نام کے ساتھ کون سا ٹکڑا لگاؤں کہ نام میں انفرادیت آ جائے۔ میں نے اُسی وقت اُس کے بلندی پر سفر کا آغاز محسوس کیا اور غور سے اس کے خدوخال کو پڑھ کر کہا: ''میاں تم اپنے نام کے ساتھ ''موجد'' کا اضافہ کر لو اور خود کو بشیر موجد لکھا کرو۔ وہ سٹپٹا سا گیا اور بوکھلائے ہوئے لہجے میں کہنے لگا: ''اس کے معنی تو ایجاد کرنے والے کے ہیں۔''

میں نے کہا: ''اس کی فکر نہ کرو، اس کے یہ معنی ہی تمھیں موجد بنائیں گے۔ آخر قدرت کچھ سوچ کر ہی نام دیتی ہے، آج سے تم یہ سمجھ لو کہ تم موجد ہو رہے ہو— رات دن محنت کرو اور خدا سے فضل و کرم اور بہبود کی دُعائیں جاری رکھو، وہ کسی کی محنت ضائع نہیں کرتا، ہر شخص کو اس کی آرزو اور کوشش کے مطابق دیتا ہے۔'' وہ خاموش ہو گیا۔

میں نے اُسے موجد کہنا شروع کر دیا، پہلے پہلے تو سرفراز نے قہقہہ لگایا

پھر وہ خود بھی اُسے موجد کے نام سے پکارنے لگے، جب پہلے دن اُسے سرفراز نے مُوجد کے نام سے پکارا تو میں نے کہا: ''برخوردار اب تم موجد ہوگئے، اُستاد تمھیں موجد کے نام سے پکار رہے ہیں۔''

اس کے بعد موجد نے اپنے فن کی تحصیل کے لیے خون پانی ایک کر کے رکھ دیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے یہ آرٹ کے علاوہ کسی کام کے لیے پیدا نہیں ہوا۔

بہت دن نہیں گزرے کہ لاہور میں اس کے ڈیزائنوں کی شہرت وبا کی طرح پھیل گئی اور بڑے بڑے آرٹسٹ اسے حیرت کی نظر سے دیکھنے لگے۔ رسالوں، اخباروں اور کتابوں میں اس کے شاہکار قدم قدم پہ نظر سے گزرنے لگے، اچھے اچھے رسالے والے موجد کی جستجو میں سرگرداں رہتے اور کتابوں والے اسے کھوجتے پھرتے تھے، آج وہ بفضلہٖ تعالیٰ لاہور جیسے شہر میں اپنی دھج کا ایک ہی آرٹسٹ ہے۔

موجد کے فن کا ظاہر و باطن تقلید اور نقالی کا رسیا نہیں، وہ روایات کو قائم رکھتے ہوئے جدید نظریات کو صفحۂ قرطاس پر اس طرح اُبھارتا ہے کہ انجان اور جانکار دونوں داد و تحسین پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ وہ جانتا ہے کہ تقلید فن کار کے لیے ایسا خطرناک راستہ ہے جو ڈھلوان سے نشیب میں اُترتا ہی چلا جاتا ہے اور چاند سورج کی روشنی روز بروز پردہ کرتی چلی جاتی ہے، آخر وہ پاتال میں اُتر جاتا ہے جہاں سے واپسی کی ہمت نہیں ہوتی، آخر وہ پستیوں ہی کو فن میں داخل کر لیتا ہے اور روشنی میں رہنے والی مخلوق کے نظامِ حیات اور حسنِ عمل سے اُسے کوئی واسطہ نہیں رہتا، اُس کے قلم سے زندہ رہنے والا آرٹ تخلیق نہیں ہوتا لیکن وہ اُسے بھی آرٹ کا نام دیتا ہے اور پستی کے باشندے اُسے بڑا آرٹسٹ کہنے لگتے ہیں۔

عموماً ایسے لوگ خود فریبی، فن فروشی اور کوتاہ قلمی کے مریض ہو جاتے

ہیں اور رفتہ رفتہ اُن کی تخلیقات ہی اُنھیں فن بدر کر کے لوگوں میں حقیر کر دیتی ہیں اور پھر وہ راستوں میں شیشے کے میلے ٹکڑوں کی طرح پڑے نظر آتے ہیں۔

موجد یہ اچھی طرح جان گیا ہے اور اس کے دل و دماغ پر یہ مُنکشف ہوگیا ہے کہ آرٹ ایک زندۂ جاوید تہذیبی یادگار اور ثقافتی مقصد ہے جسے کوئی صحیح فنکار نظر انداز نہیں کرسکتا، زندگی کے تغیرات اور عمر کے انقلابات کے باوصف ہر حال میں اس کی حفاظت فرض قرار پا جاتی ہے۔

اُسے خبر ہے اور اس کی عمر کے تجربات و مشاہدات نے اُسے بتا دیا ہے کہ شاعری اور مُصوّری ہی حیات کے گھروندوں کو مذہب اور علوم کے ایوانوں تک لے جاتی ہے کیونکہ یہ دونوں فن جابروں سے آنکھیں ملا کر بات کرنا سکھاتے ہیں، اُنھیں سے اجتماع کو افرادنوازی کا درس ملتا ہے جس سے ہر فرد اجتماع کا ممنون بھی ہوتا ہے اور شریکِ جہد بھی اور یہ زندگی کا چکر صدیوں سے اسی انداز پر چل رہا ہے۔ موسموں کے اثرات اس پر ضرور ہوتے ہیں، کوئی موسم ہو آرٹ کی تخم ریزی کو خراب نہیں کرسکتا۔

بشیر موجد پہلے بھی نقالی کا قائل نہیں تھا، نظریے اور تقلید کو تکرارِ قبیح کہتا ہے اور اسے فنکار کی توہین خیال کرتا ہے اور شخصیت پر کلنک کا ٹیکا!!

اس فنکار کے لیے تو یہ تکرار ایک داغ رسوائی سے کسی طرح کم نہیں جو اپنی انفرادیت میں پھلنے پھولنے اور پھیلنے بڑھنے کی ایمان افروز آرزو کو پیدا ہوا ہو۔ لاہور میں فنکاروں کی کمی نہیں اور ہر دور کے مختلف فنکار اپنی اپنی جگہ نئی بات پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن کامیاب بہت کم ہوتے ہیں، عموماً ہاتھوں سے ناکافی پسینہ پونچھتے دیکھا گیا ہے۔

یہ بھی نظر سے گزرا ہے کہ جو فنکار عمر میں کم ہوتا ہے، وہ اُستاد سے زیادہ شہرت پا جاتا ہے۔ اصل میں وہ اس کی ایجاد تخلیق یا ذہانت کی بات نہیں بلکہ اس کی ابتدا چونکہ پیشروؤں کے منفی شباب اور نِکھرتے ہوئے اُصولوں سے ہوتی ہے اس لیے وہ آخر میں اُستاد کہلانے لگتا ہے اور اساتذہ قدیم اللہ کو پیارے ہو جاتے ہیں۔ اس بات کو وہ فنکار خود بھی اچھی طرح جانتا ہے لیکن داد وتحسین سے بھٹکانے والے تیسرے درجے کے لوگ اسے غیر فِطری، غلط اور نامناسب دعووں پر مجبور کر دیتے ہیں۔ پھر وہ ماضی کے فن کاروں کو نظرانداز کر کے اپنی گُمراہ ذہنیت اور بھٹکی ہوئی انسانیت کو اور یجنیلیٹی کہنے لگتا ہے اور یہ وہ تخریبی مغالطہ ہے جس کی دلدل سے اُبھرنا دشوار نہیں ناممکن ہے۔''

(نقوش سالنامہ، جون 1985ء، شمارہ 132)

احسان صاحب کی شخصیت اور زندگی پر ایک انتہائی مُفصّل مضمون محمد وارث کامل نے تحریر کیا۔ یہ مضمون نقوش شخصیات نمبر میں بھی چھپا۔ اس مضمون میں مصنف نے اُن کی زندگی کے کئی چھپے ہوئے رُموز سے عوام الناس کو آشنائی کروائی۔ اسی مضمون میں سے ایک اقتباس درج ذیل ہے جس میں احسان دانش کی زندگی کے بارے میں کئی دلچسپ معلومات ملتی ہیں:

''احسان صاحب نقش پرست تو بے شک ہیں، نفس پرستی کے داغ سے اُن کا دامن کبھی داغدار نہیں ہوا۔ حُسن چاہے پھول کی پتی میں ہو چاہے گھاس کے تنکے میں، احسان صاحب کو اس سے فِطرتی اور جذباتی لگاؤ ہے۔ موسیقی، مصوری، باغبانی، مجسمہ سازی ایسے ذوقی مشاغل سے بھی آپ کی دلچسپیاں وابستہ ہیں۔ احسان صاحب حد درجہ آزاد خیال واقع ہوئے ہیں لیکن یہ آزاد خیالی دِینی بے راہ روی کا نتیجہ نہیں بلکہ پُختہ یقینی کا ثمرہ ہے۔ اُن کے ظاہر پر رند مشربی کا گمان ہوتا ہے لیکن اُن کا باطن ایمان وعرفان کا گنجینہ ہے۔ قریب کے مطالعہ سے مجھے یہ اندازہ ہوا کہ احسان صاحب ایک زاہدِ مرتاض بھی ہیں اور ایک عابدِ

شبِ زندہ دار بھی۔ خواب اور بیداری پر اُنھیں بلا کی قدرت ہے۔ جب اور جس جگہ اُن کا دل چاہے سو رہتے ہیں اور پھر اپنی مرضی اور اپنے اختیار سے بیدار بھی ہو جاتے ہیں کرسی پر بیٹھے بیٹھے، راستہ چلتے چلتے باتیں کرتے کرتے احسان صاحب نیند کے سمندر میں ڈُبکیاں لگاتے ہیں بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اس سمندر کے اچھے خاصے تیراک ہیں۔ رات کو جب ساری دُنیا خراٹے لیتی ہے تو احسان صاحب کے کاروبارِ شوق کا دفتر کُھلتا ہے۔ حقیقت میں بات بھی یہی ہے کہ دُنیا میں جس نے بھی کچھ پایا ہے، شب بیداری سے پایا ہے۔ دن کی ہنگامہ خیز مصروفیتوں میں ذہن کی گرہیں کچھ اُلجھی ہوئی سی رہتی ہیں اور انسان کوئی دماغی کام نہیں کرسکتا۔ ٹھیک کہا ہے کسی نے ؎

جب پچھلے پہر کا سناٹا آلودۂ شبنم ہوتا ہے
اُس وقت حقائق کھلتے ہیں، ہر چیز نظر بن جاتی ہے

احسان صاحب کی زندگی کا انداز کچھ اتنا سادہ رہا ہے کہ اُنھیں آج تک قرض لینے کی نوبت نہیں آئی۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ وہ آج تک کسی تجارت میں کامیاب نہیں ہو سکے کیوں کہ اس دور میں جتنے بھی کاروبار ہیں وہ قرض کے بل چلتے اور پھلتے پھولتے ہیں۔ مکتبۂ دانش جس سے بظاہر اُن کی معاشی زندگی وابستہ ہے، اس سے اتنی یافت نہیں ہوتی کہ یہ اپنا گُذر بسر کرسکیں بلکہ میں جہاں تک سمجھتا ہوں یہ مکتبۂ دانش دل کا بہلاوا ہے یا دوسرے لفظوں میں اسے چند احباب کی نشست گاہ کہہ لیجیے۔ مکتبہ دانش کی کتابیں غالباً مالِ وقف ہیں۔ اس لیے کہ دیکھنے میں آیا ہے کہ اکثر کتابیں اُٹھا لی جاتی ہیں اور اُن کے گرد پوش باقی رہنے دیے جاتے ہیں۔''

جب جہانِ دانش منظرِ عام پر آئی تو آغا شورش کاشمیری نے، جو اُس وقت ہفتہ وار ''چٹان'' کے ایڈیٹر تھے، تحریر کیا:

اس عشرے میں برعظیم کے مشہور عوامی شاعر حضرت احسان
دانش کی سوانح عمری جہانِ دانش کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ یہ سوانحِ
حیات کے معروف سائز پر ایک ضخیم اور دلآویز داستان ہے۔ تقریباً
ساڑھے سات سو صفحات ہیں— ایڈیٹر ''چٹان'' نے تمام رات جاگ
کر بالاستعیاب مطالعہ کیا۔ اس مطالعہ کے سحر کا نتیجہ اشعارِ ذیل ہیں:

گزشتہ شب تخلیہ میں بیٹھا میں پڑھ رہا تھا جہانِ دانش
مطالعہ کی بلندیوں پر کھلا ہوا تھا، بیانِ دانش
حکایتِ دل قلم کی آواز سے بلاغت میں ڈھل گئی ہے
زمینِ اُردو کی رفعتوں میں شریک ہے آسمانِ دانش
دماغ و دل کی لگن ہو سچی تو خود مشیّت بھی ساتھ دے گی
بتا گئی اک طویل صحبت میں کل مجھے داستانِ دانش
اَدب کے موتی سخن کی گنگا میں ڈوب کر اِس طرح نکالے
ہر اک ورق گنجِ شائگاں ہے ہر ایک رُخ پر نشانِ دانش
اسے ی تک زبانِ اُردو کے معرکے سر اُٹھا رہے ہیں
غُبارِ خاطر کہ عُودِ ہندی کا لخلخہ ہے زبانِ دانش
جہانِ دانش میں آپ کوئی غلط روایت نہ پا سکیں گے
بہ قولِ عبدالعزیز خالد گراں بہا ہے دُکانِ دانش
شفیق کوٹی نے تبصرے کی اَساس پر یہ لکھا ہے شورش
کہ تشنگانِ شرابِ اُردو کا میکدہ ہے مکانِ دانش

18 جون 1973ء

(کلیاتِ شورش کاشمیری، صفحہ 1531)

احسان دانش کو اُن کی بے مثال خدمات کے صلے میں 22 مارچ 1978ء کو سرکارِ پاکستان کی جانب سے تمغۂ امتیاز سے نوازا گیا۔ اس اعزاز کے چار برس بعد آپ 22 مارچ ہی کے روز 1982ء میں جہانِ فانی سے کوچ کر گئے۔ اُنھیں قبرستان میانی صاحب میں

حضرت طاہر بندگیؒ کے مزار کے دروازے کی جانب دفنایا گیا۔ عشق محمدیؐ میں سرشار احسان دانش کی قبر کا کتبہ اسی عشق کی غمازی کرتا ہے، جس پر یہ عبارت رقم ہے:

یا اللہ — بسم اللہ الرحمن الرحیم — یا محمد

لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ

مزار

شاعرِ مزدور

حضرت احسان دانش

مریدِ خاص حضرت حافظ تفضّل حسینؒ

(معروف بہ بھگرے والے پیر)

تاریخِ وفات 22 مارچ 1982ء

دانش، میں خوفِ مرگ سے مُطلق ہوں بے نیاز
میں جانتا ہوں موت ہے سنت حضورؐ کی

حمید نظامی

1915ء-1962ء

جہاں بھی نظم عوامی کو دیکھتا ہوں میں
وہیں حمید نظامی کو دیکھتا ہوں میں
حفیظ جالندھری

اُردو صحافت کا ذکر نوائے وقت کے بغیر ادھورا تصور کیا جائے گا اور نوائے وقت کا نام حمید نظامی کے ساتھ لازم آئے گا۔ حمید نظامی 3 اکتوبر 1915ء کو لائل پور (موجودہ فیصل آباد) سے کچھ دور سانگلہ ہل کے علاقے میں پیدا ہوئے۔ اُنھوں نے میٹرک تک تعلیم لائل پور میں حاصل کی۔ 1932ء میں اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور میں داخلہ لیا اور یہیں سے بی اے کیا۔ پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے انگریزی کی ڈگری حاصل کی۔ اُس وقت ہندوستان بھر میں سیاست کا دور دورہ تھا۔ حمید نظامی نے اسلامیہ کالج کے زمانے سے عملی سیاست میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ وہ اِس کالج کی سٹوڈنٹس یونین کے جنرل سیکرٹری منتخب ہوئے اور بعدازاں مسلم لیگ سے وابستگی کے باعث مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن پنجاب کے صدر منتخب ہوئے۔

1940ء میں تعلیم سے فراغت کے بعد اُنھوں نے پندرہ روزہ ''نوائے وقت'' جاری کیا۔ مسلم لیگ اُن کی سیاست کا مرکز تھا۔ اُنھوں نے 1938ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے تاریخی مرکزی اجلاس میں شرکت کی۔ پندرہ روزہ ''نوائے وقت'' کچھ ہی عرصے میں ہندوستان میں عوام، مسلم لیگ اور قائداعظم کی زبان بن گیا۔ 1942ء میں ''نوائے وقت'' پندرہ روزہ سے ہفتہ روزہ میں تبدیل ہوگیا۔ حمید نظامی نے اپنی محنت جاری رکھی اور 22 جولائی 1944ء وہ تاریخی دن تھا جب ''نوائے وقت'' روزنامہ میں تبدیل ہوگیا۔

1946ء-1945ء کے عام انتخابات میں مسلم لیگ کی بڑی کامیابی کے پیچھے حمید نظامی کی صحافت کا ایک خاص کردار تھا۔ قائداعظم نے مسلم لیگ کی تمام تر صحافتی ذمہ داریاں حمید نظامی کے کندھوں پر ڈال رکھی تھیں۔ حمید نظامی کی زندگی اور کردار پر ایک مضمون آغا شورش نے تحریر کیا جو کہ نقوش شخصیات نمبر میں چھپا، اس میں سے ایک اقتباس درج ذیل ہے:

''اس کو بڑا بننے کا شوق شروع سے تھا، اس کی طبیعت کے دروازے ادب و سیاست دونوں کے لیے کھلے تھے، ابتداً جرائد و رسائل میں لِکھتا رہا۔ ''شیرازہ'' ''ہمایوں'' اور ''ادبی دُنیا'' میں طبع زاد افسانے، ہلکے پھلکے مضامین اور خاکے لکھے۔ کئی تراجم بھی چھپے، آخر کار اس کی طبیعت کا ایک رُخ بن گیا، ادھر سیاسیات کا ایسا چسکا پڑا کہ بہ عہدِ طالب علمی 1937ء میں مسلمان طلبہ کی سٹوڈنٹس فیڈریشن کا سنگِ بنیاد رکھا، اور صدر منتخب ہوگیا۔ 1939ء میں صدارت سے علیحدگی اختیار کرلی۔ پھر 1940ء میں قائداعظم کے ایما اور دوستوں کے اصرار پر صدر بن گیا۔ اسی اثناء میں کالجوں کے مباحثوں میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ زبان پر قابو تھا، خیالات تقریباً منجھ چکے تھے، بیسیوں مباحثوں میں شرکت کی اور کوئی پندرہ کے قریب انعامی کپ بھی حاصل کیے۔ لاہور سے علی گڑھ تک مار کی، جہاں گئے کامیاب لوٹے۔ 1940ء میں ایم اے کیا تو معیشت کا سوال سامنے تھا۔ کئی راہیں کھلی تھیں لیکن طبیعت کا میلان صحافت کی طرف تھا۔ اُنھیں دنوں اپنے ایک دوست کے لیے جو آئی سی ایس کا امتحان دے رہے تھے، ادبیاتِ اُردو کا چار سوصفحات کا ایک خلاصہ تیار کیا جو ایک معروف پبلشر کو پسند آ گیا اُس نے قیمتاً خرید لیا۔ اپنے نام سے چھاپا۔ چنانچہ اب تک اس کے کئی ایڈیشن فروخت ہو چکے ہیں۔

23 مارچ 1940ء کو ہفتہ وار'' نوائے وقت'' نکالا جو پہلے ایک فکری پندرہ روزہ تھا۔ 22 جولائی 1944ء کو قائداعظم کی ''تحریک'' اور

''آشیر باد'' سے روزنامہ ہوگیا۔ پاکستان کے لیے نوائے وقت نے جو کچھ کیا مخفی نہیں۔ ہر کہ دمہ کو معلوم ہے، تین چار برس ہی میں اُن کی شہرت کا مطلع روشن ہوگیا۔اس سے پہلے صحافت کا مزاج زیادہ تر ادبی تھا، مسلمانوں میں صحافی شاذ اور انشا پرداز عام تھے۔ایک ایڈیٹر کے لیے شاعر و ادیب ہونا ضروری ہوتا تھا، نوائے وقت نے اس سنت سے اعراض کیا۔ جو لوگ اُردو اخبار نویسی کو شعر و انشا کی چیز سمجھتے تھے یا جنھیں انگریزی میں دستگاہ کے باعث اُردو اخبار نویسی کا وجود ہی اضافی نظر آتا تھا، نوائے وقت نے ان کے خیالات کی نفی کی اور اخبار کو صرف اخبار کی حیثیت سے پیش کیا۔

انگریزی کی برتری نے انگریزی خوانوں کو اُردو اخبارات سے بے تعلق کر رکھا تھا، اور مشرقی مزاج کے معدودے چند انگریزی خوان بھی اُردو اخبار اداریوں کی خاطر پڑھتے تھے، نوائے وقت نے اس ذہنیت کو یکسر بدل ڈالا اور اب غالباً نوائے وقت پہلا روزنامہ ہے جو پاکستانی انگریزوں میں بھی خوف یا شوق سے پڑھا جاتا ہے۔ ہمارے ملک کی سیاست میں اس کا وجود ناگزیر ہوگیا ہے، اس کے حامی و مخالف گالی دینے یا تعریف کرنے کے لیے اس کو ضرور پڑھتے ہیں۔ اُس کی بنیادی خوبی یہ ہے کہ وہ مُلکی سیاست میں مسائل تخلیق کرسکتا اور بسا اوقات ایسے موضوع پیدا کر لیتا ہے جن پر نقد و نظر اور تنقید و تنقیص کی ایک عام بحث شروع ہو جاتی ہے — جس سے ایک خاص ذہن مترشح ہوتا ہے اور مرحوم پنجاب کے اضلاع میں اس ذہن کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

''نوائے وقت'' اور حمید نظامی لازم و ملزوم ہیں۔ دونوں کی شخصیت ایک دوسرے میں پیوست ہے، ایک کی نفی سے دوسرا اُبھر نہیں سکتا۔ اس کی اپنی پسند و ناپسند بھی شدید ہے بلکہ سنگین، اسی طرح اس کے

مخالف و موافق بھی، افراط و تفریط پر ہیں۔ اس کے مخالفوں کی سب سے بڑی تعداد اسی کے طبقے میں ہے۔ اس کا واحد جرم یہ ہے کہ وہ ان کے طبقے کا ہو کر ان سے آگے نکل گیا ہے۔ اس کے اداریوں میں طوالت نام کو نہیں ہوتی۔ چھوٹے چھوٹے فقرے اور لگی بندھی بات۔ ''سرِ راہے'' (فکاہی کالم) کی ادبی حیثیت محل نظر ہوسکتی ہے لیکن اس میں ایک ہلکی سی چوٹ ضرور ہوتی ہے جس سے ضارب و مضروب دونوں لطف لیتے ہیں۔

اکثر لوگوں میں اس کے متعلق یہ خیال عام ہے کہ وہ مغرور ہے لیکن وہ مغرور نہیں، صرف رکھ رکھاؤ کا عادی ہے، عام لوگوں میں غلط ملط نہیں ہوتا۔ اس کا خیال ہے کہ ہر انسان اس قابل نہیں ہوتا کہ اس سے ''رسم و راہ'' پیدا ہو— جو لوگ کسی نہ کسی وجہ سے عام ہو جاتے ہیں وہ تبرک کی طرح تقسیم ہو کر اپنی عزت کھو بیٹھتے ہیں۔

وہ ان تھڑولوں میں بیٹھنے کے بجائے ان کی گالی کھانے میں عزت کو زیادہ محفوظ سمجھتا ہے۔

اور حمید نظامی کی ساری تصویر، الفاظ کے انھی نسخ یا نستعلیق جوڑوں میں ہے۔''

(نقوش، شخصیات نمبر، صفحہ نمبر 1226)

قیامِ پاکستان کے بعد وہ خواب چکنا چُور ہو گئے جو برِصغیر کے مسلمانوں نے دیکھے تھے۔ اس لیے حمید نظامی کا وہ قلم جو قیامِ پاکستان کے لیے نبرد آزما رہا، قیام پاکستان کے بعد ظلم و ستم کے خلاف چلتا رہا۔ اس تناظر میں پاکستان کے پہلے وزیر اعظم لیاقت علی خان کی پالیسیوں کے باعث حمید نظامی کے اختلافات شروع ہو گئے۔ اس وجہ سے ایک سرد جنگ نے جنم لیا اور وہ اخبار جس کا قیامِ پاکستان میں ایک خاص کردار تھا، اُس کا ڈکلیریشن ممتاز دولتانہ نے منسوخ کر دیا اور نوائے وقت بند ہو گیا۔ لیکن حمید نظامی کے نظریات میں کوئی تبدیلی نہ آسکی۔ معاملات یہیں پر ختم نہ ہوئے۔ اس کے بعد اس وقت کے وزیرِ اطلاعات خواجہ شہاب

الدین مختلف طریقوں سے ہراساں کرتے رہے۔ اس تمام منظر نامے کے بعد اُنھوں نے 9 جون 1950ء کو ایک تحریر میں اپنا جواب یوں قلم بند کیا:

''آپ کسی لالچ، ترغیب و غنڈہ گردی کے ذریعے مجھے حق بات کہنے سے نہیں روک سکتے۔ مجھے اپنی رائے تبدیل کرنے پر مجبور نہیں کرسکتے ہیں۔ میں قلم کی عصمت کو ماں بہن کی عصمت سے کم تصور نہیں کرتا۔ میں پھانسی پر لٹک جانے کو ضمیر کا سودا کرنے پر ترجیح دوں گا۔ یہ جنس کسی اور بازار میں بکتی ہے۔ میں آپ کے ظلم وستم اور سیفٹی ایکٹ کی تلوار سے ڈر کر سیاہ کو سفید اور گھوڑے کو گدھا نہیں لکھ سکتا۔ نوائے وقت کوئی بازار میں پڑی ہوئی بکاؤ چیز نہیں، جس کو آپ بے پناہ وسائل سے خرید سکیں۔ اگر اس حق اور سچ کی پالیسی کو تلوار یا بندوق سے بدلا جاسکتا ہوتا تو آج میرا سر آپ کے قدموں میں ہوتا۔ یہ سر کٹ تو سکتا ہے مگر غیر اللہ کے سامنے جھک نہیں سکتا۔ جابر سلطان کے سامنے کلمہ حق کہنا میرا ایمان ہے اور اصول ہے اور میں اپنے ایمان اور اصول سے انحراف نہیں کرسکتا۔''

حمید نظامی کی حق گوئی اور اصول پسندی کا زمانہ معترف تھا۔ اسی تناظر میں ان کا ایک مکتوب نقل کیا جارہا ہے جو اُنھوں نے تاجور نجیب آبادی کو تحریر کیا تھا:

مشفقی ومخدومی زاد لطفکم! سلام مسنون

گرامی نامہ ملا یاد آوری کے لیے شکریہ۔

خدا جانے سلیم شمیمی صاحب نے آپ سے کیا کہا؟ انکسار کے طور پر نہیں حقیقت عرض کرتا ہوں کہ میں نے کچھ زیادہ نہیں کیا۔ مرحوم اظہر کے حالات کو میں جانتا تھا۔ مجھے علم ہے کہ اُن کی موت کے بعد اُن کے پس ماندگان کا کیا حال ہے، اس لیے اگر میرے کلمہ خیر کہہ دینے سے اُن کی کوئی مدد ہو جائے تو میں اس نیکی سے کیوں محروم رہوں۔

اظہر صاحب کی زندگی میں بھی میری اُن سے کوئی عداوت نہ تھی، وہ

مجبور تھے اور موت کے بعد تو کوئی اختلاف باقی ہی نہیں رہتا۔ خدا مرحوم کی مغفرت کرے۔

اگر آپ یہ نہ بھی لکھتے کہ خط ذاتی ہے تو میں ہرگز اسے شائع نہ کرتا، اخبار میں اپنی تعریف میں خط چھاپنا بڑی بدمذاقی سمجھتا ہوں۔ اُمید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔

طالب دعا

مخلص حمید نظامی

حمید نظامی کی حق گوئی کے باعث اُنھیں پہلے مارشل لا میں بھی حکومتی دھونس کا سامنا رہا جو اسکندر مرزا نے لگائی تھی۔ بنیادی طور پر وہ کیمونزم کے مخالف اور سرمایہ دارانہ نظام کے حامی تھے لیکن مارشل لا کو ''سیاہ رات'' ہی تحریر کرتے تھے۔ حمید نظامی 25 فروری 1962ء کو 47 برس کی عمر میں انتقال کر گئے۔ اُن کی وفات کے بعد نوائے وقت نے ''حمید نظامی میموریل سوسائٹی'' کا آغاز کیا۔ یہ سوسائٹی اپنے سالانہ اجلاس کا باقاعدگی سے انعقاد کرتی ہے۔ انگریز عہد کی ایک سڑک ''لارنس روڈ'' کا نام تبدیل کر کے ''حمید نظامی روڈ'' رکھ دیا گیا باوجود اس امر کے کہ یہ عام نہ ہو سکا، لیکن سرکاری کھاتوں میں یہی نام درج ہے۔ اُن کی یاد میں آغا شورش کاشمیری نے ایک نظم ''بیادِ حمید نظامی'' تحریر کی:

ہمیشہ تذکرہ کرتے ہیں سب پیر و جواں اُس کا
قلم تھا جرأتِ اظہار میں شعلہ فشاں اُس کا
بہ اسلوبِ نگارش لالہ و گل مسکراتے تھے
کوئی ہمسر نہ پیدا کر سکی اُردو زباں اُس کا
بلا کی سادگی اِس میں، غضب کی دِلکشی اِس میں
ڈھلا تھا کہکشاں کے روپ میں طرزِ بیاں اُس کا
ہر اک اُفتاد سے لڑتا رہا سینہ سپر ہو کر

رہے گا ملک کی تاریخ میں نام و نشاں اُس کا
ہمیشہ سرخ رُو اُٹھا ، ہمیشہ کامراں نکلا
شدائد نے لیا ہر معرکہ میں امتحاں اُس کا
اِسی باعث تو اربابِ سیاست اُس سے ڈرتے تھے
خدا کے خوف سے لبریز تھا قلبِ تپاں اُس کا
وہ رُخصت ہوگیا تو اک خلا محسوس ہوتا ہے
کوئی ملتا نہیں اب اس چمن میں ترجماں اُس کا
نوائے وقت کو لہجہ کی تابانی مبارک ہو
ہمیشہ درپئے آزار ہے دورِ زماں اُس کا
مجھے اپنے قلم کی جرأتوں پر ناز ہے شورش
مگر اہلِ صحافت میں کوئی ثانی کہاں اُس کا

(کلیاتِ شورش کاشمیری، صفحہ 1799)

اُنھیں لاہور میں قبرستان میانی صاحب میں دفن کیا گیا۔ اُن کی قبر کے کتبے کا تذکرہ پروفیسر اسلم نے اپنی کتاب ''خفتگانِ خاکِ لاہور'' میں صفحہ 203 پر کیا:

''حمید نظامی کا آبائی وطن سانگلہ ہل تھا۔ اُن کی تعلیم و تربیت اسلامیہ کالج لاہور اور پنجاب یونیورسٹی میں ہوئی۔ اُنھیں نوعمری سے ہی صحافت کا شوق تھا۔ اسلامیہ کالج میں زمانۂ طالب علمی کے دوران میں مرحوم کالج کے مُجلے ''کریسنٹ'' کے نائب مدیر مقرر ہوئے۔ مارچ 1940ء میں اُنھوں نے پندرہ روزہ نوائے وقت جاری کیا جو بہت جلد روزنامے کی شکل اختیار کر گیا۔ اس اخبار نے تحریک پاکستان کو کامیاب بنانے کے لیے بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد حمید نظامی مرحوم نے انتہائی جرات کے ساتھ حکمرانوں کی غلط پالیسیوں کو ہدفِ تنقید بنایا۔ اسی بنا پر نوائے وقت حزبِ اختلاف کا ترجمان کہلانے لگا تھا۔

اُن کی لوحِ مزار پر یہ عبارت رقم ہے:

یا اللہ　　　　بسم اللہ الرحمن الرحیم　　　　یا محمد

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہ

آخری آرام گاہ

حمید نظامی

مدیر و بانی روزنامہ نوائے وقت

تاریخ پیدائش: 3 جنوری 1915ء

تاریخ وفات: 25 فروری 1962ء

بمطابق 19 رمضان المبارک 1381ھ بروز اتوار

عقیدہ و تعلیم: ''جابر سلطان کے سامنے کلمۂ حق کہنا بہترین جہاد ہے''۔

احمد ندیم قاسمی

1916ء-2006ء

ندیم، کوئی مرے فن کا اجر کیا دے گا
میں خاک چاٹ کے بھی نشۂ ہُنر میں رہوں
ندیم

تقسیم کے بعد پاکستان میں اُردو ادب کے حوالے سے جو مُعتبر ترین نام دِکھائی دیتے ہیں، اُن میں ایک نام احمد ندیم قاسمی کا بھی ہے۔ قاسمی صاحب کا جنم 20 نومبر 1916ء کو پنجاب کی ایک تحصیل خوشاب کے نواحی علاقے اَنگہ میں ہوا۔ خوشاب کے اس علاقے کو وادیِ سون سکیسر کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اُن کے والد کا نام پیر غلام نبی تھا۔ اُنھوں نے اپنے بیٹے کا نام احمد شاہ رکھا۔ احمد شاہ ابھی صرف آٹھ برس کے تھے کہ پیر غلام نبی انتقال کر گئے۔ اُن کے انتقال کے بعد احمد شاہ کا اپنی والدہ سے ایک گہرا رشتہ بنتا گیا اور اس کی گہرائی وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مزید گہری ہوتی گئی۔ اُن کی والدہ محنت مزدوری کرتی رہیں اور احمد شاہ کی تعلیم و تربیت کے لیے تکلیفیں بھی اُٹھاتی رہیں۔ احمد شاہ کی ادبی زندگی کا آغاز اُن کی والدہ کی گود ہی سے ہوگیا تھا۔ روایات میں ہے کہ اُنھیں معراج نامہ، نُور نامہ، وفات نامہ اور پنجابی صوفی شعرا حضرت سُلطان باہوؒ اور میاں محمد بخشؒ کے کلام کا ایک بڑا حصہ زبانی یاد تھا اور یہ عارفانہ کلام احمد شاہ اپنی والدہ کی رفاقت میں از بر کر چکے تھے۔

قرآنِ مجید کی تعلیم اُنھوں نے اَنگہ کی ایک مقامی مسجد سے حاصل کی اور پرائمری کا امتحان اَنگہ پرائمری سکول سے نہ صرف پاس کیا بلکہ وظیفہ بھی حاصل کیا۔ آٹھویں جماعت کا امتحان گورنمنٹ مڈل اینڈ نارمل سکول، کیمبل پور سے پاس کیا۔ آٹھویں جماعت میں ریڈ

کراس کے زیرِ نگرانی ہونے والے مقابلہ مضمون نویسی میں احمد شاہ، پورے پنجاب میں اوّل آئے۔ کہا جاتا ہے کہ احمد شاہ آٹھویں جماعت تک ایک مکمل نظم کہہ چکے تھے۔ آٹھویں کے بعد اُنھوں نے گورنمنٹ ہائی سکول شیخوپورہ سے 1931ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ 1931ء ہی میں اُنھوں نے مولانا محمد علی جوہر کے انتقال پر ایک نوحہ لکھا جو لاہور کے ایک روزنامہ ''سیاست'' میں چھپا۔ میٹرک کے بعد احمد شاہ بہاولپور چلے گئے اور وہاں 1935ء میں صادق، ایجرٹن کالج سے بی اے کا امتحان پاس کیا۔ کالج کے ایام کے بارے میں اُن کے ایک دوست محمد خالد اختر نے اپنے ایک مضمون میں کچھ اس طرح تحریر کیا:

> ''میں فرسٹ ایئر کا طالب علم تھا، وہ تھرڈ ایئر کا۔ مگر خوش قسمی سے ہم ایک ہی پروفیسر کے گروپ موسوم بہ ''سولجرز'' میں شامل تھے۔ سولجرز کے اجلاس ہر ہفتے ہمارے پروفیسر کی صدارت میں ہوتے تھے۔ ندیم جو اُس وقت احمد شاہ ندیم تھا، سولجرز کے اجلاسوں میں اپنی نئی نئی نظمیں سنایا کرتا۔ اُن نظموں میں ایک نئی نغمگی، تازگی اور اُجلا پن ہوتا تھا اور ہم اُس کے جادو تلے آ گئے تھے۔ یہ گٹھے جُثّے کا فراخ رُو دیہاتی نوجوان ایک فِطری شاعر تھا اور اُس وقت بھی ہم اُس سے مستقبل میں بڑی چیزوں کی توقع رکھتے تھے اور ہمیں یقین تھا کہ وہ شعر و ادب کی دُنیا میں اپنا مقام حاصل کرے گا۔ وہ اپنے پروفیسر کا چہیتا طالب علم تھا اور فورتھ ایئر میں آ کر ''سولجرز'' گروپ کا سیکرٹری بن گیا تھا اور کالج میگزین ''نخلستان'' کے اُردو حصّے کا ایڈیٹر بھی! اَدب سے ہمارا سانجھا شغف رفتہ رفتہ ہمیں ایک دوسرے کے قریب لے آیا اور جلد ہی ایک ایسی گہری جذباتی اور دِلی وابستگی کی بنیاد بن گیا جو اوائلِ جوانی میں ہی ممکن ہے اور زندگی کی حسین ترین چیزوں میں سے ایک ہے۔ تقریباً ہر شام کو میں ندیم کے ہاسٹل کے مانیٹر والے بالائی کمرے میں ہوتا۔ وہ مجھے اپنی اُس روز کی نظم سناتا اور میں کبھی کبھار اُسے اپنی لکھی ہوئی کسی مُہماتی کہانی کا حصہ سناتا۔''

احمد شاہ نے اپنے لیے ''ندیم'' تخلص اختیار کیا اور اپنے پردادا محمد قاسم کی نسبت سے قاسمی کی اضافت کو اپنے نام کا مستقل حصہ اس طرح بنایا کہ تمام عمر قاسمی صاحب کے نام ہی سے لکھے اور پکارے گئے۔ احمد شاہ نے اپنے نام میں اضافت کو اپنی ذات کے لیے بھی بہتر جانا کیونکہ آج کل ہمیں تجارتی بنیادوں پر لکھنے والے طرح طرح کے شاہ دِکھائی دے رہے ہیں۔

احمد ندیم قاسمی اختر شیرانی کے بہت بڑے مداح تھے۔ اُنھوں نے جب 1936ء میں اپنا پہلا افسانہ ''بدنصیب بُت تراش'' تحریر کیا تو وہ اختر شیرانی ہی کے ادبی جریدے، رسالہ ''رومان'' میں شائع ہوا۔ اس افسانے نے بطورِ نثر نگار اُن پر کامیابی کا پہلا دروازہ کھول دیا۔ اس کامیاب افسانے کے بعد اُن کی لاہور کے ادبی حلقوں میں جان پہچان بڑھتی گئی اور کئی اہم ادبی شخصیات سے ملاقاتیں بھی ہوئیں جن میں عبدالمجید سالک، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی کے نام اہم ہیں۔ عبدالمجید سالک ہی کے توسط سے علامہ اقبالؒ سے 1937ء میں اُن کی ملاقات ہوئی۔

1936ء میں قاسمی صاحب نے باقاعدہ طور پر پہلی ملازمت بطور مُحرر، ریفارمز کمشنر لاہور کے دفتر میں اختیار کی۔ 1939ء میں ٹیلی فون آپریٹر اوکاڑہ مقرر ہوئے۔ یہ ملازمت چند ماہ جاری رہی۔ اُسی برس اُن کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''چوپال'' کے نام سے شائع ہوا جو دارالاشاعت پنجاب لاہور نے چھاپا۔ روزگار کے مسائل ساتھ ساتھ رہے اور 1939ء ہی میں اُنھوں نے ایکسائز سب انسپکٹر کے طور پر نوکری شروع کی جو 1941ء تک جاری رہی۔ 1941ء ہی میں اُن کا پہلا شعری مجموعہ ''دھڑکنیں'' شائع ہوا۔ یہ مجموعۂ کلام اُردو اکیڈمی لاہور نے چھاپا۔ ندیم جو اپنے کالج میگزین کی ادارت کر چکے تھے، اُنھوں نے 1942ء سے 1946ء تک بچوں کے ادبی جریدے ''پھول'' کی ادارت کی اور 1943ء سے 1946ء تک آپ ماہنامہ ادبِ لطیف لاہور کے بھی مدیر رہے۔ 1945ء سے 1948ء تک اُنھوں نے ریڈیو پشاور میں بطور سکرپٹ رائٹر کام کیا۔ اس تمام عرصے میں اُن کی شاعری اور افسانوں کے مجموعے بھی چھپتے رہے اور وہ بطور مدیر بھی فرائض انجام دیتے رہے۔ اِسی دوران میں تقسیم بھی ہوگئی اور پھر انسانیت کی تذلیل کے ساتھ ساتھ بربادیوں کے نہ ختم ہونے والے سلسلے شروع ہوگئے۔ اُسی عہد میں سے ندیم کی دو نظمیں درج ذیل ہیں:

تاریخ کی آواز

سنسناتے ہیں اَندھیرے تو لرزتے کیوں ہو؟
ہر نئی صبح کی تخلیق یُونہی ہوتی ہے
رات کی آنکھ سے ڈھلکا ہُوا تاباں آنسو
درحقیقت مرے جُھومر کا گراں موتی ہے
بطنِ گیتی میں دھڑکتی ہیں تجلّی گاہیں
جب شفق شام کی وادی میں لہو بوتی ہے
کون جانے کہ چٹکنے کی ریاضت ہے یہی
لوگ کہتے ہیں کہ معصوم کلی سوتی ہے

جب کلی چونک کے چٹکی تو گلستانِ جہاں
اِک الاؤ کی طرح شعلہ فشاں بھڑکے گا
قدریں بدلیں گی، یقیں بدلیں گے، تم بدلو گے
تیرگی میں بھی تجلّی کا گماں دھڑکے گا

مَیں تو کہتی ہُوں مشیّت بھی تڑپ اُٹھے گی
دستِ انساں سے جب ادراک کا در کھڑکے گا
نکہتِ گُل میں پگھل جائے گا کانٹوں کا وجود
اِتنی شِدّت سے مِرا ابرِ رواں کڑکے گا

1947ء

(ندیم کی نظمیں جلد دوم، صفحہ 790)

صُبح کو جب سرِ کہسار شفق پھُولتی ہے
لوگ کہتے ہیں کہ پل بھر میں سویرا ہوگا
کون جانے کہ یہ لالی ہے عناصر کا مذاق
اور سُورج کا گھٹاؤں میں بسیرا ہوگا
عین ممکن ہے کہ اعلانِ سحر کے باوصف
دوپہر کو بھی اندھیرا ہی اندھیرا ہوگا
کون جانے کہ اگر دُھند ہٹی، ابر چھٹا
ایک طوفان نے آفاق کو گھیرا ہوگا
عین ممکن ہے کہ طوفان کے دب جانے پر
ابر کا اِک نئے انداز میں پھیرا ہوگا
کون جانے کہ اِدھر ابر کھلے گا تو اُدھر
رات کے ہاتھ میں ظُلمت کا پھریرا ہوگا

مَیں نے ان دائروں میں گھوم کے دیکھا ہے کہ تم
مجھ میں غلطاں ہو، مگر مجھ سے گریزاں بھی ہو
تم ستارہ ہو، شفق ہو، گُلِ تازہ ہو، مگر
سنسناتا ہُوا پُرہول بیاباں بھی ہو
تم جو بستی ہو جوانی کے سمن زاروں میں
اپنی تنہائی کے احساس سے ویراں بھی ہو
تم جو کترا کے نِکلتی ہو مری نظروں سے
کتنے قِصّوں کا دمکتا ہُوا عنواں بھی ہو

تم جو کہتی ہو کہ حُوروں سے گراں ہے عورت

شبنم اور پھول کی مانند فراواں بھی ہو
تم نے لُوٹا ہے مجھے، تم نے بسایا ہے مجھے
میری رہزن بھی ہو، میرا سروساماں بھی ہو

ڈبڈباتی ہُوئی آنکھوں سے نہ بہلاؤ مجھے
ٹمٹماتے ہُوئے تاروں کے چلن جانتا ہُوں
سرمئی لب میں جوانی کی چِتا جلتی ہے
مَیں کہ فن کار ہُوں، رنگینیِ فن جانتا ہُوں
اس اٹکتے ہُوئے لہجے سے نہ کھاؤں گا فریب
مَیں تو انساں کا ہر اندازِ سخن جانتا ہُوں
کیسے پندار کی میناؤں میں بال آتے ہیں
کیوں چھپاتی ہو، کہ مَیں تشنہ دہن جانتا ہُوں
کِتنی راتوں کے اندھیروں سے شناسائی ہے
کالے بالوں کی مَیں ایک ایک شِکن جانتا ہُوں
ڈالیاں مجھ کو بلاتی ہیں گلوں سے لد کر
پھول روتے ہیں کہ مَیں رازِ چمن جانتا ہُوں

ہر ستارہ نہیں پیغامبرِ نُورِ سحر
مَیں بصارت کے فریبوں میں نہیں آؤں گا
اتنی شِدّت سے نہ اپناؤ کہ مَیں آخرِ کار
پاس رہ کر بھی بہت دُور چلا جاؤں گا
یہ محبت کہیں محرومیِ اوید نہ ہو
کھو گئیں تم، تو خدا کو بھی نہ اپناؤں گا
اس تبسّم میں کہیں طنز کے نشتر ہی نہ ہوں

اب اُمنگوں کو کھلونوں سے نہ بہلاؤں گا
جن کے دم سے الم آلُود ہُوا میرا شعور
ان شکستوں کی مَیں تاریخ نہ دہراؤں گا

1947ء

(ندیم کی نظمیں جلد دوم، صفحہ 775)

تقسیم کے دوران میں ہوئے حادثات اور المناک داستانوں کو اُس عہد کے ہر بڑے افسانہ نگار نے اپنی تحریروں کا حصہ بنایا۔ جن میں سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی اور پنجابی میں کلونت سِنگھ وِرک، سنتو کھ سنگھ دِھیر اور امرتا پریتم کے نام نمایاں دِکھائی دیتے ہیں۔ انسانی تاریخ کی ایسی بربادی ہوئی جس میں برباد ہونے والوں اور برباد کرنے والوں کو اس بات کا ادراک نہ تھا کہ ایسا کیونکر ہو رہا ہے۔ تقسیم کے حوالے سے ندیم کے کئی افسانوں میں اُس دور کی خوں فشانی دکھائی دیتی ہے۔ ایسے واقعات پر مبنی اُن کے ایک افسانے ''پرمیشر سنگھ'' سے ایک اقتباس درج ذیل ہے:

''پرمیشر سنگھ نے اختر کو دوسرے کندھے پر بٹھا لیا۔ اُسے بچوں کا کوئی گیت یاد نہیں تھا۔ اِس لیے اُس نے قسم قِسم کے گیت گانا شُروع کیے اور گاتے ہوئے تیز تیز چلنے لگا۔ اختر چُپ چاپ سنتا رہا۔''

بنتو دا سر بن ورگا ہے
بنتو دا مونہہ چن ورگا ہے
بنتو دا لک چترا ہے
لوکو
بنتو دا لک چترا

''بنتو کون ہے؟'' اختر نے پرمیشر سنگھ کو ٹوکا۔

پرمیشر سنگھ ہنسا، پھر ذرا وقفے کے بعد بولا...... ''میری بیوی ہے نا۔ امر کور کی ماں۔ اُس کا نام بنتو ہے۔ امر کور کا نام بھی بنتو ہے۔ تمھاری امّاں کا نام بھی بنتو ہی ہوگا۔''

''کیوں؟'' اختر خفا ہو گیا...... ''وہ کوئی سکھ ہے؟''

پرمیشر سنگھ خاموش ہو گیا۔

چاند بہت بلند ہو گیا تھا۔ رات خاموش تھی، کبھی کبھی گنّے کے کھیتوں کے آس پاس گیدڑ دوڑتے اور پھر سناٹا چھا جاتا۔ اختر پہلے تو گیدڑوں کی آواز سے بہت ڈرا، مگر پرمیشر سنگھ کے سمجھانے سے بہل گیا اور ایک بار خاموشی کے طویل وقفے کے بعد اُس نے پرمیشر سنگھ سے پوچھا......''اب کیوں نہیں روتے گیدڑ؟'' پرمیشر سنگھ ہنس دیا۔ پھر اُسے ایک کہانی یاد آ گئی۔ یہ گرو گوبند سنگھ کی کہانی تھی۔ لیکن اُس نے بڑے سلیقے سے سکھوں کے ناموں کو مسلمانوں کے ناموں میں بدل دیا اور اختر ''پھر؟ پھر؟'' کی رٹ لگاتا رہا اور کہانی ابھی جاری تھی، جب اختر ایک دم بولا، ''ارے چاند تو سر پر آ گیا!''

پرمیشر سنگھ نے بھی رُک کر اُوپر دیکھا۔ پھر وہ قریب کے ٹیلے پر چڑھ کر دُور دیکھنے لگا اور بولا......''تمھاری اماں کا دیس جانے کِدھر چلا گیا۔''

وہ کچھ دیر ٹیلے پر کھڑا رہا۔ جب اچانک کہیں دُور سے اذان کی آواز آنے لگی اور اختر مارے خوشی کے یوں کُودا کہ پرمیشر سنگھ اُسے بڑی مشکل سے سنبھال سکا۔ اُسے کندھے پر سے اتار کر وہ زمین پر بیٹھ گیا اور کھڑے ہوئے اختر کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر بولا...... جاؤ بیٹے، تمھیں تمھاری اماں نے پکارا ہے۔ بس تم اس آواز کی سیدھ میں......''

''شش!'' اختر نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی اور سرگوشی میں بولا۔

''اذان کے وقت نہیں بولتے۔''

''پر مَیں تو سکھ ہوں بیٹے!'' پرمیشر سنگھ بولا۔

''شش'' اب کے اختر نے بگڑ کر اُسے گھورا۔

اور پرمیشر سنگھ نے اُسے گود میں بٹھا لیا۔ اُس کے ماتھے پر ایک بہت طویل پیار دیا اور اذان ختم ہونے کے بعد آستینوں سے آنکھیں رگڑ کر بھرائی ہوئی آواز میں بولا:

''میں یہاں سے آگے نہیں آؤں گا۔ بس تم......''

''کیوں......؟ کیوں نہیں آؤ گے......؟'' اختر نے پوچھا۔

''تمھاری اماں نے چٹھی میں یہی لکھا ہے کہ اختر اکیلا آئے۔''

پرمیشر سنگھ نے اختر کو پھسلایا......''بس تم سیدھے چلے جاؤ۔ سامنے ایک گاؤں آئے گا۔ وہاں جا کر اپنا نام بتانا کرتارا نہیں، اختر، پھر اپنی ماں کا نام بتانا۔ اپنے گاؤں کا نام بتانا اور دیکھو، مجھے ایک چٹھی ضرور لکھنا۔''

''لِکھوں گا'' اختر نے وعدہ کیا۔

''اور ہاں تمھیں کرتارا نام کا کوئی لڑکا ملے نا، تو اُسے اِدھر بھیج دینا۔''

''اچھا'' پرمیشر سنگھ نے ایک بار پھر اختر کا ماتھا چوما اور جیسے کچھ نگل کر بولا:

''جاؤ!''

اختر چند قدم چلا مگر پلٹ آیا......''تم بھی آ جاؤ نا۔''

''نہیں بھئی!'' پرمیشر سنگھ نے اُسے سمجھایا......''تمھاری اماں نے چٹھی میں یہ نہیں لکھا۔''

''مجھے ڈر لگتا ہے۔'' اختر بولا۔

''قرآن کیوں نہیں پڑھتے؟'' پرمیشر سنگھ نے مشورہ دیا۔

''اچھا'' بات سمجھ میں آ گئی اور وہ قل ہو اللہ کا ورد کرتا ہوا جانے لگا۔

نرم نرم پو اُفق کے دائرے پر اندھیرے سے لڑ رہی تھی اور ننھا سا اختر دُور دُھندلی پگڈنڈی پر ایک لمبے تڑنگے سکھ جوان کی طرح تیز تیز جا رہا تھا۔ پرمیشر سنگھ اُس پر نظریں گاڑے ٹیلے پر بیٹھا رہا اور جب اختر کا نقطہ فضا کا ایک حصہ بن گیا تو وہاں سے اُتر آیا۔

اختر ابھی گاؤں کے قریب نہیں پہنچا تھا کہ دو سپاہی لپک کر آئے اور اُسے روک کر بولے۔ ''کون ہو تم؟''

''اختر''۔

وہ یوں بولا جیسے ساری دُنیا اُس کا نام جانتی ہے۔

''اختر!'' دونوں سپاہی کبھی اختر کے چہرے کو دیکھتے اور کبھی اُس کی سکھوں کی سی پگڑی کو۔ پھر ایک نے آگے بڑھ کر اُس کی پگڑی جھٹکے سے اُتار لی تو اختر کے کیس کُھل کر اِدھر اُدھر بکھر گئے۔

اختر نے بھنّا کر پگڑی چھین لی اور پھر ایک ہاتھ سے سر کوٹٹولتے ہوئے وہ زمین پر لیٹ گیا اور زور زور سے روتے ہوئے بولا......''میرا کنگھا لاؤ۔تم نے میرا کنگھا لے لیا ہے۔دے دو ورنہ میں تمھیں ماروں گا۔''

یک دم دونوں سپاہی دھپ سے زمین پر گرے اور رائفل کو کندھوں سے لگا کر جیسے نشانہ باندھنے لگے۔

''ہالٹ۔''

ایک پکارا جیسے جواب کا انتظار کرنے لگا۔ پھر بڑھتے ہوئے اُجالے میں اُنھوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور ایک نے فائر کر دیا۔

اختر فائر کی آواز سے دہل کر رہ گیا اور سپاہیوں کو ایک طرف بھاگتا دیکھ کر وہ بھی روتا چلاتا ہوا اُن کے پیچھے بھاگا۔

سپاہی جب ایک جگہ جا کر رکے تو پرمیشر سنگھ اپنی ران پر کس کر پٹّی باندھ چکا تھا مگر خون اس کی پگڑی کی سیکڑوں پرتوں میں سے بھی پھوٹ آیا اور وہ کہہ رہا تھا......''مجھے کیوں مارا تم نے، میں تو اختر کے کیس کاٹنا بھول گیا تھا؟'' مَیں اختر کو اُس کا دھرم واپس دینے آیا تھا یارو۔''

اور اختر بھاگا آ رہا تھا اور اُس کے کیس ہَوا میں اُڑ رہے تھے۔''

قاسمی صاحب کی پاکستان سے محبت روزِ اوّل ہی سے لازوال تھی۔ ریڈیو پشاور سے 14 اگست 1947ء کی رات پہلا قومی نغمہ نشر ہوا۔

''پاکستان بنانے والے، پاکستان مبارک ہو''

یہ قومی نغمہ قاسمی صاحب ہی کا تحریر کردہ تھا۔ 1948ء میں ندیم انجمن ترقی پسند مصنفین کے سیکرٹری جنرل منتخب ہوئے؛ یہ عہدہ 1954ء تک اُن کے پاس رہا۔1948ء اُن کی عائلی زندگی کے حوالے سے بھی ایک اہم برس تھا۔ اُس برس اُن کی شادی وادیِ سون سکیسر کے ایک قریبی گاؤں میں رابعہ سے ہوئی۔ 1948ء میں اُنھوں نے ''نقوش'' جیسے ادبی جریدے کی ادارت بھی کی۔ یہ نام بھی قاسمی صاحب ہی کا دیا ہوا تھا۔ اس کے پہلے دس شماروں کی ادارت قاسمی صاحب نے کی اور یہ سلسلہ 1949ء تک جاری رہا۔ پاکستان بننے کے بعد ہر حق گو کی مانند قاسمی صاحب کو بھی جیل کی ہوا کھانا پڑی۔ 1951ء میں وہ پہلی بار جیل گئے اور یہ سلسلہ 1970ء کی دہائی تک چلتا رہا۔ 1952ء میں اُنھوں نے فکاہیہ کالم تحریر کرنے شروع کیے۔ یہ کالم روزنامہ ''امروز'' میں ''حرف و حکایت'' کے عنوان سے چھپتے رہے۔ اُن کے کالم بھی کالم نگاری میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ اُن کا ایک کالم ''مسمی تسلی بخش'' 1956ء میں چھپا۔ یہ کالم اُن کے ایک مجموعے ''کیسر کیاری'' میں بھی شامل ہے۔ یہ کالم اس لیے بھی اہم ہے کہ اس میں1956ء کی سیاسی صورتِ حال کی ایک شکل نظر آتی ہے:

ایک خاص مصلحت کے تحت ہم ''تلاشِ گم شدہ'' کا ایک اشتہار ''حرف و حکایت'' کے کالم میں شائع کرنے پر مجبور ہوئے ہیں۔ اشتہار کا مضمون یہ ہے!

مسمی تسلی بخش توجہ کریں

جب سے ہم نے آزادی حاصل کی ہے، مسمی تسلی بخش کا نام بار بار سننے میں آیا ہے مگر وہ اب تک دیکھنے میں نہیں آئے۔ گزشتہ نو برس کے مرکزی اور صوبائی وزیروں کے جمِ غفیر میں شاید ہی کوئی ایسا شخص ہو جس نے تسلی بخش کو کسی نہ کسی صورت میں استعمال نہ کیا ہو۔ ایک اور پُراسرار بات یہ ہے کہ تسلی بخش نے ایک سے زیادہ تخلص رکھ چھوڑے ہیں۔ کبھی وہ تسلی بخش فیصلہ ہے، تو کبھی تسلی بخش انتظام ہے، کبھی تسلی بخش نتیجہ ہے، تو کبھی تسلی بخش اقدام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ حضرتِ نتیجہ کے پیچھے بھاگتے ہیں تو راستے میں معلوم ہوتا ہے کہ اِدھر سے تو

انتظام صاحب گزرے تھے اور اگر لوگوں کے بتائے ہوئے پتے پر انتظام کا کھوج لگایا جائے تو خبر ملتی ہے کہ انتظام صاحب تو نہیں البتہ جناب تسلی بخش صاحب فیصلہ ضرور دائیں ہاتھ کو نکل گئے ہیں۔

راویوں نے بتایا ہے کہ جناب تسلی بخش بہت بھڑکیلا لباس پہنتے ہیں اور ان کے ہونٹوں پر ایک ایسی مسکراہٹ ہوتی ہے جسے یورپ والوں نے مونا لیزا مسکراہٹ کا نام دے رکھا ہے۔ اس مسکراہٹ میں نرمی بھی ہوتی ہے اور گرمی بھی۔ لاگ بھی اور لگاؤ بھی۔ شرافت بھی اور شرارت بھی۔ ہماری معلومات کے مطابق وہ تمام بڑے بڑے سرکاری دفتروں میں نہ صرف مل جاتے ہیں بلکہ پائے جاتے ہیں۔ اگر وہ یہ سطور دیکھیں تو کسی روز وقتِ مقررہ پر باغ بیرون موچی دروازہ لاہور یا جہانگیر پارک کراچی یا پلٹن میدان ڈھاکہ میں نمودار ہو جائیں کیونکہ وزرا اور اعلیٰ سرکاری حکام کے بے شمار وعدے، منصوبے، اسکیمیں اور فیصلے برسوں سے اُن کا انتظار کر رہے ہیں۔ ایک اور اطلاع کے مطابق تسلی بخش اصل میں زٹلی بخش ہیں اور وہ تسلی نہیں دیتے، زٹل مارتے ہیں۔ وہ کچھ بھی ہوں، ایک بار سامنے آ جائیں کہ اربابِ حکومت کی برسوں کی تسلی بخشیوں کی وجہ سے اہل پاکستان کو مسمی تسلی بخش کے دیدار کا بڑا ہی اشتیاق ہے۔''

ہم نے جب سے یہ خبر پڑھی ہے کہ ہمارے وزیرِ خارجہ ملک فیروز خاں نون براستہ لندن وطن تشریف لا رہے ہیں، تو گھبراہٹ سے کچھ عجیب کیفیت ہو رہی ہے۔ نون صاحب نے جب بھی لندن میں قیام فرمایا ہے، لا اُبالیانہ پن کا شکار ہو گئے ہیں۔ ابھی پچھلے دنوں دُنیا بھر کے اخباری نمائندوں کے سامنے اُنھوں نے کچھ ایسی باتیں کہہ دیں جیسے وہ پاکستان کے وزیرِ خارجہ نہیں ہیں، وزیرِ حارجہ ہیں (ہم نے خارجہ کو ضرورتاً حرج سے نکالا ہے) ''اچھا'' تو فلسطین کے سلسلہ میں

1950ء میں برطانیہ، فرانس اور امریکہ کی طرف سے کوئی سہ طاقتی اعلان بھی ہوا تھا؟...... اچھا تو پاکستان کی طرح فرانس بھی معاہدہ سیٹو میں شامل ہے؟ خوب خوب ایسی باتیں خارجہ امور کی بجائے حارجہ امور سے تعلق رکھتی ہیں اور دل دھک دھک کر رہا ہے نہ جانے اب کے وہ لندن میں کیا کہہ بیٹھیں گے۔

مسجدوں میں دُعائیں مانگیے، مزاروں پر منتیں مانیے، تعویذ گنڈا استعمال کیجیے، مراقبہ فرمایئے۔ غرض ملک نون کو لندن میں خاموش رکھنے کے لیے ہر ممکن کوشش کر ڈالیے۔ یہ دُرست ہے کہ مسٹر سہروردی نے تو لاہور کو بھی لندن بنا دیا ہے اور جمہوریہ اسلامیہ کے وزیرِ اعظم، اسلامیہ کالج میں اسلامیہ کالج کے مسلمان اولڈ بوائز کی محفل میں فرما گئے ہیں کہ انگریز ایک اسلامی ملک مصر میں عالمی اخلاق کو بحال کرنے گئے تھے اور یہ بھی دُرست ہے کہ ملک نون کو اگر پاکستان کی خارجہ پالیسی کی اس ہولناک لچک کا علم ہوتو وہ لندن میں یہی الفاظ کہہ کر دُنیا بھر کی رائے عامہ کو نیویارک سے واپسی تک بہکا بہکا چھوڑ جاتے...... لیکن اب کے اُنھیں اخباری نمائندوں کے سوالوں کا صرف ''اونہوں'' یا ''اونہک'' میں جواب دینا چاہیے اور لب کشائی صرف پاکستان میں کرنی چاہیے جہاں مسٹر سہروردی نے ان کے ارشادات کے لیے ایسی فرسٹ کلاس زمین تیار کی ہے کہ خواجہ ناظم الدین، مسٹر محمد علی بوگرا اور چودھری محمد علی سے بھی تیار نہیں ہوسکی تھی۔ اُنھوں نے انگریز کے حق میں ایسی ایسی باتیں کہی ہیں کہ خود انگریز بھی کہتے ہوئے شرمانے لگیں۔ اس لیے ہم ملک نون سے عرض کریں گے:

کھیتوں کو دے لو پانی، اب بہہ رہی ہے گنگا!

مگر یہ سب کچھ پاکستان میں ہونا چاہیے۔ گھر سے باہر ایسی بات کی جائے تو ہم ایسے اَن پڑھ اور جاہل وطن دوستوں اور قوم پرستوں کو

بڑی شرم آتی ہے۔

قاسمی صاحب نے 1953ء میں روزنامہ ''امروز'' کی ادارت سنبھالی اور 1959ء تک امروز سے وابستہ رہے۔ یہاں ''پنج دریا'' کے نام سے کالم تحریر کرتے رہے۔ صحافت ادارت کے ساتھ ساتھ اُن کی شاعری، شخصی خاکے اور افسانے مختلف ادبی جرائد کا حصہ بنتے رہے اور ہر دوسرے تیسرے برس اُن کا کوئی نہ کوئی مجموعہ شائع ہو جاتا۔ اُنھیں منظر نگاری پر بھی خاص ملکہ حاصل تھا۔ اُن کے ایک افسانے ''بھرم'' کا آغاز کچھ اِن الفاظ سے ہوتا ہے:

> ''ڈوبتا ہوا سورج ایک بدلی سے چُھو گیا تو شام کو آگ لگ گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شفق بدلی میں سما نہیں سکی، اس لیے چھلک پڑی ہے۔ شہر کی عمارتوں، درختوں، سڑکوں، بسوں اور موٹروں، شہریوں کے لباس اور اُن کے چہروں پر اسی لمحے کے موقلم نے شفق کے شعلے کا رنگ پھیر دیا تھا۔''

1964ء میں اُنھوں نے ایک عظیم ادبی جریدے ''فنون'' کی بنیاد رکھی اور آخری دم تک اس کی ادارت کی۔ شروع میں حکیم حبیب اشعر بھی اس پرچے کے شریک مدیر تھے۔ 1974ء میں اُنھیں سیکرٹری مجلس ترقی ادب چُنا گیا اور بعدازاں ڈائریکٹر مجلس ترقی ادب کے عہدے پر فائز ہوئے۔ 1977ء سے 1978ء تک وہ بزمِ اقبالؒ لاہور کے اعزازی سیکرٹری بھی رہے۔ پاکستان میں روزِ اوّل ہی سے ہر شعبے میں گروہی سیاست رہی۔ اسی طرح اُردو ادب میں بھی کئی طرح کی گروہ بندیاں آج تک چلی آ رہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر ادیب اور شاعر کو کسی نہ کسی ادبی گروہ سے ضرور منسلک ہونا پڑا۔ ان گروہ بندیوں کے باعث کئی شاعر اور ادیب منظرِ عام پر آ ہی نہ سکے جبکہ بہت سوں کو خاطر خواہ پذیرائی ملی۔ مقبول ترین شاعرہ پروین شاکر اُنھیں ''عمو جان'' اور منصورہ احمد ''بابا'' کے نام سے پکارتی رہیں۔

1964ء، 1972ء اور 1979ء میں اُنھیں آدم جی ادبی ایوارڈ سے نوازا گیا جبکہ 1968ء میں وہ پرائیڈ آف پرفارمنس کے حق دار ٹھہرے۔

ندیم ہر آمر کے خلاف برسرِ پیکار رہے۔ اِس کے باوجود اُنھیں بائیں بازو کی سیاست میں کبھی شمار نہ کیا گیا۔ وہ آزادی اور انسانیت کے بارے میں اپنی خاص قسم کی سوچ

بھی رکھتے تھے۔ 1947ء کے بعد 1971ء میں ایک بار پھر انسان اور انسانیت کی یوں تذلیل کی گئی جس کا قرض یہ دھرتی آج تک چکا رہی ہے۔ اس عہد میں اُنھوں نے جو کہا، اس میں سے دو نظمیں درجِ ذیل ہیں جو ان حالات کا ایک رُخ پیش کر رہی ہیں:

ایک ہی رنگ ہے

زندگی سات رنگوں سے مل کر بنی ہے
مگر آج تو زندگی کا فقط ایک ہی رنگ ہے
خون کا رنگ
میرے، تمھارے، سبھی کے دہکتے ہوئے خون
کا رنگ
جس طرح سورج کا عکس آئینے میں
مرے چار جانب وہی رنگ ہے
میرے اندر وہی رنگ ہے

میرے فن میں، مرے فکر میں
میری یادوں میں
میرے خیالوں میں
میرے عقیدوں میں
بس ایک ہی رنگ ہے
اور یہ خون کا رنگ ہے
خون تاریخ کا
خون تہذیب کا
خون اسلاف کے جذبۂ حُریت کا

مری آن کا
میری غیرت کا
میری حمیت کا
میری محبت کا
اُن حسرتوں، اُن اُمنگوں کا
جو پیاس سے مر گئیں

اُن اُمیدوں کا
جو یاس سے مر گئیں
خون ماؤں کا، بہنوں کا، بچوں کا، شعروں کا،
نغموں کا
گیتوں کا
اسلوبِ گفتار کا
حسنِ کردار کا
میرے پندار کا
یم بہ یم خون
میرا، تمھارا، سبھی کا
مگر خون کا تو فقط ایک ہی رنگ ہے
چاہے ڈھاکے کا ہو
چاہے لاہور کا
آج کے دن کا
یا آنے والے دنوں کا
ہزاروں کا ہو یا کروڑوں کا
رنگ تو خون کا ایک ہے

اور یہی رنگ ہے آج کی زندگی کا
مرے شہر بھی، میرے گاؤں بھی، جنگل بھی، میدان بھی
میرے کہسار، میرے سمندر
سبھی خون ہی خون ہیں
میرے کڑیل جواں خون ہی خون ہیں
میرا گھر خون ہی خون ہے
میرا دل خون ہی خون ہے

سقوط کے بعد

یہ کیا موسم آیا ہے
سورج سر پہ دمک رہا ہے
دُھوپ کی آگ سے دشت وجبل اور ساحل و بحر
سلگنے لگے ہیں
کرنیں، خون کے دھارے بن کر
شہروں کے دیوار و در کو چاٹ رہی ہیں
حدِّ نظر تک پھیلے کھیتوں سے، بھٹی میں بھنے اناج کی بُو آتی ہے!
جلتے ہوئے اشجار کی صورت میں، دھرتی سے جیسے کوئلہ اُگ آیا ہے
لیکن میرے دل و دماغ پہ برف کے گالے اُتر رہے ہیں
میرا ہاتھ اور میرا قلم اور میرا فن
سب کتنے یخ ہیں
کتنے یخ ہیں!!

ندیم کا تمام عمر دُنیا بھر کے دیگر ممالک میں موجود شاعروں اور ادیبوں سے قلمی رابطہ رہا۔ اُن کے لکھے ہوئے خطوط اور اُن کو لکھے گئے خطوط دونوں ہی خاص اہمیت اور نوعیت

کے حامل ہیں۔ ان کا ایک خط ذیل میں درج کیا جاتا ہے جو اُنھوں نے واجدہ تبسم کو 1964ء میں تحریر کیا تھا:

''170 انارکلی لاہور (مغربی پاکستان)

27 جولائی 1964ء

پیاری واجدہ بہن، دُعائیں، میں تو مایوس سا ہو چلا تھا۔ البتہ یہ ارادہ قطعی نہیں تھا کہ آپ کا پیچھا چھوڑ دوں۔ دراصل اب میں اپنے بہنوئی صاحب کو لکھنے والا تھا کہ میری مدد کو پہنچئے۔ آپ نے یہ خط لکھ کر میرے اعتماد کو بڑا سہارا دیا ہے۔ خدا آپ کو خوش رکھے اور آپ سے افسانہ نگاری کسی بہانے نہ چُھوٹے۔

میرے تین بچے ہیں۔ دو بیٹیاں، ایک بیٹا ان کی عمریں بالترتیب 13، 11 اور 8 سال ہیں اور فیصلہ ہے کہ یہی کافی ہیں، ویسے جب یہ بچے چھوٹے چھوٹے سے تھے، تو جب بھی میں اُن کی حشر سامانیوں سے محظوظ رہا۔ مرد بڑی چالاک ذات ہے۔ وہ اس قیامت کا سارا بوجھ عورت پر ڈال دیتا ہے اور پھر اس کی تربیت میں سے کیڑے بھی نکالتا ہے۔ میں سمجھ سکتا ہوں کہ آپ نے اتنی دیر کے بعد میرے عریضے کا جواب کیوں لکھا۔ پھر 11 کو جس خط کا آغاز ہوا تھا وہ تین سطروں کے بعد رُک کیوں گیا اور 16 کو جا کر کیوں مکمل ہوا۔ (مجھے یہ خط کل 26 کو ملا ہے)۔ میں نے حاجرہ اور خدیجہ کا عالم دیکھا ہے اور اب جیلانی کی ادبی سرگرمیوں پر جو (خدانخواستہ) اوس سی پڑنے لگی ہے، اس کی وجہ بھی موجود یا غیر موجود بچے ہی ہیں۔

مگر خدا کا شکر ہے کہ آپ نے خود کو لکھنے پر پھر آمادہ کر لیا ہے، آئندہ افسانہ نگاری کو ترک کرنے کا خیال بھی ذہن میں نہ لایئے گا۔ کیا آپ کو پورا پورا احساس نہیں ہے کہ اُردو افسانے میں آپ کی کیا اہمیت ہے

اور آپ کے کیا کچھ بننے کے امکانات ہیں؟ کیا آپ نے اپنے فن کے کٹیلے پن اور چٹیلے پن اور نکیلے پن کے حسن کا کبھی اندازہ کیا ہے؟ بچہ یقیناً بڑی نعمت ہے مگر فن پارہ بھی تو بچے سے کم عزیز نہیں ہوتا، میں نے نظموں اور افسانوں کو تو جنم دیا ہے نا، اس لیے اس حد تک تو میں ذاتی تجربے کی بات کرسکتا ہوں۔

فنون کا نیا شمارہ یکم ستمبر کو آئے گا اس لیے 15 اور 16 اگست کو اسے پریس میں دوں گا۔ اگر آپ میرا یہ عریضہ ملتے ہی بذریعہ ایئر میل افسانہ بھجوا دیں تو مجھے وقت پر مل سکتا ہے اور میری تمنا ہے کہ آپ اس شمارے میں بہر صورت شامل ہوں۔ میں بطورِ خاص ہندوستانی ادیبوں کی چیزیں معاوضہ ادا کر کے چھاپنا چاہتا ہوں مگر وہاں میرا کوئی ایسا ذریعہ نہیں جو میری طرف سے رقوم ادا کرتا رہے۔ البتہ کوشاں ہوں کہ اپنی حکومت کے توسط سے ایسا کوئی ذریعہ پیدا ہو جائے۔ اُس وقت تک تو آپ مجھے مفت ہی افسانے بھجوایئے۔ میں ''ظالم'' نہیں ہوں مگر ظالم بننا پڑ رہا ہے۔ البتہ اب ''ظلم کے دن تھوڑے ہیں'' یعنی اب ادائیگی کا کوئی نہ کوئی بندوبست کرلوں گا۔

''پہاڑوں کی برف'' کی اتنی بھرپور داد برادرم کرشن کے بعد آپ سے ملی ہے، اس لیے بہت مغرور ہو رہا ہوں، اور بے حد ممنون ہوں۔

آپ کے بچوں کے نام کیا ہیں؟ محترم اشفاق صاحب کو آداب!

آپ کا بھائی ندیم''

ندیم کی اپنے اربابِ اقتدار سے خاص قسم کی ذہنی ہم آہنگی بھی تھی اور بہت سارے معاملات پر اُن سے اختلاف بھی تھا لیکن وہ کبھی فوجی حکمران کے حق میں نہ تھے یہی وجہ ہے کہ جب ملک کے مُنتخب وزیرِاعظم ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دی گئی تو اُنھوں نے درجِ ذیل دو نظمیں کہیں۔ یہ دونوں نظمیں اُن کے مجموعۂ کلام لوحِ خاک کا حصہ ہیں۔

کرب نامہ
(ذوالفقار علی بھٹو کی زخم خوردہ روح کی نذر)

کرب آمادۂ اظہار ہے ، لیکن آواز
میری سانسوں کی گزرگاہ سے گزرے کیسے!
حرف انبار در انبار پڑے ہیں بے جاں
جیسے کشتوں کے ہوں پشتے سرِ جنگاہِ حیات
شعر کہتے ہُوئے اِک عمر بسر کر دی ہے
لیکن اب جا کے کھلا مجھ پہ یہ اظہار کا راز
شدّتِ کرب میں الفاظ بھی مر سکتے ہیں

چاند سکڑا ہُوا، سہا ہُوا، جاتا ہوا چاند
دیکھتا ہے کہ ستاروں کی لویں مدھم ہیں
اور ہر لَو میں ہے اک قطرۂ خوں کی تصویر
نہ خلاؤں میں گماں ہے کسی تابانی کا
نہ اُفق پر نظر آتی ہے اُجالے کی لکیر
رات کے جبر سے جب خامشی چلّاتی ہے
تیز ہوتی ہوئی چھریوں کی صدا آتی ہے
دشت و کہسار میں ظلمات سے آلودہ ہوا
صرف یہ بات، بڑے درد سے کہہ پاتی ہے
چاند جب ڈوبتا ہے، چاندنی مر جاتی ہے
سیپیاں سی جو نظر آتی ہیں نیلی نیلی
اِن میں کل رات بصارت کے دِیے روشن تھے

وہ بصارت کو جو فردا کا بھی نظّارہ کرے
اور ماضی کے دُھندلکے بھی درخشاں کر دے
برگِ ہر گل پہ فروزاں جو لہو شبنم ہے
اس میں تاریخ نے پایا ہے کمالِ تجسیم
اور تاریخ وہ گمبھیر حقیقت ہے ، جسے
وقت کی مصلحتیں قید نہیں رکھ سکتیں

میرے آدرش کے ٹکڑے ہیں کہ آئینے ہیں
ہاتھ اُٹھتے نظر آتے ہیں تو کٹتے سر بھی
آنچ دیتی ہے مری روح کی خاکستر بھی
جب سہارا کوئی چھوٹا تو ستارہ ٹوٹا
دل جو دھڑکا تو فلک میں ہوئیں درزیں پیدا
جو قیامت مرے اندر ہے ، وہی باہر بھی
اِس قدر عام ہے خونِ رگِ مظلوم کا فیض
موسمِ زرد میں گل رنگ ہُوئے پتّھر بھی
غم اِک آسیب کی صورت ہے مرے گھر پہ محیط
خیمہ زن ہے کوئی پرچھائیں مرے آنگن میں
چند سایے نظر آتے ہیں برونِ در بھی

ہم جو مظلوم ہیں، مجبور ہیں، بے مایہ ہیں
ہم جو سب دیکھ کے بھی بول نہیں پاتے ہیں
اور جب بولتے ہیں، نطق سے شرماتے ہیں
ہم ہیں پامال، مگر تیز ہوا کے دم سے
پاؤں کے نقش، سروں تک بھی اُبھر جاتے ہیں

ہم تو وارث ہیں شہیدوں کے جمالِ فن کے
وہ جو پیوندِ زمیں ہو کے، نکھر جاتے ہیں
اور نسلوں کے ضمیروں میں اُتر جاتے ہیں

5اپریل1979ء

ایک نوحہ
(ذوالفقار علی بھٹو کی یاد میں)

شعور کی دھار تھا وہ احساس کی اَنی تھا
وہ طالبِ حسنِ زندگی تھا سو کشتنی تھا
اسی لیے تو اُداس چہرے چمک رہے ہیں
وہ نُور ذہنوں کا تھا، ضمیروں کی روشنی تھا
فرازِ دار و رسن سے اس کا مقام پوچھو
کہ اس کا معیارِ عشق کس درجہ آہنی تھا
میں اُس کی تر دامنی کی سوگند کھا رہا ہوں
کہ وہ تو دل کا غنی تھا اور بات کا دھنی تھا
تم اس کی آواز پارہ پارہ نہ کر سکو گے
کہ جسم تو خیر جسم تھا اور شکستنی تھا
لہولہو پتّیوں سے شب سرخ ہو رہی تھی
کہ ایک گُل کا یہ آخری رقصِ جانکنی تھا

5اپریل1979ء (شب)

ندیم نے کچھ ٹی وی ڈرامے بھی تحریر کیے۔ اُن کے ڈراموں کا ایک سلسلہ ''قاسمی کہانیاں'' آج بھی پی ٹی وی کا سرمایہ ہے۔ اُن کے ڈراموں اور افسانوں میں پنجاب کا خالص دیہی رنگ نمایاں طور پر دکھائی دیتا ہے، وہ اُن کا افسانہ ''کپاس کا پھول'' ہو یا ''پرمیشر

سنگھ''، اس طرح کی کئی مثالیں اُن کے افسانوں میں ملتی ہیں۔ اُن کے افسانوں میں راکھا، لاکھاں، رانو، چاچا دِین محمد، دولھے شاہ، مریاں، فضلو شاہ، بشکو، کرم الٰہی، اللہ بخش، بھاگی، پھلے، لطو بتو، پیر بخش، ملکھا جیسے لاتعداد پنجابی، دیہی زندگی کے جاویداں کردار ہیں۔ وہ کئی نجی محافل اور ٹی وی پروگرامز میں بھی برملا پنجابی زبان کے مقام اور حق کے بارے میں اظہار کر چکے ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے اُن کی کوئی پنجابی تخلیق چھپی ہوئی نہیں ملتی۔ بہرحال ہم اُن کے ایک افسانے ''اُصول کی بات'' میں سے ایک اقتباس پیش کرتے ہیں کیونکہ پنجابی معاشرت اور رہن سہن اُن کے طرزِ تحریر کا خاصہ بھی رہا ہے:

> ''عبداللہ اس گھروندے سے نکل آیا تھا، جس میں اُس نے گیارہ برس گزارے تھے اور جب اُسے لائل پور گئے ہوئے بیٹے کی چٹھی ملتی تھی کہ مزدوری کرکے اپنے علاج کے لیے روپیہ کما لیتا ہوں اور آپ لوگ زیادہ فِکر نہ کریں، تو وہ اسی گھروندے کے آنگن میں گھنگھنیوں کا دیگچا پکاتا تھا اور چڑیوں، کووں اور لالیوں میں بانٹ دیتا تھا۔ اسی کے آس پاس کے پیڑوں میں اس نے اپنی بیٹی ماکھاں کے لیے جھولے ڈالے تھے اور جب وہ ہل چلاتا تھا اور اُس کی بیوی اُسے روٹی اور چھاچھ پہنچانے آتی تھی تو ماکھاں جھولا جھولتی اور گاتی تھی۔
>
> ڈاچیاں کچاوے
> وِیر خیری آوے
> بابا میرا لسّی پیوے
> امّاں میری تَسی جِیوے
> وِیر یاد آوے
> ڈاچیاں کچاوے
> وِیر خیری آوے
>
> اس وقت عبداللہ کا جی چاہا کہ اُونچے سُروں میں ''ڈاچیاں کچاوے'' گانے لگے اور ساتھ ساتھ رونے لگے۔''

ندیم کی باقاعدہ پنجابی تحریر ہمیں احمد راہی کی کتاب ''ترنجن'' کے ایک ابتدائیہ مضمون ''اِک دو گلاں'' کی شکل میں دِکھائی دیتی ہے۔ اس مضمون اور احمد راہی کی کتاب کو پڑھ کر کرشن چندر نے ایک خط احمد راہی کو تحریر کیا جس میں کتاب کے ساتھ ساتھ اس مضمون کو بطورِ خاص پسند کیا اور بار بار اس بات کا شدّت سے اظہار کیا کہ لاہور سے پنجابی زبان میں ایک رسالہ نکالنا چاہیے، جس میں ندیم کا خاص کردار بھی موجود ہو۔ لیکن بدقسمتی سے ایسا کوئی رسالہ احمد ندیم قاسمی نہ نکال سکے۔ بہرحال اُن کا وہ مکمل مضمون درج ذیل ہے:

''ایہہ کراچی دی گل اے۔ اسی کُجھ سنگی ساتھی اِک ہوٹل وِچ بیٹھے زبان دے مسئلے اُتے بحث کر رہے ساں۔ بحث بڑی سوادی سی، آکھن والے سارے پر منّن والا اِک وِی نہیں سی۔ میں بحث نوں بنے لاون لئی آکھیا۔ بھراوٗ! میں اِک کھری گل کرن لگّا جے، تے کھری گل کوڑی وِی ہوندی اے۔ تہاڈے دِلاں وِچ اِک دُوجے دِی عزت نہیں معلوم ہوندی۔ تسی بحث لئی بحث کر رہے ہو اور تہانوں منناں پئے گا، جے ساڈے وطن دِیاں ساریاں زباناں وِچ وَڈے وَڈے شاعر سَن، تے ہر شاعر دا اِک اَپنا ڈھب تے رنگ سی۔ اوہ اُڈدے وِی سَن، تَردے وی سَن، چل دے وِی سَن تے پتا لاں وِچ وِی لہہ جاندے سَن۔ تہاڈیاں چھوٹیاں چھوٹیاں دِلڑیاں نیں جیہناں دے وِچ اپنے شہر یا صوبے توں سِوا کسے دُوجے شہر یا صوبے دِی وَڈیائی سما اِی نہیں سکدی۔ ادیباں تے شاعراں نوں تاں کُھلے دِل والا ہونا چاہیدا اے۔ شیکسپیئر نوں ایسے لئی بُرا آکھنا، جے اوہ انگریز سی، تے انگریزی حاکم ساڈے پیڑھیاں دے وَیری نیں، تہاڈے مونہوں کجھ سج دا نہیں، مایا کوفکی نوں ایسے لئی برا کہنا، جے اوہ کمیونسٹ سی تے تُسی کمیونزم دا ناں سن کے تریہندے او تہانوں تجدا نہیں۔''
میرا اِک سنگی بولیا۔ تُسی ٹھیک اِی کہندے ہووو گے پر غرور او سے نوں

سجدا اے جس دے پلّے وی کجھ ہووے۔ تہاڈے کول کیہ اے؟ ٹاویں ٹاویں شعر شوعر آکھن والیاں دے نال تہذیباں دے خزانے نہیں بھر سکدے۔ اچھا دَسو تہاڈی اُردو زبان وچ کوئی ایپک (Epic) شاعر ہے؟''

میں کہیا ''جی ہے۔ میر انیس پنجابی وچ وی ہے۔ جے وارث شاہ آکھن لگا ''پہلاں اُردو دی گل کرو کوئی ڈُونگھی گل کرن والا شاعر؟''

میں کہیا ''غالب سی تے اقبالؒ تاں ایڈا پرانا وی نہیں ہویا۔''

اوہ خورے ضد وچ آ گیا سی، بولیا۔ ''اُردو وِچ لمیاں نظماں دا ناں لوو۔''

میں کہیا ''سوہنیاں سوہنیاں مثنویاں تاں درجناں نیں جیہناں دے وِچ آدمی دے دِل تے دماغ تے اوہدے آس پاس دِیاں ہزاراں نِمیاں نِمیاں تے مِٹّھیاں جھلکیاں نیں، فیر انیس تے دبیر جے۔ چکبسِت جے، حالی جے، اقبالؒ جے، ایس زمانے دے وچ سردار جعفری جے۔''

بولیا۔ ''ایس زمانے نوں وِی شامل کر رہے او، تاں فیر دسّو، تُہاڈی پنجابی زبان نوں تاں اَج کل ڈاڈھے اوکھے پینڈے پے گئے نیں، کوئی کم دا شاعر اِی نہیں۔ اوہی پرانے دوہڑے تے کافیاں تے سی حرفیاں تے قِصّے کہانیاں لکھن والے ٹُٹے بھجے لوک ہین۔ جیہناں نوں تے ایہہ خبر اِی نہیں جے دُنیا تاں بڑی اگے نکل آئی ہے۔''

میں پچھیا احمد راہی دا ناں کدی سنیا جے۔

میرا سنگی کہن لگا ''ہووے گا'' تے گھڑی دیکھ کے بولیا ''معاف کرنا بھراوٗ مینوں اِک ضروری کم یاد آ گیا اے'' تے جان دا ہویا۔

احمد راہی دے تعارف لئی میں ذرا لمّی گل کیتی اے پر میرا مقصد تعارف نہیں سی میں نے احمد راہی دِی شاعری دی اہمیت ول اشارہ کرنا سی۔ احمد راہی نوں ساڈے دیس دے پڑھے لکھے لوک چنگی طرحاں

جان دے نیں۔ اوہناں نوں پتا اے کہ راہی نوجوان اُردو شاعراں دِی سبھ توں اگلی صف وِچ شامل اے، اوس دِی اُردو غزل اوس مٹھی مٹھی پیڑ نال بھری ہوئی ہوندی اے جیہڑی میر نے، درد نے مصحفی تے دُوجے کلاسیکل اُردو شاعراں نے بڑے سوہنے تے ستھرے فن دے روپ وِچ ساڈے تک پہنچائی۔ فیر اوس دِی غزل دا میدان تنگ نہیں۔ راہی غزل توں غزل رکھ کے اوس توں ساڈے دُوجے جاگے ہوئے شاعراں وانگوں بڑے کم لیندا اے۔ اوس دِیاں اُردو نظماں وچ بڑی جان تے جوش اے۔ پر کُجھ دِناں توں لوک دیکھ رہے نیں جے اوس دِیاں تخلیقی طاقتاں نے اپنے آپ نوں کھول کے پیش کرن لئی اِک نویں راہ چُن لئی اے۔ تے اوس راہ تے اوس دِی ٹور اینی سوہنی تے موہنی اے جے پنجاب دے لوک چوکنّے ہو گئے نیں، تے راہی دِیاں نظماں پڑھن تے سنن توں بعد کہندے نے یارو ایس ساڈی پنجابی زبان دے وچ تاں بڑی مِٹھاس تے لچک جے۔ ایہہ تاں بڑے بڑے رازاں تے بھیداں نوں اپنے اندر سنبھالن دا حوصلہ رکھدی اے۔'' ایہہ راہی دی پنجابی شاعری دی برکت اے، جے اج لوک وارث شاہ، بلھے شاہ، علی حیدر تے خواجہ فریدؒ ہوراں دیاں کتاباں توں مُدتاں دا گھٹا چھنڈ کے اوہناں نوں پڑھدے نیں تے پنجابی شاعری دیاں صدیاں دِیاں پرانیاں روایتاں چمکن تے لشکن لگ گئیاں نیں۔ راہی نے پنجاب تے پنجابی زبان تے پنجابی تہذیب دا مان ودھایا اَے، تے وکھایا اَے جے نظر ڈُونگھی جاسکدی ہووے، اپنے دیس دِی تاریخ دا پتا ہووے، شاعر زمانے دِی چال نوں سمجھ سکدا ہووے تاں اوہ ''دردفراق والیاں چِٹھیاں'' توں اَگے وَدھ کے وِی شاعری کر سکدا اے۔

مینوں یاد اے۔ اَج توں چار پنج سال پہلے جدوں امرتا پریتم دِی

مشہور نظم ''اَج آکھاں وارث شاہ نوں'' ایدھر آئی سی، تے بڑے بڑے ''آکسن'' قسم دے لوکاں نوں ویکھیا جے اوہ ایس نظم دِیاں نقلاں اپنے بٹویاں دے وچ رکھدے سَن، اکلّے جا کے ایس نوں پڑھدے تے گنگناندے سَن تے نال نال روندے وی سن۔ ایہو حال احمد راہی دی ''ترنجن'' دا ہویا۔ میں نہیں جاندا جے ایہہ نظم پنڈاں دے وِچ کیکن پہنچی، پر پہنچ گئی تے میں اِک پنڈ وِچ ویکھیا جے پنڈ دِیاں کُڑیاں ڈھولکی تے آلے دوالے بیٹھ کے راہی دی ''ترنجن'' گا رہیاں نیں ہُن ایس نظم دے وِچ چھوٹے وَڈے مصرعے نیں تے میں حیران ساں جے ڈھولکی دے تال تے ایہہ نظم کس طراں جمے گی پر جم گئی۔ کُڑیاں گاندیاں رہیاں تے کُجھ دیر توں پچھے میں محسوس کیتا جے اوہناں وِچوں کجھ دِیاں آوازاں بھر رہیاں نے اوس ویلے اوہ ایہہ حصہ گا رہیاں سن۔

پُونیاں دے نال بھلیے مائے سمے نیر سُکاواں
پر ہنجو نہیں سُکدے

ہولی ہولی آوازاں کِرن لگ پئیاں، تے اخیر دے وِچ اکو کڑی گوندی رہ گئی۔ پر ایس تھاں تے آ کے اوس دا گلا وِی گھٹ گیا۔

ناں کوئی سہریاں والا آیا تے ناں وِیراں ڈولی ٹوری
جِس دے ہتھ جِدی بانہہ آئی لے گیا زور و زوری

ایہہ اوہ مقام جے جتھے وڈی تے اُچی شاعری عام لوکاں دے دِلاں دی دَھڑکن بَن جاندی اے تے جتھے آدمی سوچن لگ جاندائے جے شاعر اپنی کہہ رہیا اے یا ساری دُنیا دی کہہ رہیا اے۔ ایہہ اِک کڑی کرلائی اے یا سارے جہان دِیاں لٹیاں ہوئیاں کڑیاں ورلاپ رہیاں نیں۔ ایہہ راہی دی اِکو نظم دی مثال اے۔ کہنا ایہہ سی جے راہی صرف پڑھیاں لکھیاں پنجابیاں دا شاعر نہیں۔ اوس دی شاعری

تاں اُچی پر اوہ نیوں کے ایہہ اُچّیاں گلاں چُندائے۔
پنجاب دے وچ راہی دی اینی مقبولیت دِی کوئی وجہ وی ہونی چاہیدی اے۔ اجے اوسدی پنجابی شاعری دِی عمر اِی کیہ اے۔ پنجابی دے وچ سبھ توں پہلی چیز اوس نے فلم ''بیلی'' لئی کہی۔ ایہہ اِک گیت سی تے خورے 1948ء دِی گل اے۔ دوسری نظم 1949ء دے آخر وِچ لکھی، تے تیجی، ''ترنجن'' 1950ء دے وِچ۔ ایس توں اگلے سال راہی نے بہت ساریاں نظماں لکھیاں۔ پر اوہ سوچدا رہیا جے مشاعریاں تے مجلساں دے وِچ شعراں دی داد چنگی یا بھیڑی شاعری دی کوئی کسوٹی نہیں، تے خدا جانے میریاں نظماں دے وِچ کوئی گل بن دی وی اے یا بن دی بن دی رہ جاندی اے۔ ساڈے لوک تاں شراب دے پیالے وِچ زُلف دے پر چھاویں توں ناگ کڈھ کے خوش ہولیندے نیں، پر ہولے ہولے اوس دا اپنے آپ بھروسا ودھدا گیا۔ پچھلے سال اوس نے پنجابی شاعری نوں بہت کجھ دِتا، تے ایس اِک دو سال دِی شاعری نیں راہی نوں اوس درجے اُتے پہنچا دِتا جس ول تکّن لئی ذرا پگڑی سنبھالنی پیندی اے۔ ایس مقبولیت دی اِک وجہ تاں ایہہ جے کہ راہی نے پنجاب دے لوک گیتاں تے لوک کہانیاں نوں اپنے ذہن دے وچ رَچا تے گُھلا کے شاعری کیتی اے ''کِکلی کلیر دی''، ''ونجارا'' ''ونج کرن ونجارے''، ''چناں دے تیری چاننی''۔ ''ٹپے'' ''ماہیا'' ''بولیاں'' ایہہ سبھ ایس گل دا ثبوت نیں جے راہی نے پنجاب دے لوک گیتاں نوں سمجھیا پرکھیا تے ورتیا اے تے دُنیا دی کسے زبان تے کسے دیس دی، شاعری جدوں اپنے لوک گیتاں توں کٹ کے کجھ آکھے گی۔ تاں تاریاں تے فرشتیاں دِیاں گلاں کرے گی۔ دھرتی دی خوشبو تے اِنساناں دیاں محبتاں تے تانگھاں تے دُکھاں دے نال اوس دا کوئی واسطہ نہیں

ہووے گا۔ پنجاب دیاں لوک کہانیاں تاں احمد راہی دی پنجابی شاعری دا پس منظر نیں۔ ایہہ اِک میدان اے جیہدے اُتے راہی اپنے خیالاں دیاں رنگ رنگ دِیاں کیاریاں سجاندا اے تے پرانے کرداراں نوں ایس نویں دُنیا دے وِچ لیا کے اپنے ہر بول نوں تاریخی بنا دیندا اے۔ اسیں لوک ایہناں کرداروں نوں بڑی چنگی طرحاں پچھاندے آں ایس واسطے راہی دی گل ساڈے دِلاں وِچ کُھب کے رہ جاندی اے۔ راہی جدوں ایہہ کہندا اے:

چَھلّا ں پئی ماردی جوانی جٹّی ہیر دی
رِککلی کلیر دی
کچّے گھڑے دغا دے جاندے
پہنچ کے اَدھ وچکارے
نی مُٹیارے وَنج کرن وَنجارے
تیریاں میریاں راہواں دے وِچ
بیلے، تَھل، جَھناں
میرے ہاسے لُٹ لئے کھیڑیاں، میرے دِتے
ہونٹ پرو
میں امانت رانجھے چاک دی، ہویا میرے نال دھرو

تاں ساڈیاں اکھاں دے ساہمنے پنجاب دیس دِی تاریخ، تہذیب، پیاراں تے محبتاں دِیاں روایتاں تے کیہ کجھ نہیں آجاندا۔ اصل گل ایہہ وے، جے پنجابی زبان دے وچ شاعری کرنا ہور چیز اے تے پنجاب لئی شاعری کرنا بالکل وکھری چیز۔ راہی پنجابی زبان دے وِچ پنجاب لئی شاعری کردا اے۔

ایس دے نال اِی راہی اپنے آپ نوں کلم کلا نہیں سمجھدا۔ اوس نوں پتا اے جے پنجابی شاعری دے خزانے دے وچ بڑے بڑے لعل جواہر نیں، تے اوہناں دِی آب اج دے شاعر دی زبان تے گل کہن دے ڈھب نوں چمکا سکدی اے۔ جگہ جگہ تے تہانوں پتا چلے گا جے راہی نے کدی وارث شاہ دے اتے کدی مولوی غلام رسول دے لفظاں نوں نویں معنی دے کے ورتیا اے، اِک دو تھاواں تے مینوں ایس طرحاں لگیا۔ جے راہی، خواجہ فرید دِی ملتانی کافیاں دے سانولے رنگ نوں اپنے شعراں دے وِچ نویں شان نال تھاں دِتی اے اِک مثال دیکھو۔

سوچاں وِچ گل وَکڑیاں پاواں
اَج مَیں ہو گئی ہور دِی ہور

شاعری دے فلسفے تے فن دِیاں باریکیاں دے وِچ جان دِی ایہہ تھاں نہیں، مَیں تے دو چار موٹیاں موٹیاں گلاّں کرنیاں نیں۔ ذاتی طور تے مینوں شعر وچ تن چیزاں پیاریاں لگدیاں نیں۔ حسن تے جذبے دا ڈُونگھا مشاہدہ دُکھاں دِیاں سچیّاں تصویراں تے اپنے زمانے تے اپنی زندگی نوں بہتر بناون لئی اُمنگ تے تانگھ۔ راہی دی شاعری دے وِچ ایہہ تنے خُوبیاں نیں۔ حُسن تے جذبے دا مشاہدہ دیکھو:

اجے ہونٹھاں وِچ اَن چھوئیاں کلیاں دے رس
اجے باہواں وچ سجریاں شاخاں دی بلور
اجے ساہواں وچ سہیلیاں دے ساہواں دی ہواڑ
اجے سہیلیاں ای چن تے سہیلیاں چکور
اوہ بُلاوے تے نانہہ بولاں
وچوں پکھی وانگوں ڈولاں
پھوک دیو کھتیاں بجھا دیو تارے نی

پیار دیاں عرشاں توں واجاں کوئی مارے نی
اکلا رہیا وی نہ جائے، رل کے بہیا وی نہ جائے
دُکھ سہیاں مزہ آئے، دُکھ سہیا وی نہ جائے

دُکھاں دِیاں تے اپنے زمانے دِی حالت دِیاں تصویراں راہی دیاں اوہناں نظماں دے وِچ ویکھو جیہڑیاں ایس سرناویں توں شروع ہوندیاں نیں:

ڈاروں وِچھڑی کُونج کُرلاوے
ترنجناں چہ گون والیو!

ایہہ نظماں ساڈی ''آزادی'' دی تاریخ نیں۔ ایہہ اوہناں ''اَن کھڑے پھلاں دا قِصّہ اے جیہڑے آزادی دِی بھینٹ چڑھ گئے، تے اوہناں ''سجّرِیاں شاخاں'' دی کہانی اے جیہڑیاں آپنے ''بابل'' نال آپنا تعارف اِنج کراندیاں نیں:

آئیاں بوہے تیرے تیریاں جائیاں بابل
تیریاں لٹّیاں ہوئیاں کمائیاں بابل

ذرا ایس نظم دا مقابلہ شادی دے ایس گیت نال وی کر ویکھو جِس نوں کڑی دیاں سہیلیاں مُنڈے نوں جگاون لئی گوندیاں نیں۔ دِل تے جیہڑی سَٹ وجے گی اوہدی داد راہی نوں دیوو:

اُٹھ جاگ وے لالہ سائیاں وے
اسیں آئیاں تاں گلیاں سُہائیاں وے
اسیں نیک ماواں دِیاں جائیاں وے
اُٹھ جاگ وے لالہ!

''ترنجن'' وی ایہناں نظماں دے وِچ شامل اے جیہدے وچ

ہوراں خُوبیاں توں علاوہ پسی ہوئی کُڑی دی فریاد نوں راہی نے ایہناں چند لفظاں دے وِچ گھول کے پا دِتا اے۔

دَرداں والیے مائے

ہنجواں والیے مائے

سَدھراں والیے مائے

رِیجھاں والیے مائے

میں تاں ایہہ گل کہواں گا جے پنجابی ماں دی پوری زندگی ایہناں چار بولاں دے وچ بھر دِتی گئی اے۔ ایہناں نظماں دے وچ ''کتھے بنھ بَنیرے نیں بابلے دے''، ''کھلے رکھیں سدا بُوہے بابلا'' تے ''بوہے ہو گئے بھیڑے'' وی پڑھن دیاں چیزاں نیں، تے آخر دے وِچ کُڑی دا اوہ دُکھ جیہنوں خبر نہیں دُنیا نے کس طرحاں سہار لیا۔

رُکھ چھڈ گئے چھاواں لے گئے

کالے کوہاں تے ڈیرے نیں بابلے دے

کتھے بنھ بَنیرے نیں بابلے دے؟

کسے نوں کیہ پتا سی جے راہی جیہڑا چھوٹی عمر وِچ اپنی ماں نوں مولوی غلام رسول ہوراں دا، قصّہ ''یُوسف زلیخا'' بڑیاں عقیدتاں دے نال سناؤندا سی، تے سناؤندا سناؤندا رو وی پیندا سی تے سَوں وی جاندا سی، اوہ اگے چل کے پنجابی شاعری دِیاں بھلیاں ہوئیاں عظمتاں تے رونقاں نوں فیر زندہ کرے گا، تے ایس شان تے حُسن تے اُستادی نال زندہ کرے گا جے پنجابی بھرا پرانے قِصّیاں دے ڈھیراں وچوں سِر چُک کے اوس ول ویکھن گے تے کہن گے یارو ایہہ مُنڈا تاں سچ کجھ کہہ رہیا جے!'' راہی نے خالی شاعری نہیں، کیتی اوس نے سچ مچ کجھ کہیا جے۔ ایسے لئی اَج پرانے پرانے پنجابی شاعر وی ''دِلاں دے سودے''، تے ''ترنجن''، تے ''کھلے رکھیں سَدا بُوہے بابلا'' ورگیاں

چیزاں لکھن دِیاں کوششاں کر دے نیں تے ایہہ بڑا نیک شگن اے۔ راہی نے تاں دِی سنی ہوئی پنجابی زبان دا پاسا پرت کے جگا دِتا اے تے اوس نوں نویاں نویاں طرزاں، نویں نویں پینترے، تے نویں نویں موضوع دتے نیں۔ ایہو جیہے موضوع جیہڑے خالص پنجابی ہوندیاں ہوئیاں وی ساریاں انساناں دے موضوع نیں ...... ہنجُواں تے دیسیاں دے موضوع تاں ساری دُنیا واسطے برابر نیں۔ راہی اوس اِنسان دے ہنجُواں تے دیسیاں نوں اپنی شاعری وِچ لے آیا اے جیہڑا زندہ رہنا چاہندائے۔ زندگی دے محلاں وچوں ہنیریاں نوں نسا دینا چاہندا اے تے ساری دُنیا دے اِنساناں دے رشتیاں دیاں نینہاں نوں ''اُتوں ہور تے وِچوں ہور'' سیاست دی تھاں سوہنی، ستھری، سچری محبت تے پیار اُتے اُسارنا چاہندائے۔ راہی دی شاعری دا رَس تے چس اَجے ہور نکھرن والا اے، اوہ ہُن لمیاں نظماں وی سوچ رہیا اے تے سارا پنجاب اوس دِیاں لمیاں نظماں دی راہ تک رہیا اے۔ راہی دی اِک اپنی نظم ''نمی نمی واہ وگ دی'' دے وِچ جے ''نمی نمی وا'' نوں اوس دی شاعری کہہ لتا جاوے تاں فیر میں اوس دی شاعری دے اثر ہیٹھاں سارے پنجاب دِی حالت اوسے دے شعر وچ ایس طرحاں بیان کراں گا۔

رُکھ ڈولدے تے اَکھ نہیں لگ دی
نمی نمی وا وگ دی

احمد ندیم قاسمی

لاہور 12 دسمبر 1952ء

ندیم کی عائلی زندگی پر ایک نِگاہ دوڑائی جائے تو اُن کی اہلیہ رابعہ ندیم 1930ء میں پیدا ہوئیں اور 1992ء میں فوت ہوئیں۔ اُنھیں اُن کی رہائش گاہ کے قریب قبرستان میں دفن کیا گیا۔ اُن سے دو بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ ناہید قاسمی پیدائش 1949ء اور نشاط خالد پیدائش

1951ء۔نشاط 1955ء میں فوت ہوگئیں۔ایک بیٹا ہے نعمان ندیم قاسمی، پیدائش 1956ء، ناہید قاسمی جو ڈاکٹر بھی ہیں اور اُردو زبان کی ایک اچھی شاعرہ بھی، آج کل اپنے والد کے کام کی ترتیب و تروین میں جُتی ہوئی ہیں۔اُن کی دو منہ بولی بیٹیاں بھی ہیں ...... پروین شاکر اور منصورہ احمد، پروین شاکر اُن کی زندگی ہی میں ایک ٹریفک حادثے میں وفات پا گئیں جبکہ منصورہ احمد نے اُن کی وفات کے بعد انتقال کیا۔منصورہ احمد نے اُن کی وفات کے بعد ایک سہ ماہی مجلہ ''مونتاج'' کا اجرا کیا جس کا پہلا شمارہ ''نذرِ احمد ندیم قاسمی'' تھا۔اُن کا اپنے ایک ملازم ارشاد سے بھی گہرا پیار تھا۔ارشاد بہت چھوٹی عمر ہی سے ٹی وی اداکارہ عظمیٰ گیلانی کے ہاں ملازم تھا۔وہ بھی ارشاد کو بچوں کے مانند پیار کرتی تھیں۔ارشاد ابھی لڑکپن ہی میں تھا کہ قاسمی صاحب اُسے مجلس ترقی ادب میں لے آئے۔کلب روڈ پر واقع اس عمارت میں ایک پرانا حصہ بطور سرونٹ کوارٹر ارشاد کو الاٹ کر دیا گیا۔قاسمی صاحب نے بطور ڈائریکٹر مجلس ترقی ادب ایک تحریر جاری کی کہ جب تک ارشاد مجلس ترقی ادب کا ملازم رہے گا، اُسے اس کوارٹر سے بیدخل نہیں کیا جائے گا۔لیکن ارشاد کے آج کے حالات دیکھ کر منٹو کی وہ تحریر نظروں کے سامنے آ جاتی ہے جو قائداعظم کے ڈرائیور کے حالات، قائداعظم کی زندگی میں اور اُن کی زندگی کے بعد سے متعلق تھی۔ارشاد آج بھی اپنے اس کوارٹر میں قاسمی صاحب اور منصورہ احمد کے ساتھ خاص قسم کی عقیدت لیے بیٹھا زندگی کے دن گن رہا ہے۔

ندیم نے اُردو زبان میں شعری اور نثری اصناف پر کام کیا۔نثر کی ایک صنف ''سوانحی خاکے'' بھی اُن کے زیرِ قلم رہی ہے۔ذیل میں اُن کی ایک تحریر میں سے یہ اقتباس درج ہے جو سیّد ضمیر جعفری سے متعلق ہے:

> ''ہم دونوں، ضمیر اور میں، اختر شیرانی کے غیر مشروط عقیدت مندوں میں شامل تھے۔اختر عموماً عالمِ سرخوشی میں رہتے تھے مگر اُنھیں ہم دونوں کی شاعرانہ صلاحیتوں کا اندازہ تھا۔چنانچہ وہ ہمارے ساتھ بے پناہ شفقت اور اپنائیت سے پیش آتے تھے۔ضمیر ان دنوں اسلامیہ کالج کے طالب علم تھے۔وہ میری طرح اختر کے یہاں باقاعدگی سے حاضری دیتے تھے۔

مجھے اس زمانے کی ایک رات یاد ہے جب اختر شیرانی نے بے پناہ پی رکھی تھی۔ گیارہ بجے رات کا عمل ہوگا جب ہم دونوں اختر کو تھامے فلیمنگ روڈ پر اُن کے گھر لائے۔ اپنے کمرے میں، جو رسالہ ''رومان'' کا دفتر بھی تھا، اختر نے مجھ سے فرمائش کی کہ اُن کی کوئی نظم ترنّم سے سناؤں— ''ترنّم سے؟'' —میں نے بڑی مشکل سے اپنی ہنسی کو روکا اور عرض کیا کہ میں تو ترنّم کی ابجد سے بھی ناواقف ہوں۔ میرا گلا تو اتنا خراب ہے کہ تنہائی میں بھی گنگناؤں تو اپنے آپ سے شرما جاتا ہوں۔ تب اختر شیرانی ضمیر کی طرف متوجہ ہوئے اور بولے ''ندیم کو معاف کیا مگر ضمیر کا کوئی بہانا نہیں چلے گا۔ گاؤ ضمیر ہماری نظم گاؤ۔ ''اے عشق کہیں لے چل —کس حال میں ہیں یارانِ وطن — جہاں ریحانہ رہتی تھی— دیارِ حضرت سلمٰی کی سمت جاتا ہوں— چلو سناؤ!!'' اور ضمیر گانے لگے۔

یہ ترنّم اس ترنّم سے بہت مختلف تھا جس میں وہ بعد میں اپنا مزاحیہ کلام سناتے رہے اور میں سوچتا رہتا تھا کہ اُن کے کلام کے مزاح پر اُن کے ترنّم کا مزاح سونے پر سہاگے کا کام کر رہا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ ضمیر اُن دنوں نوجوان تھے۔ گلے میں توانائی اور صفائی تھی اور وہ اختر شیرانی کی نظموں کی فضا سے بھی مسحور تھے، چنانچہ اُنھوں نے جب اختر شیرانی کی ایک نظم ایسے دلآویز ترنم میں پڑھی تو اختر شیرانی متاثر ہو کر رونے لگے اور میں طلسم زدہ ہو کر رہ گیا۔

اُن دنوں ضمیر کے سر پر طرّے دار پگڑی ہوتی تھی۔ میں بھی طرّے دار پگڑی باندھتا تھا۔ ہم اپنے ضلعوں کے لحاظ سے پڑوسی بھی تھے۔ وہ جہلمی، میں سرگودھوی۔ ہمارا پنجابی کا لہجہ بھی خاصا مماثل تھا اور ہم دونوں جب اختر کے ہاں حاضر ہوتے تھے تو اختر کہتے تھے ''وہ آ گئے میرے طرّے دار دوست!''

یہ آج سے کم و بیش نِصف صدی پہلے کا ذکر ہے اور کسی شخص کو پرکھنے کے لیے یہ مدت بہت کافی ہے۔ضمیر اور میں اپنی مصروفیتوں اور دلچسپیوں کے لحاظ سے خاصے دُور رہے مگر ہمارے قلب و ذہن کا قرب، جو کم و بیش نصف صدی پر محیط ہے، ہم دونوں کا عزیز ترین سرمایہ رہا۔ ایسے کھرے سونے کے سے تابندہ اور درخشندہ انسان میرے تجربے میں سے بہت کم گزرے ہیں۔ ننھی ننھی کمزوریاں سبھی میں ہوتی ہیں۔ یہ کمزوریاں ہماری انسانیت کی پہچان ہیں۔ مجھے تو ضمیر کے سے پیارے انسانوں کی کمزوریوں پر بھی پیار آتا ہے۔مگر ضمیر کا مزاح اور کردار اتنی بہت سی خوبیوں سے لدا پھندا وار بھرا پڑا تھا کہ میں اُنھیں محبتوں کا کروڑ پتی کہتا تھا۔

محبت اور اپنائیت جیسے اُن کی گھٹی میں پڑی ہوں۔ مجھے اُس شخص پر رحم آتا ہے جسے ضمیر سے تعارف کے بعد ضمیر کی اپنائیت نہ ملی۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ خود اس کے اندر اس جذب کا فقدان تھا جس سے ضمیر کا وجود چھلکتا رہتا تھا۔ وہ دو ایک بار متعارف ہونے والوں سے بھی اس قدر قربت کے جذبے سے بات کرتے تھے کہ مخاطب یوں محسوس کرتا تھا جیسے اسے اپنا کوئی کھویا ہوا بھائی مل گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری ادبی دُنیا میں جو بے شمار حلقے اور گروہ بلکہ فرقے بنے ہوئے ہیں، ان سب میں ضمیر مقبول تھے کہ وہ کسی کا دل نہیں دُکھاتے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ اپنی ملازمت کے دوران بھی وہ اس طرح غیر مشروط طور پر ہردلعزیز رہے ہوں گے۔‘‘

قاسمی صاحب کی تحریروں کا ایک بڑا حصہ اپنے وقت کے اہم ترین ادبی جرائد کی زینت بنا اور بعدازاں وہ کتابی شکل میں بھی شائع ہوا۔اس کے باوجوداُن کی تحریروں کا ایک بڑا حصہ ابھی تک کتابی شکل میں شائع نہیں ہوا۔اُن کی بیٹی ڈاکٹر ناہید قاسمی اُن کے کچھ کام کو ازسرِنو شائع کرنے کی کوشش کر رہی ہیں لیکن اگر وہ ان کی وہ تحریریں بھی جو کبھی کتابی شکل

میں نہیں آئیں، شائع کرنے کا انتظام کریں تو زیادہ بہتر ہوگا۔ اُن کی کتابوں اور دیگر اعزازات کی ایک تفصیل صحیفہ ''احمد ندیم قاسمی نمبر'' (ص۔ 7) پر یوں درج ہیں:

اُن کے سترہ افسانوی مجموعوں میں چوپال (دارالاشاعت پنجاب لاہور 1939ء)، بگولے (مکتبہ اُردو لاہور 1941ء)، طلوع و غروب (مکتبہ اُردو لاہور 1942ء)، گرداب (ادارہ اشاعت اُردو حیدر آباد دکن 1943ء)، سیلاب (ادارہ اشاعت اُردو حیدر آباد دکن 1943ء)، آنچل (ادارہ فروغ اُردو لاہور 1944ء)، آبلے (ادارہ فروغ اُردو لاہور 1946ء)، آس پاس (مکتبہ فسانہ خواں، لاہور 1948ء)، در و دیوار (مکتبہ اُردو لاہور 1948ء)، سناٹا (نیا ادارہ لاہور 1952ء)، بازار حیات (ادارہ فروغ اُردو لاہور 1959ء)، برگِ حنا (ناشرین، لاہور 1959ء)، سیلاب و گرداب (مکتبہ کارواں، لاہور 1961ء)، گھر سے گھر تک (راول کتاب گھر، راولپنڈی 1963ء)، کپاس کا پھول (مکتبہ فنون، لاہور 1973ء)، نیلا پتھر (غالب پبلشرز، لاہور 1980ء)، کوہ پیما (اساطیر، لاہور 1995ء)، آٹھ شعری مجموعوں میں دھڑکنیں (قطعات اُردو اکیڈمی لاہور 1942ء)، رِم جھم (قطعات و رُباعیات، ادارہ فروغ اُردو لاہور 1944ء)، جلال و جمال (شاعری۔ نیا ادارہ لاہور 1946ء)، شعلۂ گل (قومی دارالاشاعت لاہور 1953ء)، دشتِ وفا (کتاب نما لاہور 1963ء)، محیط (التحریر، لاہور 1976ء)، دوام (مطبوعات لاہور 1979ء)، لوح و خاک (اساطیر لاہور 1988ء) شامل ہیں، ان کے علاوہ تین تحقیقی وتنقیدی مجموعوں کے نام یہ ہیں: تہذیب وفن (پاکستان فاؤنڈیشن لاہور 1975ء)، ادب اور تعلیم کے رشتے (التحریر، لاہور 1974ء) اور علامہ محمد اقبالؒ 64-1940ء کے دوران میں اُنھوں نے پانچ فلموں کے مکالمے اور گیت بھی لکھے۔

احمد ندیم قاسمی کی ترتیب و ترجمہ کردہ کتب میں انگڑائیاں (مرد افسانہ نگاروں کا انتخاب، ادارہ اشاعت اُردو حیدر آباد دکن 1944ء)، نقوش لطیف (خواتین افسانہ نگاروں کا انتخاب، ادارہ اشاعت اُردو حیدر آباد دکن 1944ء)، پاکستان کی لوک کہانیاں (از: میریلن سرچ، ترجمہ شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور)، کیسر کیاری (مضامین، ڈرامے، تراجم، مکتبہ شعر و ادب لاہور 1944ء)، منٹو کے خطوط بنام احمد ندیم قاسمی (ترتیب، کتاب نما لاہور 1966ء)، نذرِ

حمید احمد خاں (ترتیب مجلس ترقی ادب لاہور 1977ء) اور میرے ہم سفر شامل ہیں۔ اُنھوں نے بچوں کا ادب بھی تخلیق کیا، تین ناٹک (پنجاب بک ایجنسی، لاہور 1944ء) دوستوں کی کہانیاں (پنجاب بک ایجنسی، لاہور 1944ء) اور نئی نویلی کہانیاں (پنجاب بک ایجنسی لاہور 1944ء) کے عنوان سے اُن کی کتب نے بچوں میں خاصی مقبولیت پائی۔

احمد ندیم قاسمی سے متعلق متعدد کتابیں اور ادبی جرائد کے خصوصی نمبر شائع ہو چکے ہیں جن میں ندیم کی شاعری اور شخصیت (تحقیق) جمیل ملک، احمد ندیم قاسمی کے بہترین افسانے مرتبہ مظفر علی سیّد، ندیم نامہ مرتب محمد طفیل، بشیر موجد (مجلس ارباب فن، لاہور 1974ء) مٹی کا سمندر، مرتبہ ضیا ساجد (مکتبہ القریش لاہور 1991ء)، احمد ندیم قاسمی...... ایک لیجنڈ از شکیل الرحمن (اساطیر لاہور) ندیم نمبر (مرتب: صہبا لکھنوی، ماہنامہ افکار کراچی 1976ء)، احمد ندیم قاسمی: شخصیت اور فن مرتبہ: نندکشور وکرم (عالمی اُردو ادب دہلی 1996ء) سہ ماہی ''مونتاج'' نذرِ ندیم مدیر: منصورہ احمد (جنوری تا اگست 2007ء) اور ہندی میں ''اُردو کہانی کار احمد ندیم قاسمی'' مرتبہ: نندکشور وکرم، اندر پرتھ پرکاش دہلی، قابلِ ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ انگریزی، رُوسی، چینی، جاپانی، ہندی، پنجابی، بنگلہ، سندھی، گجراتی، مراٹھی اور فارسی میں اُن کی کہانیوں اور شاعری کے تراجم ہو چکے ہیں۔

اُنھیں دیے جانے والے اعزازات و انعامات میں آدم جی ادبی ایوارڈ برائے دشتِ وفا (شاعری 1963ء)، آدم جی ادبی ایوارڈ برائے محیط (شاعری 1976ء)، آدم جی ادبی ایوارڈ برائے دوام (شاعری 1979ء)، پرائیڈ آف پرفارمنس حکومتِ پاکستان کا سول اعزاز (1968ء)، ستارۂ امتیاز حکومتِ پاکستان کا اعلیٰ ترین سول اعزاز (1980ء)، کمالِ فن ایوارڈ (1997ء)، نشانِ امتیاز (1999ء) اور عالمی فروغِ اُردو ادب ایوارڈ (دوحہ قطر)

قاسمی صاحب جب تک ڈائریکٹر مجلس ترقی ادب رہے، ادب سے نا آشنا نوکر شاہی کی ریشہ دوانیوں کا سامنا رہا...... یہاں تک کہ جنرل مشرف کے دورِ حکومت میں اُنھیں بیوروکریٹ افسران کے جاہلانہ رویے کے باعث استعفیٰ دینا پڑا اور اُن کی الٹی سیدھی باتوں کے باعث ہسپتال داخل ہونا پڑا۔ قاسمی صاحب کے استعفیٰ نے پورے ملک میں ہلچل مچا دی۔ پھر اُس وقت کے وزیرِ اعظم شوکت عزیز کی درخواست پر اُنھوں نے استعفیٰ واپس لے لیا۔ اُن

کے ساتھ یہ معاملات کس قدر پرانے اور گمبھیر تھے، اس کا اندازہ مسعود اشعر کے مضمون کے آخری حصّے سے لگایا جاسکتا ہے۔ یہ مضمون ''آخری ملاقات'' کے عنوان سے صحیفہ (احمد ندیم قاسمی، صفحہ 184) میں چھپا۔

''قاسمی صاحب کے اور بھی غصے ہم نے دیکھے مگر جس غصے نے اُنھیں آخری عمر میں تنگ کیا وہ مجلس ترقی ادب کی عمارت کے سلسلے میں تھا۔ یہ غصہ اُنھیں اُس وقت آیا جب نظریۂ پاکستان کے ٹھیکیداروں نے نرسنگھ داس گارڈن کا حلیہ بگاڑنے کی کوشش کی تھی۔ یہ وہ کوٹھی ہے جس میں مجلس ترقی ادب، بزمِ اقبالؒ اور ادارہ ثقافتِ اسلامیہ کے دفاتر ہیں۔ کئی ایکڑ میں پھیلی ایک سو سال سے زیادہ پرانی اس سرسبز و شاداب کوٹھی پر ہمیشہ سے بہت سے مقتدر لوگوں کی نظر تھی، لیکن اس کوٹھی کی بدقسمتی کہ غلام حیدر وائیں پنجاب کے وزیر اعلیٰ بن گئے۔ وہ اپنے آپ کو تحریکِ پاکستان کا بہت بڑا کارکن سمجھتے تھے۔ اُن کے پاس اور تو کرنے کو کچھ تھا نہیں (اُن کا کام وہ لوگ کرتے تھے جنھوں نے اُنھیں وزیر اعلیٰ بنایا تھا)، اس لیے اُنھوں نے سیدھے سادے عوام کو خوش کرنے کی غرض سے نظریۂ پاکستان اور کارکنانِ تحریکِ پاکستان کا ڈھنڈورا پیٹنا شروع کر دیا۔ اب ان کارکنانِ تحریکِ پاکستان کو اپنا کام کرنے کے لیے کوئی جگہ بھی چاہیے تھی۔ اُنھوں نے نرسنگھ داس گارڈن کی تاریخی اہمیت اور اس کی خوب صورتی کا خیال کیے بغیر اس پر قبضہ کرنے کی ٹھان لی اور ایک دن اُنھوں نے مال روڈ کے ساتھ ملنے والے باغ کے ایک حصّے پر قبضہ بھی کر لیا اور وہاں عمارت بنانا شروع کر دی۔ قاسمی صاحب کو طیش آ گیا۔ وہ اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ اُن کی مخالفت اصولی تھی کہ ایک دِل کشا ہرے بھرے باغ میں، اس کوٹھی کو، جس کی تاریخی اہمیت بھی ہے، کیوں غارت کیا جا رہا ہے؟ اُن کا کہنا تھا کہ اگر کارکنانِ تحریک

پاکستان کے لیے کوئی عمارت بنانا ہی ہے تو کسی اور جگہ بنا لو۔ کیا ضروری ہے کہ تاریخ کو مسخ کیا جائے۔ لیکن حکومت اپنے اقتدار کے نشے میں سب کچھ بھول چکی تھی، اوّل تو اس باغ کا ایک بڑا قطعہ مفت ہی ہضم کرنے کی کوشش کی گئی مگر جب قاسمی صاحب نے بزمِ اقبالؒ اور ادارہ ثقافت اسلامیہ کے سربراہوں کے ساتھ مل کر یہ مؤقف پیش کیا کہ یہ کوٹھی ان اداروں کی ملکیت ہے تو اُن کے آنسو پونچھنے کے لیے کچھ رقم اُنھیں دے دی گئی۔ قاسمی صاحب اس کے بعد بھی اس باغ کو اُجاڑنے کی مخالفت کرتے رہے۔ ظاہر ہے اس کوٹھی کے ساتھ قاسمی صاحب کا اپنا کوئی ذاتی مفاد وابستہ نہیں تھا۔ وہ تو ایک اصول کے لیے لڑ رہے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی نوکر شاہی قاسمی صاحب کے خلاف ہوگئی۔ بھلا افسر یہ کیسے برداشت کر سکتے تھے کہ کوئی اُن کے راستے کی رکاوٹ بنے اور افسر حکومت کے ملازم ہوتے ہیں۔ جو بھی اقتدار میں ہوگا، وہ اُسی کی مانیں گے۔ اس لیے میرا تو خیال یہ ہے کہ بعد میں مجلس ترقی ادب کی سربراہی کے سلسلے میں سرکاری افسروں نے قاسمی صاحب کو جس طرح تنگ کیا، اس کی وجہ بھی یہی جھگڑا تھا۔ اب جہاں تک مجلس ترقی ادب کی سربراہی کا قصہ ہے: وہ ایک سیدھا سادہ معاملہ تھا۔ مجلس کا سربراہ تاحیات ہوتا ہے۔ بری یا بھلی، یہ ایک روایت ہے۔ آخر سیّد امتیاز علی تاج اور پروفیسر حمید احمد خان تاحیات سربراہ رہے تو اب یہ روایت کیوں توڑی جا رہی تھی؟ یہ انتہائی تکلیف دہ صورتِ حال تھی جس کا سامنا قاسمی صاحب کو آخری عمر میں کرنا پڑا اور یہ وہ زمانہ تھا جب ان کی طبیعت مستقل خراب رہنے لگی تھی۔ اس تنازع نے اُن کی صحت پر اور بھی برا اثر ڈالا۔

اس عمارت کے سلسلے میں مجھے ایک اور واقعہ بھی یاد آ رہا ہے۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ اس عمارت پر کس کس کی نظر تھی اور قاسمی صاحب نے

اسے بری نظر سے بچانے کے لیے کیسی کیسی کوششیں کیں۔ ایک بار ہم قاسمی صاحب کے پاس بیٹھے تھے تو ایک صاحب اندر آئے اور سلام کر کے بیٹھ گئے۔ قاسمی صاحب نے پوچھا کیسے تشریف لائے؟ تو کہنے لگے اگر آپ ہماری بات مان لیں تو ہم اس جگہ ایک بہت عالی شان پلازا تعمیر کر دیں گے۔ اس میں آپ کو بھی ایک شاندار دفتر دے دیا جائے گا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ قاسمی صاحب کو لالچ دے رہے تھے۔ لیکن اِدھر وہ صاحب اپنا پلان بتا رہے تھے اور اُدھر قاسمی صاحب کا چہرہ سرخ ہوتا جا رہا تھا۔ لگتا تھا کہ قاسمی صاحب ابھی غصے میں کھڑے ہو کر اس شخص کا منہ نوچ لیں گے۔ پہلے تو قاسمی صاحب سنتے رہے، پھر اپنے غصے پر قابو پانے کے لیے اُن صاحب کی طرف سے منہ پھر لیا۔ باقی کام منصورہ نے کیا اور وہ صاحب برا سا منہ بنا کر چلے گئے۔ وہ چلے گئے تو قاسمی صاحب نے کہا: اُنھیں کسی کی طرف سے بھیجا گیا تھا۔ ان تمام کڑوی کسیلی باتوں کے باوجود اُن کے مزاج میں کڑواہٹ نہیں آئی تھی۔ ہم (میں اور کاظم صاحب) جب بھی اُن کے پاس جاتے، وہ اسی طرح خوش گوار موڈ میں نظر آتے۔ اُن کا ہنسی مذاق اور اُن کے لطیفے اسی طرح چلتے رہتے، لیکن اس دن وہ واقعی بہت بے چین تھے۔ فراز نے ہنسی مذاق کرنے کی کوشش بھی کی مگر ان کے چہرے سے پریشانی دُور نہیں ہوئی۔ وہ بار بار کرسی سے اٹھنے کی کوشش کر رہے تھے اور آخر وہ کھڑے ہو گئے۔ کہنے لگے ''آپ لوگ بیٹھیں، میں ڈینٹل سرجن کے پاس جا رہا ہوں۔'' اور وہ چلے گئے۔

یہ اُن سے آخری ملاقات تھی، اور میرے دماغ پر وہ منظر ہمیشہ کے لیے نقش ہو گیا جب وہ ذرا سے جھکے ہوئے اپنے کمرے سے باہر جا رہے تھے۔''

قاسمی صاحب کو دمے کا مرض لاحق تھا۔ اسی مرض کے باعث 10 جولائی 2006ء کو

وہ اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ اُن کے جنازے میں اس وقت کے بڑے بڑے ادبی اور سیاسی لوگوں نے شرکت کی۔ سمن آباد میں موجود ان کے پرانے گھر کے باہر کھڑے ایک بڑے سیاستدان نے کہا کہ یہ عظیم شخص اگر دُنیا کے کسی اور ملک میں ہوتا تو اس کے محلات نما گھر ہوتے۔ پاس کھڑے ارشاد نے دل میں کہا کہ جناب کئی مرتبہ آپ کی جماعت بھی برسرِ اقتدار رہی ہے۔ آپ ہی اس عظیم شخص کو اس کا جائز مقام دلوا دیتے۔ دو نظمیں جو مشہور ہندوستانی شاعر گلزار نے اُن کی وفات کے بعد کہیں:

کچھ دن پہلے......

کچھ دن پہلے......
پاکستان میں بابا رہتے تھے
لاہور بڑا اپنا لگتا تھا
آخری بار آواز سنی تھی بابا کی
"گرمی ہے، اِک بارش ہو جائے تو
میری سانس بھی بہتر ہو جائے گی
گرمی سے تو سانسیں گھٹنے لگتی ہیں
سانس ہی توڑ ڈالی بابا نے!

کوئی نہیں اب شہر میں اپنا
شہر لاہور اب صرف پڑوسی لگتا ہے!

میں نے سوچا تھا

میں نے سوچا تھا، مسیحا جو زمانے کو شفا دیتا ہے
وہ جو سہلاتا ہے سب وقت کے درد اور مٹا دیتا ہے
شعروں میں گوندھ کے اُمید و قرار
نظم کے کوزے میں تسکین پلاتا ہے ہمیشہ

وہ مسیحا ہے، اسے کچھ بھی نہیں ہونے والا!
آج لاہور میں، وہ میرا مسیحا
اپنے ہی جسم پہ مصلوب ہوا!!

اُن کی قبر کا کتبہ درج ذیل ہے:

یااللہ　　لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ　　یا محمدؐ

شاعر، ادیب، دانشور
پیرزادہ احمد شاہ
ولد پیر غلام نبی
پیدائش 20 نومبر 1916ء
وفات 10 جولائی 2006ء (بروز سوموار)
بمطابق 12 جمادی الثانی 1427ھ
میں مر بھی جاؤں تو تخلیق سے نہ باز آؤں
بنیں گے نِت نئے خاکے مرے غبار سے
(ندیم)

آغا شورش کاشمیری

1917ء-1975ء

بڑے بے باک ہو اِس دور میں بھی حضرت شورش
جو کچھ لکھتے ہو، سوچا ہے کبھی اُس کی سزا کیا ہے
شورش

آغا شورش کاشمیری کا شمار ایسی ہمہ جہت شخصیات میں ہوتا ہے جو کہ بیک وقت کئی خوبیوں کے مالک تھیں۔ اُنھیں اپنے وقت کے شُعلہ بیان مُقررین میں سرِفہرست گِنا جاتا تھا۔ وہ ایک مُفکر، ادیب، شاعر، مدیر، تحریکِ آزادی کے صفِ اوّل کے کارکن اور ایک سیاستدان کے طور پر جانے جاتے تھے۔

اُن کا پیدائشی نام آغا عبدالکریم تھا۔لیکن ادبی زندگی کے باعث تمام عمر آغا شورش کاشمیری کے نام سے معروف رہے۔ وہ 14 اگست 1917ء کو امرتسر (پنجاب۔متحدہ ہندوستان) میں پیدا ہوئے۔ ایم آر شاہد نے اپنی کتاب ''لاہور میں مدفون مشاہیر'' میں ان کے بچپن کے بارے میں کچھ یوں تحریر کیا ہے:

''یہ پہلی جنگِ عظیم کا زمانہ تھا۔ اُن کے پردادا سری نگر سے نقل مکانی کر کے امرتسر آئے تھے۔ پھر کچھ عرصہ بعد لاہور چلے آئے۔ اُنھوں نے دیوسماج ہائی سکول میں میٹرک تک تعلیم حاصل کی۔''

لاہور ہمیشہ سے فنونِ لطیفہ کا مرکز رہا ہے۔ انگریز سرکار کے عہد میں یہاں ہر جانب اُردو کا دور دورہ تھا۔ اُس وقت پورے ہندوستان کے اُن شہروں میں جن میں سیاسی سرگرمیاں عروج پر تھیں، لاہور بھی شامل تھا۔ آغا شورش نے 1935ء میں جب اُن کی عمر صرف اٹھارہ برس تھی، اپنے سیاسی سفر کا آغاز اپنی تاریخی تقریر سے کیا جو شہید گنج کانفرنس کے

موقع پر کی گئی تھی۔ اُس کانفرنس کی صدارت مولانا ظفر علی خان نے کی تھی۔ اس کے بعد آپ تحریکِ آزادی کے پُرجوش کارکن بن کے اُبھرے۔ وہ سیاست کی باریکیوں کا علم رکھتے تھے اور مذہب کے نام پر سیاست کرنے والوں کو آڑے ہاتھوں لیا کرتے تھے۔ سیاست کی یہ سمجھ بوجھ اُن کی درجِ ذیل نظم میں نمایاں ہے:

سیاست

ہم نے اُس وقت سیاست میں قدم رکھا تھا
جب سیاست کا صِلہ آہنی زنجیریں تھیں
سرفروشوں کے لیے دار و رسن قائم تھے
خان زادوں کے لیے مُفت کی جاگیریں تھیں
بے گناہوں کا لہو عام تھا بازاروں میں
خونِ احرار میں ڈُوبی ہوئی شمشیریں تھیں
از اُفق تا بہ اُفق خوف کا سناٹا تھا
رات کی قید میں خورشید کی تنویریں تھیں
رہنماؤں کے لیے حکمِ زباں بندی تھا
جُرم بے جُرم کی پاداش میں تعزیریں تھیں
جانشینانِ کلائیو تھے خداوندِ مجاز
سرِّ توحید کی برطانوی تفسیریں تھیں
حیف اب وقت کے غدّار بھی رُستم ٹھہرے
اور زنداں کے سزا وار فقط ہم ٹھہرے

اُن میں قُدرتی طور پر موجود تین خوبیوں کو چار چاند اُس وقت لگے جب ان تینوں میں الگ الگ شخصیات کی اثر انگیزی دیکھنے کو ملی۔ اُن کی نثر نگاری، مضمون نگاری اور کالم نگاری پر مولانا عبدالکلام آزاد کی تحریروں کے اَثرات تھے۔ فنِ تقریر کے حوالے سے وہ سیّد عبداللہ شاہ غازی کے ساتھ کھڑے دِکھائی دیتے ہیں۔ شاعری میں مولانا ظفر علی خاں کا رویہ اور انداز نظر آتا ہے۔ مولانا کے علاوہ وہ اختر شیرانی سے انتہائی متاثر تھے کیونکہ اس عہد کا ہر

غزل گو شاعر اختر شیرانی سے متاثر تھا۔ اختر کی سلمٰی کے مانند اُن کی شاعری میں بھی جابجا ربیعہ کا استعارہ موجود ہے۔ شاعری کے حوالے سے شورش کُلی طور پر جن شعرا سے متاثر تھے۔ اُن کا اشارہ شورش کی ایک تحریر گفتنی ناگفتنی کے دیباچے میں موجود ہے:

''ولی، میر، سودا، درد، مظہر جان جاں، مصحفی، غالب، مومن، شیفتہ، آتش، حالی اور داغ کے بعد خود اقبالؒ، شاد، چکبست، حسرت، فانی، یگانہ، احسان دانش، اصغر، جگر، حفیظ، اثر اور فراق نے اس کو چار چاند لگا دیے، اساتذہ کا یہ رنگ قدرے شوخ ہو کر بعض نوجوانوں میں منتقل ہوا، جن میں عابد علی عابد، سیف الدین سیف، ناصر کاظمی، قیوم نظر، احمد ندیم قاسمی، مُعین الدین جذبی، ساحر لُدھیانوی، اسرار الحق مجاز، عبدالحمید عدم اور ظہیر کاشمیری معروف ہیں۔

بظاہر داغ کے بعد غزل کو جینا نہ چاہیے تھا۔ لیکن حسرت نے جو سنبھالا دیا، پھر اصغر گونڈوی اور فانی بدایونی نے جو شکوہ پیدا کیا، اُس سے غزل گونج اٹھی۔ اُن کے ہمرکاب حفیظ جالندھری، جگر مراد آبادی اور احسان دانش بھی تھے۔ اُن کی ساکھ سے غزل کی ساکھ بڑھی۔ فراق نے اِس میں لوچ پیدا کیا۔ جن نوجوانوں کو اب شہرت ہوئی ہے، اُن میں عدم کے ہاں تیکھا پن ہے لیکن خرابات کے بعد تلچھٹ زیادہ ہے۔ ناصر کاظمی میں بڑی جان ہے لیکن ظہیر کاشمیری میں عمق ہے۔ قاسمی ہمہ گیر خصوصیت کے شاعر تھے مگر اُن کی فکر اشتمالیت سے زنگ آلود ہوگئی۔ جذبی و مجاز اپنے تمام احترام کے باوجود تقریباً چالیس مصرعوں اور بیس شعروں کے شاعر ہیں۔ عابد علی عابد کے اُفقِ شعر پر مہتابی روشنی ہے لیکن سیف میں جو بات ہے وہ اُن کے کسی ہم عصر میں نہیں۔ حفیظ ہوشیار پوری کا نام تغزل میں سرِ فہرست آ سکتا ہے مگر اُنھیں ریڈیو نے گُم کر رکھا ہے......!

ایک شاعر کا ذکر ابھی تک اس سارے تذکرے میں نہیں آیا اور وہ اختر

شیرانی ہیں وہ بظاہر رواجی غزل اور رواجی نظم دونوں کے شاعر تھے لیکن اُنھوں نے نہ صرف نظم میں تغزل سمویا بلکہ اپنے اجتہاد سے ایک ایسی راہ لی جس کے بانی اور خاتم بھی وہ خود ہی ہیں۔ اُنھوں نے عربی اور ہندی شاعری کی تقلید میں اُردو شاعری کو عورت کے تصور سے آشنا کیا جس سے پہلی دفعہ یہ بات منظرِ عام پر آئی کہ اُردو میں بھی عورت سے عشق ہوسکتا ہے۔ اُن کا انداز اتنا منفرد ہے کہ اس کی رِیس ناممکن ہے بعض نوجوانوں نے ابتدا میں نقل اتارنا چاہی لیکن بالآخر سپرانداز ہوگئے بلکہ اپنی راہ بھی بھول گئے۔

جن شعراء نے راقم کے ذوقِ شعر پر اثر ڈالا، ان میں اختر شیرانی بھی ہیں۔ ہیں ہی نہیں بلکہ چھائے ہوئے ہیں۔ مرحوم اپنے سوا کسی کو شاعر نہ مانتے تھے۔ یہ انا تقریباً ہر شاعر میں ہوتی ہے، اختر شیرانی تو بہرحال اختر شیرانی تھے، اُنھوں نے جتنے موضوع انتخاب کیے، اتنے ہی ریشمیں الفاظ چُنے۔ اُن کا شعری عقیدہ تھا کہ نظم یا غزل موضوع یا مضمون اپنے لیے خاص قسم کے الفاظ چاہتے ہیں، اُن کے نزدیک غزل، نظم، قصیدہ، ہجو، مرثیہ، اِن سب کی زبانیں مختلف تھیں۔ وہ پہلے صورت پر زور دیتے پھر سیرت کو لیتے، اُن کی نظموں کی واحد خصوصیت یہ ہے کہ وہ ملائم سے ملائم الفاظ برتتے اور کنوارے کنوارے لہجے میں شعر کہتے ہیں۔

گفتنی و ناگفتنی کی بیشتر نظمیں اُن کے انداز پر ہیں۔ مثلاً ربیعہ پر جتنی نظمیں یا سانیٹ موزوں ہوئے ہیں، اُن کا سانچا اختر سے مُستعار ہے۔ فرق یہی ہے کہ اس میں کہیں کہیں سیاست کی تلخی آ گئی ہے جو اختر کے ہاں عیب ہے۔ اُن کے نزدیک سیاست اور عشق دو مختلف راستے تھے۔ میرے نزدیک ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں۔ لیکن اختر کی سلمٰی کا وجود ہے ربیعہ کا کوئی وجود نہیں۔ وہ مجھے ایک شعری پیکر

ہے، جسے حُسن کے احساس اور عشق کے اظہار نے ذہن کی جمالیاتی حسیات کے تحت تخلیق کیا ہے۔ جن دنوں ربیعہ پر نغمہ سرائی کا زور تھا، اُن دنوں مختلف دوستوں نے مختلف افسانے تراش رکھے تھے۔ وہ اس ٹوہ میں دُور تک نکل گئے کہ کہیں سے کوئی گھونگھٹ اُلٹیں اور ربیعہ کا چہرہ دیکھ لیں، لیکن اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارنا بے معنی تھا۔ آخر اُنھیں کوچہ و بازار میں گھوم پھر کے ناکام لوٹنا پڑا۔ ربیعہ ممکن ہے کبھی کوئی وجود ہو لیکن جن دنوں یہ شعر کہے گئے، اُن دنوں ایسا کوئی وجود نہ تھا، اور تھا تو افسانہ سازوں کے نہاں خانۂ دماغ میں، جو بلاوجہ تصویر آرائی میں محو تھے۔ اختر شیرانی کی ایک مشہور نظم کا ٹکڑا ہے......''عفت اور اس کے مظاہر کی کہانی یہ ہے..... شاعروں کو نہ سنائی جائے۔''

......جن احباب کو اب بھی ربیعہ کی تلاش ہو اُن کے لیے یہ مصرع یا شعر ''تمت بالخیر'' ہے۔ اس اخفا سے یہ ثابت کرنا مقصود نہیں کہ جوانی اور اس کے تقاضوں نے زندگی کی دہلیز پر قدم نہیں رکھا۔ جوانی آئی اور پورے ساز و سامان کے ساتھ آئی۔ چاروں طرف لالہ و گُل کا ہجوم رہا لیکن کسی مرحلے میں بھی حکایت شکایت نہ ہوسکی۔ میں سمجھتا ہوں، عورتیں غزل یا نظم میں گھسیٹنے کی چیز نہیں، صرف پیار کی چیز ہیں۔ اُن کا احترام کرو کہ آبگینے ہیں۔ اُن کی محبت کو ٹھوکر نہ مارو کہ عورت زندگی میں ایک ہی دفعہ محبت کرتی ہے۔ اُنھیں کامیابی یا ناکامی دونوں صورتوں میں رُسوا نہ کرو کہ رُسوائی اُن کی حجاب آلود پلکوں پر آنسو لے آتی ہے جن سے مُہیب بددعا نکلتی ہے۔ اختر شیرانی نے یُونہی نہیں کہا تھا کہ:

اے نازنیں خدا کے لیے بددعا نہ دے

اختر شیرانی کا یہ رنگ مجھے بے حد عزیز ہے۔ میں نے اس طرز کی نظموں کو اس مجموعہ میں الگ عنوان کے تحت ترتیب دیا ہے۔

تمام مجموعے مختلف شعری عنوانوں کے تحت منضبط ہیں۔ ہر عنوان کی ایک ذوقی اور مزاجی کیفیت ہے جن سے خاص قسم کے رجحانات مترشح ہوتے ہیں......

طبعِ حسرت نے اٹھایا ہے اساتذہ سے فیض

روزنامہ ''زمیندار'' کے مطالعے نے اوائل عمر ہی میں مجھے مولانا ظفر علی خان کا گرویدہ بنا دیا۔ اُدھر اُن کی نظم چھپ کر آتی، اِدھر نوکِ زُبان ہو جاتی۔ رفتہ رفتہ یہی ذوق شعر گوئی میں ڈھل گیا۔ مدرسہ کے اُستاد مولانا نیاز احمد نعمانی مرحوم نے دستگیری کی۔ اُن سے بھی پہلے تیسری یا چوتھی جماعت میں احسان دانش میرے ٹیوٹر رہ چکے تھے اور یہ شوق غیر شعوری طور پر موجود تھا۔ عمر آگے بڑھی تو شعر کہنے شروع کیے میں شعر کہتا، نیاز یا احسان اصلاح دیتے اور میں وہ شعر دوستوں میں بانٹ دیتا جنھیں وہ اپنے نام سے چھپوا لیتے۔ یہ وقت بھی بیت گیا۔ دسویں کے امتحان سے فارغ ہوا تو کالج کا سروسامان نہ تھا۔ کئی اذیتیں جسم و جاں کا احاطہ کیے ہوئے تھیں۔ غرض سیاست کی اُنگلی پکڑی اور ہمرکاب ہو لیا۔ کئی سال تک چلتا رہا، 1935ء سے لے کر 1945ء تک یہ تمام عرصہ تقریباً جیل ہی میں کٹا ......اِدھر رہا ہوا، اُدھر پکڑا گیا:

خور افسوس زمانے کہ گرفتار نہ بود

1946ء میں احرار نے روزنامہ آزاد نکالا تو اس کی ادارت میرے سپرد کی گئی جس سے شعر گوئی کی خُفیہ خواہشیں جاگ اُٹھیں۔ اس سے پہلے سال میں دو چار دفعہ شعر ہوتے تھے۔ اب طبیعت کو پورے طور پر راغب پایا۔ تاثیر مرحوم نے اُنھیں دنوں ایک خط میں کسی نظم کا ذکر کرتے ہوئے لکھا:

''اپنی بیاض لے کر دہلی آ جاوٴ۔ شعر میں جو چیز ہونی چاہیے، وہ تمھارے اندر کماحقہٗ نظر آ رہی ہے صرف رکھ رکھاوٴ کی ضرورت ہے۔ ہم آپس میں صلاح مشورہ سے راہ پیدا کریں گے۔''

یہ الفاظ میرے شوق کے لیے مہمیز کا کام دے گئے۔ مصرع اٹھانے والی بات تھی۔ اختر شیرانی پہلے ہی ہونہار سمجھتے تھے۔ علامہ تاجور نجیب آبادی میری ایک نظم پر ماہنامہ ''شاہکار'' میں ایک طویل تنقیدی نوٹ لِکھ چکے تھے، جس میں بعض ایسے تعریفی کلمات بھی تھے جن کا میں اہل نہ تھا مگر اُن سے میرا حوصلہ بڑھ گیا۔ مولانا عبدالمجید سالک سے نیاز مندانہ مراسم تھے۔ اُن سے گاہے گاہے ملاقات ہوئی تو وہ ادبی زندگی میں کُود پڑنے کا مشورہ دیتے۔ اُن کا خیال تھا کہ سیاسی زندگی کی لذتیں اُٹھائی ہیں تو اب ادبی زندگی کا لطف بھی لو۔''

آغا شورش کاشمیری کی بنیادی شناخت ایک شعلہ بیان مقرر کی تھی۔ اُن کی اس خوبی کو اہم چشم دِید گواہ کے مانند محمد وارث کامل نے اپنے مضمون میں قلم بند کیا۔ یہ مضمون نقوش شخصیات نمبر میں بھی چھپا۔ اس میں سے ایک اقتباس دیکھیے:

''شاہی مسجد میں ایک جلسہ کا پروگرام تھا۔ لوگ شہر کے اطراف واکناف سے اس کثیر تعداد میں جمع ہوئے تھے کہ مسجد کا صحن عرفات کا منظر پیش کر رہا تھا۔ اس اجتماع میں مَیں بھی شریک تھا لیکن میری حیثیت ایک ایسے تماشائی کی سی تھی جس کی بیدلی نہ اسے درسِ عبرت دیتی ہے نہ اُس کے تسکینِ ذوق کا سامان فراہم کرتی ہے غالب نے کسی ایسے ہی تماشائی کی ذہنیت کا اس شعر میں ماتم کیا ہے:

بیدلی ہائے تماشا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق
بیکسی ہائے تمنا کہ نہ دُنیا ہے نہ دِیں

خوش قسمتی سے میں سٹیج کے قریب ہی بیٹھا تھا، اور یہ میں ہی جانتا ہوں کہ اس قرب کی خاطر میں نے اپنے وقت کا کتنا قیمتی سرمایہ صرف کیا

تھا۔ مجمع جمے ہوئے کچھ زیادہ دیر نہیں ہو پائی تھی کہ میں نے سٹیج پر بچھی ہوئی ایک کرسی پر اس شیر بیشہ سیاست کو متمکن دیکھا جسے اُن ایام میں زندہ دلانِ پنجاب، اپنی کشتی کا ناخدا سمجھتے تھے، یعنی ظفر الملتِ والدین مولانا ظفر علی خاں (جو آج کل کسمپرسی کے عالم میں بستر علالت پر اپنی بچی کھچی زندگی کے دن بسر کر رہے ہیں) شاہی مسجد کے بام و در اللہ اکبر اور مولانا ظفر علی خاں زندہ باد کے نعرہ ہائے زلزلہ انداز سے گُونج اُٹھے۔ مولانا نے اپنے مخصوص انداز میں تقریر کی۔ تقریر کیا تھی شعر و ادب کے سانچے میں ڈھلا ہوا ایک بصیرت افروز مقالہ تھا یا کسی کوہِ آتش فشاں کا شعلہ جوالہٗ سامعین ''**صم بکم عمی فھم لایرجعون**'' کی تصویر بنے بیٹھے تھے اور اگر اُس پورے مجمع میں کسی کو مولانا کے خیالات سے اختلاف بھی تھا تو اس پر یہ کیفیت گزر رہی تھی:

دل میں گھٹ گھٹ کے رہ گئی حسرت
لب پہ آ آ کے رہ گیا مطلب

دیکھتا کیا ہوں کہ وہی چھریرے بدن کا کشیدہ قامت نوجوان سٹیج پر نمودار ہوتا ہے اور کسی رسمی تمہید کے بغیر تقریر شروع کر دیتا ہے۔ میں نے ابتدا ہی میں سمجھ لیا تھا کہ مولانا ایسے بلیغ البیان اور فصیح اللسان مقرر کے بعد اس طوطی کی صدا نگار خانے میں کون سنے گا، لیکن اس نوجوان نے اس ٹھسے اور اس زناٹے سے تقریر کی کہ مجمع اس کی تقریر کے اختتام تک جما رہا بلکہ کچھ نعروں سے اپنی دلچسپی کا ثبوت بھی دیا۔ مجھے یاد ہے کہ اس نوجوان نے مولانا کی بارگاہِ فضل و کمال میں خراجِ عقیدت پیش کرنے کے بعد یہ بھی کہا تھا:

''مولانا آپ کی شخصیت واجب الاحترام ہے، میں آپ کے فضل و کمال کا اعتراف کیے بغیر بھی نہیں رہ سکتا، لیکن یہ کبھی نہیں ہوسکتا کہ آپ کی

ہر بات تسلیم کر لی جائے۔ آپ نے جو روش اختیار کی ہے، میرے خیال میں اس سے قوم کو نقصان تو پہنچ سکتا ہے کسی فائدے کی توقع نہیں کی جا سکتی۔''

میں اس نوجوان کی تقریر کے دوران کچھ ایسا کھو سا گیا تھا کہ قوتِ تمیز بھی جواب دے گئی، جانی پہچانی اور دیکھی بھالی شکل کی شناخت بھی نہ کر سکا۔ جب اُس نوجوان کی تقریر کے خاتمہ پر لوگوں میں کھسر پھسر ہوئی، تو میں نے بھی کان ٹٹورے۔ کوئی صاحب اپنے ساتھی سے کہہ رہے تھے کہ یار! یہ شورش ہمارے سامنے کا لونڈا ہے، کل تک اسے بستہ بغل میں دبائے سکول جاتے دیکھتے تھے اور آج یہ اتنے بڑے مقرر کے کان کتر رہا ہے، جس کی دھاک دُور دُور بیٹھی ہوئی ہے۔ یہ لونڈا تو آفت کا پرکالہ نکلا۔ یہ بات چیت ابھی ختم ہوئی تھی کہ پیچھے سے ایک صاحب نے میرا شانہ ہلایا۔ میں نے مُڑ کر دیکھا تو میرے خالہ زاد بھائی تھے (یہ صاحب کیپٹن شفیق احمد خان ایم اے پی سی ایس ہیں جو آج کل جھنگ میں مجسٹریٹ درجہ اوّل لگے ہیں)۔ کیوں وارث صاحب! سنی شورش کی تقریر! یہ ہے قابلیت۔ ایک مدت سے ہم دونوں کتابوں کے ورق چاٹ رہے ہیں لیکن پھر بھی ہمارے اندر یہ اہلیت پیدا نہیں ہوئی کہ ہم اس دھڑلے سے تقریر کر سکیں۔ وارث صاحب! دراصل تقریر ہی ایک ایسا فن ہے جس سے کسی کی شخصیت بلند ہو سکتی ہے۔ ہمارا یہ کہنا کہ ہم نے اتنے امتحان پاس کیے ہیں اور ہمارے پاس اتنی سندیں ہیں جو دُنیا کی نظر میں ہمارا وقار اونچا نہیں کر سکتیں۔ میں نے کہا بھائی صاحب! اس نوجوان شورش کو میں اچھی طرح جانتا ہوں کئی ماہ برابر میری اور اس نوجوان شورش کی گزرگاہ ایک ہی رہی ہے۔ اندازہ تو مجھے پہلے بھی تھا کہ یہ نوجوان چھپا رُستم ہے اور ہو نہ ہو ضرور اس کی گدڑی میں لال چھپے ہوئے ہیں لیکن میں نے اس

سے کچھ اور زیادہ قریب ہونے کی کوشش نہیں کی۔"

شورش نے اپنی جوانی کے ایام تحریکِ آزادی کے حق اور انگریز سامراج کے خلاف لڑتے بسر کیے۔ اُس وقت کی دُنیا کی سب سے بڑی بادشاہت کے خلاف صدائے حق بلند کرنا کسی بھی طور آسان نہیں تھا۔ اسی جدوجہد کے سفر کے پہلے دو ماہ میں بھوک ہڑتال کی۔ ایک برس سے زائد قیدِ تنہائی کے قیدی نے کال کوٹھڑی میں بتائے۔ اِس کے علاوہ کلی طور پر دس برس سات ماہ کا ایک طویل عرصہ جیل کی صعوبتوں میں گزارا۔ عالمِ شباب کے وہ دن جو نوجوان گُل وبُلبل کی شاعری اور پنکھڑیوں کے خوابوں میں بسر کرتے ہیں۔ وہ جیل کی سلاخوں کے پیچھے گزرے۔ تاریخ اس امر کی بھی شاہد کہ جبر وظلم کے نظام کے خلاف دُنیا کی کئی بڑی شخصیات نے جیل ضرور کاٹی۔ قید کے دوران میں شورش میں موجود صلاحیتیں اور چھپے ہوئے جوہر مزید نکھر کر سامنے آگئے۔ اُنھوں نے جیل میں بھی کئی کتب تحریر کیں اور بذریعہ خط کتابت ادبی اور سیاسی حلقوں سے منسلک رہے۔ دورانِ قید میں اُنھوں نے اپنے عہد کے انتہائی عالم فاضل انسان تاجور نجیب آبادی کو ایک خط تحریر کیا جو درجِ ذیل ہے:

سنٹرل جیل منٹگمری 5فروری1942

حضرت مولانا مدظلہ العالی!

سلام عقیدت!!!

عزیز بھائی کاوس سلمہ اللہ تعالیٰ کے خط سے معلوم ہوا کہ آپ نے میری استدعا قبول فرمالی ہے۔ میں آپ کی اس بزرگانہ شفقت، ادبی احسان اور علمی نوازش کا بہ صمیمِ قلب ممنون ہوں اور مجھے فخر ہے کہ میری پیہم جستجو آپ کی ادبی رہنمائی کے حصول میں کامیاب ہوگئی ہے۔

اس سچائی سے رُوگردانی عظیم کفر ہے کہ آپ کے شُہرۂ آفاق قلم کی چند خوبصورت جنبشوں نے اکثر اہلِ قلم پیدا کیے ہیں اور اُردو کے دورِ جدید کی ادبی امانتوں کا غالب حصہ آپ ہی کے مدرسۂ شعر وادب کا تربیت یافتہ ہے!!

کیا آپ اس تشنہ کام کو بھی اپنے عظیم الشان اور زندۂ جاوید میکدے
سے چند سبو عنایت فرما سکتے ہیں۔

عقیدت کیش
شورش کاشمیری پولیٹیکل قیدی
سنٹرل جیل منٹگمری۔ پنجاب

قیامِ پاکستان کے لیے زندگی گزارنے والے شورش کے معاملات قیامِ پاکستان کے بعد بھی تسلی بخش نہ رہے اور جیل میں آنا جانا بھی لگا رہا۔ اسی وجہ سے احمد ندیم قاسمی نے ایک جگہ تحریر کیا:

''اُن کے ساتھ میرے مراسم کی نوعیت دلچسپ رہی کہ وہ میرے نظریات کی مخالفت کرتے تھے اور میری ذات سے محبت کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ جیل گئے تو میں نے اُن کے حق میں طویل کالم لکھے اور جب میں جیل گیا تو اُنھوں نے حکومت کو لرزا دینے والے اشعار تحریر کیے۔''

شورش نے اپنی صحافتی زندگی میں روزنامہ ''آواز'' کی ادارت کی اور اس کے بعد ایک طویل عرصہ ہفتہ وار چٹان کے مالک و مدیر رہے۔ یہ ہفتہ روزہ بلا تفریق ہر طبقے، علاقے اور مسلک کے لوگوں میں مقبول تھا۔ باوجود اس امر کے کہ شورش خود خاص قسم کے مذہبی نظریات رکھتے تھے اور قادیانیوں کے شدید ترین خلاف تھے، اُنھوں نے اپنی کئی نظموں میں اس امر کا برملا اظہار بھی کیا ہے۔ شورش نے بحیثیت مدیر ''چٹان'' کچھ نظمیں اسرار بصری کے نام سے بھی شائع کیں۔ وہ نظمیں اصل میں شورش کی اپنی تخلیق تھیں اور یہ قلمی نام بوجہِ مصلحت اختیار کیا گیا تھا۔ محمد وارث نے کچھ اپنے الفاظ اَور کچھ شورش کے، اِس طرح رقم کیے کہ اس تحریر سے شورش کے کہنے اور کر گزرنے کی خوبی نمایاں ہوگئی ہے:

''آغا شورش کاشمیری ایک خاص طرزِ نگارش کے مالک ہیں۔ ''چٹان''

کے قارئین جو قریباً پاکستان اور بھارت کے گوشے گوشے میں پھیلے ہوئے ہیں آغا کے قلم کا لوہا مانتے ہیں۔ اس ہر دلعزیزی اور اس قبول عام کا راز شاید اس حقیقت میں مضمر ہے کہ آغا گفتار کا غازی بھی رہا ہے، اور اس کے ساتھ ہی کردار کا غازی بھی۔ تقریر ہو یا تحریر، نظم ہو یا نثر، اُن کی تہہ میں جوہرِ عمل کارفرما نظر آتا ہے گفتنی و ناگفتنی کے دِیباچے میں آغا نے لکھا ہے کہ:

''میں نے جو کچھ کہا، اس پر عمل بھی کیا۔ ان سیاسی شعروں میں میرے کردار کی پوری پوری جھلک موجود ہے۔ میری کامیابیاں بھی ہیں اور خوبیاں بھی۔ یہاں مجھ میں قدرے انا جاگ اٹھتی ہے۔ جو شاعر مستعار انقلابی نعروں سے ہیرو بنتے ہیں، مجھے نہ صرف اُن سے ہمدردی پیدا ہوتی بلکہ اُن کے شیوۂ ستائشِ باہمی پر رحم آتا ہے: اُن کا سارا گھمنڈ خود فریبی کے کھوکھلے دعوؤں پر ہے۔ جن لوگوں کو اپنے ملک کی سیاسی جدوجہد کے ابجد سے واقفیت نہیں اور جن عوام کا وہ نام لیتے ہیں کبھی اُن کے لیے کانٹے کی چبھن محسوس نہیں کی، وہ اُنھیں تلوار کے زخم کھانے پر کیوں کر آمادہ کر سکتے ہیں۔ مجھے فِکر ہے کہ میں نے عوام کو قریب سے پکارا اور اُنھوں نے قریب سے سنا ہے۔ میرے ہر شعر کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ میں اُنھیں کے لہجے میں بولتا اور اُنھیں کے ذہن کی بات کہتا ہوں۔ مجھے اس مقصد کے لیے اپنے ماحول سے باہر کسی مزدور کا گلنار چہرہ دیکھنے کی ضرورت نہیں اور نہ پرائے دیس سے محرکاتِ شعر ڈھونڈنے کی احتیاج ہے۔ میرا ملک اور میری قوم ایک نظمِ مسلسل ہیں، میں اُنھیں میں سے موضوع، مضمون اور عنوان ڈھونڈتا ہوں۔ میرے گردو پیش اتنا مواد پڑا ہے کہ اس کے سامنے شعر و ادب تو ایک طرف رہے، آفتاب و ماہتاب بھی دامن پھیلا سکتے ہیں:

دامانِ باغباں سے کفِ گل فروش تک
بکھرے پڑے ہیں سینکڑوں عنواں مرے لیے''
(نقوش شخصیات نمبر، صفحہ 1233)

آغا شورش کاشمیری کو واقعی یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ یہ کہیں:

بہت قریب سے دیکھا ہے رہنماؤں کو بہت قریب سے کچھ راز پائے ہیں میں نے
کہوں تو گردشِ لیل و نہار رُک جائے وہ راز جن سے بہت زخم کھائے ہیں میں نے

شورش نے تمام عمر قلم سے دوستی نبھائے رکھی۔ اُن کی نظم و نثر اُردو ادب کا ایک بڑا سرمایہ ہے۔ اُن کے نظریات اور شخصیت سے اُن کی زندگی میں بھی اور بعد از زندگی بھی لوگوں کو اختلاف رہا۔ شورش نے خود اپنی زندگی میں کئی ادبی اور سیاسی شخصیات کی کھل کر مخالفت بھی کی اور کئیوں سے دوستی بھی نبھائی۔ ان کی معروف کتب میں اقبالؒ پیامبرِ انقلاب، بُوئے گل، نالۂ دل، دُودِ چراغِ محفل، الجہاد الجہاد، دہلی چلو، شب جائے کہ من بودم، مولانا ابوالکلام آزاد، سید عطا اللہ شاہ بخاری، میاں افتخار الدین، موت سے واپسی، گفتنی ناگفتنی، چہ قلندرانہ گفتم، ظفر علی خان، پس دیوارِ زنداں، تمغۂ خدمت، خطباتِ احرار، چہرے، مرزائیل، تحریکِ ختمِ نبوت 1947ء— 1891ء، قیدی کا روزنامچہ، آزاد ہند کے فوجی عناصر، اُس بازار میں شاملہیں۔ ''قیدی کا روزنامچہ'' انگریز عہد میں تحریر کی گئی ایک انتہائی جُرأت مندانہ کتاب تھی۔ یہ کتاب انگریز سرکار نے پنجاب سی آئی ڈی کے مشورے پر ضبط کر لی تھی۔

شورش کو فنِ مضمون نگاری، سوانح نگاری اور شخصی خاکوں کی اَصناف پر بھی ملکہ حاصل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مدیر ''نقوش'' محمد طفیل نے اُن سے نقوش کے کئی اہم نمبروں کے لیے مضامین لکھوائے۔ نقوش شخصیات نمبر میں شورش نے چودھری افضل حق، سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری اور حمید نظامی کے شخصی خاکے تحریر کیے۔ یہ مضامین بھی اپنے اندر ایک کمال طرزِ تحریر اور طرز سوانح رکھتے ہیں۔ یہ موضوع شخصیت کے کئی چھپے زاویے اور زندگی کے دِیگر عوامل کی تصویریں بکھیرتے جاتے ہیں۔ اس حوالے سے اُن کے مضمون کا ایک اقتباس درجِ ذیل ہے جو اُنھوں نے سیّد عطا اللہ شاہ بخاری کے بارے میں تحریر کیا تھا:

''شاہ جی اور خطابت ہم نشیں ہیں۔ آپ نے تقریباً تیس یا بتیس برس (قید کا زمانہ چھوڑ کر) اس دشت پیمائی میں بسر کیے ہیں۔ برصغیر کی تقریباً دونسلیں آپ کے لولوئے لالہ سمیٹ چکی ہیں۔ لاکھوں آدمیوں کو آپ کی سیاست سے اختلاف رہا۔ اب بھی اختلاف کرنے والوں کی کمی نہیں۔

کوئی سا شخص بھی اس سے اختلاف نہیں کرے گا کہ خطابت اُن کی لونڈی ہے۔ وہ بولتے نہیں، موتی رولتے ہیں — اُن کی برجستہ گوئی، اُن کی حاضر جوابی، اُن کی بذلہ سنجی، اُن کی نکتہ آفرینی، اُن کی زبان دانی، اُن کی شعر و سخن سے دلچسپی غرض —

ہزاروں خوبیاں ایسی کہ ہر خوبی پہ دم نکلے

درحقیقت وہ ایک چلتا پھرتا شرعی انسائیکلوپیڈیا ہیں۔ اُردُو، فارسی، پنجابی، کسی زبان میں بھی ان کی طبیعت بند نہیں۔ وہ ایک بحرِ مواج ہیں، اُن کا کوئی صدف موتی سے خالی نہیں — بلاشبہ اُن کا نام ڈیماستھنیز سسر وائیڈ منڈ برک صہبان ابنِ غزال اور سعد زاغلول کے ساتھ لیا جاسکتا ہے۔ اُنھوں نے خطابت اختیار نہیں کی بلکہ خطابت نے اُنھیں اختیار کیا ہے، برصغیر کی بہت سی تحریکیں اُنھوں نے جگمگائی ہیں۔ وہ زبان و بیان کا ایک ایسا مرقع ہیں جس میں رنگا رنگ تصویریں ہیں، اُن کی خطابت کو نگار خانے سے تشبیہہ دی جاسکتی ہے —

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است

ایک خوبصورت وجود میں عنفوانِ شباب کی جو رعنائیاں ہوتی ہیں، وہ تمام تر اُن کی خطابت میں ہیں۔ اُنھوں نے اپنے خیالات کی سزا بھی بھگتی ہے...... انگریزوں سے بھی اور مسلمانوں سے بھی لیکن انگریزوں کی سزائیں ان کی متاعِ عزیز ہیں، مسلمانوں سے اُنھیں کوئی گلہ نہیں، وہ اس کے ڈانڈے تیرہ سو برس کی تاریخ کے مختلف حلقوں سے ملاتے

ہیں— اس وقت اِن کی عمر پینسٹھ برس کے لگ بھگ ہے۔ اس حساب سے اُنھوں نے ہفتے میں سے ڈیڑھ دن قید و بند میں بسر کیا—

خورد افسوس زمانے کہ گرفتار نہ بود

اُن کی نجی محفلیں باغ و بہار ہوتی ہیں:

اک ذرا چھیڑیے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے

تمام رات بیت جائے گی، لیکن وہ بولنے سے نہیں تھکتے اور آپ سننے سے نہیں تھکیں گے۔ جب آتش جوان تھا۔ وہ شروع رات سے پو پھٹنے تک تقریر کرتے اور لوگ تھے کہ نقش کالحجر ہو کر بیٹھے رہتے۔ اُن کا مضمون، زُلفِ یار کی طرح پیچ و خم کھاتا ہوا کہیں ختم نہیں ہوتا۔

تنہائی سے اُنھیں سخت نفرت ہے۔ غالباً اس کا تصور بھی اُن کے ہاں نہیں، وہ زندگی کو بازار سمجھتے اور بازار ہی پر مرتے ہیں لیکن سب سے بڑا عوامی خطیب ہونے کے باوجود عوام کو کالانعام سمجھتے ہیں، غالباً اُن کا خیال ہے کہ رائے عامہ، ہوا کی موج یا بادل کا ٹکڑا ہے۔ اُن کی زندگی رائے عامہ نظمِ معریٰ، پکا راگ، برطانوی سیاست اور غلام احمد کی نبوت عجیب وغریب پہیلیاں ہیں۔

دوستوں پر غایت درجہ اعتماد کرتے ہیں۔ دشمنوں کو درخورِ اعتنا ہی نہیں سمجھتے— سیاسیات میں حصہ لینے کے بعد اب سیاسیات سے سخت متنفر ہیں، اُنھیں انتخاب کے نام سے چڑ ہے، غیبت کرتے نہ سنتے ہیں، دل کی دوستی کو دماغ کی دوستی پر ترجیح دیتے ہیں۔ چنانچہ اِختلافِ فکر وعمل کے علی الرغم مولانا عبدالمجید سالک، ڈاکٹر محمد دِین تاثیر، سیّد احمد شاہ بخاری اور صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کی یاری کا دم بھرتے تھے مگر جس زمانے میں مولانا ظفر علی خان، ڈاکٹر شیخ محمد عالم، ڈاکٹر سیف الدین کچلو وغیرہ سے اتحادِ فکر وعمل تھا، اُن سے دل کی رسم و راہ کا کوئی معاملہ نہ تھا۔

جماعتِ احرار، سیاسیات میں اُن کی ''مساعیِ شکست انجام'' کا ثمرہ ہے۔ اب تو خیر حکومت ہی نے اسے خلافِ قانون قرار دے رکھا ہے لیکن ایک زمانے میں احرار کا طوطی بولتا تھا۔ چودھری افضل حق مرحوم، مولانا مظہرعلی اظہر، مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی ایسے لوگ آپ کے دست و بازو تھے۔ اب وہ سبو ٹوٹ چکا، صہبا چھلک گئی، میکدہ اُجڑ گیا، آبخورے کے ریزوں میں تلچھٹ باقی ہے، بقولِ اقبالؒ:

بیا یک لحظہ با عاماں در آمیز
کہ خاصاں بادہ ہا خوردند و رفتند

حسن جہاں کہیں ہو، اُن کی کمزوری ہے، پلکوں کی سنانوں سے لے کر پھریروں کی اُڑانوں تک میں وہ حُسن تلاش کرتے اور اس پر مرتے ہیں۔ وہ جذبات کے لیے جیتے اور جذبات پر مرتے ہیں۔ اُنھیں عمارتی حسن سے قطعاً لگاؤ نہیں۔ تاج محل کو گاندھی جی کے الفاظ میں مزدوروں کے بیگار کی یادگار کہتے ہیں۔ تمام زندگی سیر و سیاحت میں گزار دی لیکن سیر و سیاحت کے عادی نہیں۔ موٹا جوتا پہنتے، سادہ غذا کھاتے اور ہنسی خوشی جیتے ہیں۔ اب کچھ دِنوں سے طبیعت بیمار ہے، دوستوں کے بچھڑنے کا سخت رنج ہے۔ فرماتے ہیں:

''میاں اب تو دشمن بھی شریف نہیں رہا، شریف دشمن سے لڑنے میں تو لطف آتا تھا۔''

چہرہ خوش اور آوازِ خوش اُن کی طبعی خوراک ہیں، گو صوفی منش ہیں لیکن مزامیر کے قائل نہیں، صرف گلے کے رس سے لطف اُٹھاتے ہیں۔ شعر و شاعری سے اُنھیں ایک گونہ دلبستگی ہے، تمام اساتذہ کے چیدہ چیدہ شعر ازبر ہیں، اُن کے باموقع استعمال میں جو خصوصیت اُنھیں حاصل ہے، وہ کسی اور کو نہیں، مولانا آزاد کی طرح اُن کے حافظے کی گرہیں بھی طبیعت شگفتہ ہو تو کھلتی اور بکھرتی چلی جاتی ہیں، بہ قول شاعر:

وہ اپنی ذات میں اک انجمن ہیں

کبھی سرو قامت تھے، اب اُن کا قد بھی اُن کے دل کی طرح اللہ کے حضور میں جھک گیا ہے۔ چہرہ نے پر جھریوں کی مسجع عبارتیں، ماتھا کُشادہ لیکن تفکر کی کائنات پیپائیوں سے مجروح آنکھیں—ایک زمانے میں ساری مستی شراب کی سی تھی—اب چپ چاپ، گویا کچھ سوچ رہی ہیں۔ لہجے میں عرب شہسواروں کا بانکپن، قرآن پڑھیں تو قرنِ اوّل کا مدینہ یاد آ جاتا ہے۔شعر سنائیں تو عجمی درباروں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے الفاظ میں:

''دُنیا کسی کے لیے کبھی نہیں بدل سکتی۔ تمام زندگی نِصف افسانۂ اُمید اور نصف ماتمِ یاس ہے۔''

اور اب اس مرحلے میں:

مختصر حالِ چشم و دل یہ ہے
اِس کو آرام اس کو خواب نہیں'

(نقوش شخصیت نمبر، صفحہ 1214)

قیامِ پاکستان کے بعد جو حالات مملکت خداداد پاکستان نے دیکھے، وہ آج تک کسی سے ڈھکے چُھپے نہیں۔ شورش کو اُن معاملات کی پوری آگہی تھی اور چونکہ شہر لاہور سے ایک خاص قسم کا عشق بھی تھا، اس لیے اُنھوں نے وادیِ لاہور کو خطاب کرتے ہوئے ماضی کے اوراق اور حال کے مضامین کچھ یوں بیان کیے:

اے وادیِ لاہور

اس بات پہ بھی تو نے کیا ہوگا کبھی غور حالات نے کس طرح کیا طور سے بے طور
اُفتاد کی ہر ضرب صدا دیتی ہے ہاں اور
اے وادیِ لاہور

میں نے تری راتوں کو سحر تاب کیا ہے میں نے ترے ذرّات کو سیراب کیا ہے

میں نے ترے افکار کو شاداب کیا ہے

اے وادیِ لاہور

تُونے جو کیا ٹھیک کیا ،خوب کیا ہے   ہر بار مرے دل کو نیا زخم دیا ہے

یہ تیرا کرم ہے کہ سکوں لُوٹ لیا ہے

اے وادیِ لاہور

تُونے بھی تو دیکھا ہے اُنھیں ایک نظر سے   وہ لوگ جوگزرے ہیں تری راہ گزر سے

نسبت تھی جنھیں قافلۂ شمس و قمر سے

اے وادیِ لاہور

تقدیر کا شاکی رہوں مقسوم کو چھیڑوں   کیا پھر کسی افسانۂ مغموم کو چھیڑوں

یہ سوچتا ہوں ماضیِ مرحوم کو چھیڑوں

اے وادیِ لاہور

یہ کس کا تصور ہے کسے مان رہا ہوں   اپنے ہی خدوخال کو پہچان رہا ہوں

یارانِ سرِپل کا نگہبان رہا ہوں

اے وادیِ لاہور

قربانی و ایثار کے میداں میں اڑے ہیں   بیٹے ترے ساونت جوانوں سےلڑے ہیں

مٹی میں تری گوہرِ نایاب پڑے ہیں

اے وادیِ لاہور

اللہ کے دربار سے آوازِ رسا مانگ   ہر شے سے اُٹھا ہاتھ، فقیرانہ دعا مانگ

اب اپنے جوانوں کے لیے خوفِ خدا مانگ

اے وادیِ لاہور

وہ دن بھی ہے نزدیک جوانی نہیں ہوگی   شاعر کی طبیعت میں روانی نہیں ہوگی

ظاہر ہے کہ اک دن یہ کہانی نہیں ہوگی

اے وادیِ لاہور

یہ تیرے شب و روز گزرتے ہی رہیں گے   یہ کاکلِ شب تاب سنورتے ہی رہیں گے

یہ تیرے جواں سال بچھڑتے ہی رہیں گے

اے وادیِ لاہور

میں نے تری خاطر کئی دیوان لکھے ہیں اس شہر میں رسوائی کے سامان کیے ہیں
تہمت بھی اُٹھائی ہے الیمے بھی سہے ہیں

اے وادیِ لاہور

میں تیرے فقیہوں کی زباں تول چکا ہوں میں اپنی فغانوں کے علم کھول چکا ہوں
ہر حال میں در ہائے سخن کھول چکا ہوں

اے وادیِ لاہور

کچھ گردشِ حالات نے افسردہ کیا ہے کچھ تیرے شب و روز نے آزردہ کیا ہے
دل توڑ دیا روح کو پژمردہ کیا ہے

اے وادیِ لاہور

سوچا ہے کبھی مجلسِ احباب کہاں ہے؟ راوی کے کناروں کی تب و تاب کہاں ہے؟
پنجاب کہاں، رونقِ پنجاب کہاں ہے؟

اے وادیِ لاہور

ایامِ گزشتہ کے نقیبوں کو اُٹھا لا قبروں سے جواں سال ادیبوں کو اُٹھا لا
پنجاب کے مرحوم خطیبوں کو اُٹھا لا

اے وادیِ لاہور

(کلیاتِ شورش کاشمیری، صفحہ 779)

1946ء میں شورش آل انڈیا مجلس احرارِ اسلام کے سیکرٹری جنرل منتخب ہوئے تو اسی شورش نے 1974ء میں چلنے والی تحریکِ ختم نبوت میں اہم ترین کردار سرانجام دیا۔ 1974ء کے آئین کی منظوری کے اگلے برس 25 اکتوبر 1975ء کو انتقال فرما گئے۔ شورش نے تمام عمر اُردو میں لکھا لیکن ذریعۂ گفتگو اُن کی مادری زبان پنجابی ہی رہی۔ قیامِ پاکستان کے بعد شورش کے تعلقات منٹو صاحب سے بھی کچھ خاص خوشگوار نہ رہے تھے۔ اِن دونوں شخصیات کی گفتگو کی زبان پنجابی ہی تھی۔

شورش کی وفات کے بعد اُن کی اُردو ادب کے لیے بے پایاں خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے سرکارِ پاکستان نے لاہور جی پی او کے سامنے شمالی سیدھ میں جاتی ہوئی سڑک ان کے نام سے منسُوب کی۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور میں اُن کے فن اور شخصیت پر مقالہ جات تحریر کیے گئے اور طلبا کو ڈگریاں دی گئیں۔ اُن کو لاہور میں قبرستان میانی صاحب میں دل افروز سٹریٹ کے ساتھ بائیں جانب احاطے میں دفن کیا گیا۔ اُن کی قبر سے قبلہ سیدھ میں چراغ حسن حسرت کی قبر بھی ہے۔ اُن کی قبر کی لوح پر درجِ ذیل تحریر رقم ہے:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ

آخری آرام گاہ

بطلِ حُریت مردِ غیور درویش منش صحافی

ادیب شاعر اور بے مثل خطیب

آغا شورش کاشمیری

تاریخ پیدائش 14 اگست 1917ء

تاریخ وفات 25 اکتوبر 1975ء

لوحِ مراد کے باہر کی جانب یہ عبارت کندہ ہے:

آخری یا اللہ مدد آرام گاہ

تیری آواز سے تھا زلزلہ کہساروں میں
تیری آواز سے تھا حشر جہانداروں میں
تُو نے آباد کیے سینکڑوں ایماں کے دیار
تیرے قدموں میں رہا فرنگی کا وقار
اگرچہ فرعون رہے تیرے خریداروں میں

تُو خریدا نہ گیا مصر کے بازاروں میں

ایشیا کا عظیم شعلہ نوا مُقرر

غازی کردار، عاشقِ رسول

آغا شورش کاشمیری

منجانب: پروانۂ شورش کاشمیری

طارق محمود رضوی

فیضِ عام میڈیکل سٹور

گرجا گھر، گوجرانوالہ

محمد طفیل

1923ء۔1986ء

جو نقش اُبھرے گا آخر کو وہ فنا ہوگا
مگر ''نقوش'' چراغِ رہِ بقا ہوگا
سیّد عطا حسین کلیم

محمد طفیل زمانے بھر میں محمد نقوش کے نام سے بھی معروف رہے۔ وہ ایک عہد ساز شخصیت تھے۔ طفیل صاحب مدیر نقوش تھے اور اُنھوں نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ اپنے ادبی جریدے ''نقوش'' کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ اُردو ادب کی تاریخ میں سے اگر ''نقوش'' کے 133 سے زائد شماروں کو حذف کر دیا جائے تو اُردو ادب کے قلعے کی دیواروں میں دراڑیں پڑ جائیں۔

طفیل صاحب کسی بڑی یونیورسٹی اور ادارے سے سند یافتہ نہیں تھے لیکن اُنھوں نے اپنے عہد کے کئی ادیبوں شاعروں کو ادب کے دائرہ کار میں رکھا اور پھر ایک ایسا وقت بھی آیا کہ کسی بھی شخص کے لیے ادیب اور شاعر کہلوانے کے لیے ''نقوش'' کی سند حاصل کرنا لازم ہو گیا۔

طفیل صاحب ہی کا جگرا تھا کہ اُنھوں نے اُردو ادب کے سب سے منہ زور افسانہ نگار ''سعادت حسن منٹو'' کو اُن کا تحریر شدہ افسانہ یہ کہہ کر لوٹا دِیا کہ جناب آپ نے جو تحریر کیا، ہے وہ قطعاً منٹو کے شایانِ شان نہیں۔ پھر اُسی کے نتیجے میں ''موذیل'' جیسا افسانہ صفحۂ قرطاس پر اُبھرا۔ طفیل صاحب نے ''نقوش'' کے معمول کے شماروں کے ساتھ ساتھ کئی خاص نمبر بھی شائع کیے۔ ان خاص شماروں میں نہ صرف ادب بلکہ ادب کی تاریخ، شہروں کی تاریخ،

عظیم شخصیات کے سوانح، خطوط میں چھپی داستانیں، یہ سب کچھ شامل تھا۔ ورنہ ماضی کی تمام حقیقتیں پچھلی پیڑھیوں کی یادوں کا حصہ بن کر رہ جاتیں۔ طفیل صاحب جیسے کُہنہ مشق شخص کی مدّح سرائی کے لیے شاید الگ سے کوئی کتاب درکار ہو، اس لیے اُن کی زندگی پر کچھ نِگاہ ڈالتے ہیں۔ طفیل صاحب کا جنم 14 اگست 1923ء کو محلہ جوگیاں بازار حکیماں اندرون بھاٹی دروازہ ہوا۔ اُن کی پیدائش کی یہ تاریخ پروفیسر اسلم اور خود طفیل صاحب نے اپنی ایک تحریر ''مَیں'' میں بیان کی ہے جبکہ اُنھوں نے اپنے سوانحی خاکے مدیرِ نقوش میں ایک سطر کچھ یوں تحریر کی:

> ''صورت دیکھیے تو مسکین، بھولے بھالے، تجربہ اس کے برعکس۔ میں اُنھیں 15 اگست 1923ء سے جاننے کی کوشش کر رہا ہوں۔ مگر یہ حضرت اب تک چکمہ دیے جا رہے ہیں اور اب تک یہ معلوم نہیں ہونے دیا کہ یہ آخر ہیں کیا بلا!''

اُن کے والد کا نام میاں عمر الدین اور والدہ کا نام امام بی بی تھا۔ اُن کے والد کو، جن کا تعلق اندرونِ لاہور کے متمول گھرانے سے تھا، ایامِ شباب ہی میں دَمے کا مرض لاحق ہو گیا اور یہ بیماری جڑ پکڑتی گئی۔ گھر میں جو جمع پونجی تھی، اُن کے علاج کی نذر ہوگئی، لیکن وہ جانبر نہ ہو سکے اور انتہائی تنگدستی میں اپنے پسماندگان کو چھوڑ گئے۔ محنت اور لگن کا وتیرہ اُن کی اآخری سانس تک برقرار رہا۔ اُنھوں نے اپنے حالاتِ زندگی یوں تحریر کئے ہیں:

''مَیں''

پیدائش 14 اگست 1923ء

مَیں لاہور کا رہنے والا ہوں۔ آباواجداد کا بھی جہاں تک سراغ ملا ہے، وہ بھی لاہور ہی کے تھے۔ جب ہوش نے آنکھیں کھولیں، تو بندہ نے اپنے آپ کو محلہ جوگیاں، اندرون بھاٹی گیٹ میں پایا..... وہ بھاٹی گیٹ جسے حکیم احمد شجاع مرحوم نے ''لاہور کا چیلسی'' کہا..... چیلسی لندن کا وہ بازار ہے جس میں بڑے بڑے مصور، موسیقار اور ادیب

پیدا ہوئے۔
تعلیم محض اس وجہ سے ادھوری رہی کہ گھر میں راج غریبی کا تھا۔ والدین میرے لیے بہت کچھ کرنے کے ارمان رکھتے تھے مگر وہ حالات کے ہاتھوں بے بس تھے۔ میری تعلیم نے جب والدین کی بے بسی کو آزردگی کی سرحد تک پہنچا دیا تو میں نے خود بھی تعلیم کو جاری رکھنا پسند نہ کیا۔ گھر والوں کے لیے دال روٹی کے چکر میں پڑ گیا۔ میں اسلامیہ ہائی سکول بھاٹی گیٹ میں پڑھتا ضرور رہا ہوں، لیکن میرے پاس میٹرک کا سرٹیفکیٹ نہیں ہے۔
میں الراعی برادری سے تعلق رکھتا ہوں، جس میں بڑے لوگ پیدا ہوئے۔ اس برادری کے بارے میں میرا خیال یہ ہے کہ یہ لوگ اپنی ذہانت اور فطانت میں کسی سے کم نہیں، مگر سادہ اتنے ہوتے ہیں کہ جس کا بھی جی چاہے، کہنی مار کے آگے نکل جائے۔ مات دینے کی نہیں مات کھانے کی اہلیت رکھتے ہیں۔''

تنگیِ حالات کے باعث طفیل صاحب تعلیم جاری نہ رکھ سکے۔ وہ اپنے اساتذہ میں سیّد اختر علی سے خاص عقیدت رکھتے تھے اور اُن کے چھوٹے بھائی سیّد محفوظ علی بھی اُن کی یادداشتوں کا حصہ بنے۔ اُنھوں نے چھوٹی عمر ہی میں فنِ خطاطی اپنے شوق اور مالی ضروریات کے باعث سیکھا۔ کچھ برس فنِ کتابت ہی کو ذریعۂ روزگار بنایا۔ اِس فن میں مہارت حاصل کرنے کے لئے تاج الدین زریں رقم جیسے عظیم اُستاد کی شاگردی بھی اختیار کی۔ کتابت اور خطاطی کے باعث اُن کا لاہور کے علمی اور ادبی حلقوں میں آنا جانا شروع ہوا۔ 1938ء میں اُنھوں نے اپنے ایک دوست لطیف فاروقی کے ساتھ مل کر ''مکتبۂ شعروادب'' کی بنیاد رکھی۔ وہ اس ادارے سے کس طرح الگ ہوئے، اس کا ذکر اُنھوں نے اپنے مضمون میں اپنے خاص فکاہیہ انداز میں کچھ ان الفاظ میں کیا:

''جہاں تک نشر و اشاعت کا تعلق ہے، اس کی ابتدا تو 1944ء سے بھی پہلے ہوئی تھی۔ وہ یوں کہ میرے ایک دوست لطیف فاروقی (مرحوم)

تھے، اُن کے اشتراک سے میں نے مکتبۂ شعر و ادب کے نام سے پبلشنگ ہاؤس کی داغ بیل ڈالی تھی۔ بعد میں مجھے یہ معلوم ہوا کہ اُن کی شادی صرف اس وجہ سے نہیں ہو رہی ہے کہ وہ ایک چھوٹے سے ادارے کے تنہا مالک نہیں بلکہ حصہ دار ہیں،تو مَیں نے مناسب سمجھا کہ الگ ہوجاؤں۔ چُنانچہ میری اس قربانی سے اُن کا مسئلہ حل ہوگیا تھا۔''

1944ء میں طفیل صاحب نے اندرون لوہاری دروازہ میں ادارۂ فروغِ اُردو قائم کیا۔ اس ادارے کا نام اُس وقت کے اُردو زبان کے مشہور نقاد سیّد احتشام حسین نے تجویز کیا تھا۔ اس ادارے کو یہ فخر بھی حاصل ہے کہ اس نے اُردو کے مشہور مزاح نگار ادیب شوکت تھانوی کی پہلی کتاب شائع کی۔ یہ کتاب اُن کے ریڈیو ڈراموں پر مشتمل تھی۔ یہ وہ دور تھا جب شاعر اور ادیب اپنی کتابوں یا معاصر پرچوں کے ذریعے لوگوں تک رسائی حاصل کرتے تھے۔ خصوصاً اہلِ پنجاب نے کئی اعلیٰ معیار کے ادبی جرائد دیکھے۔ اُن میں مخزن، نیرنگِ خیال، ادبی دُنیا، ہمایوں، عالمگیر، ارمان، ادبِ لطیف، تہذیبِ نسواں، سویرا، ماہِ نو اور بچوں کے لیے پھول کے نام نمایاں ہیں۔ پاکستان بننے کے بعد یکم مارچ 1948ء کو ''نقوش'' کا پہلا شمارہ منظرِ عام پر آیا۔ اس ادبی شمارے کا نام احمد ندیم قاسمی کا دیا ہوا تھا۔ ''نقوش'' کی اشاعت کی ذمے داریاں ایک تکون نما تھیں اور اس کے تین کونے احمد ندیم قاسمی، طفیل صاحب اور ہاجرہ مسرور پر مشتمل تھے۔ ''نقوش'' کے ابتدائی شماروں نے برصغیر پاک و ہند کے تمام اُردو حلقوں میں ہلچل مچا دی۔ طفیل صاحب بنیادی طور پر ایک ادب دوست شخصیت تھے اور اُن کا ادبی اور ملکی سیاست کی جانب کوئی خاص رُجحان نہیں تھا۔ قاسمی صاحب اور ہاجرہ مسرور دیگر سیاسی معاملات میں بھی گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ کئی اداروں کی نظرِ کرم ''نقوش'' پر بھی شروع ہوگئی اور حد یہاں تک پہنچی کہ صرف ایک برس کے بعد ''نقوش'' کچھ عرصے کے لیے بند ہوگیا۔ ''نقوش'' کی ابتدا اور اس کے دِیگر معاملات کا تذکرہ خود طفیل صاحب نے ''ناچیز'' کے عنوان سے اپنی یادداشتوں میں کیا ہے:

’’نقوش‘‘ کی اِبتدا

جب ہاجرہ مسرور ہندوستان سے واردِ پاکستان ہوئیں تو میری رِفاقت میں نقوش کا ڈول ڈالا گیا۔ منصوبہ احمد ندیم قاسمی نے بنایا۔ چنانچہ اپنے اپنے حصّے کا کام تینوں نے بانٹ لیا۔ ’’نقوش‘‘ کے ابتدائی شمارے بڑے اچھے نکلے۔ اُٹھان مرعوب کن تھی۔ پھر ایکا ایکی ’’نقوش‘‘ اپنی ادبی ڈگر سے ہٹ کر سیاست کا موڑ مڑ گیا۔ میں نے دبے لفظوں میں احتجاج کیا۔ اِدھر دو ووٹ تھے۔ اُدھر اکیلا، بالآخر ندیم صاحب نے فرمایا۔ ہم اپنی روش کو ترک نہیں کر سکتے۔ جب خیالات میں ہم آہنگی نہ رہی تو نتیجہ یہ نکلا کہ ’’نقوش‘‘ کچھ عرصے کے لیے بند ہو گیا۔ بعد میں ندیم صاحب ہی کے مشورے سے ’’نقوش‘‘ کا پھر اِجرا ہوا، تو وہ سیّد وقار عظیم کی ادارت میں۔ وہ بھی صرف ایک ہی سال تک ساتھ دے سکے۔ وہ موڑ ایسا تھا کہ ’’نقوش‘‘ اگر ہمیشہ کے لیے بند ہو جاتا، تو بھی کچھ عجب نہ ہوتا۔ اس لیے کہ اس کے مالی خسارے اتنے تھے جو ایک چھوٹے سے ادارہ کے لیے ناقابلِ برداشت تھے۔

یکم مارچ 1948ء کو ’’نقوش‘‘ کا پہلا شمارہ نکلا تھا۔ یکم مئی 1951ء کو میں نے اس کی ادارت سنبھالی۔ اس وقت میں نے طے یہ کیا تھا کہ کشتیوں کو آگ لگا دوں تا کہ واپسی کی گنجائش نہ رہے یعنی میں نے اپنا سارا سرمایہ اور اپنی ساری توانائیاں داؤ پر لگا دیں۔ اپنے پاس سرمایہ ہی کیا تھا کہ جس پر ناز ہوتا۔ لے دے کے ایک جذبہ ہی تھا جس کی بدولت ادب کے سمندر میں کود گیا تھا۔ اُس وقت سب یہی کہتے تھے کہ میرا قدم خودکشی کے مترادف ہے، لیکن میں یہ سوچتا تھا کہ اگر خودکشی ہی میرے خوابوں کا مقدر ہے تو مجھے خودکشی بھی کر کے دیکھنا چاہیے۔

نقوش

نقوش میرے لیے کیا کچھ ہے یا اس کے لیے میں نے کیا کچھ کیا، اِس کی تفصیل خوش کن نہیں، تکلیف دہ ہے۔ وہ رسالہ جس کی پاک و ہند میں دُھوم ہے، جس کی کوئی مثال نہیں، میرے لیے دو روٹیوں کا بھی بندوبست نہ کر سکا۔ اس کے باوجود میں نے اس کی رفاقت سے منہ نہ موڑا۔ جوانی اس کی نذر کر دی۔ صندلیں بدنوں میں بھی ترغیب تھی مگر میں نے نظر اُٹھا کے دیکھنے کو بھی اپنے مقصد سے دُوری جانا۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے اپنی دُھن میں بہت کچھ کر ڈالا۔ اگر کوئی میری کاوشوں کو ''بہت کُچھ'' نہیں کہہ سکتا، تو پھر وہ بہت کچھ کر کے دِکھلا دے۔ زبانی ڈینگیں میرے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتیں، پھر بات یہ بھی نہیں کہ میں اس کلمے کو کسی غرور کے ماتحت لِکھ رہا ہوں۔ غرور کا زور تو اُسی دن ٹوٹ گیا تھا جس دن میں نے ''نقوش'' سے یارانہ گانٹھا تھا۔

جس دن سے میں ادارتی کرسی پر ''جلوہ افروز'' ہوا ہوں۔ اُس دن سے لے کر آج کے دن تک میرے لیے یہ مسئلہ ادب کے پُل صِراط سے گزرنے کے مترادف رہا ہے۔ نہ تن کا ہوش نہ من کا اور نہ ہی دھن کا۔

جس دن میں نے اس کام کے لیے قلم اُٹھایا تھا، اُس دن میرے ذہن میں اس کام کا ایک خاکہ بھی تھا جس میں میں بعد کے برسوں میں رنگ بھرتا رہا۔ میں نے ابھی اپنی ادبی مسافت کا پورا سفر طے نہیں کیا۔ لیکن منزل کی جانب رواں دواں ضرور ہوں۔ پھر یہ بھی کہ جس جوش و خروش کے ساتھ میرا پہلا قدم اُٹھا تھا، اُسی ولولے کے ساتھ آج بھی سرگرمِ سفر ہوں۔ وسائل نے قدم پکڑے ہوں، تو پکڑے ہوں، جذبے نے ہار نہیں مانی۔

جو کام اب تک ہو چکے ہیں، اُن پہ خوش تو ہوں لیکن اُن پہ فخر نہیں، فخر تو اس امر پہ ہوگا کہ زندگی کا آخری لمحہ بھی'' نقوش'' کی گود میں

گزرے۔

بہرحال میری ادبی کارگزاریوں اور اس کی افادیت کا اندازہ آج نہیں لگایا جاسکتا۔ اس کا تعین تو آنے والا وقت ہی کرے گا۔‘‘

’’نقوش‘‘ اُن کی زندگی کا سب کچھ تھا۔ اِس میں کئی لازوال تحریروں نے اپنے اَنمٹ نقوش چھوڑے۔ اُن تحریروں کا ایک بڑا حصہ طفیل صاحب کی مستقل مزاجی ہی کے باعث تھا۔ وہ شاعر، ادیب، سوانح نگار اور مضمون نویس حضرات کے مزاج کو جانتے سمجھتے ہوئے، اُن کے ساتھ جُڑے رہنے اور اُنھیں کچھ نہ کچھ لکھنے پر مجبور کرتے رہے۔ یہی وجہ تھی کہ طفیل صاحب کے پاک و ہند کے علاوہ دُنیا کے کئی دیگر ممالک میں موجود شاعر ادیب خواتین وحضرات سے بھی ذاتی مراسم تھے۔ ان مراسم کے باعث اُن کا دِیگر شخصیات کے ساتھ قلمی رابطہ بھی موجود رہا۔ بے پناہ خط کتابت کے باعث طفیل صاحب کی تحریر کا بھی ایک اپنا ہی انداز تھا۔ نمونے کے طور پر ذیل میں ایک خط نقل کیا جارہا ہے جو اُنھوں نے گوپی چند نارنگ کو لکھا تھا:

’’جناب!

خط لکھنے کا وعدہ تھا۔ خط لکھ نہ سکا۔ یوں تو خط یہ بھی ہے مگر میں یہ کہنا چاہ رہا ہوں کہ جلد خط نہ لکھ سکا۔ آپ کو بھی کیا پروا ہوگی۔ میں اپنی جگہ بلاوجہ شرمندہ ہورہا ہوں۔ اتنے میٹھے انسان کے ہاں دوستوں کی کیا کمی ہوگی۔ اس وقت میں بڑے غصے میں ہوں۔ ابھی ابھی ایک صاحب نے موڈ خراب کردیا ہے۔ چونکہ خط شروع کرچکا تھا، اس لیے اب اسے کھینچنا ہی پڑے گا۔

آج کل سالنامہ کے پیچھے پڑا ہوا ہوں۔ دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ ہونا کیا ہے۔ دو تین سیر وزن کم ہو جائے گا۔ اپنے آپ سے بیزار ہو جاؤں گا۔ بیوی ایک بار پھر مجھے رولے گی۔

آپ کا بڑا اچھا مضمون میرے پاس ہے۔ اس میں وہ جچے گا۔ اپنی

تصویر بھی بھیجیں (سوہنا مکھڑا)۔ اب کے تخلیق اور صاحبِ تخلیق دونوں کو رُسوا کرنے کا ارادہ ہے۔ تخلیق تو خودبخود رُسوا ہو جائے گی، صاحبِ تخلیق کو میں رُسوا کروں گا۔

یہ ٹھیک ہے کہ میں دِلّی آیا تھا۔ چند دن، چند گھنٹے ثابت ہوئے۔ جانا اتنا اچانک ہوا تھا کہ اتوار کی صبح ٹرنک کال آیا، دِلّی پہنچو۔ اُسی دن بارہ بجے چل پڑا— پھر لاہور سے ٹرنک کال پہنچا۔ لاہور پہنچو۔ اُسی دن لاہور کے لیے چل پڑا۔ یہ تو ہوا اِس غریب کے ساتھ۔ بجائے ہمدردی کے آپ ناراض ہوتے ہیں، ہے نا ستم!

رسید حاضر ہے۔ خود غیر حاضر ہوں۔

طفیل صاحب انتہائی خاموش طبع انسان تھے لیکن اُن کا مشاہدہ بہت ہی گہرا تھا۔ انسان کی اندرونی کیفیات کو جاننے میں اُنھیں ایک خاص وجدان حاصل تھا۔ دوستیاں نبھانے کی اہلِ لاہور والی صفت بھی بدرجہ اُتم اُن میں موجود تھی۔ اُن صفات کے باعث اُنھوں نے مدیر ہونے کے ساتھ ساتھ سوانح نگاری کی صنف میں بھی کمال حاصل کیا۔ اُنھوں نے اپنے ذاتی تجربات کی بنیاد پر کچھ سفرنامے بھی تحریر کیے۔ وہ بھی اہلِ ذوق نے بہت پسند کیے۔ لیکن سوانح نگاری نے کئی عظیم شخصیات کے پوشیدہ پہلو بھی قاری کے سامنے لا کھڑے کیے۔ اُنھیں اپنی اس صفت کا خود بھی ادراک تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی ذات کے بارے میں تحریر کرتے ہوئے اُنھوں نے لکھا:

''میں خاکہ نگار ہوں۔ یہ صنف میں نے اس لیے اختیار کی ہے کہ اسے میں سب سے مشکل صنف سمجھتا ہوں۔ میں نے سوچا کہ اگر ''امتحان'' دینا ہی ہے، تو سب سے مشکل پرچہ حل کیا جائے۔ بحمداللہ آج میں اپنی تحریری کارگزاریوں پہ بھی خوش ہوں۔ گو ابھی مطمئن نہیں کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ:

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں''

طفیل صاحب کی خاکہ نگاری کے بارے میں کرشن چندر نے اپنے ایک مضمون ''ہم قلم'' میں بھی کچھ اچھوتی اور خوبصورت باتیں تحریر کیں۔ جو درجِ ذیل ہیں:

''طفیل احساس کی نازکی کو بہت سمجھتے ہیں۔ خود بھی جلدی آزردہ خاطر اور زود رنج ہو جاتے ہیں کیونکہ طفیل صرف ایک پبلشر ہی نہیں ہے بلکہ ادیب بھی ہے۔ ''محترم'' اُن کا ایک مشہور سفر نامہ ہے جو شاہ عبداللطیف بھٹائی کے عرس پر جانے کے بعد لکھا گیا مگر طفیل بالخصوص اپنے نازک خاکوں کی تخلیق کے لیے مشہور ہیں جن میں اُنھوں نے جگر مراد آبادی سے لے کر اختر اورینوی جیسی مقتدر شخصیتوں کے قصر تعمیر کیے ہیں۔ یہ سب کے سب ان کی کتابوں میں شامل ہیں جن کے نام بالترتیب یہ ہیں:

نمبر ایک ''صاحب''، نمبر دو ''جناب''، نمبر تین ''آپ''۔

ان کے بعد دو اور مجموعے ان کے آنے چاہئیں۔

اور نمبر چار ''آپ جناب'' ''نمبر پانچ'' ''اناپ شناپ''۔

مؤخرالذکر مجموعہ طفیل کے دشمنوں کے متعلق ہوگا یا ایسے مضمون نگاروں کے متعلق جن کی تخلیقات کسی وجہ سے نقوش میں شامل نہیں ہوسکیں۔

طفیل کے یہ خاکے بڑی بے باکی سے لکھے گئے ہیں۔ ان میں فاصلے بھی ہیں اور قربتیں بھی، دُوریاں بھی ہیں اور طرف داریاں بھی مگر کہیں کیچڑ اُچھالنے کی کوشش نہیں ہے مگر چھینٹے ضرور اُڑائے ہیں۔ طفیل ان خاکوں میں اُس بچے کی طرح ہے جو گھٹنوں گھٹنوں پانی ہے اور برابر دوسروں پر چھینٹے اڑائے جاتا ہے اور جب کوئی دوسرا نہیں ملتا تو اپنے آپ پر ہی چھینٹے اُڑانے لگ جاتا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ طفیل کا بچپن کیسا تھا! مجھے تو ایسا لگتا ہے، وہ ابھی تک بچپن کے عہد سے باہر نکلا ہی نہیں۔''

اُن کی خاکہ نگاری کا بہت تذکرہ ہوا۔ اُن کے تحریر کردہ سوانحی خاکوں میں ایک

خاکہ شاہد احمد دہلوی کا بھی تھا۔ اُس میں سے ایک اقتباس درج ذیل ہے جس سے اُن کی اس صنف میں مہارت کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے:

''22 مئی 1906ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ بچپن میں والدہ کا انتقال ہوگیا۔ والد نے اُن کی دیکھ بھال کے لیے یورپین گورنس رکھی جس کی وجہ سے اُن کی بنیادی انگریزی اچھی ہوگئی اور یہ بھی کہ اس زبان سے لگاؤ پیدا ہوا۔ یہی وجہ تھی کہ قلم اُٹھاتے تھے اور انگریزی مضامین کا ترجمہ کر ڈالتے تھے۔ ترجمہ کرنا خالہ جی کا گھر نہیں۔ بڑے بڑے مار کھا گئے مگر اُنھوں نے درجنوں ہی کتابوں کا ترجمہ کر ڈالا۔ وہ بھی اصل کی رُوح کو سمجھ کر، اپنی دل نشین اُردو میں، ترجموں میں یا تو عنایت اللہ دہلوی کا لطف آیا یا پھر ان کا، باقیوں نے تو وقت گزارنے کے لیے ترجمے کیے مگر مولوی مدن والی بات پیدا نہ ہوئی یا اگر کسی نے اچھا ترجمہ کیا بھی، تو وہ بھی ایک آدھ کتاب کا، جیسے مولوی ظفر علی خاں نے عبدالمجید سالک نے، ڈاکٹر عابد حسین نے، پطرس بخاری نے۔ یہاں بحث معیار اور مقدار دونوں سے ہے۔

ہاں تو ذکر اُن کے بچپن اور اُن کی تعلیم کا ہو رہا تھا۔ اُنھوں نے ابتدائی تعلیم حیدرآباد دکن میں پائی۔ پھر علی گڑھ میں، میٹرک عربک سکول دِلّی سے کیا۔ لاہور کے ایف سی کالج سے ایف ایس سی کیا۔ آخر میں مشن کالج سے بی اے آنرز کی ڈِگری لی۔

شاہد صاحب کے بہنوئی، ڈاکٹر اجمل حسین صاحب کنگ ایڈورڈ کالج (لاہور) میں پروفیسر تھے۔ اُن کی خواہش تھی کہ شاہد میاں ڈاکٹر بنیں۔ تھوڑا عرصہ پڑھا بھی۔ چونکہ یہ بنیادی طور پر بے حد رقیق القلب تھے۔ اس لیے مُردوں کی چیر پھاڑ سے بھاگے۔ بھاگے بھی ایسے کہ دلّی جا کر دم لیا۔

جن دنوں یہ دہلی کے مشن کالج سے ایم اے کی ڈگری حاصل کرنے

کے درپے تھے، اُنھیں دنوں، اُنھوں نے پرانا رسالہ ''ساقی'' جاری کیا، غالباً 1940ء میں جب سے آخری دم تک، ادب کے ساتھ اپنا رشتہ نباہا۔ نہ صرف نباہا بلکہ ادا کیا۔
رسالہ نکالنے کا تو یہ مطلب ہوتا ہے کہ ''مالی خدائی مار''۔ چنانچہ جیسے جیسے ساقی لوگوں کی نظروں میں چڑھتا گیا، توں توں جمع جتھا کم ہوتا گیا۔ ایک دن شاہد صاحب کے ماموں سیّد اشتیاق حسین چشتی (جن کے پاس ساقی کے مالی امور تھے) نے بتایا: برخوردار! تم نے باوا جان کی اتنی دولت اب تک برباد کر دی ہے، سنبھل جاؤ ورنہ ہوا کھاؤ۔
تب شاہد صاحب کے دوستوں کی کابینہ بیٹھی۔ غور و خوض ہوا۔ طے یہ پایا کہ رسالے کے ساتھ پبلشنگ ہاؤس کا بھی کام کیا جائے۔ بڑے بڑے ادیب گھر کے تھے۔ پھر نئے اور اچھے لکھنے والوں سے شاہد صاحب کے مراسم تھے، بلکہ جن نئے لکھنے والوں کا سکہ رواں تھا اُن میں سے بیشتر کو ''ساقی'' نے اُجالا تھا۔
یوں کہیں جا کر رسالے کے سنبھلنے کے آثار پیدا ہوئے۔ کتابیں بھی چھپتی رہیں۔ رسالہ بھی نکلتا رہا۔ اُن دنوں ترقی پسند ادب کا طوطی بول رہا تھا۔ شاہد صاحب ایسے لٹریچر کے مربیّوں میں سے تھے۔ لہٰذا خوب کاروبار چمکا۔ ادیبوں کی بھی خدمت ہوئی، ادب کی بھی!
پاکستان بنا تو یہ صرف اپنا قلم اُٹھا کر ادھر چلے آئے تھے۔ بنی تو دال روٹی کے چکر میں اُسی کو گھساتے رہے، آخری دم تک، اُسی کی روٹی کھائی۔
سرمایہ نہ ہونے کی وجہ سے، جب ادھر پبلشنگ ہاؤس کا کام نہ چلا تو اُنھوں نے سوچا مُستحق ادیبوں کو یا اُن کے ورثا کو کتابوں کے حقوق لوٹا دیے جائیں تاکہ اُنھیں کچھ مالی آسودگی ہو جائے اور کتابیں بھی بازار میں آ جائیں۔ یہ حوصلہ بھی کسی کسی کا ہوتا ہے کہ اپنی خریدی ہوئی چیز کو کوئی یوں بغیر داموں واپس کرے۔ اس موضوع پر کسی نے اُن سے

بات کی بھی تھی۔ جواب میں اُنھوں نے کہا تھا کہ پاکستان آ کر مجھے معلوم ہوا ہے کہ غربت کیا چیز ہوتی ہے۔ میرے پاس اور تو کچھ ہے نہیں۔ یہی کتابوں کے حقوق ہیں۔ سوچا، یہی ساتھیوں کو واپس کر دوں۔

اُنھیں ادبی ذوق ورثہ میں ملا تھا۔ ڈپٹی نذیر احمد کے پوتے تھے۔ جغادری ادیب کے پوتے، پھر بشیر الدین احمد کے صاحبزادے، جن کی ادبی حیثیت نہ صرف مسلّم تھی بلکہ حد درجہ واجب التعظیم بھی۔ اُنھوں نے ''واقعات دارالحکومت دہلی'' ایک ایسی کتاب (تین جلد و ں میں) لکھ دی ہے کہ کیا اس سے بہتر کوئی لِکھ سکے گا۔ یہ اکیلی کتاب ہی اُن کا بہت بڑا کارنامہ ہے، جو بڑی لمبی زندگی پائے گی۔ دِلّی پر کچھ لکھنے کے لیے اس کتاب کو بھولنے والا ٹھوکر کھائے گا، موتی نہ رولے گا۔

پھر اسی قسم کی ایک اور کتاب ''تاریخِ بیجاپور'' لکھی۔ اس کا بھی حق ادا کیا۔ مگر یہ کوشش ''واقعات دارالحکومت دہلی'' سے بالاتر نہیں، فروتر ہے، مگر اس فروتر کا بھی مرتبہ یہ ہے کہ اس سے بڑھ کر کوئی کچھ کہنے والا پیدا ہوگا تو اُسے لوہے کے چنے چبانے ہوں گے۔ اسی طرح کا اُن کا ایک اور کارنامہ ''فرامینِ سلاطین'' ہے جو مُغل بادشاہوں کے فرامین پر مشتمل ایک قیمتی دستاویز ہے۔

باپ ڈپٹی نذیر احمد نے مراۃ العروس لکھی تو بیٹے (بشیر الدین احمد) نے اسی طرز پر ''اقبال دلھن'' لکھی۔ بشیر الدین جو کچھ بھی تھے، اپنی جگہ بھاری پتھر تھے مگر ڈپٹی نذیر احمد تو نہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ''اقبال دلھن'' کو زیادہ شہرت کے پَر نہ لگے۔''

طفیل صاحب نے نقوش کے 35 برس کے طویل عرصے میں 133 پرچے ترتیب دیے۔ جن میں سے آخری پرچہ اُن کی وفات کے بعد شائع ہوا۔ اُن کے سوانح کے بارے میں نقوش طفیل نمبر (دو جلدوں میں) اُن کے بیٹے جاوید طفیل نے شائع کیا۔ اُنھوں نے کئی

خاص نمبر دوبارہ شائع کئے جو اپنی جگہ انتہائی جامع اور بھرپور تھے۔ اُن میں بیاضِ غالب (بخطِ غالب)، غالب نمبر، منٹو نمبر، اقبال نمبر، انیس نمبر، میر نمبر، عصری ادب نمبر، افسانہ نمبر، ادبی معرکے نمبر، طنز و مزاح نمبر، شخصیات نمبر، خطوط نمبر، آپ بیتی نمبر، جدید غزل نمبر، پطرس بخاری نمبر، لاہور نمبر اور رسولؐ نمبر جیسے عظیم الشان نمبروں کی مکرر اشاعت ہوئی۔ رسولؐ نمبر 13 جلدوں پر مشتمل ایک لاثانی دستاویز ہے۔ ''نقوش رسولؐ نمبر'' کے بارے میں تحسین فراقی نے ''نقوش، منزل بہ منزل'' میں کچھ تفصیلات بیان کی ہیں:

> ''حقیقت یہ ہے کہ نہ صرف ''نقوش'' کی ادبی خدمات آنے والے زمانوں میں زندہ رہیں گی بلکہ سیرتِ سرورؐ عالم پر تحریروں کی جمع و تدوین کے سلسلے میں بھی اس کا کارنامہ مدتوں یاد رکھا جائے گا۔
>
> ''نقوش'' اِس عظیم موضوع پر تیرہ جلدیں پیش کر چکا ہے۔ ان تیرہ جلدوں کے مشمولات کا مختصر جائزہ بھی ان صفحات میں ممکن نہیں ہے۔ ہاں محض مشمولات کی جانب اشارے کیے جاسکتے ہیں۔ ان جلدوں میں سیرت کی جامعیت کے بنیادی اُصول، سیرت نگاری کی ذمے داریاں، سیرتِ نبویؐ قرآنی، قرآن سے مظہرِ نبوت کی تشریح، قرآن کی روشنی میں بھی کریمؐ کا مقصدِ بعثت، حضرت عرُوہ بن الزبیر پہلے سیرت نگار، ابنِ اسحاق اور سیرتِ رسول اللہؐ ابن ہشام اور سیرت ابن ہشام، تاریخ یعقوبی، ابنِ عبدالبر، قاضی عیاض، ابنِ کثیر اور ابنِ الجوزی کی سیرۃ نگاری، سیرت نگاری کی اوّلیں کتابیں، سیرتِ نبوی کی توقیت، خطباتِ رسولؐ، مکاتیبِ نبویؐ، حقیقتِ توحید، وحی، مکۂ مدینہ کی تاریخ قدیم، رحمۃ اللعالمینؐ بحیثیتِ انسانِ کامل، سیاسی نظام پر حضور اکرمؐ کے اثرات، فلاحی معاشرہ اور اقتصادی نظام، علومِ انسانی کے فروغ پر رسولؐ اللہ کا اثر، حضورؐ بحیثیتِ سپہ سالار، رسول اللہؐ غیر مسلموں کی نظر میں، عہدِ نبوی میں ریاست کا نشو و ارتقا، عہدِ نبویؐ میں تنظیمِ ریاست و حکومت، فنِ حدیث کا جائزہ، اقوالِ رسولؐ، مکالماتِ رسولؐ، کاتبانِ وحی، عہدِ نبویؐ

کے چند نامور سپہ سالار، بارگاہِ رسالتؐ میں حاضر ہونے والے وفود، اصحاب بدر، اصحابِ صُفّہ، ارشادات نبویؐ، فصاحتِ نبویؐ، علم وتہذیب کے ارتقا میں معارفِ محمدیؐ کا حِصّہ، رسالتِ محمدیؐ کے عقلی ثبوت اور آثار ومتعلقاتِ سیرت پر بڑا قابلِ قدر لوازمہ فراہم کر دیا گیا ہے۔ یہ لوازمہ ممتاز اور عالمی شہرت رکھنے والے علماء کی تحریروں اور تراجم پر مشتمل ہے۔ رسولؐ نمبر کی دسویں جلد میں نعت رسولؐ مقبول کے سلسلے میں نہ صرف عربی، فارسی اور اُردو کے نعتیہ ادب کا انتخاب شامل کیا گیا ہے بلکہ صنفِ نعت پر نامور لکھنے والوں سے مضامین بھی لکھوائے گئے ہیں۔ ان رسولؐ نمبروں میں گیارھویں جلد اس اعتبار سے نہایت قابلِ قدر ہے کہ اس کے ذریعے پہلی بار سیرت ابنِ اسحاق کے کچھ اجزا (اُردو ترجے کی صورت میں) منظرِ عام پر لائے گئے ہیں۔ یہ اجزا ممتاز عالمِ دین ڈاکٹر حمید اللہ نے دریافت کیے۔ بارہویں اور تیرہویں جلد میں ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی اور مصطفی سباعی کے مضامین لائق توجہ ہیں جبکہ آخری جلد میں خُلفائے راشدین کے احوال اور کارناموں کو خوبی سے سمیٹا گیا ہے۔ اُردو میں سیرتی ادب کے اتنے عظیم مجموعے کی کوئی مثال نہیں ملتی اسی لیے اس اہم کارنامے کو خراج تحسین پیش کرنے میں علمی دُنیا نے بخل سے کام نہیں لیا۔ نقوش کے رسولؐ نمبر نے جن ممتاز اہلِ قلم سے خراج وصول کیا ہے ان میں خصوصیت کے ساتھ مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی، علامہ سعید احمد اکبر آبادی، مولانا محمد مالک کاندھلوی، سیّد صباح الدین عبدالرحمن، ڈاکٹر محمد حمید اللہ، عبدالقدوس ہاشمی، غلام جیلانی برق، نعیم صدیقی، جمیل جالبی، مشفق خواجہ، ممتاز مفتی، ابو سلمان شاہجہان پوری اور حکیم عبدالقوی دریابادی جیسے مُستند لوگ شامل ہیں۔

اگر طفیل کے کچھ گناہ رہ بھی گئے ہیں تو رسولؐ نمبر کی معرکہ آرا

(13 جلدیں) ان کے ان گناہوں کو ڈھانپ لیں گی اور ادب کی تاریخ میں نقوش کا ذکر ہمیشہ سنہری لفظوں میں کیا جائے گا۔ رہا اس سنہری اون میں کہیں کہیں کمزور اور گدلے سُوتی ریشوں کی موجودگی کا مسئلہ تو یہ عین تقاضائے بشریت ہے، خالص سنہری اون آج کہاں ملتی ہے!

رشید احمد صدیقی افسوس کیا کرتے تھے کہ ''لوگ آج کل دوسروں کی پگڑی اور اپنا نام اُچھالنے کی فکر میں رہتے ہیں مدیرِ نقوش نے اپنا نام ضرور اُچھالا مگر مقامِ شکر ہے کہ کسی کی پگڑی نہیں اچھالی۔''

نقوش رسولؐ نمبر پر اُنھیں دنیا بھر سے مبارکباد کے پیغامات وصول ہوتے رہے اور طفیل صاحب اپنے آخری سانس تک اپنی زندگی بھر کی کمائی رسولؐ نمبر ہی کو مانتے رہے۔ اُن کی اس کاوش پر تنویر بخاری نے اُنھیں اِن الفاظ میں یاد کیا۔

کیتا عشق رسولؐ دا حق پورا
جھاکن پئے، ''نقوش'' چوں نقش اوہدے
نقش حق دا جیس جما دتا
جلداں تیراں وچ سیرت نوں جمع کر کے
''سیرت نمبر'' نوں اَمر بنا دِتا
ہویا نہیں سی کم جو اَج تیکن
کر کے اوہ طفیل وکھا دتا
کیتا عِشق رسول دا حق پورا
حَقّی فرض تنویر بجا دتا

نقوش کا ہر نمبر قابلِ ذکر اور قابلِ بحث بھی ہے لیکن لاہور کی تاریخ کے حوالے سے لاہور نمبر قابلِ ذِکر بھی اور قابلِ بحث بھی ہے، کیونکہ آج کے طلبا کے لیے یہ نمبر کسی بھی خزانے سے کم نہیں۔ کسی بھی طالب علم کی تحقیق نقوش لاہور نمبر کے بغیر ادھوری ہے۔ لاہور نمبر کی تفصیلات تحسین فراقی نے اس طرح بیان کی ہیں:

''لاہور نمبر کی اشاعت ''نقوش'' کا ایک اور اہم سنگِ میل ہے۔ یہ نمبر

لاہور کی سیاسی اور ثقافتی تاریخ کا ایک انتہائی مُفصل، جاندار اور دلچسپ مرقع ہے۔ اس نمبر میں گزشتہ و موجودہ لاہور کا کوئی گوشہ نہیں چھوڑا گیا۔ لاہور کے باغات، مزارات، مُغلیہ عہد، خالصہ عہد، علمائے کرام، دینی مدرسے، مساجد، کتب خانے، دروازے، انگریزی دور کی تعمیرات، مندر، گرجے، کالج، موسیقار، گویے، ہلکی پھلکی موسیقی گانے والے اور گانے والیاں، سارنگی نواز، طبلہ نواز، کلارنٹ نواز، پیانو نواز، نَے نوا، سرود نواز، قوال، میوزک ڈائریکٹر، اکھاڑے، تکیے، میلے، ڈراما، تھیٹر، فلم، اطباء مُصنف، موٗرخ، خوش نویس، ادبی تحاریک، اُردو صحافت اور لاہور کے فارسی گو شعرا، سب اس نمبر میں بولتے چالتے ' گاتے گمکتے، اُچھلتے، پچھاڑتے، پڑھتے پڑھاتے، لڑتے مارتے، کودتے پھاندتے، پھونکتے اور لپکتے لہلہاتے دِکھائی دیے جاتے ہیں۔''

نقوش لاہور نمبر پر ایک زاویۂ نگاہ سے بحث تو ہو ہی سکتی ہے کہ جب لاہور کی تاریخ و ثقافت کو موضوعِ بحث بنایا گیا تو ثقافت کے ایک انتہائی اہم جزو مادری زبان کو کس طرح نظرانداز کر دیا گیا۔ اہلِ لاہور کی ہزار ہا برس سے زبان پنجابی تھی اور نقوش کے عالمِ شباب کے دنوں میں بھی تمام لاہور میں پنجابی زبان ہی رائج تھی۔ طفیل صاحب بذاتِ خود اپنے پُرکھوں کو کئی پیڑھیوں سے اہلِ لاہور ہی جانتے اور مانتے تھے۔ اُنھوں نے ثقافت کے اس اہم ترین جزو کو کس طرح پسِ پشت ڈال دیا..... یہ سوال اپنی جگہ موجود ہے۔ اگر ہم ادارے کے نام ''ادارۂ فروغِ اُردُو'' کی مناسبت سے جانیں تو پھر اہلِ ایران کی زبان فارسی اور فارسی گو شعرا کا نقوش لاہور نمبر میں موجود ہونا ایک سوالیہ نشان بن جاتا ہے۔ حالانکہ طفیل صاحب زبان کی اہمیت کو بہت اچھی طرح جانتے تھے۔ انھوں نے جب اپنا سفر نامہ ''روزنامچہ'' تحریر کیا تو وہ لندن کے شہر مانچسٹر میں تھے اُس میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر صاحب اس ہسپتال کے علاوہ مانچسٹر کے دو اور ہسپتالوں کے بھی ڈاکٹر ہیں، مگر وہ ذمہ داری جُزوی ہے۔ اصل کارنامہ ننھے منے فرشتوں سے متعلق ہے۔

ہسپتال سے نکلے تو ایک پاکستانی سٹور پر گئے، کچھ چیزیں خریدنا تھیں، وہاں پہنچے تو اندر لوگ پنجابی بول رہے تھے، کچھ پنجابیوں کو اکٹھے دیکھا تو خوشی ہوئی۔ ویسے انگریزوں سے زیادہ خوشی اُس وقت بھی ہوتی تھی، جب کوئی ادھر ہندوستان کا بھی شہری ملتا تھا۔ زبان کی ایکتا بڑی بات ہوتی ہے۔''

اسی طرح اُنھوں نے سوانحی خاکہ ''حکیم صاحب'' تحریر کیا تو ایک جملہ، ایک فٹ نوٹ کی مدد سے یوں تحریر کیا:

جملہ: غریبوں سے حتیٰ المقدور رعایت کرتے ہیں۔ امیروں سے ''ٹکا'' کے پیسے لیتے ہیں مگر کھال پھر بھی سلامت رہنے دیتے ہیں۔

فٹ نوٹ: یہ لفظ پنجابی کا ہے۔ اُردو میں مجھے اس سے بہتر لفظ نہیں ملا۔

طفیل صاحب اہلِ محلہ میں باؤجی کہلاتے تھے۔ اُن کے بچے بھی اُنھیں ''ابا جی'' کے ساتھ ساتھ ''باؤجی'' بھی کہتے تھے۔

لاہور کی تاریخ کے اہم ترین شاعر شاہ حسینؒ المعروف مادھولعل حسینؒ کے بغیر لاہور کی شاعری کس طرح مکمل ہوسکتی ہے۔ اُن کے علاوہ بیسویں صدی کے اوائل ہی میں اُستاد کرم امرتسری، اُستاد گام، اُستاد عشق لہر، مولا بخش کشتہ، اُستاد شرم امرتسری، اُستاد فیروز دِین شرف، ملک لال دِین قیصر، قاضی الہ دین کشش، چودھری محمد افضل خان، اُستاد اللہ دتہ ناظر، اُستاد دامن اور نثر نگاری میں اکبر لاہوری، انور علی اور کئی دیگر نام نمایاں نظر آتے ہیں اور ان میں سے ایک بڑی تعداد شہرِ لاہور ہی میں مدفون ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ سوال بھی جواب طلب ہے کہ اُس وقت کے بڑے پنجابی نثر نگار اور پنجابی شاعر حضرات طفیل صاحب کے ساتھ رابطے میں تھے یا نہیں!

طفیل صاحب کی زندگی ہی میں ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن نے اُن کے بارے میں ''محمد نقوش'' کے عنوان سے کتاب ترتیب دِی، جس میں اُن کے حالاتِ زندگی اور اُن کی ادبی کاوشوں کو سراہا گیا۔ سرکار پاکستان نے تحقیق، افسانہ، طنز و مزاح، خاکہ اور شاعری کی ادبی اَصناف پر نقوش ایوارڈ بھی جاری کیا۔ اُنھیں صدارتی انعام کے ساتھ ساتھ تمغۂ امتیاز سے بھی

نوازا گیا۔لیکن پاکستان میں صدارتی اور دیگر انعامات کی بندر بانٹ کس طرح ہوتی ہے، وہ طفیل صاحب ہی کی ایک تحریر ''صدارتی انعام'' سے واضح ہوجاتی ہے:

میرے کئی دوستوں کوصدارتی انعام ملے۔ اُنھیں بھی ملے، جواس کے حقدار تھے، اُنھیں بھی ملے، جواس کے حقدار نہ تھے، کئی مرتبہ مجھ سے دوستوں نے کہا: انعام آپ کا حق ہے مگر حکومت توجہ نہیں دے رہی'' مگر میں نے اس اعزاز کوکبھی بھی اپنے لیے باعثِ عزت نہ جانا، کیونکہ اصلی انعام تو وہ ہے جو اہلِ علم کے دِلوں میں ہو نہ کہ وہ جوحکومت کے ایوانوں سے حاصل ہو۔

ایک موقع ایسا آیا تھا کہ جب مجھے بھی یہ اعزاز حاصل ہوسکتا تھا۔ وہ یوں کہ مرکز کے سیکرٹری تعلیمات میرے دوست تھے۔ اُنھوں نے ازخود میرے لیے سوچا اور تحریک کردی۔ اس وقت کے وزیرِتعلیم شمس الحق صاحب سے بھی تجویز پر صاد کرالیا۔ معاملہ تقریباً پکا تھا۔ ریکارڈ آج بھی موجود ہوگا۔

اُنھیں دنوں مَیں بھی کسی کام سے اسلام آباد گیا ہوا تھا۔ سیکرٹری تعلیمات کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ وہاں ڈاکٹر عبدالسلام، جو صدر کے مُشیر بھی ہیں اور مشہور سائنٹسٹ بھی، سیکرٹری صاحب سے ملنے آئے۔ اُنھوں نے اور باتوں کے ساتھ یہ بھی فرمایا کہ اب کے صدارتی انعام شیخ محمد اسماعیل پانی پتی کو ملنا چاہیے۔

جب ڈاکٹر عبدالسلام چلے گئے تو سیکرٹری صاحب نے میری طرف دیکھا۔ میں نے اُن سے گزارش کی کہ ''مجھے انعام کی خواہش نہیں ہے۔ شیخ صاحب ضعیف اور ناتواں ہیں۔ اس لیے میری بھی سفارش اُن کے لیے ہے۔''

اس پر سیکرٹری صاحب نے فرمایا تھا کہ ''میری موجودگی میں اگر آپ کو آپ کا حق مل گیا، تو مل گیا۔ ورنہ بعد میں نہ ملے گا۔

میرا جواب یہ تھا:

اب مَیں ہُوں جو دُنیا میں تو پُرساں نہیں کوئی
جب میں نہ رہوں گا تو مری یاد رہے گی

نقوش کے ہر شمارے کا آغاز طفیل صاحب کی تحریر بعنوان ''طلوع'' سے ہوتا تھا۔ طلوع کی تحریریں اپنی جگہ انتہائی اہم تھیں۔ جاوید طفیل نے وہ تمام تحریریں نقوش طفیل نمبر کا حصہ بنائیں۔ اگر ان کا بغور مطالعہ کیا جائے تو وہ پاکستان میں بدلتے ادبی رُجحانات کے تسلسل کی نشان دہی کرتے ہیں۔ قارئین کی دلچسپی کے لیے نقوش شمارہ نمبر 122 (جنوری 1977ء) کا ''طلوع'' حاضر ہے:

''جنوری 1977ء

ہمارے ایک بھائی الہ آباد میں رہتے ہیں۔ وہ ہندو ہیں، میں مُسلمان۔ وہ شاعر ہیں، میں مدیر ہوں۔ میرا نام محمد طفیل ہے، اُن کا نام رگھوپتی سہائے۔ میں معروف محمد نقوش کے نام سے ہوں، وہ معروف فراق گورکھپوری کے نام سے — نوید کہ ان کا ایک خط آیا ہے:

''میرے دل و جگر بھائی طفیل، وہ دن تو آیا کہ میرے دل و دماغ اور کلیجے کے جو دو ٹکڑے ہو گئے تھے جن میں سے ایک پاکستان میں رہ گیا تھا اور صرف آدھا ہندوستان میں، اب وہ دونوں ٹکڑے پھر مل گئے۔ میرا دل و دماغ اور کلیجا پورے کا پورا پاکستان میں بھی ہے اور پورے کا پورا ہندوستان میں بھی ہے۔ محبت بڑے سے بڑے فاصلے کی بھی نفی نہیں، شاعرِ عظم ٹیگور نے کیا خوب کہا ہے کہ ہم کئی ہیں اس لیے اور بھی ہم ایک ہیں کیونکہ جو خلائیں ہمارے ٹکڑے ہو جانے سے پیدا ہوتی ہیں، اُنھیں ہم محبت سے بھر دیتے ہیں، کچھ اِس سے بڑھ کر عاصی غازی پوری کا یہ مطلع ہے:

تمھیں کثرت سے وحدت اور محوِ ذوقِ وحدت ہو
کچھ اس سے اور بڑھ جاؤ تو وحدت ہو نہ کثرت ہو

چنانچہ یہ غزل جو آج سے کئی برس پہلے دس یا بارہ اشعار پر ختم ہو گئی تھی،

کسی غیبی سبب سے میرے وجدان میں پھر عود کر آئی اور کچھ کم چالیس اشعار کی غزل ہوگئی۔ اب یہ پوری غزل اپنے پیغامِ محبت کے ساتھ آپ کی خدمت میں نقوش کے لیے حاضر ہے۔ بھائی! اب میں موت اور زندگی کے درمیان سانس لے رہا ہوں۔''

1974ء میں میری آپا کا بھی ایک خط آیا تھا۔ آپا سے مراد عصمت چغتائی! بے شک میں لاہور میں تھا، وہ بمبئی میں تھیں۔ بڑا فاصلہ تھا۔ مگر اس پر بھی کوئی فاصلہ نہ تھا۔ ذہنی قرب کی حدیں آس پاس ہی ہوتی ہیں۔ اُنھیں دیکھنے کی آرزو بھی تھی مگر جلد دیکھ نہ پایا۔ کوئی 26 برس کے گیان دھیان کے بعد آپا خود ہی لاہور آ نکلیں۔ پوچھا۔ کہو طفیل کیسے ہو؟ جواب میں میں نے بھی پوچھا۔ آپ کیسی ہیں؟ میرا جواب مختصر تھا۔ مگر آپا کا جواب پوری ایک کتاب ہے۔ جو میں لکھ لوں تو آپ کو پڑھنے کے لیے دوں۔ بس ذرا فرصت کی بات ہے۔ اس وقت تو میں آپا کے 1974ء کے ایک خط کا ذکر کرنے نکلا تھا۔

''طفیل صاحب! آپ کا خط پا کر دل کی عجیب حالت ہوئی۔ کوئی کہانی بغیر چھپی نہیں تھی۔ جلدی سے لکھی کہ آپ کی فرمائش کیسے بھی پوری ہو جائے۔ بہت جلدی میں لکھی ہے۔ جی چاہتا تھا کہ بڑی چیز بھیجتی مگر مہلت نہیں ہے اور سنو دروازے ضرور کھلیں گے۔ پچیس برس سے انتظار ہے۔ ہم لوگ یہاں زمین ہموار کر رہے ہیں۔ دراصل اب تک کچھ کیا بھی تو نہیں۔ اب وقت آ گیا ہے کہ دونوں ملک کوئی راستہ نکالیں۔ دونوں طرف محبت بھرے دل ہیں۔ پھر یہ دُوریاں کب تک؟ پرسانِ حال کو سلام! پورے پاکستان کو دعائیں اور سلام''—

خدا کرے یہ پیار کی کہکشاں سدا سلامت رہے۔ صرف ذرا سی بات ہماری طرف سے کہ ''ہمیں اپنی آزادی بڑی عزیز ہے۔ ہم دونوں ایک ہیں'' کے نعرے کا بھی ساتھ نہیں دے سکتے۔''

بقول فراق گورکھپوری دل و دماغ اور کلیجے کے ٹکڑے پھر مل گئے ہیں۔
عِصّمت چغتائی کی خواہش کے مطابق دروازے کھل گئے ہیں— مگر میرے کرم فرماؤ! پیار کے جو راستے کُھل گئے ہیں، اب اُن راستوں سے ٹینکوں اور توپوں کا گزر نہ ہو۔

محمد طفیل‘‘

طفیل صاحب نے تمام عمر انتہائی محنت اور مستقل مزاجی سے کام کیا۔ اُن کی زندگی کے بعد چند ایک شمارے جن میں قرآن نمبر بھی شامل ہے، شائع ہوئے تھے۔ اُن کی تیاری بھی اُنھوں نے اپنی زندگی ہی میں شروع کر دی تھی۔ اُن کی وفات کے بعد آج تک ادارہ ’’نقوش‘‘ پرانے نمبر ہی شائع کر رہا ہے اور ان کی طلب اتنی زیادہ ہے کہ لوگ سالہا سال ان نمبروں کا انتظار کرتے ہیں۔ خود مجھے بھی آپ بیتی نمبر کی شدید تلاش ہے۔ طفیل صاحب انتہائی خاموشی کے ساتھ کام کرتے تھے اور جب کام باہر آتا تھا تو دُنیا بھر میں ایک شور مچ جاتا تھا۔ اپنے کام کے مانند اُنھوں نے اپنا آخری سفر بھی انتہائی خاموشی سے طے کیا۔ اُن کی وفات دُنیا بھر کے اُردو ادبی حلقوں میں ایک بڑے سانحے سے کم نہ تھی۔ طفیل صاحب کسی کام کے سلسلے میں اسلام آباد گئے ہوئے تھے۔ 4 جولائی 1986ء کو اُنھوں نے اپنے ایک قریبی دوست کے ہاں قیام کیا اور صبح سویرے جلد اُٹھانے کو کہا۔ لیکن اگلی صبح اُن کو مالکِ حقیقی نے اپنے پاس بلا لیا تھا۔ اُن کی میّت اسلام آباد سے لاہور لائی گئی۔ اُن کے واپسی کے سفر کی رُوداد صادق حسین نے اپنے مضمون ’’چُپ کی چادر‘‘ میں بیان کی ہے۔ اس مضمون کا آخری حصہ ملاحظہ فرمایئے:

’’5 جولائی 1986ء صبح سویرے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ میری بیوی نے رسیور اُٹھایا۔ اس نے کہا منشا یاد کا فون ہے۔ منشا یاد کی آواز میں زندگی اور زندگی کا عزم ہوتا ہے۔ اُس دن منشا یاد کی آواز میں زندگی تھی نہ عزم۔ اُس نے کہا: ’’محمد طفیل، اختر جمال کے گھر ٹھہرے ہوئے تھے۔ رات کو سوئے اور پھر نہ اُٹھے۔‘‘ اتنے میں ڈاکٹر وحید قریشی کا فون آ گیا۔ آج اُن کی آواز میں وہ گھن گرج نہ تھی۔ اس آواز میں دُکھ تھا اور وہ دُکھ ہم نے آپس میں بانٹ لیا۔

سوگوار دوست احباب اختر جمال کے گھر جمع ہو گئے۔ اس مرتبہ محمد طفیل تنہا اسلام آباد آیا تھا۔ وہ ایک کمرے میں، پلنگ پر چپ چاپ پڑا تھا...... یوں جیسے گہری نیند سو رہا ہو۔ چہرہ پرسکون تھا۔ زندگی کی کہانی کا مرکزی نقطہ خاموش ہو چکا تھا، محبتوں کی سوغاتیں بانٹنے والا خالی ہاتھ تھا۔ احسن علی خان اور اختر جمال میّت کے پاس کھڑے تھے۔ میرے کانوں میں محمد طفیل کی آواز گونج رہی تھی: ''میں اُن کے پاس ہوتا ہوں، تو اُن کی ڈھارس بندھی رہتی ہے۔''

جاوید طفیل لاہور سے اُڑ کر اپنے باپ کے پاس پہنچ گیا۔ اس کے ہزار پکارنے پر ابا جی نہ بولے۔ تھوڑی دیر بعد ایک لمبی ویگن نما گاڑی داتا کی نگری کی طرف چل پڑی، اس گاڑی میں محمد طفیل بدستور سو رہا تھا۔ احسن علی خاں، اختر جمال، میری بیگم اور مَیں محمد طفیل کی موٹر کار میں سفر کر رہے تھے۔ گزشتہ شب سونے سے پہلے، محمد طفیل نے دو کام کیے تھے۔ پہلا یہ کہ اپنی کواٹر کار کی ٹینکی پٹرول سے بھرا لی۔ دوسرا یہ کہ رسول نمبر کا پورا سیٹ اختر جمال کے حوالے کرتے ہوئے کہا:

''یہ امانت صادق حسین کو پہنچا دیں۔ میں منہ اندھیرے لاہور روانہ ہو جاؤں گا۔''

منہ اندھیرے تو وہ لاہور روانہ نہ ہو سکا۔ اب تو سورج نکل آیا تھا۔ روپہلی کرنیں اس راستے سے کھیلنے لگیں جن پر کل محمد طفیل کے قدم پڑے تھے۔ ان قدموں کا کوئی اعتبار نہیں۔ زندگی سے اُن کا رشتہ اچانک ٹوٹ جاتا ہے۔ ''اچانک'' کہنا شاید دُرست نہ ہو، اس لیے کہ اس شکست کے پیچھے ایک لمبی داستان ہوتی ہے۔

میّت ایک باوقار رفتار سے دریائے سوہاں کے پُل پر سے گزری۔ پوٹھوہار کی سرزمین کو ایک دوست کا آخری سلام پہنچا تو سڑک کے دونوں طرف کھڑے ٹیلے ٹبّوں پر اُداسی چھا گئی۔ محمد طفیل پوٹھوہار کے

کنوؤں کا ٹھنڈا اور میٹھا پانی پسند کرتا تھا۔
میّت جہلم کے پُل پر سے گزری۔ لہروں نے چپ سادھ رکھی تھی۔ رچنا کا سفر طے ہوا۔ چناب پیچھے رہ گیا۔ اپنی دھرتی کے ان ناتوں سے ایک محبِ وطن بچھڑ رہا تھا۔ دریائے راوی پار کر کے داتا کی نگری آ گئی۔ محمد طفیل، داتا کے دربار میں حاضری دیا کرتا تھا۔ اس شہر کے راستے، اندرون شہر کی تنگ گلیاں اور تاریخی دروازے، سب محمد طفیل کے بچپن کے دوست تھے۔ اس نگری کے دوست وفادار ہوتے ہیں۔ موت اُن کی دوستی پر اثر انداز نہیں ہوتی۔
اُسی شام، محمد طفیل کو سپردِ خاک کر دیا گیا۔
محمد طفیل کے چھوٹے بھائی اکرم نے کہا: ''میں تو آج یتیم ہوا ہوں۔''
بیگم طفیل نے کہا: ''مجھے اس بات کا صدمہ ہے کہ میں اس مرتبہ اپنے شوہر کے ہمراہ اسلام آباد نہ جا سکی۔ خدا جانے ان کا کس حال میں دم نکلا ہوگا۔ اُنھیں پیاس لگتی، تو میں پانی پلاتی۔ شاید وہ کوئی آخری بات کرتے۔''
محمد طفیل اپنی پیاس بجھا چکا تھا۔ وہ آخری باتیں کر چکا تھا۔ اس کا پُرسکون چہرہ گواہی دے رہا تھا: ''میں زندہ ہوں اور موت اتنی ہی خوب صورت ہے جتنی کہ زندگی۔''

اُن کی وفات کے بعد اُن کے عہد کے کئی بڑے شعرا نے قطعات تاریخ و رحلت تحریر کیے، جن میں علی احمد جلیلی، کسریٰ منہاس، شان الحق حقی، عبدالصمد صارم، مُغیث الدین فریدی، سیّد عارف محمود، محمد شریف بِگل کے نام نمایاں ہیں۔
محبوب احمد تھابل نے تاریخ یوں کہی:

''نقوشِ'' بے خزاں بخشے ہیں اس نے کرے گا اِک زمانہ تا ابد یاد

کہو تاریخِ رحلت ان کی تھابل!   ''فروغِ اُردُو'' سے خارج ہو ''فواد''
۱۴۹۷ (۔) ۹۱=۱۴۰۶ھ

اُنھیں قبرستان میانی صاحب لاہور میں دفن کیا گیا۔ اُن کی قبر کا کتبہ مشہور خطاط سیّد نفیس رقم کے فن کی نشانی ہے۔ کتبے کی عبارت یوں ہے:

ھو الحی القیوم

محمد طفیل

نقوش

صاحب

تاریخ وفات

۲۷ شوال المکرم ۱۴۰۶ھ

۵ جولائی ۱۹۸۶ء

انا للہ و انا الیہ راجعون

نوٹ: اس مضمون میں کئی حوالہ جات ''نقوش طفیل نمبر'' سے لیے گئے ہیں۔

ناصِر کاظمی

1925ء-1972ء

ناصر یہ شعر کیوں نہ ہوں موتی سے آبدار
اِس فن میں کی ہے میں نے بہت دیر جاں کنی
ناصر کاظمی

اُردو غزل کی تاریخ میں جب بھی جدید غزل کو موضوعِ بحث بنایا جائے گا، ناصر کاظمی کا نام سرِفہرست دِکھائی دے گا۔ چھوٹی بحر، استعارے کا استعمال ناصر کاظمی کی شاعری کے نمایاں عناصر تھے۔

ناصر کاظمی کا مکمل نام سیّد ناصر رضا کاظمی تھا۔ اُن کا جنم 8 دسمبر 1925ء کو سیّد محمد سلطان کاظمی کے گھر، شہر انبالہ میں ہوا۔ اُن کے والد ایک ذِی حیثیت شخص تھے اور تقسیم سے قبل وہ سرکار انگلشیہ، متحدہ ہندوستان کی رائل انڈین آرمی میں صوبیدار کے عہدے پر فائز تھے۔ اُن کی ابتدائی تعلیم انبالہ ہی میں مسلم ہائی سکول میں تکمیل پائی۔ اُن کا بچپن انبالہ شہر کی گلیوں، ریلوے لائن کے گرد باغات اور پرانی حویلیوں میں گزرا۔ یہی سبب ہے کہ انبالہ اُن کی زندگی کے آخری سانس تک اُن کے حواس پر چھایا رہا۔ اِس حوالے سے اُن کا یہ شعر قابلِ توجہ ہے:

انبالہ ایک شہر تھا، سنتے ہیں اب بھی ہے
مَیں ہوں اُسی لٹے ہوئے قریے کی روشنی

اسی حوالے سے ایک اقتباس اے حمید کے مضمون بعنوان ''ناصر کاظمی'' سے ملاحظہ فرمائیں (یہ مضمون اُن کی کتاب ''چاند چہرے'' میں شامل ہے):

''ایک دن سگریٹ کا کش لگا کر کہنے لگا:

''انبالے میں آم کے بہت باغ تھے۔ ساون کے موسم میں ان باغوں

میں کوئلیں بولا کرتی تھیں۔

مجھے اس کی اِس بات پر یقین آ گیا کیونکہ انبالہ شہر اور انبالہ چھاؤنی میں نے اپنی آوارہ گردیوں کے زمانے میں دیکھی ہوئی تھی۔ وہاں کے باغ بھی میں نے دیکھے تھے اور ساون کے دنوں میں ان باغوں میں کوئلوں کی آوازیں بھی سنی تھیں۔ وہ زمانہ ہی بڑا پُرسکون تھا۔ آم کے باغوں میں ساون کی راتوں کو کوئلیں بولا کرتی تھیں۔ جیسے جیسے آبادی بڑھتی جا رہی ہے، آم کے باغ شہروں سے دُور ہوتے جا رہے ہیں۔ کچھ کٹ گئے ہیں۔ باقی جو بچے ہیں، اُن میں کبھی کبھار ہی راتوں کو کوئل کی آواز سنائی دیتی ہے۔

ناصر کاظمی نے مجھے انبالے کے باغوں اور کوئلوں کی اتنی خوبصورت باتیں سنائیں کہ میں نے اُسے کہا۔

''ناصر! ان باغوں پر بلکہ اپنے شہر پر ایک مثنوی لکھو۔''

انبالے کے بعد ہم ناصر کی کالج کی تعلیم کی جانب بڑھتے ہیں۔ کالج کی تعلیم کے لیے ناصر کی نظر شملہ اور لاہور پر پڑی۔ تاہم اُن کا زیادہ وقت اسلامیہ کالج لاہور اور گورنمنٹ کالج لاہور میں گزرا۔ پندرہ برس کی عمر سے شعر کہنے والے ناصر کی شاعری کالج کے دور ہی میں نمایاں ہو گئی تھی۔ تقسیم سے قبل صاحب حیثیت ناصر نے تقسیم کے بعد کس طرح کے حالات دیکھے، اُن کا تذکرہ محمد طفیل نے ''نقوش'' کے ''شخصیات نمبر'' میں کیا۔ یہ مضمون طفیل صاحب نے نامکمل تحریر کیا:

''میری ان سے ملاقات اس وقت ہوئی جب یہ اسلامیہ کالج لاہور میں پڑھتے اور ٹھاٹھ سے رہتے تھے۔ کالج میں دو لڑکوں کا بڑا چرچا تھا۔ ایک ان کا، دوسرے حمید نسیم کا۔ کالج میں جن لڑکوں کے چرچے ہوتے ہیں، اُن کی وجوہ عجیب وغریب ہوتی ہیں۔ اُن کا چرچا کیوں تھا، بات سمجھ میں نہ آئی۔ نہ شکل وصورت، نہ ذہانت، شکل وصورت تھی تو ایسی

جیسے کوئی ہالی وڈ کا جواری ہو اور ذہانت بس اتنی کہ کام چلے جائے۔

ان دنوں بس یہی سرسری سا ہی تعارف ہوا تھا۔ اس وقت اُنھوں نے چڑھی پتنگ کی طرح شانے ہلا ہلا کر کچھ مرعوب کرنا چاہا۔ اپنی امارت کی طرف اشارے بھی کیے اور دوسرے لڑکوں سے اپنے آپ کو الگ سا بھی بتایا۔

پاکستان کی بدولت یہ کھاتا پیتا شاعر اسی لاہور میں آگیا جس میں اس کی امارت سے بہت سے مرعوب تھے، مگر اب امارت اُدھر رہ گئی تھی اور یہ اِدھر آ گئے تھے۔ برسوں سے دھکے کھا رہے ہیں اور شعر کہہ رہے ہیں۔

انتظار حسین ان کی بڑی کمزوری ہیں۔ اکیلے ہوں تو یہ اُنھیں اور وہ اِنھیں ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ جب دونوں اکٹھے ہو جاتے ہیں تو کسی بھی ہاؤس میں بیٹھ جاتے ہیں، ورنہ ایک دوسرے کو ساری ساری رات ڈھونڈنے ہی میں گزار دیتے ہیں۔

ویسے ایسا ہوتا کبھی کبھی ہی ہے۔ جب تک ان دونوں کے مشاغل آپس میں نہ ٹکرائیں، یہ نوبت نہیں آتی۔ معلوم ہوتا ہے، اب دونوں نے کچھ وعدے وعید کر رکھے ہیں۔ اگر مشاغل ٹکرا بھی جائیں تو بھی ایک دوسرے کو صورت دِکھانا ہے ضروری۔

ناصر صاحب بلاشبہ مزے دار آدمی ہیں، بور قطعی نہیں ہیں۔ ورنہ شاعر، چند ایک کو چھوڑ کر بیس قدم دُور اپنے اوصاف سمیت پہچان لیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ اپنے ملنے والوں میں ضرورت کی حد تک ہردلعزیز ہیں۔ اگر ہردلعزیز نہیں ہیں تو صرف اُن میں جو خود کو بھی غزل کا شاعر سمجھتے ہیں۔

اُن کی باتیں بڑی دلچسپ ہوتی ہیں، پوری معصومیت لیے ہوئے۔ اگر اُنھیں معلوم ہو جائے کہ فلاں ادیب کی فلاں آدمی سے نہیں بنتی تو اس

رعایت سے فائدہ اٹھاتے اور سگریٹ پیتے ہوئے پوچھیں گے۔ وہ چیز دیکھی؟ بات بنی نہیں، اپنی تو سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ پھر مخاطب کی رڈی سی چیز پر تبصرہ— واہ وا— سُبحان اللہ— بات ہوئی نا کوئی! بخدا جو سلیقہ اور ڈھنگ آپ کو کہنے کا ہے، اس کا عشرِ عشیر بھی اُسے نہیں چھوا۔ دیکھیے جب پندرہ برس بعد آپ مرجائیں گے تو اسے کوئی پوچھے گا بھی نہیں۔ یہ دن کو سوتے ہیں اور راتوں کو جاگتے ہیں۔ جب میں بھی اُن کا تھوڑا بہت ہمراز تھا تو مجھے معلوم تھا کہ یہ رات کے اتنے بج کر اتنے منٹ پر کہاں ملیں گے اور اتنے بج کر اتنے منٹ پر کہاں۔ جیسے جیسے سورج کے نکلنے کا وقت قریب آتا، ان کے ٹھکانے غیر یقینی ہوتے جاتے۔

اُن دنوں ان کی جیب میں ایک چھوٹی سی پنسل ہوتی تھی۔ چائے پی، بل پر دستخط کر کے سرخرو ہو گئے۔ اس طرح ان کی ساری رات بلوں پر دستخط کرنے میں گزر جاتی تھی۔ ہوٹل والوں کے سینکڑوں روپے ہو گئے تو بھی وہ مطمئن، اس لیے کہ اُن کا یہ گاہک اور شاعروں کی طرح کا نہ تھا۔ بزرگوں کا احترام کرنا، عام زندگی میں شاعری سے کام نہ لینا، صرف غزل کی کتابیں پڑھنا، نثر کی کتابوں سے دُور بھاگنا اُن کا روزمرہ ہے۔''

اُن کی شاعری میں میر کا رنگ نمایاں تھا۔ مِیر کے ساتھ ساتھ وہ اختر شیرانی اور حفیظ ہوشیار پوری سے بھی بہت متاثر دکھائی دیتے تھے۔ اُن کا پہلا شعری مجموعہ ''برگِ نے'' 1952ء میں مکتبۂ کارواں لاہور نے شائع کیا۔ اس شعری مجموعے کی اشاعت کے بعد اُن کا شمار نہ صرف پاکستان بلکہ دُنیا بھر میں موجود مستند اُردو شعرا میں ہونے لگا۔ اِس مجموعے میں اُنھوں نے ''اعتبارِ نغمہ'' کے عنوان سے دیباچہ تحریر کیا۔ اُن کی نثر میں شعریت اور رمزیت کے عناصر نمایاں دِکھائی دیے۔ نثر نگاری کا یہ حُسن ان کے نثری مجموعے ''خشک چشمے کے کنارے'' میں اُبھر کر سامنے آیا۔ میری ذاتی رائے ہے کہ اگر وہ نثر کے لیے کچھ اور وقت نکالتے تو ان کا شمار اُردو کے بہترین نثر نگاروں میں ہوتا۔ اُن کا نثری مجموعہ اُن کی وفات کے

بعد 1982ء میں چھپا جس میں سے دیباچہ بطورِ نمونہ پیشِ خدمت ہے:

اعتبارِ نغمہ

''یہ اُن دنوں کی بات ہے جب شاعری فنکار کے لیے باعثِ ننگ نہیں تھی۔ گیت گانے والا گاؤں گاؤں، نگری نگری گھومتا پھرتا تھا اور باٹ باٹ پر عشق و محبت، دلیری، شجاعت، سیر و تفریح اور اَن جانے دیسوں کے نغمے گاتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کوئی بہت ہی سیدھا سادہ اور رس بھرا ساز ہوتا تھا جس کی دُھن پہ اس کے سارے گیت ڈھلتے تھے اور گلے سے باہر نکلتے ہی دلوں میں اُتر جاتے تھے۔ وہ جن لوگوں میں بیٹھ جاتا اُن کے دلوں کا تار ملا لیتا۔ جانی پہچانی دھرتی کا ہر گوشہ اور دھڑکنوں کے سارے مسکن اُس کی جاگیر تھے۔ پاس پڑوس کے سارے باسی اس کی آواز پر فریفتہ تھے، کہنے والا ایک تھا اور سننے والے ہزاروں اور ان ہزاروں کے دل اُس کی مٹھی میں تھے۔ جدھر اُس کی آواز پھرتی، اُدھر اس کا سامع کھنچتا چلا جاتا تھا۔ شاعر اور اس کے سامعین میں اگر کوئی حدِ فاصل تھی تو یہی کہ وہ کہہ سکتا تھا اور یہ سن سکتے تھے۔ یہ دیوارِ چین بھی جذب و کیف کے مراحل میں ٹوٹتی پھوٹتی رہتی تھی۔ سننے والوں کی دھڑکنیں اُس کی آواز میں شامل تھیں، اُن کے ذہن کی ساری لرزشیں اس کے ساز میں جاگ اُٹھتی تھیں۔ اس ''من توشدم تو من شدی'' کے مراحل میں کوئی فاصلے نہ تھے جو مٹ نہیں سکتے تھے اور کوئی روک نہیں تھی جو اُن کو جدا کر سکتی تھی۔ اُسے پہچاننے والے اسے بھاٹ کہتے تھے، موجد اور خالق کا نام دیتے تھے اور اس کے ذریعے دھرتی کا رابطہ آسمانوں سے جا ملتا تھا۔

مگر دھرتی پر حکومت کرنے والوں کو اس کی فرماں روائی پہ، اس کی گرفت اور اثر و نفوذ پہ حسد ہوا۔ وہ بھی دلوں پر حکومت کرنا چاہتے تھے۔ دونوں کا ملاپ ہوا مگر منافقت اور جلاپے کی بنیادوں پہ۔ اس

مقصدی مصالحت سے حکمرانوں نے اُسے کہا کہ ہماری دلیری، ہمارے عشق، ہماری سیر و سیاحت اور تفریح کے ترانے گاؤ۔ بھاٹ اب بھٹئی کرنے پر اُتر آیا۔ شاید اسے یہ غرور ہوگیا تھا کہ میں جب بھی اور جیسے بھی چاہوں سننے والوں کو رجھا سکتا ہوں، اُن کا رُخ پھیر سکتا ہوں۔ درباری سخن ساز نے فنِ سخن رانی ایجاد کیا، دِلوں میں گھر کرنے کے اصول وضع کیے اور جو چیز کبھی اپنے آپ ہو جایا کرتی تھی اسے اپنی مرضی سے پیدا کرنے کے لیے طریقے سلیقے ترتیب دیے۔ مگر آہستہ آہستہ وہ ان ہتھ پھیریوں کا شکار ہو کے رہ گیا۔ شطرنج کی چالوں نے اسے ایسا اُلجھایا کہ وہ اُنھی میں دھنس کر رہ گیا اور سننے والے اس کی آواز سے دُور ہوتے گئے۔ حتیٰ کہ ایک دن اس کا نغمہ اپنی ہی گونج میں کھو کے رہ گیا۔ اُس نے آس پاس دیکھا، سوا اس کے مربی اور ممدوح کے کوئی بھی نہ تھا جو اس کی فنی مہارت اور چابکدستی کی داد دے سکتا، کوئی بھی نہ تھا جو اس کی پرداز خیال کے ساتھ ذرا بھی اُڑان دِکھا سکتا۔ اُس نے دیکھا کہ اُس کی تعریفیں کتنی کھوکھلی، اس کے نغمے کتنے بے رُوح اور اس کی آواز کتنی بے سوز ہو کے رہ گئی۔ آخر اس کی مدح سرائی کا طلسم بھی ٹوٹنے لگا اور وہ دربار سے بھاگ نکلا۔

اس نے پھر سننے والے تلاش کرنے شروع کیے، لوگ جمع کیے اور محفلیں جمائیں۔ مگر اب کوئی اسے پہچانتا نہیں تھا۔ اور اس کے منبع و ماخذ سے آشنائی نہیں رکھتا تھا۔ لوگ واہ وا کرتے تھے، سُبحان اللہ کے ڈونگرے برساتے تھے، مگر وہ لرزشیں اور وہ دھڑکنیں کہاں تھیں؟ آواز و سامع کے وہ پرانے عہد و پیماں کہاں تھے؟ چشم و گوش کی وہ آشتی کہاں تھی؟ اب تو لوگ اُس کا وطن پوچھتے تھے، اس کا مذاق اُڑاتے تھے۔ آخر تحسینِ ناشناس نے اُسے خود پسند و خودنگر بنا دیا۔ اب وہ لوگوں سے بھاگتا تھا، اُن کی داد و تحسین پہ جھلاتا تھا۔ لعل و گہر اُگلنے کے بعد کچھ

بُلبلے بطورِ انعام ملیں تو اُن کی کیا بساط ہے؟ اب تو ممدوح کی مربیانہ شفقت بھی اسے میسر نہیں تھی۔ وہ پرانی مصلحت کسی مقصد سے ہی سہی مگر خود اس کے لیے ایک حد تک آرام وسکون کا باعث تو بنتی تھی، رُوحانی کوفت کے باوجود پہلے جسمانی آسائش کے تو سارے سامان مہیا تھے۔ زمانے کی قدر ناشناسی، سننے والوں کی بے اعتنائی کو دیکھ کے اس نے بھی روپ بدلا اور چیخنا چلانا شروع کر دیا تا کہ لوگ راغب ہوں۔ اس کی فریادوں میں بدلتی دُنیا کا الم بھی شامل تھا اور اس کا اپنا المیہ بھی جا بجا نمایاں ہو رہا تھا۔

بدلتی ہوئی دُنیا کا عکس اور شاعری میں شاعر کا فرار ایک بہانا تھا جو رُوحِ عصر اپنے اظہار کے لیے ڈھونڈ رہی تھی۔ نالہ گویا گردشِ سیارہ کی آواز ہے! وہ آسمان و زمین کے بگڑتے ہوئے رنگ روپ اپنی آواز میں سمو کے کہہ رہا تھا: دیکھو! اور سننے والے اپنی اپنی حدوں میں محبوس اُس کی آواز کو سن سن کے ڈرے جا رہے تھے۔ شاعر نے اس باولے کا بھیس بنا رکھا تھا جو ہر گاؤں کے گرداگرد چکر کاٹتا ہے اور آنے والے حادثوں کی خبر دیتا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ یہ پگلا گاؤں سے کتنا پیار کرتا ہے اور گاؤں والوں کے دُکھ میں کس محبت سے اشک فشانی کرتا ہے۔ مگر اس کے باوجود اس پگلے کی پیغمبری ایک بڑا ناگوار اور دِلدوز فریضہ ہے جس کو ادا کرنا کسی محفل پرست، دُنیا دار اور مصلحت آشنا سخن ساز کے بس کی بات نہیں:

یوں ہی گر روتا رہا غالب تو اے اہلِ جہاں
دیکھنا اِن بستیوں کو تم کہ ویراں ہوگئیں!

شعر کی ماہیت پہ سوچنے والے عموماً شاعر کو بھول جاتے ہیں۔ اس شاعر کو جو بھیس بدل بدل کر ہر زمانے میں نئے جلوے اپنے ساتھ لے کر آتا رہا ہے۔ ہمارے زمانے کا شاعر کئی اعتبار سے اکیلا ہے۔ شعر

پڑھنے والے ہیں تو اشعار کے بارے میں سوچنے والے اس کے ساتھ نہ چل سکتے ہیں نہ چلنا چاہتے ہیں۔ کہنے والے کی آزمائش اس سے بڑی کیا ہوگی کہ باوجود ان حد بندیوں اور فاصلوں کے اس کی فریادیں دیواریں چیر کے کانوں تک پہنچتی ہیں یا نہیں۔ اس دورِ ابتلا میں نالہ آفرینی محض ایک دیوانے کی پکار ہی نہیں، کئی دلوں کی دھڑکنیں اس کی ہم ساز و ہم نوا ہو سکتی ہیں، اگر مصلحت آشنا ذہن ان دھڑکنوں کو ملفوف نہ کر دے۔ آج کا شاعر نگری نگری گھومنے والے شاعر اور درباری سخن ساز دونوں کے مختلف مزاجوں کو ملا کے ایک نئی آواز پیدا کرنا چاہتا ہے، جو اس کے اپنے گردو پیش اور اس کے اپنے آسمان و زمین سے بھی علاقہ رکھتی ہو۔ طباعت کی مدد سے چشم و گوش تک پہنچنے والا پرانے نغمہ پیرا کی بے ساختگی کو سخن ساز کی مہارت فن سے اس طرح باہم پیوستہ کرنا چاہتا ہے کہ دونوں یک جان ہو جائیں۔ اسی طرح اس کی آواز میں ایک ٹھہراؤ، گرفت اور قوت و تیزی کا اجتماع ہوگا۔ اگر وہ اس شک و شبہ میں ڈوب جائے کہ اُس کی آواز کہیں خلاؤں میں کھو کے رہ جائے گی تو شاید اسے بلند کرنے کا ہی کوئی جواز نہ رہ جائے۔

نالہ آفرینی جبر و اختیار کا ایک انوکھا کرشمہ ہے۔ قاری کے دل میں جگہ پانا بھی محض اس کے بس کی بات نہیں۔ آواز قوی ہو تو دُور دُور پہنچ جاتی ہے، نحیف ہو تو حلق سے باہر ہی نہیں نکلنے پاتی، صرف پہنچنے کی بات نہیں، دیکھنا یہ ہے کہ ایک آواز ہزاروں کی آواز بن سکتی ہے یا نہیں۔ محض ہزاروں کا ذکر کرنے یا ہزاروں کو مخاطب کرنے سے اُن کی دھڑکنیں اور لرزشیں ساز کی ہم نوائی نہیں کر سکتیں۔

نالہ محفلیں برہم نہیں کرتا۔ نالہ آفریں پہ جو کچھ بھی گزری ہو، اُس کی فریاد فن کے سانچے میں ڈھل کر نغمہ نہیں بن سکتی تو محض چیخ و پکار ہے۔''

ناصر نے 1950ء میں ایک صحافی کی حیثیت سے بطورِ مدیر ''اوراقِ نو'' میں کام

شروع کیا۔ دو برس یہاں کام کیا اور اس کے بعد 1952ء میں مدیرِ ''ہمایوں'' مقرر ہوئے اور یہاں پانچ برس تک کام کیا۔ یہ عرصہ 1957ء تک محیط تھا۔ اس کے بعد روزی روٹی کے مسائل کے باعث محکمہ سماجی بہبود میں کام کیا۔ پھر اُن کی تقرری بطور پبلسٹی آفیسر ویلج ایڈ 1959ء میں ہوئی۔ اس ادارے میں اُنھوں نے جولائی 1964ء تک کام کیا اور پھر اگست 1964ء کو لاہور ریڈیو سے منسلک ہوگئے اور زندگی کے آخری ایام تک اسی ادارے سے وابستہ رہے۔ ناصر جب ریڈیو لاہور سے منسلک ہوئے تو وہاں اُنھیں اپنے پرانے دوست بھی دوبارہ ملے۔ ان تمام یادداشتوں کا تذکرہ اے حمید نے اپنے مضمون میں کچھ یوں کیا ہے:

> ''لاہور ریڈیو کے لیے بھی ناصر کاظمی کا بطور سٹاف آرٹسٹ ملازم ہو جانا بڑی خوش آئند بات تھی۔ اس سے پہلے ریڈیو پر ایک مَیں سکرپٹ رائٹر تھا۔ صوفی غلام مصطفی تبسم اور میرزا ادیب بھی تھے۔ میرزا صاحب کچھ دیر بعد ریڈیو چھوڑ کر چلے گئے۔ صوفی صاحب اور ناصر کاظمی صرف یہ دو شاعر بطور سکرپٹ رائٹر رہ گئے۔ ادیبوں میں اکیلا میں سکرپٹ رائٹر تھا۔ ہم باقاعدہ سرکاری ملازم نہیں تھے۔ ہمارے ساتھ سال بہ سال اور بعد میں دو دو سال کے بعد کنٹریکٹ کیا جاتا تھا۔ مجھے یہ ملازمت اس لیے بہت پسند تھی کہ اس میں دفتر وقت پر آنے، وقت پر جانے اور ٹرانسفر وغیرہ کی پابندی نہیں تھی۔ بہرحال ناصر کاظمی کے آنے کی مجھے بڑی خوشی ہوئی۔
>
> مجھے ریڈیو سٹیشن پر اپنا ایک اور دوست مل گیا تھا۔ اب ناصر سے روز ہی ملاقات ہوتی۔ عام طور پر وہ صبح دس گیارہ بجے کے قریب آتا اور شام تک ریڈیو سٹیشن پر ہی رہتا۔ اس نے لاہور ریڈیو سے ''ایوانِ غزل'' کے عنوان سے تقریروں کا ایک سلسلہ شروع کر دیا۔ یہ غزل کی پوری تاریخ تھی۔ تب مجھے پتا چلا کہ ناصر کاظمی نثر بھی بڑے کمال کی لکھتا ہے۔ تین چار منٹ کی تقریر ہوتی تھی جس میں وہ بڑے ناقدانہ انداز میں غزل کے تمام پہلوؤں پر عالمانہ انداز میں بحث کرتا۔ ناصر کاظمی

کی آواز ریڈیو کے لیے بے حد موزوں تھی۔ اُس کی ان تقریروں کو سامعین میں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس کے علاوہ وہ میوزیکل فیچر بھی لکھتا۔ موسیقی کے پروگراموں کے سکرپٹ بھی لکھتا۔
کینٹین کے ساتھ والے کمرے میں صوفی صاحب بیٹھتے تھے۔ صوفی صاحب کے ساتھ ہی ناصر کاظمی کی میز ڈال دی گئی تھی۔ یہاں ناصر ریڈیو کے لیے سکرپٹ اور اناؤنسمنٹ وغیرہ لکھتا۔ ریڈیو کا مشاعرہ ہوتا تو ناصر کاظمی اس میں شرکت بھی کرتا اور مشاعرے کی کمپیئرنگ بھی کرتا۔ دن میں کئی بار ہماری چائے کی محفلیں لگتیں۔ کبھی ہم کینٹین میں چائے پینے بیٹھ جاتے۔ کبھی ناصر کاظمی کے کمرے میں چائے منگوا لیتے۔ لیکن سردیوں کے موسم میں ہم ریڈیو کے لان میں سبزے پر گلاب کے پھولوں کی کیاری کے پاس بیٹھ کر اپنی چائے کی محفل لگاتے۔ کبھی ہم پاک ٹی ہاؤس کے زمانے کی باتیں کرتے۔ اپنے ٹی ہاؤس کے دوستوں کو یاد کرتے اور کبھی اُردو ادب اور موسم پر باتیں کرتے۔ کبھی ناصر کاظمی انبالے کے باغات اور اپنے کبوتروں کی باتیں کرتا۔
اپنے شہر کے باغوں کو یاد کرتے ہوئے ناصر بڑا جذباتی ہو جاتا۔ وہ مجھے بتاتا کہ انبالے میں بڑے باغ تھے جن کے ہرے بھرے درختوں پر رنگین پرندے بولتے تھے۔
''ریلوے لائن کی دونوں جانب یہ باغ شہر سے باہر دُور تک چلے گئے تھے۔ ہم وہاں کالج کے زمانے میں پک نک منانے جایا کرتے تھے۔ ایک بڑی خوبصورت نہر بھی تھی۔ اس نہر میں بڑا ٹھنڈا پانی بہتا تھا۔ ہم وہاں گرمیوں میں نہایا کرتے تھے۔''
اپنے کبوتروں کی باتیں کرتے ہوئے ناصر کاظمی بڑا خوش ہوتا۔
''اے حمید کبوتر بڑا معصوم پرندہ ہے، بڑا حیادار پرندہ ہے۔''
پھر وہ مجھے کبوتروں کی کئی ایک قسمیں بتاتا۔ اُن کے خواص بیان کرتا۔

اُن کی عادتیں بتاتا۔ کبوتروں کا ناصر کاظمی کو شوق بھی تھا اور وہ کبوتر بازی کے فن کو بھی بڑی اچھی طرح سے جانتا تھا جو کم از کم میری سمجھ سے باہر تھا۔ مجھے تو کبوتر آسمان پر اُڑتے ہوئے بڑے پیارے لگتے ہیں۔ وہ کہاں سے آئے ہیں کہاں جا رہے ہیں، اس سے مجھے کوئی غرض نہیں رہی۔ میں گلاب کی کیاریوں کے پاس بیٹھا چائے کی پیالی ہاتھ میں لیے ناصر کو گلاب کے بارے میں بتاتا کہ ان کی کتنی قسمیں ہیں اور انگریزی گلاب کے کیا خواص ہوتے ہیں اور ان کی قلم کہاں لگانی چاہیے، کب لگانی چاہیے۔

ایک دفعہ خزاں کا موسم تھا۔ مالی گلاب کی کاٹ چھانٹ کر رہا تھا۔ ناصر کاظمی نے ولایتی گلاب کی دس بارہ اچھی اچھی قلمیں چھانٹ کر لے لیں۔ کہنے لگا۔

''میں اِنھیں گملوں میں لگاؤں گا۔''

میں نے کہا۔

''ناصر! گلاب کی قلمیں گملوں میں لگاؤ گے تو یہ پوری طرح نہیں پھلیں پھولیں گی۔''

ناصر کاظمی نے ہنس کر کہا۔

''کیسے نہیں پھولیں گی۔ تم دیکھ لینا، اگلے سیزن میں بڑے شاندار پھول دیں گی۔''

مَیں نے کہا۔

''چلو مالی سے پوچھ لیتے ہیں۔''

مالی قریب ہی کیاری میں کام کر رہا تھا۔ ہم اُس کے پاس چلے گئے۔ اُس سے پوچھا تو وہ بولا۔

''ولایتی گلاب کی قلم ایسی ہے چاہے گملے میں لگاؤ، چاہے زمین میں لگاؤ، یہ پوری طرح سے پھول نہیں دیں گی۔ ان کے پھول چھوٹے

ہوں گے اور یہ وقت سے پہلے ختم ہو جائیں گی۔''

ناصر نے پوچھا۔

''تو پھر ہمیں کیا کرنا چاہیے بھائی۔ میں اپنے گھر میں ولایتی گلاب ضرور لگانا چاہتا ہوں۔''

مالی نے بڑے پتے کی بات بتائی۔ کہنے لگا:

''اس کا طریقہ یہ ہے کہ اس کی دیسی گلاب کی قلم کے ساتھ پیوند کاری کریں جس طرح یہاں ان کیاریوں میں ہم نے ولایتی گلاب لگایا ہے اور قلم کی پیوند کاری گملوں میں نہیں بلکہ زمین میں کریں جہاں پودے کو دھوپ اور ہوا اور روشنی وافر مقدار میں ملتی رہے۔''

ناصر کاظمی میری طرف دیکھ کر بولا:

''یار یہ تو واقعی ایک بالکل نئی بات سنی ہے میں نے۔ اچھا اب میں یہ گلاب اپنے صحن میں لگاؤں گا۔''

کئی طرح کی نوکریوں اور دیگر نامساعد حالات کے باوجود ناصر کا قلم آخری ایام تک چلتا رہا۔ سادہ الفاظ، قدرت کی نشانیاں، اشارے کنایے، استعارے، کیا کچھ نہ تھا۔ اُنھیں چھوٹی بحر میں شعر کہنے پر بھی ملکہ حاصل تھا۔ اُن کا ایک مجموعۂ کلام ''پہلی بارش'' اُردو غزل میں ایک الگ ہی نوعیت کا تجربہ تھا جس میں تمام غزلیں ایک ہی وزن اور ایک ہی ردیف قافیہ میں ہیں۔ اُس کی پہلی غزل کا ابتدائی شعر خدائے بزرگ و برتر کی شان میں تھا۔ اس شعر کے متعلق ناصر کا اپنا خیال تھا کہ یہ اُردو زبان کے بہترین حمدیہ اشعار میں شمار ہوگا:

میں نے جب لکھنا سیکھا تھا
پہلے تیرا نام لکھا تھا

''پہلی بارش'' میں ایک غزل اِس طرح ہے:

چاند ابھی تھک کر سویا تھا
تاروں کا جنگل جلتا تھا
پیاسی کونجوں کے جنگل میں
میں پانی پینے اُترا تھا

ہاتھ ابھی تک کانپ رہے ہیں
وہ پانی کتنا ٹھنڈا تھا
آنکھیں اب تک جھانک رہی ہیں
وہ پانی کِتنا گہرا تھا
جسم ابھی تک ٹوٹ رہا ہے
وہ پانی تھا یا لوہا تھا
گہری گہری تیز آنکھوں سے
وہ پانی مجھے دیکھ رہا تھا
کتنا چُپ چُپ، کتنا گم صم
وہ پانی باتیں کرتا تھا

اس مجموعۂ کلام میں ہر غزل اور ہر شعر اپنی جگہ خاص اور منفرد تھا۔ تقابلی جائزے میں کسی کو بھی ایک دوسرے پر برتری نہیں دی جاسکتی۔ ''پہلی بارش'' ہی کے حوالے سے اُن کے اپنے بیٹے باصر سلطان کاظمی کی تحریر میں سے ایک اقتباس:

'پہلی بارش' دوبارہ، سہ بارہ پڑھی۔ یوں لگا جیسے کتاب اب سمجھ میں آ گئی۔ جس طرح کسی غزل کے اشعار اپنا جُداگانہ وجود رکھتے ہوئے بھی آپس میں کسی طور منسلک ہوتے ہیں، اُسی طرح ''پہلی بارش'' کی غزلیں بھی انفرادی طور پر مکمل غزلیں ہونے کے ساتھ ساتھ مل کر ایک وحدت کو تشکیل دیتی دکھائی دیں۔ یہ وحدت طویل نظم کے قریب کی کوئی چیز معلوم دی۔ ہر غزل گویا اس نظم کا ایک بند تھی، جس کے اشعار ایسے مربوط نظر آئے جیسے کسی زینے کے مدارج یا کسی منزل کے مراحل۔ ایسا محسوس ہوا گویا شاعر کوئی کہانی سنا رہا ہو۔ بار بار پڑھنے پر یہ کہانی واضح ہوتی چلی گئی۔

صدیوں پرانی روایت ہے کہ شعرا (مغربی ومشرقی) طویل نظم کی ابتدا خدا یا دیوی دیوتاؤں (اپنے اپنے ایمان یا اعتقاد کے مطابق) سے

خطاب کر کے کرتے ہیں۔ ''پہلی بارش'' اور روایتی طویل نظم کا ایک اور مشترک وصف آغاز ہے۔

میں نے جب لکھنا سیکھا تھا
پہلے تیرا نام لکھا تھا

اس شعر کے بارے میں پاپا خود کہا کرتے تھے کہ اس کا شمار چند بہترین حمدیہ اشعار میں ہوگا۔

اس کے علاوہ پہلی غزل ''کہانی'' کے ''مرکزی کردار'' کا تعارف بھی ہے۔ شروع ہی میں پڑھنے والا جان لیتا ہے کہ یہ ایک ایسے تخلیقی شخص کی کہانی ہے جو اللہ کو ماننے والا اور اس کی کتاب کا بغور مطالعہ کرنے والا ہے۔ اللہ ہی کے فرمان پر عمل کرتے ہوئے وہ قرآنی آیات پڑھ کر اوندھے منہ گر نہیں جاتا (اندھا دھند ایمان نہیں لے آتا)، بلکہ تدبر کرتا ہے اور غور و فکر کے ذریعے ان آیات کو اپنے رگ و پے کا حصہ بناتا ہے۔

وہ آدم کے مقام اور کائنات میں اس کے کردار سے بخوبی واقف ہے:

میں وہ صبرِ صمیم ہوں جس نے
بارِ امانت سر پہ لیا تھا
میں وہ اسمِ عظیم ہوں جس کو
جنّ و ملک نے سجدہ کیا تھا

یہ شخص نہ صرف اللہ سے سوال کرنے کی بلکہ شکوہ کرنے کی بھی جرأت رکھتا ہے:

تونے کیوں مرا ہاتھ نہ پکڑا
میں جب رستے سے بھٹکا تھا
پہلی بارش بھیجنے والے
میں ترے درشن کا پیاسا تھا

یہ اشعار غزلوں کے اس سلسلے میں بیان کی جانے والی کہانی کے موضوع کی طرف بھی ایک واضح اشارہ ہیں۔''

ناصر کاظمی جو 1947ء میں بٹوارے کی بربادیاں دیکھ چکے تھے، اُن کے دل میں بنگال کا درد بھی گہرا تھا۔ اپنی بیماری کے آخری دنوں میں بھی وہ بنگال کو یاد کرتے رہے۔ مشرقی پاکستان میں اُنھوں نے ایک یادگار مشاعرہ بھی پڑھا تھا۔ وہ مشاعرہ اے حمید کی یادداشتوں میں محفوظ تھا۔ اور بنگال اور بنگال کا دُکھ اُن کی اس تحریر میں بحوالۂ ناصر نمایاں دکھائی دیتا ہے:

''ڈھاکے میں دوسری رات کو مشاعرہ ہوا۔ یہ مشاعرہ گلستان سینما میں ہو رہا تھا۔ لوگ شاعروں کو سننے کے لیے ہجوم در ہجوم آ رہے تھے۔ سٹیج کو بڑی خوبصورتی سے سجایا گیا تھا۔ سب شاعر سٹیج پر نیم دائرے کی شکل میں بیٹھے تھے۔ مشاعرہ شروع ہوگیا۔ میں بھی وہیں سٹیج پر اپنے شاعر ادیب دوستوں کے پاس بیٹھا تھا۔ ناصر کاظمی بھی مجھے ایک طرف بیٹھا نظر آ رہا تھا۔ شروع میں پڑھائے جانے والے شاعر اپنا اپنا کلام سناتے رہے۔ جب بڑے شاعروں کی باری آئی تو مشاعرہ اپنے عروج پر تھا۔ اچانک میری نظر بائیں طرف گئی تو میں نے دیکھا کہ ناصر کاظمی وہاں نہیں تھا۔ میں نے سوچا کہ کہیں کسی ضرورت سے گیا ہوگا۔ شاید پان کھانے چلا گیا ہو۔ ابھی آ جائے گا۔ جب کافی دیر گزر گئی اور ناصر کاظمی کی شکل نظر نہ آئی تو میں سوچنے لگا کہ یہ شخص کہیں بھاگ تو نہیں گیا کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ وہ ایسے موقعوں پر کبھی کبھی بھاگ جایا کرتا ہے۔

اتنے میں مشاعرے کے سیکرٹری (میں ان کا نام بھول گیا ہوں بڑے صاحبِ ذوق آدمی تھے) میرے پاس آئے اور جھک کر میرے کان میں کہا۔

''ناصر کاظمی کہیں نظر نہیں آ رہے۔ خدا کے لیے اُنھیں کسی طرح سے ڈھونڈھ کر لائیں۔ ورنہ بڑی گڑبڑ ہو جائے گی۔''

میں پہلے ہی جیسے تیار بیٹھا تھا۔ جلدی سے سٹیج سے اُتر کر سینما ہال کی دوسری طرف جو راہداری تھی اُس طرف نکل گیا۔ یہ راستہ باہر بازار کو جاتا تھا۔ جیسے ہی میں ذرا آگے گیا، ایک طرف سے ناصر کاظمی کو باہر

نکلتے دیکھا۔ حسبِ معمول سگریٹ والا ہاتھ اس کے منہ کے قریب تھا اور وہ بڑے مزے مزے سے قدم اُٹھاتا چلا جا رہا تھا۔

میں نے پیچھے سے جا کر اسے پکڑ لیا۔

''کہاں جا رہے ہو؟''

ناصر کاظمی نے صاف صاف کہہ دیا۔

''پیارے! مشاعرہ پڑھنے کو دل نہیں مانتا۔''

خدا جانے کیا ہوا تھا کہ اس کی طبیعت ایک دم سے اُکھڑ گئی تھی۔ مجھے اس نے اندر کی بات بالکل نہ بتائی۔ بس یہی کہتا رہا کہ مشاعرہ پڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔ میں نے کہا:

''کچھ اُن لوگوں کا خیال کرو جنھوں نے تمھیں کتنی محبت سے یہاں بلایا ہے۔ اُن لوگوں کا خیال کرو جو تمھیں سننے نہ جانے کہاں کہاں سے چل کر سینما ہال میں پہنچے ہیں! کیا تم اپنے چاہنے والوں کو بھی نااُمید کرو گے؟''

اس پر وہ بولا:

''ہاں یار یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔ چلو سٹیج پر چلتے ہیں۔''

ناصر کاظمی زیادہ لوگوں کو دیکھ کر گھبرا بھی جایا کرتا تھا۔ مگر خیر میں اسے کھینچ کر سٹیج پر واپس لے آیا۔ سٹیج سیکرٹری نے ناصر کاظمی کی شکل دیکھی تو اُن کی جان میں جان آئی۔ لپک کر اس کی طرف بڑھے اور اُنھیں بڑی عقیدت سے ایک طرف تکیہ دے کر بٹھا دیا۔ پھر میرے کان میں آ کر کہا:

''خدا کے لیے اب اُنھیں یہاں سے اس وقت تک نہ جانے دیں جب تک یہ مشاعرہ نہیں پڑھ لیتے۔''

میں مسکرا کر خاموش رہا:

مشاعرہ بڑا زبردست تھا۔ ہزاروں کی تعداد میں لوگ جمع تھے۔ سینما

ہال سارے کا سارا بھرا ہوا تھا۔ بڑے بڑے نامور شاعر وہاں جمع تھے۔ سٹیج سیکرٹری نے حفظِ ماتقدم کے خیال سے سٹیج پر جاتے ہی ناصر کاظمی کا نام پکار دیا۔ ناصر کاظمی آہستہ آہستہ اُٹھا اور سٹیج پر مائیک کے آگے جا کر کھڑا ہو گیا۔ عادت کے مطابق دو ایک بار سوں سوں کی اور پھر اپنی پاٹ دار آواز میں تحت اللفظ یہ غزل سنائی۔

کون اِس راہ سے گزرتا ہے
دل یُونہی انتظار کرتا ہے
شہرِ گل میں کٹی ہے ساری رات
دیکھیے دن کہاں گزرتا ہے
دھیان کی سیڑھیوں پہ پچھلے پہر
کوئی چپکے سے پاؤں دھرتا ہے
دل تو میرا اُداس ہے ناصر
شہر کیوں سائیں سائیں کرتا ہے

ناصر کو بڑی داد ملی۔ لوگوں نے ناصر سے تین چار غزلیں سنیں۔ سیکرٹری صاحب کی جان میں جان آئی کہ مشاعرے سے بھاگ جانے والا شاعر ان کے قابو میں رہا اور وہ بھی بھگتا دیا گیا۔

دوسرے دن شاعروں ادیبوں کو کشتیوں پر دریا کی سیر کرائی گئی۔ میں اور ناصر ایک ہی کشتی میں سوار تھے۔ دریا کا پانی گدلا گدلا تھا۔ یہ دریا شہر ڈھاکے میں سے گزرتا تھا۔ کتنی ہی پھٹے پرانے بادبانوں والی کشتیاں دریا کی سطح پر رواں تھیں۔ چھوٹی چھوٹی کشتیاں بھی چل رہی تھیں۔ خاص طور پر ایک لوک فنکار کو ہماری کشتی میں بھی بٹھایا گیا تھا۔ وہ بنگلہ ماہی گیروں کے گیت ساتھ ساتھ گاتا جاتا تھا۔ میں اور ناصر بڑے غور سے اس کے گیت سن رہے تھے۔ دریا اور اس کی فضاؤں نے ہمیں بڑا متاثر کیا تھا۔ وہ دن ہمیں لاہور میں آ کر بھی بہت یاد آتا تھا۔

ہفتہ دس دن کے بعد ہم لوگ واپس لاہور آ گئے۔ ناصر کاظمی نے واپس آ کر کئی غزلوں میں مشرقی بنگال کے درختوں، دریاؤں اور ماہی گیروں کا ذکر کیا۔ اس نے اپنے اس سفر پر ایک مثنوی بھی لکھنی شروع کر دی۔ مگر پہلی والی مثنوی کی طرح یہ بھی نامکمل ہی رہی۔ اپنی زندگی کے آخری ایام میں جب وہ میو ہسپتال کے البرٹ وکٹر وارڈ میں زیرِ علاج تھا تو اُس نے سقوطِ ڈھاکہ پر ایک بڑی دردناک نظم لکھی تھی۔ میں اور انتظار حسین اس سے ملنے ہسپتال گئے تو اس نے ہمیں اپنی اس نظم کے کچھ اشعار سنائے تھے جن میں سے مجھے صرف ایک مصرع یاد رہ گیا ہے:

وہ کشتیاں چلانے والے کیا ہوئے''

ناصر کے بیشتر مجموعہ ہائے کلام اُن کی وفات کے بعد شائع ہوئے۔ اُن کی کتب کچھ اس ترتیب سے شائع ہوئیں۔ برگِ نَے 1952، دیوان 1972ء، پہلی بارش 1975ء، نشاطِ خواب 1977ء، سُر کی چھایا 1981ء، خشک چشمے کے کنارے 1982ء، 1990ء (اضافہ ترمیم شدہ) انتخابِ میر 1989ء، انتخابِ نظیر 1990ء، انتخاب ولی 1991ء، انتخاب انشاء 1991ء، ناصر کاظمی کی ڈائری 1995ء۔ 1997ء میں اُن کی رفیقۂ حیات شفیقہ ناصر کاظمی نے اُن کے تمام مجموعہ ہائے کلام (منظوم ڈراما ''سُر کی چھایا'' سمیت) ''کلیاتِ ناصر'' کے عنوان سے اُن کی کل شاعری چھپوائی..... یہ کتاب پہلی بار مکتبۂ خیال، حکیم سٹریٹ، اسلام پورۂ لاہور سے شائع ہوئی..... ناصر کاظمی کی رہائش ہمیشہ اِسی پتے پر رہی۔ اس کے بعد ناصر کاظمی کی کتب کی اشاعت اور دیگر معاملات کی ذمے داری جہانگیر بُک ڈپو اُردو بازار نے سنبھال لی۔

منظوم ڈراما ''سُر کی چھایا'' میں سے ایک منظر دیکھئے:

پانچواں منظر

(اندھیرے جنگل میں عبدل، نندی کو ڈھونڈتا ہے لیکن نندی کا کوئی نشان نہیں ملتا۔ عبدل تھک ہار کر ایک گھنے درخت کے تنے کے سہارے حیران کھڑا ہو جاتا ہے۔ خاصی رات ہو گئی ہے۔ وہ نندی کے خیال میں کھو جاتا ہے۔)

عبدل ٹھہرو نندی!
ٹھہرو نندی کہاں چلی ہو؟
رستہ بھول نہ جانا!
نندی کنویں میں نہ جھانکو!
عبدل وہ دیکھو وہ ریت پہ بڑھیاں دوڑ رہی ہیں!
اکبر میں کنج گھر جا رہا ہوں عبدل!
تمھارا پیغام بھیج دوں گا
بڑی اندھیری ہے آج کی شام
آندھی آئے گی!
نندی ادھر گرد سی اُڑ رہی ہے۔
چلو اس بنی کے درختوں میں چھپ جائیں
رات ہوگئی ہے
(اتنے میں لوگوں کا شور سنائی دیتا ہے اور وہ جنگل کو آگ لگا دیتے ہیں)
عبدل کم بختوں نے چاروں طرف سے گھیر لیا ہے۔
کیسے بھاگوں؟
آگ— آگ— آگ
چاروں جانب آگ کا دریا
کہاں ہو نندی؟
بولو نندی کہاں چھپی ہو!
باہر جاؤں!
لیکن نندی!
نندی مر جائے گی عبدل!
ایک آواز: اُلٹے پاؤں پلٹ جا عبدل!

نندی اب نہ ملے گی
اُس کی قسمت میں جلنا ہے
اُلٹے پاؤں پلٹ جا!

عبدل لیکن نندی! اُسے اکیلا چھوڑ کے جاؤں!
نہیں نہیں! میں جل جاؤں گا!
جل جاؤں گا!
جل جاؤں گا!

آواز آگ کسی کی مِیت نہیں ہے
اپنی جان بچالے عبدل!
نندی اب نہ ملے گی
اندھی آگ کا رستہ چھوڑ کے راتوں رات نکل جا پیارے
وہ رستہ ہے!
اب آواز نہ دینا عبدل!
نندی اب آواز نہ دے گی!
وہ رستہ ہے!
اس رستے سے دریا کے اُس پار اُتر جا!
آگ کے منہ پہ آنکھیں نہیں ہیں
آگ ہے اندھی
آگ ہے بہری!
اپنی جان بچالے عبدل
وہ رستہ ہے!''

(سُر کی چھایا، کلیاتِ ناصر کاظمی، صفحہ 66)

ناصر کی شاعری میں موسیقیت بدرجۂ اتم موجود تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی کئی

غزلیں اُس وقت کے بڑے گائیک حضرات نے گائیں اور آج تک ہندوستان پاکستان کے گائیک گا رہے ہیں۔ کچھ غزلیں آج تک عوام الناس کی زبان پر ہیں جیسے:

1۔ نیتِ شوق بھر نہ جائے کہیں

2۔ دیارِ دِل کی بات

3۔ دِل دھڑکنے کا سبب یاد آیا

4۔ تیرے ملنے کو بیکل ہو گئے ہیں

غزلوں کے علاوہ اُن کے تحریر کردہ ملی نغمے بھی نہایت مقبول ہوئے۔ جن میں سے کچھ درجِ ذیل ہیں:

گیت	گائیک	موسیقی
1۔ ہمارے پاک وطن کی شان، ہمارے شیر دل جوان	سلیم رضا، مُنیر حسین، کورس	کالے خان
2۔ ہر محاذِ جنگ پر ہم لڑیں گے بے خطر	نور جہاں، سلیم رضا، کورس	کالے خان
3۔ پاک ارض وطن کے جیالے، یہ جواں ہیں بڑی شان والے	ملکہ موسیقی روشن آرا بیگم	کالے خان
4۔ تُو ہی ہماری جان ہے، تُو قوتِ ایمان ہے	کورس	کالے خان
5۔ عقیدتوں کا سلام تجھ پر	مُنیر حسین، کورس	کالے خان
6۔ اے ارضِ پاک تُو ہے دارالاماں ہمارا	سلیم رضا	پولیس بینڈ
7۔ تُو ہے دلوں کی روشنی تو ہے سحر کا بانکپن	راگ بسنت بہار اُستاد سلامت علی خان اُستاد نزاکت علی خان	پولیس بینڈ

8۔میرے سُر میرے دل کی صدائیں، ترے گُن گائیں	راگ کلاوتی اُستاد سلامت علی خان اُستاد نزاکت علی خان	پولیس بینڈ
9۔اے غازیانِ صاحب کردار دیکھنا	استاد سلامت علی خان استاد نزاکت علی خان	پولیس بینڈ

ناصر کاظمی اپنے بے مثال کام، بے نظیر شاعری اور نکتہ آفرینی کے باعث رہتی دُنیا تک زندۂ جاوید رہیں گے۔ اُن کی خدمات کا اعتراف سرکارِ پاکستان نے بھی کیا اور اُن کی برسی پر ڈاک کا اعزازی ٹکٹ جاری کیا جس کی قیمت 15/۔ روپے تھی۔

ناصر کو آخری ایام میں معدے کا کینسر ہوگیا۔ اسی مرض کے باعث وہ 2 مارچ 1972ء کو میو ہسپتال میں اپنے پیاروں کو چھوڑ کر اگلے جہاں چلے گئے۔ اُنھیں قبرستان مومن پورہ میکلوڈ روڈ میں دفنایا گیا۔ یہ قبرستان لاہور کے ایک مشہور سینما گھر ''صنوبر'' کے سامنے واقع ہے۔ ''صنوبر'' کا نام تبدیل ہو کر ''امپیریل'' ٹھہرا اور آج کل یہ بھی اپنی زندگی کے آخری سانس لے رہا ہے۔ ناصر کی قبر کے ساتھ ہی اُن کی زندگی کی سب سے جاں نثار اور وفا شعار ساتھی ''شفیقہ ناصر کاظمی'' کی قبر ہے۔ مرحومہ ناصر کے کلیات چھپوانے کے بعد اللہ کو پیاری ہوگئیں تھیں۔ ناصر کاظمی کی قبر کا کتبہ یہ ہے:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

علیؑ محمدؐ فاطمہؑ

حسنؑ حسینؑ

دائم آباد رہے گی دُنیا

ہم نہ ہوں گے کوئی ہم سا ہوگا

ناصر کاظمی

ولد

سیّد محمد سلطان کاظمی مرحوم

تاریخ پیدائش 8 دسمبر 1925ء انبالہ

تاریخ وفات 2 مارچ 1972ء لاہور

ساغر صدیقی

1928ء-1974ء

کہتے ہوئے سنے ہیں سخن آشنائے وقت
ساغر کے شعر بزمِ لطافت کے پھول ہیں
ساغر

ساغر صدیقی 1928ء میں مشرقی پنجاب کے ایک علاقے انبالہ (متحدہ ہندوستان) میں پیدا ہوئے۔ زمانے بھر میں ساغر اور فقیر کے نام سے معروف ہوئے مگر اصلی نام محمد اختر تھا۔ اُن کے والدین کس خاندان سے تھے، بہن بھائی، عزیز رشتہ دار اور دیگر اعزہ واقارب کون تھے، ان سوالوں کا جواب آج تک صیغۂ راز میں ہے۔ ابتدائی معلومات کے مطابق اُنھوں نے چھوٹی سی عمر میں کنگھیاں بنانے کا فن سیکھا اور اسی عمر میں شعر کہنا شروع کر دیے۔ وہ مشاعروں میں اپنا کلام ایک خاص ترنم سے پڑھتے، اور مشاعرہ لوٹ لیتے تھے۔ تقسیم سے قبل ہی امرتسر اور لاہور میں اُن کے نام کا ڈنکا بجنے لگا تھا۔ تقسیم کے بعد وہ لاہور آ گئے۔ ادبی حلقوں میں پہلے سے شناسائی موجود تھی۔ اس لیے لاہور کے فلمستان سے بھی روابط پیدا ہو گئے۔ یہاں ساغر کے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہ ہوا اور وہ دوستوں کی بے وفائیوں اور فلمی حلقوں کی مخصوص گروہی سازشوں کا بری طرح شکار ہوئے۔ ان حالات نے ساغر کے ذہن اور رُوح پر کچھ ایسے زخم لگائے کہ وہ بقیہ تمام عمر چرس کی غنودگی میں ڈوبے رہے۔

حضرتِ انسان کی معلوم تاریخ کے مختلف اَدوار میں کئی ایسے لوگ آئے جنھوں نے ظلم وستم کے نظام کو نہ مانا اور اُس کے خلاف کلمۂ حق بلند کیا۔ ہر باغی نے اپنے خاص وضع

کردہ طریقے اور ڈھنگ سے اُس نظام کی نفی کی اور ساری زندگی کوشش اور احتجاج میں بسر کر دی۔ ساغر نے بھی اپنی ساری زندگی اس منافقانہ، غیر مساویانہ اختیارات اور دولت کے نظام کے خلاف بسر کی۔ اُن کی زندگی کا ایک ایک لمحہ، چلتے پھرتے، اُٹھتے بیٹھتے، سانس لیتے اور یہاں تک کہ سانس دیتے وقت تک مجسم احتجاج بنا رہا۔ یہ اُس ریاضت اور مسلسل احتجاج ہی کا نتیجہ تھا کہ اُنھیں وہ فقر نصیب ہوا جسے حاصل کرنے کے لیے لوگ سالہا سال ریاضت میں گزار دیتے ہیں مگر کامیاب نہیں ہوتے۔

ساغر نے اپنی زندگی کے بارے میں ایک مضمون خود تحریر کیا تھا جس سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ کہ اُنھیں نثر پر کتنی مہارت حاصل تھی ..... یہ مضمون اُن کے مختلف مجموعہ ہائے کلام کے ابتدائیوں کے علاوہ کئی ادبی جرائد میں بھی چھپ چکا ہے۔ اس میں سے دو اقتباس درج ذیل ہیں:

> ''میری زندگی زنداں کی ایک کڑی ہے۔ 1928ء کے کسی ماہ میں پیدا ہوا ہوں۔ گھٹنوں کے بل چلنے کا زمانہ سہارن پور اور انبالے کی آغوش میں گزرا۔ انبالہ اُردو اور پنجابی بولنے والے علاقے کا سنگم ہے۔ ماں کی ممتا، باپ کی شفقت اور کہاں پیدا ہوا ہوں، یہ سب میرے لیے علی بابا چالیس چور کے پُراسرار غار کی کہانی ہیں۔ میں نے دُنیا میں خداوندِ رحیم و کریم سے بھائی بہن کا عطیہ بھی نہیں پایا۔ یہ معلوم نہیں کہ خدا کو اس تنہائی سے یگانہ بنانا مقصود تھا یا بیگانہ۔ بہرحال شاید میری تسکینِ قلبی کے لیے کسی کا نام بھائی رکھ دیا ہو۔ اس طرح ایک وجود کا تذکرہ میرے بارے میں لکھنے والوں نے کیا ہے جو سراسر غلط ہے۔ دُنیا کی چھے سمتوں پر نظر رکھنے والے صاحبِ فراست لاہور کی سڑکوں پر مجھے جب چاہیں، ٹوٹا ہوا بازو کالی چادر میں چھپائے احساس کے اُلٹے پاؤں سے چلتا پھرتا دیکھ سکتے ہیں۔ اگر کوئی بھائی بہن ہوتا تو شاید یہ حال نہ ہوتا۔ میں نے لوگوں سے اپنا نام محمد اختر سنا۔ البتہ ایک پُرشکوہ ماضی کی سرسراہٹ میں نے اپنے پاؤں کے نیچے سنی ہے۔

1936ء میں جب ذرا سوجھ بوجھ کا زمانہ آیا تو ایک ویران مکان کی افسردہ دیواروں کے ساتھ لگے ہوئے لکڑی کے پرانے صندوقوں میں دِیمک چاٹتی ہوئی کتابوں کو دیکھا۔ شاید اُن کے پڑھنے والے 1857ء کی گھٹاؤں میں گم ہو چکے تھے۔ ہاں رات کی تاریکی میں ایک ڈیوٹ پر روشنی پھیلانے کی جستجو کرتا ہوا ایک دِیا میرے مشاہدے کی پہلی چیز تھی۔ اُس گھر میں مجھ سے پہلے حاجی محمد حنیف اور حاجی محمد حسین نام کے دو بزرگ آباد تھے۔ یہ کتابیں شاید اُنھیں کی تھیں۔ یہ بزرگ انبالہ شہر کی سماجی زندگی میں اچھی خاصی شہرت کے حامل تھے۔ اُن کی پکی اور بیل بوٹوں والی قبر کا کوئی پتھر شاید آج بھی وہاں کے قبرستان کے کسی کونے میں موجود ہو۔

میں نے اُردو اپنے گھر میں پڑھی۔ ایک چالیس پچاس سالہ بزرگ جن کا نام حبیب حسن تھا، بچوں کی تربیت و تعلیم کا بہت ذوق رکھتے تھے۔ یہیں مجھ میں شاعری کا شوق پیدا ہوا۔ میری عمر سات یا آٹھ سال کی ہوگی کہ میں اُردو میں اتنی مہارت حاصل کر چکا تھا کہ اکثر لکھوانے والے اپنی گزارشات کو میرے اندازِ بیان میں سن کر دادِ تحسین سے نوازتے تھے۔ میں نے بچپن کا دور بھی غربت میں صبر و شکر سے گزارا ہے۔ جو کچھ ملتا، اُسی پر بخوشی قناعت کرتا۔ اُس وقت کے تمام اُردو روزناموں زمیندار، احسان، انقلاب کا مُطالعہ میرا شغل تھا۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ شاید ہی میں نے آج تک اُردو زبان کا کوئی لفظ غلط پڑھا یا لکھا ہو۔

امرتسر میں امین گیلانی ادبی دوست تھے، نفیس خلیلی مرحوم، ظہیر کاشمیری، احمد راہی، مرزا جانباز سے نشست و برخاست رہی۔ ساحر لدھیانوی، نریش کمار شاد مرحوم، لطیف انور گورداسپوری مرحوم جن کا میں علم و ادب کے میدان میں بے حد احترام کرتا تھا اور اب بھی کرتا ہوں، میری

یادداشت کا ابتدائیہ ہیں۔ عطاء اللہ شاہ بُخاری جیسے جید عالم کے دستِ شفقت سے سرفراز ہوا۔ لدھیانہ میں مولانا عزیز الدین عظامی مرحوم سے ملا۔ جو مولانا گرامی مرحوم کے شاگرد اور فارسی کے بہت اچھے شاعر تھے، جالندھر، لدھیانہ، گورداسپور کے کئی مشاعروں میں شرکت کی۔ 1947ء میں تقسیمِ ہند کے وقت میری عمر 19 برس کی تھی۔ جیسے جیسے حالات کا ارتقا جاری رہا، میرا شعور اسرار ہائے کائنات کا حامل ہوتا گیا۔ تقسیم کے بعد سے صرف شعر کہتا ہوں، شعر پڑھتا ہوں، شعر کھاتا ہوں اور شعر پیتا ہوں۔

یہ حیات کی کہانی ہے فنا کا اِک مسافر
تو لبوں سے مسکرا کے اسی جام کو لگا لے

رونقِ جشنِ رنگ و بُو کے لیے
زخم حاضر ہیں ، داغ حاضر ہیں"

1947ء میں ہندوستان دو الگ الگ مقتدر ریاستوں میں تقسیم ہوا، تقسیم کے اثرات آج بھی تمام ہندوستان پر دیکھے جاسکتے ہیں۔ صدیوں سے اپنے بزرگوں کی نشانیاں سنبھالے جس طرح خاندان برباد اور بے گھر ہوئے، اُس طرح کی بربادی چشمِ فلک نے کم ہی دیکھی ہوگی۔ ساغر ان تمام حالات سے بہرہ مند تھے، یہ اُن کی باریک بینی تھی کہ اُنھوں نے اپنی ایک غزل میں کچھ اس طرح کے اشعار کہے:

یہ جو دیوانے سے دوچار نظر آتے ہیں
اِن میں کچھ صاحبِ اَسرار نظر آتے ہیں
کل جنھیں چُھو نہیں سکتی تھی فرشتوں کی نظر
آج وہ رونقِ بازار نظر آتے ہیں

محمد اختر..... اختر کے معنی تارے کے ہیں۔ تاہم اُن کی مثال ایک ٹوٹے ہوئے تارے کی تھی۔ ساغر نے اپنا ابتدائی قلمی نام ناصر حجازی رکھا، لیکن یہ نام مزاج سے میل نہ کھا سکا، کچھ ہی عرصے کے بعد اُنھوں ساغر صدیقی نام اختیار کرلیا۔ نفاست اور خوش لباسی کے خوگر

ساغرؔ تقسیم کے بعد، لاہور کی سڑکوں کا مستقل حصہ بن کر رہ گئے۔ پوری زندگی لاہور کی سڑکوں کی رفاقت میں گزری۔ نہ کبھی کوئی مکان بنایا اور نہ ہی مکان داریاں بنیں۔ زمین کی خاک بچھونا اور بے کراں آسماں کی کھلی چھت سر پر رہی۔ ہزارہا لوگوں کی نظریں اس فقیر پر پڑیں مگر وہ بے حسی کے ساتھ آگے بڑھ گئے۔ لاکھوں کے مجمع میں کبھی کسی نے یہ نہ چاہا کہ اس فقیر کے پاس کچھ لمحوں کے لیے رُک جائے، اُس سے پوچھے کہ وہ اِن حالات کا شکار کیوں کر ہوا۔ جبر کے نظام کے خلاف احتجاجِ مسلسل کرنے والا یہ انسان، جو کالا کمبل اوڑھے کبھی داتا دربار، کبھی ٹکسالی دروازے کے اندرونی محلّوں میں، کبھی بھاٹی دروازے کے باہر شہزاد ہوٹل کی دہلیز پر، کبھی تسکین کارنر کے تھڑوں پر ہوتا تو کبھی بھٹہ خشت کی اینٹوں کو سرھانا بنائے سو جاتا، کون تھا؟ زوال پذیر معاشرت میں بے حِس اور بے رحم سماج کے نزدیک تو ساغر محض اُس قدیم کھنڈر کے مانند تھا، جس کے قریب سے ہزاروں لوگ گزرتے تھے لیکن کسی کو عہدِ رفتہ کی اس نشانی سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ یہ کھنڈر عمارت کس کی ملکیت تھی؟ اسے تعمیر کرنے والے کون اور کس عہد کے لوگ تھے؟ کون کون سے نشیب و فراز اِس نے دیکھے۔ یہ حوادث کی داستان کیوں کر ہے؟ سماج کے نزدیک تو وہ بس ایک مالی منفعت سے دُور کھنڈر ہے۔ ان حالات میں فقیر ساغر کی زبان سے اس طرح کے شعر سنائی دیے۔

ہوس مُشیر ہو جس بادشاہ کی ساغر
تو اُس غلام پہ درویش مسکراتا ہے

ساغر کے اَشعار آج تک ہر خاص و عام کی زبان پر ہیں۔ ذیل کے اشعار اُس شخص کے جذبات کی غمازی کرتے ہیں جو دِل میں درد رکھتا ہو، کرب محسوس کرتا ہو:

زندگی جبرِ مسلسل کی طرح کاٹی ہے
جانے کس جُرم کی پائی ہے سزا، یاد نہیں
آؤ اِک سجدہ کریں عالمِ مدہوشی میں
لوگ کہتے ہیں کہ ساغر کو خدا یاد نہیں

یہ اور بات کہ تم آئے ہو تو کوئی نہیں
وگرنہ غم تو یہاں بے شمار رہتے ہیں

دینِ اسلام کی شمع سے منور صوفیا اور درویش حضرات کی حیات کا مطالعہ کریں تو کئی ایسے بلند پایہ عظیم لوگ دِکھائی دیتے ہیں جنھوں نے جس روز جو کمایا، اُسی روز اپنی معمولی ضرورت پوری کرنے کے باقی کا سب راہِ حق میں تقسیم کر دیا اور اگلے دِن کے رِزق کی ذمے داری اپنے خالق پر چھوڑ دی۔ ساغر کی زندگی اس طرح کے واقعات سے بھری پڑی ہے۔ وہ دور جب سرکاری دفاتر میں ملازمین کی ماہانہ تنخواہ تین سو سے چار سو روپے ہوتی تھی، اُس وقت ساغر کو فلمی گیتوں کے عوض پانچ سو روپے ملے تو فقیر نے صرف پانچ روپے اپنی مدہوشی کے واسطے رکھے اور باقی رقم ایک درگاہ کے باہر گداگروں میں تقسیم کر دی۔

تاریخ اس امر کی بھی شاہد ہے کہ بزرگ اور درویش حضرات نے ہمیشہ جابر حکمرانوں کے خلاف علم بغاوت بلند کیے رکھا۔ صدر ایوب نے الیکشن جیتنے کے بعد ساغر سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تو سرکاری اہلکاروں کی ایک فوج لاہور کی سڑکوں پر ایک فقیر کی تلاش میں نکل پڑی۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے جب سرکاری اہلکار فقیر تک جا پہنچے تو اُس نے ملنے سے نہ صرف انکار کر دیا بلکہ ایک سگریٹ کی ڈبیا سے پنی نکالی اور ایک شعر لکھ کر آگے بڑھ گیا۔

جس دور میں لٹ جائے فقیروں کی کمائی
اُس دور کے سلطان سے کچھ بھول ہوئی ہے

بات یہیں نہ رُکی، بدلتے سماجی اور سیاسی ڈھانچے کو دیکھتے ہوئے ساغر نے کہا:

دستور یہاں بھی گونگے ہیں، فرمان یہاں بھی اندھے ہیں
اے دوست خدا کا نام نہ لے، ایمان یہاں بھی اندھے ہیں
تقدیر کے کالے کمبل میں عظمت کے فسانے لپٹے ہیں
مضمون یہاں بھی بہرے ہیں، عنوان یہاں بھی اندھے ہیں
زردار توقع رکھتا ہے نادار کی گاڑھی محنت پر
مزدور یہاں بھی دیوانے، ذی شان یہاں بھی اندھے ہیں

ساغر فقر اور انسانیت کی ایک جیتی جاگتی مثال تھے، عشقِ محمدؐ اور عشقِ الٰہی سے بھی سرشار تھے۔ اُن کی نعتیہ شاعری بڑے بڑے گدی نشینوں کے دلوں میں جگہ بنا چکی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اُس وقت پاک پتن شریف کے دیوان صاحب قبلہ غلام قطب الدین چشتیؒ اپنی

ذاتی گاڑی لاہور بھجوا کر ساغر کو بلاتے، اُن سے نعتیہ اور حمدیہ کلام سن کر اُسی عزت کے ساتھ اُنھیں لاہور واپس بھجوا دیتے۔

اُن کے نعتیہ کلام میں سے چند اشعار ملاحظہ کیجئے:

ساغر سُرور و کیف کے ساغر چھلک اٹھے
صبح تجلیات ہے سیرت رسولؐ کی
چشمِ کلیم ایک تجلّی میں بِک گئی
جلووں کی واردات ہے سیرت رسولؐ کی

محمدؐ اول و آخر، محمدؐ ظاہر و باطن
محمدؐ ہیں بہر صورت عیاں، ایمان ہے میرا

اور جب فقیر نے منقبت کہی تو یہ شعر صفحۂ قرطاس پر اُبھرے:

وہ خود کریں گے کوئی جُرمِ زِیست کا چارہ
سنا ہے اُن کو فقیروں کا دھیان رہتا ہے
علیؓ کی بات جو محسوس کر سکے ساغر
وہ اُجڑا اُجڑا سا دل گلستان رہتا ہے

ساغر صدیقی کے کلام کا ایک بڑا حصہ چھپ نہ سکا اور اس سے بڑھ کر ظلم یہ ہوا کہ اُن کے معاصرین میں سے اکثر کا یہ کہنا تھا کہ اُس وقت کے کئی شہرت پسندوں نے محض ایک سگریٹ کے عوض اُن سے غزل لکھوا کر اُس میں معمولی سا ردوبدل کیا، اُسے اپنے نام سے چھپوایا اور مشاعروں میں مصنوعی شہرت بھی حاصل کی۔ شعرا کے علاوہ اُس وقت کے کئی بڑے گلوکاروں نے اُن کے کلام کے باعث لاکھوں روپے کمائے لیکن اُن میں سے کسی ایک کو بھی توفیق نہ ہوئی کہ فقیر شاعر کے زخموں پر کچھ مرہم رکھ دیں۔ اُن کی دوستی کا دم بھرنے والوں کی ایک بڑی تعداد موقع پرستوں کی تھی۔ بظاہر وہ اُن کے بڑے معتقد تھے، لیکن اُن کے مفادات ساغر کے کلام سے جُڑے ہوئے تھے۔ اِسی باعث فقیر نے کہا:

زہرِ قاتل ہے آبگینوں میں
سانپ پلتے ہیں آستینوں میں
کچھ فرشتوں کا نام انساں ہے
میرے احساس کے قرینوں میں
اب شراروں کی فصل ہے ساغر
رنگ اُگتے تھے جن زمینوں میں

پھر ایک جگہ انتہائی کرب کے عالم میں فقیر نے یوں صدا بلند کی:

اِس رہزنِ حیات زمانے سے دُور چل
مر بھی گئے تو چادرِ صحرا بری نہیں

ساغر سے مخالفت کا معاملہ اُن کی زندگی میں بھی رہا اور بعد میں بھی۔ 1990ء میرے کالج کا زمانہ تھا۔ میں کچھ دوستوں کے ساتھ پاک ٹی ہاؤس میں بیٹھا تھا جہاں کچھ اصحاب کا موضوعِ بحث ساغر ہی تھے۔ ایک صاحب نے اُن کے خلاف کچھ اِس طرح کی دلیل دِی:

''ساغر صدیقی چونکہ زیادہ پڑھے لکھے نہ تھے، اِس لیے وہ کسی بھی نصاب کا حصہ نہ بن سکے اسی وجہ سے یونیورسٹی اُنھیں شاعر تسلیم نہیں کرتی۔''

اِس پر ایک دردمند فوراً بولا:

''جناب اس مُنافقانہ نظام کے تحت چلنے والی یونیورسٹی کو ساغر صدیقی نے بھی کبھی تسلیم نہیں کیا۔''

اُن حضرات کی بحث جاری رہی اور میں سوچتا رہا کہ ایسے بہت سے شعرا ہیں جو کسی بڑے ادارے کے سند یافتہ نہیں تھے اور کیا تمام سند یافتہ لوگ بڑے ادیب یا شاعر بن گئے! ہمیں کئی ایسے شاعر نظر آتے ہیں جو نصاب کی کتابوں میں تو موجود ہیں مگر کیا وہ لوگوں میں اپنی جگہ بنا سکے، جبکہ ساغر صدیقی آج بھی بسوں، ویگنوں، رکشوں، پر موجود تحریروں میں زندہ دکھائی دیتے ہیں۔ نصاب کا حصہ نہ ہونے کے باوجود کئی پبلشر اُن کا کلام بار بار شائع کر چکے ہیں۔ ساغر صدیقی کی زندگی اور اُن کے ہم عصر شعرا کے ساتھ تقابلی موازنے کے

حوالے سے ایک مضمون سعید ساحلی نے تحریر کیا، جس میں سے ایک اقتباس پیشِ خدمت ہے:

''ہمارے شُعرا اگرچہ کلی طور پر زندگی کی خوشیوں سے بہرہ یاب نہیں ہو سکے لیکن اُن کی زندگیاں سرتاپا محرومیوں کا مرقع بھی نہیں ہیں—— اُنھوں نے زندگی کی کڑی، دھوپ بھی دیکھی لیکن محبوب کی زُلف کے سائے سے بھی یکسر محروم نہ رہے۔ گھر بار بھی سجایا اور بیوی بچوں کی محبت سے بھی بہرہ یاب، ہوئے لیکن ساغر صدیقی ایک ایسا انسان تھا جسے زندگی نے صرف کڑی دھوپ میں جُھلسایا، اس وقت تک جب تک اس کی رُوح اُس کے جسم کا ساتھ نہ چھوڑ گئی—— وہ اپنے دُکھوں کی صلیب اپنے کاندھے پر اُٹھائے اس لاکھوں کے شہر میں، جہاں فلک بوس عمارتیں بھی ہیں اور سڑکوں کے چوڑے سینے بھی، چلتا رہا، یہاں تک کہ اس کی سانسیں اُکھڑ گئیں اور وہ اپنی اس صلیب کے نیچے دب کر مر گیا—— اس کے اردگرد مایوسی کا اتنا اتھاہ اندھیرا تھا کہ وہ نا اُمید ہو کر کہہ اُٹھا:

اِس اندھیروں کے عہد میں ساغر
کیا کرے گا کوئی اُجالوں کو

ذکر ہو رہا تھا ساغر کی شاعری اور اُس کے لہجے کا...... ساغر کی شاعری اپنے ہم عصروں سے الگ ہے، اس حیثیت میں کہ اُس نے اپنی ذات کے حوالے سے جو بات کی ہے، وہ ایک معتبر استعارہ بن گئی ہے، ایک توانا اور بھرپور علامت ہے، اس سماج کی چکی میں پسنے والے اُن لوگوں کی جن کی حالت اندر باہر سے اس کی اپنی ذات جیسی ہے، اُس کی شاعری عوام کے دُکھ درد، اور سِسکتے ہوئے جذبات کی ترجمان ہے..... اُس کے اشعار میں عہدِ حاضر کا کرب ہے، اُس نے اپنے اشعار کی قدرت میں فکر و فن کے جو چراغ روشن کیے ہیں ان کی روشنی آج تک مدھم نہیں ہوئی۔''

(سپوتنک، ستمبر 1993ء)

سعید ساحلی کی درج بالا تحریر کی صداقت ہمیں ساغر کے درجِ ذیل اشعار میں صاف نظر آتی ہے:

ہر شے ہے پُرملال، بڑی تیز دھوپ ہے
ہر لب پہ ہے سوال، بڑی تیز دھوپ ہے

چکرا کے گر نہ جاؤں میں اِس تیز دھوپ میں
مجھ کو ذرا سنبھال، بڑی تیز دھوپ ہے

پچھلے زمانوں میں اہلِ نظر اور مقرب لوگوں کا ایک نظریہ یہ بھی تھا کہ جب بھی کوئی درویش اس فانی دُنیا سے پردہ پوش ہو کر خالقِ حقیقی کی جانب لوٹنے کے قریب ہوتا ہے تو آخری ایام میں اُن کی بھوک پیاس ختم ہو جاتی ہے اور جسمِ خاکی اس فانی دُنیا کی دین ہے، وہ یہیں کا یہیں رہ جاتا ہے اور رُوح اگلے جہاں کو سدھار جاتی ہے۔فقیر ساغر صدیقی کی بھوک پیاس تو اُن کی زندگی میں کئی برس پہلے ہی ختم ہو چکی تھی۔ وہ تو محض اِک چلتا پھرتا ہڈیوں کا ڈھانچا تھا جس میں ایک انتہائی خوبصورت رُوح موجزن تھی۔جن اشخاص نے اُنھیں آخری ایام میں دیکھا، اُن کا کہنا ہے کہ اُس وقت اُن کے بازو اور ٹانگیں کسی دو تین برس کے بچے کے مانند تھیں اور یوں وہ اس دُنیا کو چھوڑنے سے بہت عرصہ قبل ہی فانی جسم سے چھٹکارا پا چکے تھے۔

ساغر صدیقی کے کلام کا ایک بڑا حصہ گردشِ ایّام کی نذر ہو گیا اور بہت سا حصہ چوری بھی ہو گیا؛ اس کے باوجود اُن کے کچھ شعری مجموعے، غمِ بہار، لوحِ جنوں، شبِ آگہی، تیشۂ دل، مقتل گاہ، خشتِ میکدہ اور ناقۂ لیلیٰ کے عنوان سے موجود ہیں جبکہ نعتوں کا مجموعہ سبز گنبد بھی دستیاب ہے۔ لاہور کے فلمستان میں آپ جتنا عرصہ رہے، اُن کے کمال یادگار گیت لوگوں کو سننے کے لیے ملے۔آپ کا ایک گیت ’’میرا نشانہ‘‘ کئی دہائیوں تک مقبولِ عام رہا۔ اِس کے علاوہ چند ایک گیت یہ ہیں:

گیت	فلم
(1) موجیں تڑپ رہی ہیں	انوکھی داستان
(2) مینوں ڈنڈیاں گھڑا کے دے گیا	جبرو
(3) مرے ٹوٹے من کی بات زمانہ کیا جانے	شالیمار
(4) آگ من کو لگائیں نظارے	باپ کا گناہ
(5) کوئی اپنی نشانی دے گیا	دو آنسو
(6) دل کو ملا دِلدار	باغی
(7) محفلیں لُٹ گئیں	سرفروش

(8) میرا نشانہ، دیکھے زمانہ، تیر پہ تیر چلاؤں	سرفروش
(9) مری ترچھی نظر، کرے زخمی جگر	غلام
(10) اب شمع اکیلی جلتی ہے	غلام
(11) چمکا پیپل کی اوٹ سے	انجام

درجِ بالا معلومات سپوتنک کے ''ساغر صدیقی نمبر'' کے صفحہ 10 پر بھی درج ہیں۔ زمانے کی بے حسی اور مروجہ سرمایہ دارانہ نظام سے تمام عمر لڑنے کے بعد برصغیر پاک و ہند کا یہ بے مثال شاعر میں 19 جولائی 1974ء کو صرف چھیالیس برس کی عمر اِس دارِفانی سے کوچ کر گیا۔

اُن کی وفات کے بعد ایک موقع پر اعتزاز احسن نے درج ذیل الفاظ کہے:

> ''ساغر کی شاعری ہمیں اپنے معاشرے سے غیر جمہوری رویوں کو ختم کرنے اور استحصالی قوتوں کو جڑ سے اُکھیڑ دینے کا پیغام دیتی ہے اور اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ ہم ناانصافی اور جبر کے نظام کے خاتمہ کے لیے آگے بڑھیں۔ ساغر میلہ میں شرکت کرنے سے ہمیں مشکلوں کا مقابلہ کرنے کا درس ملتا ہے۔ اس کے دور میں ظالم اور مظلوم کی تصویریں بڑے واضح انداز میں نظر آتی ہیں جس میں سامراجی جبر کے خلاف ناصر، مارشل ٹیٹو، چواین لائی، چی گیویرا، ہوچی منہ اور بھٹو شہید آواز اُٹھا رہے تھے۔ ساغر صدیقی بھی معاشرے میں ہونے والے ظلم و ستم اور ناانصافیوں کے خلاف شاعری صورت میں احتجاج کر رہا تھا۔ ساغر نے اس دُنیا کے مقابلے میں اپنی ایک چھوٹی سی دُنیا بنا رکھی تھی جہاں ظالموں کے خلاف آواز بلند ہوتی تھی۔ ماضی کے قبرستان کی قبروں میں ہمیں ساغر کی قبر ظلم کے خلاف آواز اُٹھانے کا درس دیتی ہے۔''

ساغر صدیقی کی برسی کئی برس تک یونس ادیب کی زیرِ نگرانی ''ساغر میلہ'' کے نام سے منائی جاتی رہی۔ اُن کی سولھویں برسی کے موقع پر جاپانی دانشور سویاما نے ایک مضمون پڑھا، جس میں سے ایک اقتباس درج ذیل ہے:

> ''جاپان کے کلاسیکی ہائیکو گو شاعر باشو کی پوری زندگی سفر میں گزری۔ اُنھوں نے سفر کو مکان قرار دیا تھا۔ وہ جاپان کے دُور دراز علاقوں میں اپنے شاگردوں کے ساتھ گھومتے رہے۔ اُن کے پاس سفر کے لیے معمولی سے سامان کے علاوہ

کچھ نہیں تھا۔ جیسے اُن کے دل میں کوئی خاص خواہش نہ رہی ہو۔ سفر کے دوران باشو متعدد ہائیکو لکھتے رہے مگر بالآخر وہ شدید بیمار ہو گئے۔ بستر میں لیٹے ہوئے اُنھوں نے یہ کہا: سفر سے دیوانہ ہو کر بھی خواب ویرانے میں دوڑ رہا ہے۔

شہری زندگی سے کنارہ کش ہو کر زندگی گزارنا ایک تجربہ ہے۔ مگر ساغر صدیقی نے اپنی زندگی کو شہر میں رہتے ہوئے معمول کی زندگی سے دُور رکھا۔ یہ ذرا عجیب معلوم ہوتا ہے ایسی درویشانہ زندگی گزارنے والے کی کیسی نفسیات ہو گی؟ میں نے زندگی میں بہت سے ایسے آدمی دیکھے جو اپنے اظہارِ خیال میں بہت شرماتے ہیں۔ لوگوں کے سامنے آتے ہی جھجک محسوس کرتے ہیں۔ مگر ان لوگوں کے دل میں کہنے کی باتیں اُبھرتی رہتی ہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے کسی سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسے آدمی بھی ہوتے ہیں جو ضرورت سے زیادہ کھل کر باتیں کرنے لگتے ہیں۔ یا ایسے لوگ بھی ہیں جو بالکل تنہائی اختیار کر لیتے ہیں۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ساغر صدیقی کے لیے مدہوشی ایک سہارا تھا۔ مگر اس نشے نے ساغر کو بحیثیتِ شاعر ایک الگ مقام پر پہنچا دیا۔

مدہوشی میں زندگی گزارنے کو انسانی کمزوری بھی کہہ سکتے ہیں مگر ہمیں اب ساغر کی شاعری کا جائزہ لینا ہے۔

ساغر صدیقی کے ہاں زندگی ایک درویشانہ بے نیازی محسوس ہوتی ہے اور یہ کیفیت اُن کی ذاتی زندگی کا کچھ نہ کچھ اثر ہو سکتی ہے۔ شہرت یا عزت اُن کے لیے اہم نہیں رہی۔ اُن کی تمنا، آرزو اور خواہش جیسی ساری چیزیں شاعری ہی سے پوری ہو سکتی تھیں۔ جن خواہشوں کا حصول عملی طور پر ناممکن رہا۔ ساغر تو جیسے ایک بے نقاب آدمی بن کر رہے۔ اُن کی شاعری ایک تہی دست آدمی کا گیت ہے اور کیا خوب ہے کہ دُنیاوی خواہشوں سے اُٹھ کر ہی آدمی اس انداز کی بات کر سکتا ہے:

کچھ نہیں مدعا فقیروں کا
درد ہے لا دوا فقیروں کا
اپنی تنہائیوں پہ ہنستے ہیں
کون ہے آشنا فقیروں کا
منزلوں کی خبر خدا جانے
عشق ہے رہنما فقیروں کا

میکدے کی حدود میں ہوں گے
کیا بتائیں پتا فقیروں کا
توہین ہے درویش کا اِس شہر میں جینا
ہو فاقہ کشی نام جہاں صبرو رضا کا

سلطنت ہے قناعتِ درویش
ہر نفس ہے سکندر و دارا
یہی ساغرصدیقی کی قوت ہے۔''

19 جولائی 1974ء کی ایک صبح، ساغر کی زندگی کا چراغ گل ہو چکا تھا۔ فقیر کی لاش لاہور کی ایک سڑک کے کنارے پر پڑی تھی۔ اُنھیں لاہور میں قبرستان میانی صاحب میں دفنایا گیا۔ اُن کی قبر تک رسائی ہمیں چوبرجی کے سامنے ثریا عظیم ہسپتال سے آگے بائیں طرف جانے والی ایک گلی سے ملتی ہے۔ اُن کی زندگی میں اُن کا بہت زیادہ ساتھ نبھانے والے یونس ادیب بھی اُن کی قبر کے پہلو میں دفن ہیں۔ ساغر میلہ سالہاسال کسی بھی حکومتی سرپرستی کے بغیر بڑے زور وشور سے ہر سال منایا جاتا رہا اور یہ شاید دُنیا کا واحد ادبی میلہ تھا جو قبرستان میں منایا جاتا تھا۔ اُن کے فن کی معراج کو نہ ماننے والوں کے لیے اس سے بڑا اور کوئی جواب ہو ہی نہیں سکتا۔ اُن کی قبر مبارک کے اُوپر ایک اور تعویذ تعمیر کر کے اُس کے اِردگرد ایک چوکھٹا سا بھی تعمیر کر دیا گیا ہے۔ قبر کے تعویذ پر سبز رنگ کی چادر چڑھی رہتی ہے۔ ساغر صدیقی کی موت پر اے حمید نے ایک مضمون تحریر کیا۔ اس کا آخری حصہ منقبس ہے:

''ساغر صدیقی کی موت کی خبر مجھے اس کے لاہور کے ایک دوست نے دی۔ اس کے لیے یہ آج مرا تھا۔ میں ساغر صدیقی کے جنازے میں نہیں گیا، جس طرح کہ میں اپنے دوستوں کے جنازے میں نہیں جایا کرتا اور جس طرح میں چاہتا ہوں کہ میرے جنازے میں میرا کوئی دوست شریک نہ ہو۔ اب میں اس پر مضمون لکھنے بیٹھا تو وہ میرے سامنے آ کر بیٹھ گیا۔ گولڈ فلیک کا پیکٹ کھول کر ایک سگریٹ مجھے دیا، ایک سگریٹ خود سُلگایا اور چُپکے سے اُٹھ کر چلا گیا۔ یہ لوگ تو چُپکے سے اُٹھ کر چلے جاتے ہیں۔ مجھے یقین ہے، جب موت آئی ہوگی تو ساغر صدیقی کو اتنا زیادہ تیار دیکھ کر خود بھی حیران ہوگئی ہوگی۔ اگر کچھ دیر لگائی

ہو گی تو موت نے لگائی ہو گی۔ ساغر نے کوئی دیر نہیں لگائی ہو گی۔

ساغر صدیقی نے مرنے میں بہت جلدی دِکھائی۔ میں جب کبھی اُسے شہر لاہور کی بارونق سڑکوں پر فقیروں کی طرح گھومتا پھرتا دیکھتا تو مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے ایک سادھو جنگل سے بن باس لے کر شہر میں آ گیا ہے۔ ساغر صدیقی کے لیے یہ شہر ایک جنگل ہی تھا، جہاں تپتی سڑکوں کے پہاڑ تھے اور اُس کی غزلوں کی ہرنیوں کو شکار کرنے والے ظالم شکاری تھے۔ آج اُس کی تمام غزلوں کی ہرنیاں شکار ہو چکی ہیں۔ یہ جو آپ اُس کے چھپے ہوئے دیوان دیکھ رہے ہیں یہ وہ طشت ہیں جن میں ساغر صدیقی کی غزلوں کی لاشیں سجا کر رکھی گئی ہیں۔ جو شخص بیس برس تک لاہور کی سڑکوں پر ننگے پاؤں پھرتا رہا ہو، اُس پر مضمون لکھنے کے لیے ضروری تھا کہ میں جوتا اُتار کر بیٹھوں۔ ساغر صدیقی بیس برس اس شہر میں ننگے پاؤں پھرا۔ معلوم نہیں کہ اُس نے اس شہر کی سڑکوں کا احترام کیا اور اس پر جوتا نہ رکھا یا اپنے جوتے کا احترام کیا کہ اس شہر کی سڑکوں سے بچایا۔"

مملکت خداداد پاکستان میں عظیم لوگوں کے کام کی سنبھال نہ ہونے کے برابر ہے۔ اربابِ اختیار سے یہ درخواست ضرور کروں گا کہ وہ ساغر کے کام کو سنبھالنے کے لیے تمام موجود ذرائع بروئے کار لائیں۔

مزار کی لوح پر درج ذیل عبارت رقم ہے:

حق حق حق

بسم اللہ الرحمن الرحیم

وہاں اب تک سنا ہے سونے والے چونک اُٹھتے ہیں
صدا دیتے ہوئے جن راستوں سے ہم گزر آئے (ساغر)

درویش شاعر ساغر صدیقی رحمۃ اللہ علیہ
تاریخ وصال 19 جولائی 1974ء، لاہور

حبیب جالب

1928ء–1993ء

میں تو سورج ہوں، ستارے مرے آگے کیا ہیں
شب ہے کیا شب کے سہارے مرے آگے کیا ہیں
جو ہمیشہ رہے شاہوں کے ثناخواں جالب
وہ سخن ساز بچارے مرے آگے کیا ہیں
جالب

حضرتِ انسان کی تاریخ ابتدا ہی سے دو طبقوں میں تقسیم دِکھائی دیتی ہے۔ ایک جابر، طاقتور طبقہ اور دوسرا مظلوم اور پسا ہوا طبقہ۔ طاقتور طبقہ ہر دَور میں کسی نئے رنگ میں دِکھائی دیا اور یہ سلسلہ بادشاہت سے ہوتا ہوا سرمایہ دارانہ نظام تک اپنے تانے بانے بنتا گیا۔ صنعتی انقلاب کے بعد مزدوروں اور کسانوں کے حقوق کی پاسداری کے لیے کئی عظیم لوگوں نے اپنی پوری زندگی صرف کر دی۔ تقسیم کے بعد پاکستان میں سیاسی اور انقلابی تحریک میں ایک بڑا نام حبیب جالب کا نظر آتا ہے۔

جالب کا جنم 24 مارچ 1928ء کو ہوشیار پور (متحدہ ہندوستان) کے ایک قریبی گاؤں میں ہوا۔ اُن کے والد کا نام صوفی عنایت اللہ خان تھا۔ تقسیم کے بعد آپ پاکستان آن بسے اور کراچی سے جاری ہونے والے روزنامہ ''امروز'' میں پروف ریڈر کی نوکری کر لی۔ شاعری کا دِیپ مَن میں جگمگا چکا تھا اور ذہن سامراجی نظام کو کلی طور پر رد کر چکا تھا، اس لیے شاعری ہی اِظہار کا ذریعہ ٹھہری اور بہت قلیل عرصے میں آپ اپنے مخصوص اندازِ بیاں سے مشرقی اور مغربی

پاکستان میں مقبول ہو گئے۔

جالب بنیادی طور پر ایک مارکسسٹ تھے۔ ان پر مارکس اور لینن کے فلسفہ حیات کا اتنا گہرا اثر تھا کہ تمام عمر مزدوروں کے شاعر کہلائے۔ اُن کی ایک نظم ہے:

نذرِ مارکس

یہ جو شب کے ایواں میں اِک ہلچل ہے اِک حشر بپا ہے
یہ جو اَندھیرا سمٹ رہا ہے، یہ جو اُجالا پھیل رہا ہے
یہ جو ہر دُکھ سہنے والا، دُکھ کا مداوا جان گیا ہے
مظلوموں، مجبوروں کا غم یہ جو مرے شعروں میں ڈھلا ہے
یہ جو مہک گلشن گلشن ہے، یہ جو چمک عالم عالم ہے
مارکسزم ہے مارکسزم ہے مارکسزم ہے مارکسزم ہے

سیدھی اور سادہ زبان استعمال کرنے والے جالب سیاسی طور پر سب سے پہلے کمیونسٹ پارٹی کے رُکن بنے۔ کمیونسٹ پارٹی پر جب سرکار کی جانب سے پابندی لگی تو اُنھوں نے نیشنل عوامی پارٹی (NAP) میں شمولیت اختیار کر لی۔ اُنھوں نے ہر دور میں پسے ہوئے طبقے کی نمائندگی کی۔ پاکستان میں دولت کی غیر مساویانہ تقسیم اور غریب کا استحصال روزِ اوّل ہی سے ہو رہا ہے۔ اقتدار کے ایوانوں میں ہمیشہ طاقتور طبقے کی نمائندگی رہی، یہی وجہ ہے کہ جالب کی زندگی کا ایک بڑا عرصہ جیلوں اور تحاریک میں گزرا۔ اُنھیں بیسویں صدی کے انقلابی اردو شعرا کا امام کہا جا سکتا ہے۔ تقسیم سے قبل جس روزِ روشن کی نوید سنائی گئی، آزادی کے بعد وہ ایک طویل سیاہ رات میں بدل گئی۔ کلمۂ حق کی صدا بلند کرنے والے جالب نے پہلی مرتبہ ایوب کے دور میں جیل کی ہوا کھائی۔ اُسی دور میں اُنھوں نے اپنی شہرہ آفاق نظم ''دستور'' کہی جو آج تک بڑے بڑے سیاستدانوں اور مزدور رہنماؤں کی زبان پر ہے اور عام محافل میں بھی گفتگو کے دوران میں اس نظم کے مصرعے بطورِ محاورہ استعمال کیے جاتے ہیں۔ جب تک یہ جبر کا نظام قائم ہے، یہ نظم خلقت کی زبان پر رہے گی:

دستور

دِیپ جس کا محلات ہی میں جلے
چند لوگوں کی خوشیوں کو لے کر چلے
وہ جو سائے میں ہر مصلحت کے پلے
ایسے دستور کو، صبح بے نُور کو
میں نہیں مانتا ، میں نہیں مانتا

میں بھی خائف نہیں تختۂ دار سے
میں بھی منصور ہوں کہہ دو اَغیار سے
کیوں ڈراتے ہو زِنداں کی دیوار سے
ظلم کی بات کو، جہل کی رات کو
میں نہیں مانتا ، میں نہیں مانتا

پھول شاخوں پہ کھلنے لگے، تم کہو
جام رِندوں کو ملنے لگے، تم کہو
چاک سینوں کے سلنے لگے، تم کہو
اِس کھلے جھوٹ کو، ذہن کی لُوٹ کو
میں نہیں مانتا ، میں نہیں مانتا

تم نے لُوٹا ہے صدیوں ہمارا سکوں
اَب نہ ہم پر چلے گا تمھارا فسوں
چارہ گر میں تمھیں کس طرح سے کہوں
تم نہیں چارہ گر، کوئی مانے مگر
میں نہیں مانتا ، میں نہیں مانتا

جالب تمام مسائل کا حل ایک آزادانہ انتخاب کو مانتے اور اُن کے نزدیک جمہوریت ہی سے عوام کے مسائل حل ہو سکتے تھے۔ جمہوریت کے حق میں اُنھوں نے اپنی ایک نظم میں عوام سے یوں خطاب کیا:

جمہوریت

دس کروڑ انسانو!
زندگی سے بیگانو!
صرف چند لوگوں نے حق تمھارا چھینا ہے
خاک ایسے جینے پر یہ بھی کوئی جینا ہے
بے شعور بھی تم کو بے شعور کہتے ہیں
سوچتا ہوں یہ ناداں کس ہوا میں رہتے ہیں
اَور یہ قصیدہ گو فِکر ہے یہی جن کو
ہاتھ میں علَم لے کر تم نہ اُٹھ سکو لوگو
کب تلک یہ خاموشی چلتے پھرتے زِندانو
دس کروڑ انسانو!
یہ ملیں یہ جاگیریں کس کا خون پیتی ہیں
بیرکوں میں یہ فوجیں کس کے بل پہ جیتی ہیں
کس کی محنتوں کا پھل داشتائیں کھاتی ہیں
جھونپڑوں سے رونے کی کیوں صدائیں آتی ہیں
جب شباب پر آکر کھیت لہلہاتا ہے
کس کے نین روتے ہیں کون مسکراتا ہے
کاش تم کبھی سمجھو کاش تم کبھی جانو
دس کروڑ انسانو!
علم و فن کے رستے میں لاٹھیوں کی یہ باڑیں
کالجوں کے لڑکوں پر گولیوں کی بوچھاریں
یہ کرایے کے غنڈے یادگارِ شب دیکھو
کس قدر بھیانک ہے ظلم کا یہ ڈھب دیکھو
رقصِ آتش و آہن دیکھتے ہی جاؤ گے

دیکھتے ہی جاؤ گے ہوش میں نہ آؤ گے
اے خموش طوفانو!
دس کروڑ انسانو!

سینکڑوں حسن ناصر ہیں شکار نفرت کے
صبح و شام لٹتے ہیں قافلے محبت کے
جب سے کالے باغوں نے آدمی کو گھیرا ہے
مشعلیں کرو روشن دُور تک اندھیرا ہے
میرے دیس کی دھرتی پیار کو ترستی ہے
پتھروں کی بارش ہی اس پہ کیوں برستی ہے
مُلک کو بچاؤ بھی ملک کے نگہبانو
دس کروڑ انسانو!

بولنے پہ پابندی سوچنے پہ تعزیریں
پاؤں میں غلامی کی آج بھی ہیں زنجیریں
آج حرفِ آخر ہے بات چند لوگوں کی
دن ہے چند لوگوں کا رات چند لوگوں کی
اُٹھ کے درد مندوں کے صبح و شام بدلو بھی
جس میں تم نہیں شامل وہ نظام بدلو بھی
دوستوں کو پہچانو دشمنوں کو پہچانو
دس کروڑ انسانو!

آزادی کے فوراً بعد قائداعظم کو بھی اس بات کا احساس ہوگیا تھا کہ اُن کی جیب میں کھوٹے سِکّے ہیں۔ مملکت خدادادِ پاکستان پر چند خاندانوں کی حکومت قائم ہوگئی۔ اُن خاندانوں نے ملکی مفادات کے بجائے ذاتی مفادات کی خاطر اس ریاست کو اپنی ذاتی جاگیر سمجھ لیا۔ مفادات کی یہ رِیت اِکہتر برس گزر جانے کے باوجود آج تک قائم ہے۔ ریاست کے ذرائع، وسائل اور عوام کی محنت کا سمیٹا ہوا پیسہ اُن کے ہاتھوں کی پوریں بنتا چلا گیا اور چند

گھرانوں کی حکومت فوجی ڈکٹیٹروں کے زیرِ سایہ پلتی بڑھتی گئی۔

بیس گھرانے

بیس گھرانے ہیں آباد
اور کروڑوں ہیں ناشاد
صدر ایوب زندہ باد
آج بھی ہم پر جاری ہے
کالی صدیوں کی بیداد
صدر ایوب زندہ باد
بیس روپیہ من آٹا
اس پر بھی ہے سناٹا
گوہر، سہگل، آدم جی
بنے ہیں برلا اور ٹاٹا
ملک کے دشمن کہلاتے ہیں
جب ہم کرتے ہیں فریاد
صدر ایوب زندہ باد
لائسنسوں کا موسم ہے
کنونشن کو کیا غم ہے
آج حکومت کے در پر
ہر شاہیں کا سر خم ہے
درسِ خودی دینے والوں کو
بھول گئی اقبالؒ کی یاد
صدر ایوب زندہ باد

عام ہوئی غنڈہ گردی
چپ ہیں سپاہی باوردی
شمعِ نوائے اہلِ سخن
کالے باغ نے گُل کر دی
اہلِ قفس کی قید بڑھا کر
کم کر لی اپنی میعاد
صدر ایوب زندہ باد
یہ میثاقِ استنبول
کیا کھولوں میں اس کا پول
بجتا رہے گا محلوں میں
کب تک یہ بے ہنگم ڈھول
سارے عرب ناراض ہوئے ہیں
سیٹو اور سنٹو ہیں شاد
صدر ایوب زندہ باد
گلی گلی میں جنگ ہوئی
خلقت دیکھ کے دنگ ہوئی
اہلِ نظر کی ہر بستی
جہل کے ہاتھوں تنگ ہوئی
وہ دستور ہمیں بخشا ہے
نفرت ہے جس کی بنیاد
صدر ایوب زندہ باد

بنگلہ بھاشا (بنگالی) کے سرکاری زبان نہ بننے اورفوجی حکومتوں کے باعث مشرقی پاکستان میں ایک شدید احساسِ محرومی نے جنم لے لیا۔ مسائل بڑھتے گئے، پھر پاکستان کی سیاسی تاریخ

کا ایک انتہائی موڑ سامنے آیا، جب مشرقی اور مغربی پاکستان کی تمام جمہوری قوتیں آمریت کے خلاف اکٹھی ہوگئیں اور اُس وقت کی نوجوان نسل، شُعرا اور ادبا کی ایک بڑی تعداد مادرِ ملت کے ساتھ آن کھڑی ہوئی۔ ڈھاکہ اور کراچی دونوں جانب سے سوشلزم کی ایک بھرپور لہر چل پڑی۔ جالب نے ہر مقام پر مادرِملت کی بھرپور تائید کی۔

مادرِملت

ایک آواز سے ایوان لرز اُٹھے ہیں
لوگ جاتے ہیں تو سلطان لرز اُٹھے ہیں
آمدِ صبحِ بہاراں کی خبر سنتے ہی
ظلمتِ شب کے نگہبان لرز اُٹھے ہیں
دیکھ کے لہر مرے دیس میں آزادی کی
قصرِ افرنگ کے دربان لرز اُٹھے ہیں

مشعلیں لے کے نکل آئے ہیں مظلوم عوام
غم و اَندوہ میں ڈُوبی ہے محلّات کی شام
یاس کا دور گیا خوف کی زنجیر کٹی
آج سہمے ہوئے لوگوں کو ملا اِذنِ کلام
راہ میں لاکھ صداقت کے مُخالف آئے
قوم نے سن ہی لیا مادرِ ملت کا پیام

ماں کے قدموں ہی میں جنّت ہے اِدھر آ جاؤ
ایک بے لوث محبت ہے اِدھر آ جاؤ
وہ پھر آئی ہیں، ہمیں ملک دلانے کے لیے
اُن کی یہ ہم پہ عنایت ہے اِدھر آ جاؤ

اُس طرف ظلم ہے، بیداد ہے، حق تلفی ہے
اِس طرف پیار ہے، اُلفت ہے، اِدھر آ جاؤ

(کلیاتِ حبیب جالب، صفحہ 188)

لیکن تمام تر سرکاری وسائل کے استعمال، طاقت، زور اور دھونس کے بل بوتے پر نہ صرف مادرِ ملت کو الیکشن میں شکست دے دِی گئی بلکہ اُن کا کردار ملکی سیاست ہی سے ختم کر دِیا گیا اور بنگلہ دیش کے قیام کی راہ ہموار کر دی گئی۔ فاطمہ جناح اِسی غم سے نڈھال ہو کر بیمار پڑ گئیں اور پاکستان کے عوام کو اُن کی موت کی صورت میں ایک عظیم صدمہ دیکھنا پڑا۔ اُن کی پہلی برسی پر جالب یوں گویا ئے:

غلام ہم کو بنائے رہو گے تم کب تک
ہمارے سر کو جھکائے رہو گے تم کب تک
ہمارے حق کو دبائے رہو گے تم کب تک
وطن کو سولی چڑھائے رہو گے تم کب تک

اندھیرا ظلم و ستم کا مٹا کے چھوڑیں گے
چراغِ مادرِ ملت جلا کے چھوڑیں گے

جالب کی پاکستان میں رُونما ہونے والے تمام حالات پر عمیق نگاہ تھی۔ وہ اپنی شاعری کو نقارۂ خلق بناتے رہے۔ زور آور کا زور ہر شے، ہر جنس پر تھا۔ انسانی جان اور عزت بھی اُن کے لیے ایک شے کے مانند تھی۔ ایک موقع پر مغربی پاکستان کے گورنر، نواب آف کالاباغ نے غیر ملکی سفیروں کے اعزاز میں ایک تقریب کا انعقاد کیا۔ جس کی شان بڑھانے کے لیے اس وقت کی مشہور فلمی اداکارہ نیلو کو ناچ کے لیے بلوایا۔ نیلو کے انکار پر اُسے زبردستی بذریعہ پولیس اُٹھوا لایا گیا۔ اس وحشیانہ اقدام پر نیلو نے خودکشی کرنے کی کوشش بھی کی۔ حبیب جالب نے اپنی ایک نظم میں کہا:

عورت

بازار ہے وہ اب تک جس میں تجھے نچوایا
دیوار ہے وہ اب تک جس میں تجھے چنوایا

اس کے بعد جالب نے ایک نظم ''نیلو'' کے عنوان سے کہی:

تُو کہ ناواقفِ آدابِ شہنشاہی تھی
رقص زنجیر پہن کر بھی کیا جاتا ہے
تُجھ کو انکار کی جرأت جو ہوئی تو کیونکر
سایۂ شاہ میں اس طرح جیا جاتا ہے؟

اہلِ ثروت کی یہ تجویز ہے سرکش لڑکی
تجھ کو دربار میں کوڑوں سے نچایا جائے
ناچتے ناچتے ہو جائے جو پایل خاموش
پھر نہ تا زیست تجھے ہوش میں لایا جائے

لوگ اس منظرِ جانکاہ کو جب دیکھیں گے
اور بڑھ جائے گا کچھ سطوتِ شاہی کا جلال
تیرے انجام سے ہر شخص کو عبرت ہوگی
سر اُٹھانے کا رعایا کو نہ آئے گا خیال

طبعِ شاہانہ پہ جو لوگ گراں ہوتے ہیں
ہاں اُنھیں زہر بھرا جام دیا جاتا ہے

تُو کہ ناواقفِ آدابِ شہنشاہی تھی
رقص زنجیر پہن کر بھی کیا جاتا ہے

یہ نظم کچھ تبدیلی کے ساتھ فلم ''زرقا'' میں ایک نغمے کے طور پر بھی پیش کی گئی۔ حکمرانوں کی عیاشیوں اور ریاستی ریشہ دوانیوں کے باعث مشرقی پاکستان میں حالات بد سے بدتر ہوتے گئے۔ وہ معاملات جو سیاسی طریقۂ کار اور انصاف کی بنیاد پر بغیر کشت وخون کے حل ہو سکتے تھے، وہاں فوج کشی کر دی گئی۔ فوج کشی کے خلاف مغربی پاکستان میں بھی شدید مزاحمت ہوئی۔ کسی فلسفی نے کیا خوب کہا تھا کہ '' جنگیں جیتی جاسکتی ہیں لیکن لوگوں کو نہیں جیتا جاسکتا''۔ اپنے ہی ملک کو فتح کرنے کے لیے فوجیں اُتارنے پر جالب یوں گویا ہوئے:

محبت گولیوں سے بو رہے ہو
وطن کا چہرہ خوں سے دھو رہے ہو
گماں تم کو کہ رستہ کٹ رہا ہے
یقیں مجھ کو کہ منزل کھو رہے ہو

جالب پر یہ سطریں تحریر کرتے وقت مجھے کئی بار گمان گزرا کہ میں پاکستان کی تاریخ پر مضمون لکھ رہا ہوں کیونکہ جالب نے کوئی موقع ایسا ہاتھ سے نہ جانے دیا جب حق کی آواز بلند کرنے کی ضرورت تھی۔ اپنے دامن میں ظلم وستم کی تاریخ سمیٹے مشرقی پاکستان، بنگلہ دیش بن گیا۔ ایک تقسیم 1947ء میں ہوئی تھی۔ 1971ء کی اِس تقسیم پر جالب یوں گویا ہوئے:

اِک بار اَور ہم ہوئے تقسیم
اِک بار اَور دل ہوا دونیم

ہوگئے دُور راہبر کیا کیا
چھن گئے ہائے ہم سفر کیا کیا

یہ فسانہ ہے پاسبانوں کا
چاق و چوبند نوجوانوں کا

سرحدوں کی نہ پاسبانی کی
ہم سے ہی داد لی جوانی کی

اس زمانے کی کیا لکھوں رُوداد
خوف، مہنگائی، جبر و اِستبداد

اب کمشنر زکوٰۃ دیتے ہیں
اور ٹی وی پہ داد لیتے ہیں

سقوطِ ڈھاکہ کے المیے کے بعد پاکستانی فوجیوں کی اپنے وطن واپسی ایک اہم سوال تھا۔ ذوالفقار علی بھٹو نے کامیابی سے یہ مرحلہ طے کیا اور فوجیوں کی ایک بڑی تعداد وطن واپس آ گئی۔ اس کے بعد بھٹو صاحب عوام کی امیدوں کا منبع بن گئے۔ اُنھوں نے کئی بڑے مسائل کامیابی سے حل کیے لیکن عوام کے بنیادی مسائل کو وہ بھی حل نہ کر سکے۔ بھٹو صاحب خود بھی جن حالات کا شکار ہو رہے تھے، اُنھیں جالب نے اپنی نظم ''ممتاز'' میں یوں پیش کیا:

قصرِ شاہی سے یہ حکم صادر ہوا ، لاڑکانے چلو
ورنہ تھانے چلو
اپنے ہونٹوں کی خوشبو لٹانے چلو ، گیت گانے چلو
ورنہ تھانے چلو
منتظر ہیں تمھارے شکاری وہاں ، کیف کا ہے سماں
اپنے جلووں سے محفل سجانے چلو ، مسکرانے چلو
ورنہ تھانے چلو

حاکموں کو بہت تم پسند آئی ہو ، ذہن پر چھائی ہو
جسم کی لو سے شمعیں جلانے چلو ، غم بھلانے چلو
ورنہ تھانے چلو

بھٹو صاحب کی پھانسی کے بعد مارشل لا ایک بار پھر عفریت بن کر پاکستان پر نازل ہوا۔ اس عہد کی کاشت کی ہوئی فصل آج بھی ہم لوگ دہشت گردی کی شکل میں کاٹ رہے ہیں۔ ضیا کے اُن اقدامات کی اُنھوں نے بھرپور مخالفت کی اور بلاخوف وخطر کہا:

ہر شام یہاں شامِ ویراں، آسیب زدہ رستے گلیاں
جس شہر کی دھن میں نکلے تھے وہ شہرِ دلِ برباد کہاں
صحرا کو چمن، بن کو گلشن، بادل کو رِدا کیا لکھنا
ظلمت کو ضیا، صرصر کو صبا، بندے کو خدا کیا لکھنا

مارشل لا کے دور ہی میں سرد جنگ کا میدانِ جنگ افغانستان اور پاکستان کے سرحدی علاقے بنے۔ جالب جو عوام کی نمائندہ آواز تھے، شروع ہی سے امریکہ کے کردار کو پاکستان کے لیے ناپسند کرتے تھے۔ ملکی سیاست کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی سیاست پر گہری نظر رکھنے کے باعث وہ امریکیوں کی ریشہ دوانیوں سے بھی بخوبی آشنا تھے۔ اس مرحلے پر آپ نے برملا صدرِ پاکستان کو للکارا:

ہم لڑیں امریکیوں کی جنگ کیوں
اور کریں اپنی زمیں خوں رنگ کیوں
روشنی کے ہم تو خود ہیں منتظر
روشنی پر ہم اُٹھائیں سنگ کیوں
اے ستم گر تو نے سوچا ہے کبھی
تجھ سے ہے ساری خدائی تنگ کیوں

امن و آزادی کے ہم تو ہیں نقیب
ہوں کسی غاصب سے ہم آہنگ کیوں

کر کے نذرِ گردشِ حالات، امریکہ نہ جا
کیسے پورے ہوں گے اخراجات، امریکہ نہ جا
بس لڑائے رکھ یُونہی جانِ جہاں ہمسایوں سے
بس بنائے رکھ ہماری بات، امریکہ نہ جا
تیرے جانے سے تو جاں ہو جائیں گے برباد ہم
دے کے اشکوں کی ہمیں برسات، امریکہ نہ جا
خاک میں مل جائیں گے سارے ہمارے کرّ و فر
لوگ بیٹھے ہیں لگائے گھات، امریکہ نہ جا
تیرے ہی لطف و کرم سے ہے ہماری زندگی
کر کے کم جینے کے امکانات، امریکہ نہ جا
ایک پنڈی شہر کیا تجھ پر نچھاور پورا ملک
بھیجتا رہ آتشیں آفات ، امریکہ نہ جا
کاخِ زرّیں تجھ سے ہے، تیری بدولت تخت و تاج
تجھ سے قائم ہے ہماری ذات، امریکہ نہ جا
تُو ہی بتلا کس طرح پالیں گے اتنی فوج کو
جوڑتے ہیں تیرے آگے ہاتھ، امریکہ نہ جا

دُنیا کے جس خطے میں بھی ظلم ہوا، جالب نے شاعری کے ذریعے اُس کی نشان دہی کی۔ اُنھوں نے فلسطین، کشمیر، آرمینیا اور لبنان پر بھی نظمیں کہیں۔ اُنھوں نے وارث شاہ، بھٹائی، ساحر، فراق، جوش، بھگت کبیر، مصحفی، فیض، ولی خان، سبطِ حسن، دادا امیر حیدر، میرا جی، نیلو، نُور جہاں اور لتا جی پر نظمیں لکھیں اور اُنھوں نے ضیاء الحق کے نام نہاد ریفرنڈم پر بھی قلم

اُٹھایا۔ضیاء الحق کے دور میں بے نظیر بھٹو وطن واپس لوٹیں تو ایک بار پھر سامراجی قوتوں کے ایوانوں میں زلزلے برپا ہوئے۔جالب نے کہا:

ڈرتے ہیں بندوقوں والے ایک نہتّی لڑکی سے
پھیلے ہیں ہمّت کے اُجالے ایک نہتّی لڑکی سے
ڈرے ہوئے ہیں، مرے ہوئے ہیں، لرزیدہ لرزیدہ ہیں
مُلّا، تاجر، جنرل جیالے، ایک نہتّی لڑکی سے
آزادی کی بات نہ کر، لوگوں سے نہ مِل، یہ کہتے ہیں
بے حِس، ظالم، دل کے کالے ایک نہتّی لڑکی سے
دیکھ کے اِس صُورت کو جالب ساری دُنیا ہنستی ہے
بلوانوں کے پڑے ہیں پالے ایک نہتّی لڑکی سے

1988ء کے انتخابات میں بے نظیر بھٹو مسلم اُمہ کی پہلی خاتون وزیرِ اعظم بنیں تو محترمہ کے سب سے بڑے حمایتی جالب نے اُن سے یوں خطاب کیا:

حال اب تک وہی غریبوں کا
دِن پھرے ہیں فقط وزیروں کے
ہر بلاول ہے دیس کا مقروض
پاؤں ننگے ہیں بے نظیروں کے

جالب نے ہر اُس حکمران کو تنبیہ کی جس نے امریکہ سے روابط اُستوار کرنے کی کوشش کی۔اُنھوں نے بے نظیر بھٹو کو بھی امریکہ سے دور رہنے کی رائے دی، اِس حوالے سے ان کی شہرہ آفاق پنجابی نظم ”گل سن“ پڑھنے کے قابل ہے۔

جالب نے سیاسی اَور سماجی موضوعات کے ساتھ ساتھ جدید طرزِ شاعری میں بھی کمال دِکھایا اَور اہلِ نظر سے داد وصول کی۔مثال کے طور پر اُن کی یہ غزل ملاحظہ فرمائیں جس میں ندرتِ خیال اور باریک بینی اپنے عروج پر ہے:

جی دیکھا ہے، مر دیکھا ہے
ہم نے سب کچھ کر دیکھا ہے
برگِ آوارہ کی صورت
رنگِ خشک و تر دیکھا ہے
ٹھنڈی آہیں بھرنے والو
ٹھنڈی آہیں بھر دیکھا ہے
تیری زلفوں کا افسانہ
رات کے ہونٹوں پر دیکھا ہے
اپنے دیوانوں کا عالم
تم نے کب آ کر دیکھا ہے
انجم کی خاموش فضا میں
میں نے تمھیں اکثر دیکھا ہے
ہم نے اِس بستی میں جالب
جھوٹ کا اُونچا سر دیکھا ہے

اَور اِس مختصر نظم میں بے مثال منظر کشی کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے:

ایک یاد

کچّے آنگن کا وہ گھر، وہ بام و در
گاؤں کی پگڈنڈیاں وہ رہ گزر
وہ ندی کا سُرمئی پانی، شجر
جا نہیں سکتا بجا ان تک مگر
سامنے رہتے ہیں وہ شام و سحر

جالب کے کلام میں موسیقیت کا عنصر قدرتی طور پر موجود تھا۔ وہ خود بھی ایک خاص

انداز سے اپنا کلام سناتے تھے۔ اُن کی ایک نظم بعنوان ''مشیر'' بے پناہ مقبول ہوئی۔ خاص طور پر پرویز مشرف کے دور کے آخری حصّے میں جب عدلیہ بحالی تحریک شروع ہوئی تو لال بینڈ نے یہ نظم کئی جگہوں پر سنائی:

میں نے اُس سے یہ کہا

یہ جو دس کروڑ ہیں
جہل کا نچوڑ ہیں
اِن کی فکر سو گئی
ہر اُمید کی کرن
ظلمتوں میں کھو گئی
یہ خبر دُرست ہے
اِن کی موت ہو گئی
بے شعور لوگ ہیں
زندگی کا روگ ہیں

اور تیرے پاس ہے
اِن کے درد کی دوا

میں نے اُس سے یہ کہا

تُو خدا کا نُور ہے
عقل ہے، شعور ہے
قوم تیرے ساتھ ہے
تیرے ہی وجود سے
ملک کی نجات ہے
تُو ہے مہرِ صبحِ نو
تیرے بعد رات ہے

بولتے جو چند ہیں
سب یہ شر پسند ہیں
اِن کی کھینچ لے زباں
اِن کا گھونٹ دے گلا

میں نے اُس سے یہ کہا

جن کو تھا زباں پہ ناز
چُپ ہیں وہ زباں دراز
چین ہے سماج میں
بے مثال فرق ہے
کل میں اور آج میں
اپنے خرچ پر ہیں قید
لوگ تیرے راج میں
آدمی ہے وہ بڑا
در پہ جو رہے پڑا
جو پناہ مانگ لے
اُس کی بخش دے خطا

میں نے اُس سے یہ کہا

ہر وزیر ہر سفیر
بے نظیر ہے مشیر
واہ کیا جواب ہے
تیرے ذہن کی قسم
خوب اِنتخاب ہے
جاگتی ہے افسری
قوم محوِ خواب ہے

یہ ترا وزیر خاں
دے رہا ہے جو بیاں
پڑھ کے اُس کو ہر کوئی
کہہ رہا ہے مرحبا

میں نے اُس سے یہ کہا

چین اپنا یار ہے
اُس پہ جاں نثار ہے
پر وہاں ہے جو نظام
اُس طرف نہ جائیو
اُس کو دُور سے سلام
دس کروڑ یہ گدھے
جن کا نام ہے عوام
کیا بنیں گے حکمراں
تُو "یقیں" ہے یہ "گماں"
اپنی تو دُعا ہے یہ
صدر تُو رہے سدا

میں نے اُس سے یہ کہا

جالب کا لاہور کے فلمستان سے بھی خاص تعلق رہا۔ منور ظریف پر ان کا ایک گانا ''چور چور'' اپنے عہد میں انتہائی مشہور ہوا اَور اُس گیت میں اُس وقت کے سیاسی و سماجی نظام کی بھرپور عکاسی نظر آتی ہے۔ اُنھوں نے فلم ''کالے چور'' کے نہ صرف گیت تحریر کیے بلکہ اس فلم کی تیاری میں بھی بھرپور کردار ادا کیا۔ وہ فلم پاکستانی سینما کی تاریخ کی کامیاب ترین فلموں میں شمار ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اپنے وقت کے نامور موسیقاروں نے اُن کے کلام کی موسیقی ترتیب دی اَور اُن گیتوں کو بڑے گلوکاروں نے گایا۔ ذیل میں کچھ گیت درج کیے جاتے ہیں:

	گیت	فلم	موسیقار	گلوکار
(1)	آج اس شہر میں	زرقا	مصلح الدین	احمد رُشدی
(2)	دے گا نہ کوئی سہارا	کون کسی کا	منظور اشرف	نسیم بیگم
(3)	تُو کہ ناواقف آدابِ شہنشاہی تھی	زرقا	رشید عطرے	مہدی حسن
(4)	یہ اعجاز ہے حُسنِ آوارگی کا	سماج	اے حمید	مہدی حسن
(5)	مرے دل کی انجمن میں	قیدی	رشید عطرے	سلیم رضا
(6)	من تو پہ واروں	ناگ منی	نثار بزمی	نور جہاں
(7)	ظُلم رہے اور امن بھی	یہ امن	اے حمید	مہدی حسن، نُور جہاں
(8)	اس درد کی دُنیا سے گزر	زخمی	خورشید انور	مہدی حسن
(9)	اِک بھول سمجھ کر	بھروسہ	اے حمید	منیر حسین
(10)	نندیا رُوٹھ گئی	ماں، بہو اور بیٹا	حسن لطیف	نور جہاں
(11)	بھول جاؤ گے تم	سیما	ماسٹر عنایت حسین	سلیم رضا
(12)	پیار بھرے خوابوں کی مالا	دو راستے	ماسٹر عنایت حسین	سلیم رضا

جالب کی تمام زندگی مسلسل جدوجہد کا شاخسانہ تھی۔ پورے ملک کو اپنا گھر جانا، عوام کو اولاد مانا، اِسی وجہ سے تمام عمر اپنا ذاتی گھر نہ بنا سکے۔ اولاد انتہائی برے حالات کا شکار رہی۔ 1990ء کے عشرے کی ابتدا میں پیپلز پارٹی کے کچھ رہنماؤں نے مل کر جالب کو ایک تین مرلے کا پلاٹ سبزہ زار سکیم لاہور میں لے کر دیا۔ وہی اُن کا ذاتی گھر ٹھہرا۔ یہی وجہ ہے کہ جالب کی وفات کے بعد اُنھیں قبرستان سبزہ زار اے بلاک میں دفنایا گیا۔ یہ قبرستان مزار شاہ فریدؒ کے ساتھ واقع ہے۔

جالب 12 مارچ 1993ء کو اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ وہ زندگی کے آخری سانس تک کیمونسٹ پارٹی کا حصہ رہے۔ اُن کی وفات کے بعد اُنھیں نگار ایوارڈ ملا اور 2009ء میں نشانِ امتیاز سے نوازا گیا۔

جالب کی رفیقۂ حیات بھی ایک انتہائی پرعزم اور نظریاتی خاتون تھیں۔ اُنھوں نے

1993ء میں اُس وقت کی حکومت سے جالب کی تدفین کے اخراجات لینے سے انکار کر دیا۔ تمام عمر محنت مزدوری کر کے اولاد کو پالا جو انتہائی مخدوش حالات میں رہی۔ جنوری 2015ء میں وہ بھی اپنے خالق حقیقی سے جا ملیں ۔ آخری وقت میں وہ اپنے بچوں کے ساتھ سبزہ زار سے ماڈل ٹاؤن لاہور سے ملحقہ ایک آبادی میں منتقل ہوگئیں تھیں۔

جالب کی قبر کا کتبہ کچھ یوں ہے:

بسم اللہ الرحمن الرحیم
لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ

اب رہیں چین سے بے درد زمانے والے
سو گئے خواب سے لوگوں کو جگانے والے

شاعرِ عوام حبیب جالب
ولد صوفی عنایت اللہ خان

تاریخ پیدائش 24 مارچ 1928ء
تاریخ وفات 12 مارچ 1993ء

پروفیسر محمد اسلم

1932ء-1998ء

جو حال خیز ہو دل کا، وہ حال ہے بھی نہیں
فغاں کہ اب وہ ملالِ ملال ہے بھی نہیں
تُو آ کے بے سروکارانہ مار ڈال مجھے
کہ تیغ تھی بھی نہیں اور ڈھال ہے بھی نہیں
جون ایلیا

انگریز سرکار جب ہندوستان کے طول وعرض میں پھیل گئی تو اُس نے اپنے تسلط کو دوام بخشنے کے لیے کئی بنیادی اِقدامات کیے جن میں ایک اِقدام مختلف قسم کے اَعداد وشمار جمع کرنا تھا۔ علاقائی زبانوں اَور اَدب کی تاریخ مرتب کی گئی، انگریزی ادب کے علاقائی زبانوں میں تراجم کرائے گئے اور علاقائی زبانوں میں موجود تحریر شدہ اور غیر تحریر شدہ داستانوں کے انگریزی اور اُردو میں تراجم کرائے گئے۔ علاقوں کی جغرافیائی ہیئت، ثقافت، تاریخی عادات اور شخصیات کے حوالے سے بھی انتہائی اہم فیصلے کیے گئے، تاریخ کی کتب مُرتب کرائی گئیں، مختلف شہروں کے سالانہ گزیٹیرز کا اِجرا کیا گیا۔ نصاب میں اہم شہروں کا جغرافیہ متعلقہ صوبے کے نصاب کا لازمی جزو قرار دیا گیا۔ انگریز عہد میں لاہور کی تاریخ کے حوالے سے تین انتہائی اہم کتب ملتی ہیں جن کے پسِ پشت بھی انگریز سرکار ہی کا ہاتھ تھا۔ اِن تین کتابوں کے مُحقق اور مصنف مولوی نُور احمد چشتی، رائے بہادر کنہیا لال ہندی اور جسٹس سیّد لطیف تھے۔ مولوی نُور احمد چشتی اور رائے بہادر کنہیا لال ہندی نے اُردو میں کتب تحریر کیں جن کے نام ''تحقیقاتِ چشتی'' اور'' تاریخِ لاہور'' ہیں، جبکہ جسٹس لطیف نے ''تاریخِ لاہور'' انگریزی زبان

میں تحریر کی۔ اس کتاب کے مختلف اوقات میں دیگر زبانوں میں بھی تراجم ہوتے رہے۔ تقسیم کے بعد اہم ترین نام محمد طفیل کا تھا جنھوں نے نقوش 'لاہورنمبر' نکالا۔ تاریخ کا پہیہ آگے بڑھتا رہا، شہر لاہور کی ثقافت کے ساتھ ساتھ پرانی عمارتوں کی بربادی جاری رہی، ظلم وجبر کی بنیاد پر حکومتیں آتی جاتی رہیں اور مزاحمت کے عناصر بھی جنم لیتے رہے؛ کئی عظیم شخصیات، اپنا اپنا کردار ادا کر کے خالقِ حقیقی سے جاملیں۔ اُن کے جسدِ خاکی لاہور کے قبرستانوں کی زینت بنتے رہے۔

شہرِ لاہور کو ''ترقی'' کے نام کی دِیمک چاٹ گئی۔ شہر کے پرانے محلّے پلازوں میں تبدیل ہوتے گئے، قبضہ گروپوں نے گلیوں اور بازاروں کے ساتھ ساتھ قبرستانوں کی زمینیں تک بیچ ڈالیں۔ تقسیم کے بعد آنے والی سرکاروں کو تاریخ اور ثقافت سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ اس سے اُن کی شہرت میں کوئی اضافہ نہیں ہوسکتا تھا۔ ان حالات میں لاہور میں مدفون کئی عظیم شخصیات ہمیشہ کے لئے گم شدہ ماضی کا حصہ بن جاتیں اگر پروفیسر محمد اسلم کی کتاب ''خفتگانِ خاکِ لاہور'' منظرِ عام پر نہ آتی۔

مولوی نُور احمد چشتی، رائے بہادر کنہیا لال ہندی اور جسٹس سیّد لطیف کو اپنی تحقیق میں تمام تر سرکاری ذرائع مکمل طور پر حاصل تھے۔ مولوی نُور احمد چشتی انگریز افسران کے اتالیق تھے، رائے بہادر کنہیا لال ہندی لاہور کے ایگزیکٹو انجینئر تھے اور سیّد لطیف، جسٹس تھے جن کے نام کا محلہ آج بھی اندرون بھاٹی دروازہ میں ملتا ہے۔ اتنے بڑے سرکاری عہدوں پر بیٹھ کر کام کرنا انتہائی آسان تھا۔ اُن کی بے پناہ محنت قابلِ تحسین ہے لیکن تقسیم کے بعد کام کرنا انتہائی مشکل تھا۔ کیونکہ اب لاہور میں کئی جگہیں ایسی بھی ہیں جہاں چند فٹ زمین بھی لاکھوں روپوں میں ملتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی تاریخ کا طالبِ علم کسی جگہ چلا جائے تو لوگ اُسے اپنا دُشمنِ اوّل تصور کرتے ہیں۔ ان حالات میں پروفیسر محمد اسلم کے کام کی اہمیت کئی گنا بڑھ جاتی ہے۔ اُن کے بعد اِس طرح کا کام ایم آر شاہد نے بھی کیا۔

ایم آر شاہد نے پروفیسر محمد اسلم کے حالاتِ زندگی کچھ اس طرح قلم بند کیے ہیں:

> ''پروفیسر محمد اسلم نامور ادیب، ماہرِ تعلیم، محقق 28 نومبر 1932ء کو طفیل محمد کے گھر تحصیل پھلور ضلع جالندھر میں پیدا ہوئے۔ ایم اے تک تعلیم حاصل کی اور اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان میں نو سال قیام کیا۔

1967ء میں پنجاب یونیورسٹی شعبۂ تاریخ میں لیکچرار مقرر ہوئے۔ اُنھوں نے تاریخی اور تحقیقی نوعیت کی متعدد کتابیں تصنیف کیں۔ دو کتابیں ''وسطِ ایشیا کا شاندار ماضی'' اور ''لاہور — تاریخ کے آئینے میں'' زیرِ طبع ہیں۔ 1992ء میں پنجاب یونیورسٹی شعبۂ تاریخ سے بطورِ صدرِ شعبہ ریٹائر ہوئے۔ پروفیسر محمد اسلم نے کچھ عرصہ مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی کی نظامت بھی کی۔ اُنھوں نے اپنی ایک شاگرد صبیحہ گل جاوید، صدرِ شعبۂ تاریخ، گورنمنٹ اپوا کالج لاہور، کے تحقیقی مقالے ''قادریہ سلسلہ کے صوفیائے کرام کے ساتھ تعلقات'' کی نگرانی کی اور یہ کام اپنی زندگی میں مکمل کروایا۔''

(لاہور میں مدفون مشاہیر، صفحہ 240)

پروفیسر محمد اسلم کے کام کو اُن کے ایک ہم عصر مشفق خواجہ نے کس طرح دیکھا......؟ اِس حوالے سے اُن کی ایک تحریر بعنوان ''تقریظ'' (مشمولہ ''خفتگانِ خاکِ لاہور'') میں سے چند اقتباسات درج ذیل ہیں:

''پروفیسر صاحب کا کام دو طرح کا ہے۔ ایک تو ہم عصر شخصیات کے بارے میں ہے اور دوسرا اُن افراد کے متعلق جن کے مدافن پر کتبات موجود ہیں۔ ہم عصر شخصیات کے سلسلے میں اُنھوں نے یہ کیا ہے کہ 14 اگست 1947ء سے لے کر زمانۂ حال تک پاکستان کی جن اہم شخصیات کا انتقال ہوا ہے، اُن کی تاریخ ہائے وفات مع مختصر کوائف حروفِ تہجّی کے اعتبار سے مُرتب کر دی ہیں۔ یہ کام دو جلدوں میں شائع ہو چکا ہے۔ پہلی جلد ''وفیاتِ مشاہیرِ پاکستان'' کے نام سے 1990ء میں طبع ہوئی تھی۔ اس میں 14 اگست 1987ء تک یعنی قیامِ پاکستان کے بعد چالیس برس میں وفات پانے والی شخصیات کا تذکرہ ہے۔ دوسری جلد ''وفیاتِ اعیانِ پاکستان'' کے نام سے 1992ء میں شائع ہوئی ہے، اس میں 1990ء تک کی مرحوم شخصیات کے کوائف ہیں۔

اس کام کی اہمیت کا اندازہ اس سے کرنا چاہیے کہ یہ تینتالیس برسوں پر پھیلا ہوا ہے۔ اس تمام عرصے میں پروفیسر محمد اسلم ایک لمحے کے لیے بھی اس کام سے غافل نہیں ہوئے اور بچھڑنے والوں کے کوائف جمع کرتے رہے۔ اُردو زبان میں شاید ہی کوئی کتاب کسی فردِ واحد نے اتنے طویل عرصے تک مُرتب کی ہو۔ اِس سے فاضل مُرتب کی اُس لگن کا اندازہ کیا جاسکتا ہے جو اُنھیں اس مفید کام سے ہے۔

پروفیسر صاحب کا دوسرا کام جو پہلے سے بھی زیادہ دِقّت طلب ہے، یہ ہے کہ وہ قبرستانوں میں جا کر اہم افراد کی قبریں دریافت کرتے ہیں اور اُن کے کتبے نقل کر لیتے ہیں۔ بِرصغیر پاک و ہند کے کئی شہروں میں اُنھوں نے یہ کام کیا ہے اور بے شمار کتبے نقل کر کے رسالوں میں قسط وار شائع کرائے ہیں۔ دوشہروں (کراچی اور لاہور) کی حد تک یہ کام مکمل ہو چکا ہے۔ کراچی سے متعلق کتبات پر ایک کتاب ''خفتگانِ کراچی'' کے نام سے 1991ء کے آخر میں شائع ہو چکی ہے اور اب لاہور کے کتبات پر مشتمل زیرِ نظر کتاب منصۂ شہود پر آ رہی ہے۔

لاہور صدیوں سے ایک عظیم ثقافتی و سیاسی مرکز کی حیثیت رکھتا ہے۔ عالمی تہذیب کو باثروت بنانے میں اس شہر نے بے مثال تاریخی کردار ادا کیا ہے۔ یہاں ہر دور میں زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے اہلِ کمال بکثرت موجود رہے ہیں۔ اُن میں خاصی تعداد ایسے مشاہیر کی بھی ہے جنھیں اس شہر کی تہذیبی مرکزیت دور دراز علاقوں سے کھینچ کر لاتی رہی اور بالاخر اس شہر کی خاک نے اُنھیں اپنے دامن میں سمیٹ لیا۔ مولانا حالی نے دہلی کے بارے میں کہا تھا:

چپے چپے پہ عیاں گوہرِ یکتا ہیں تہہِ خاک
دفن ہوگا نہ کہیں اِتنا خزانہ ہرگز

یہی بات کاملاً لاہور پر بھی صادق آتی ہے۔

''قبرستانوں میں جا کر ہزارہا قبروں کے درمیان ممتاز افراد کی قبروں کو تلاش کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ مناسب دیکھ بھال نہ ہونے کی وجہ سے بعض قبرستانوں کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ قبروں کے درمیان چلنا پھرنا تقریباً ناممکن ہے۔ صفائی نہ ہونے کی وجہ سے جھاڑ جھنکار کی ایسی کثرت ہے کہ بہت سی قبریں تو نظر بھی نہیں آتیں۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ کتبوں کو پڑھنا اور پھر نقل کرنا کیسا مشکل کام ہوگا۔ یہ پروفیسر صاحب ہی کا حوصلہ ہے کہ اُنھوں نے سالہا سال اس صبر آزما کام کو جاری رکھا اور بالآخر ایک ایسا تذکرہ مرتب کر دیا جس سے تحقیق کے باب میں بہت سی مشکلیں آسان ہو جائیں گی۔''

پروفیسر محمد اسلم کی اپنے وقت کے کئی دانشوروں سے گہری دوستی تھی۔ اُن میں حکیم سعید (ہمدرد) اور اشرف صبوحی کے نام نمایاں ہیں۔ وہ دوستوں اور طالب علموں میں اپنے خاص طرزِ اُستادی کے باعث اپنی مثال آپ تھے۔ ایک مرتبہ وہ اشرف صبوحی اور اُن کے بیٹے حبیب اشرف کے ساتھ کہیں بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک طالب علم نے پروفیسر محمد اسلم کے گھر کا پتا جاننا چاہا تو اُس طالبِ علم کے ساتھ کچھ اس طرح کے مکالمات ہوئے۔

''آپ نے سمن آباد کا علاقہ تو دیکھا ہوا ہے...... نا......''

''جی ہاں......''

''ٹھیک، تو آپ جانتے ہیں کہ حضرت نوحؑ کی کتنی عمر تھی......؟''

''950 برس''

''نوحؑ نام کے لیے کونسا انگریزی حرف استعمال کیا جاتا ہے؟''

''سر اُن کے نام کے لیے ''N'' استعمال کیا جاتا ہے۔''

''تو میاں صاحبزادے 950۔ N سمن آباد میری رہائش ہے۔''

اُن کے اس طرح پتا سمجھانے پر احباب بہت محظوظ ہوئے۔ اسی طرح ایک محفل میں کتابوں کے مطالعے کی بتدریج کمی پر بحث ہو رہی تھی۔ اس پر پروفیسر محمد اسلم نے ایک انتہائی باریک اور طنزیہ بات کی:

''اگر پاکستانی قوم پورے مہینے میں صرف ایک کِلو گوشت کم کھائے اور اُن پیسوں سے کتاب خریدے تو ایک بار پھر سے پڑھنے لکھنے کا رُجحان قائم ہوسکتا ہے۔''

اُن کی تحریریں انتہائی اہم ملکی اور غیر ملکی جرائد کا حصہ بنتی رہیں جن میں نقوش جیسے ادبی مجلّے بھی شامل تھے۔ اُن کی تحریروں کا حوالہ اُن کی کتاب ''تاریخی مقالات'' کے پیش لفظ مصنفہ شیخ عبدالرشید میں موجود ہے:

شعبۂ تاریخ پنجاب یونیورسٹی لاہور کے جواں سال اُستاد اور تاریخ کے ہونہار طالبِ علم مسٹر محمد اسلم پاکستان، بھارت اور بیرونی ممالک کے علمی و ادبی حلقوں میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ وہ جامعاتِ پنجاب، ڈرہم، مانچسٹر اور کیمبرج کے فارغ التحصیل ہیں۔ اُن کی اوّلیں تصنیف دِین الٰہی کے موضوع پر دہلی سے شائع ہوئی تھی۔ حال ہی میں اِس کتاب کا جدید ایڈیشن طویل اضافوں کے ساتھ لاہور سے ندوۃ المصنفین کی اولین پیشکش کے طور پر۔ دینِ الٰہی اور اس کا پس منظر۔ کے نام سے شائع ہوا۔ دینِ الٰہی ایک متنازعہ فیہ مسئلہ ہے اور اس کے متعلق عوام میں خاصی غلط فہمی پائی جاتی ہے۔ دِین الٰہی کے موضوع پر مسٹر محمد اسلم کی کتاب سے زیادہ مُستند کتاب آج تک نہیں لکھی گئی۔ اس کتاب کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ فاضل مصنف نے اس کی تالیف کے دوران ایسے بہت سے مخطوطات سے استفادہ کیا ہے جو اب تک مستشرقین یورپ اور خود ہمارے تاریخ دانوں کی نگاہوں سے اوجھل رہے ہیں۔ فاضل مصنف کے بعض نظریات سے اختلاف ہوسکتا ہے لیکن جہاں تک ماخذ سے استنباط کا تعلق ہے، وہ شک و شبہ سے بالا ہے۔ مصنف نے جس محنت تجسس اور ذوق اور شوق کے ساتھ اس کتاب کے لیے مواد اکٹھا کیا ہے اور پھر اسے جس قرینے کے ساتھ ترتیب دیا ہے، وہ اُسی کا حصہ ہے۔

مسٹر محمد اسلم کی تازہ تصنیف تاریخی مقالات، ندوۃ المصنفین کی دوسری پیشکش ہے۔ زیبِ عنوانِ کتاب عزیزِ موصوف کے ان مقالات پر مشتمل ہے جو پاکستان اور بھارت کے بلند پایہ علمی و ادبی جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ یہ مقالات جن کا بظاہر ایک دوسرے سے کوئی ربط نہیں، اپنے اندر وسیع معلومات کو سمیٹے ہوئے ہیں۔ ان کے مطالعہ سے جہاں مصنف کے تبحرِ علمی اور وسیع معلومات کا پتا چلتا ہے، وہیں اُس صبر آزما محنت اور لگن کا بھی اندازہ ہوتا ہے جس کے ساتھ عزیز گرامی نے ہمارے گم شدہ علمی اور ثقافتی ورثے کا کھوج لگا کر اپنے قارئین کو نامور مسلم فضلا اور اُن کے علمی کارناموں سے متعارف کرایا ہے۔''

(تاریخی مقالات، صفحہ 7)

پروفیسر محمد اسلم کی تحریروں میں ایک خاص قسم کا نظریاتی رنگ بھی نمایاں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی زندگی اور انتقال کے بعد بھی اُن کی تحریروں سے اُصولی اختلافات کا سلسلہ جاری رہا۔ راقم کو بذاتِ خود اُن کی کئی تحریروں سے خاصا اختلاف رہا۔ خصوصاً اُن کی ایک تحریر ''اورنگ زیب کی تخت نشینی میں علما و مشائخ کا کردار'' کے عنوان سے ملتی ہے۔ اس مضمون کی پہلی چند سطریں ہی بحث کی دعوت دیتی ہیں:

''شاہ جہان کی تخت نشینی کے لیے اُس کے بیٹوں میں جنگ ناگزیر تھی۔ اس لیے وہ حصولِ تخت کے لیے علما اور عوام کی حمایت حاصل کرنے میں کوشاں تھے۔ تخت نشینی کے لیے جنگ اورنگ زیب اور داراشکوہ کے درمیان نہ تھی بلکہ اصل معرکہ راسخ العقیدہ اور آزاد خیال مسلمانوں، شریعت اور آزاد تصوف، وحدت الشہود اور وحدت الوجود پابندِ شریعت نقشبندیوں اور حضرت مجدد الف ثانی اور ہردے رام کے نظریات کے درمیان تھا۔ اگر اورنگ زیب اوّل الذکر گروہوں کا نمائندہ تھا تو داراشکوہ مؤخر الذکر گروہوں کا علمبردار تھا۔''

(تاریخی مقالات، صفحہ 283)

اُنھوں نے مُغل بادشاہوں اور شہزادوں کی آپسی جنگ کے تسلسل کو پسِ پشت ڈال کر اورنگ زیب کو راسخ العقیدہ مسلمانوں کا نمائندہ اور داراشکوہ کو ہندوؤں اور آزاد خیال مسلمانوں کا نمائندہ قرار دے دیا اور تخت نشینی کی اس جنگ کو حق و باطل کی جنگ کی شکل میں بیان کیا۔ داراشکوہ بذاتِ خود حضرت میاں میرؒ کے معتقدین میں سے تھا، اُس نے اُن کی رہنمائی میں ''سفینة الاولیا'' جیسی اہم کتاب تحریر کی۔ اُس کے بعد حضرت میاں میر کی شان میں ''سکینة الاولیا'' بھی تحریر کی۔ شاہ جہاں ابھی زندہ تھا اور اورنگ زیب نے اپنے سگے باپ کو اقتدار کے لیے قلعے میں قید کر دیا۔ اپنے بھائیوں اور بھتیجوں کو قتل کیا۔ داراشکوہ کا سر کاٹ کر شاہ جہان کو بھجوایا۔ یہ تمام کام نہ صرف مُغلوں بلکہ کئی دیگر بادشاہوں میں بھی نظر آتے ہیں۔ مُحقق کو ہمیشہ حقائق پر توجہ دینی چاہیے۔ اورنگ زیب جیسے حکمران کی اس طرح کی مدح سرائی سمجھ سے بالاتر ہے اور خصوصاً پروفیسر محمد اسلم جیسے انتہائی محنت کش اور قابل محقق سے اس طرح کے رویے کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

نظریاتی اختلافات ایک جانب رکھ کر میں ذاتی طور پر اُن کے کام اور تحقیق کا انتہائی قدر دان ہوں اور خصوصاً لاہور کی تاریخ کے حوالے سے یہ بات انتہائی اہم ہے کہ اگر اُن کی کتاب ''خفتگانِ خاکِ لاہور'' منصۂ شہود پر نہ آتی تو آج کے تاریخ کے طلبہ کو وہ بھرپور روشنی ہرگز نہ ملتی جس سے آج وہ استفادہ کر رہے ہیں۔ کھوج اور محنت کا رنگ اُن کی اسی کتاب کی سب سے پہلی تحریر ''قبرستان میانی صاحب'' میں دیکھا جا سکتا ہے:

> ''یہ لاہور کا سب سے بڑا قبرستان ہے۔ سلاطینِ دہلی کے زمانے میں لاہور کا سب سے بڑا قبرستان، بی بی حاج تاج کا قبرستان تھا جو اِن دنوں قبرستان بیبیاں پاک دامناں کے نام سے موسوم ہے۔ مُغلوں کے دور میں شاہ ابو المعالی کا قبرستان سب سے بڑا قبرستان مانا جاتا تھا۔ موجودہ گوالمنڈی، دیال سنگھ کالج، نسبت روڈ، میکلوڈ روڈ، ایبٹ روڈ، فلیمنگ روڈ اور عبدالکریم روڈ اسی قبرستان پر آباد ہیں۔ رنجیت سنگھ نے ۱۸۳۲ء میں مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ اب قبرستان کو شہر سے دُور لے جائیں۔ اس کے بعد لوگوں کا رُخ میانی صاحب کی طرف ہوا۔ ویسے یہاں پہلے

بھی چند مزارات تھے۔ ان میں میر میراں گیلانی (م۱۵۷۸ء) حضرت شیخ محمد طاہر بندگیؒ (م۱۶۳۰ء) اور حاجی نُور پراچہ (م۱۹۴۵ء) کی قبریں تاحال موجود ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ پہلے یہاں علماء کی بستی تھی۔ پنجاب کے عوام عالم کو میاں جی کہہ کر مخاطب کرتے ہیں، اس لیے اس بستی کا نام میانی پڑ گیا۔ ایک روایت یہ بھی کہ میانہ ایک گوت ہے جو گوندل قوم کی شاخ ہے۔ اس گوت کے لوگ یہاں آباد تھے۔

اس وقت جتنے مشاہیر اس قبرستان میں مدفون ہیں، اس کی نظیر پاکستان کے کسی قبرستان میں نہیں ملتی۔ ان میں سے کئی اصحابِ قبور پر پی ایچ ڈی کے مقالے لکھے جا چکے ہیں۔''

''خفتگانِ خاکِ لاہور'' کی وجہِ تحریر اور دیگر معاملات کی تفصیلات پروفیسر محمد اسلم نے کتاب کے ابتدائی مضمون ''گزارشِ احوال'' میں درج کی ہیں۔ یہ مضمون انتہائی دلچسپ ہے اور تاریخی معاملات پر روشنی ڈالتا ہے۔ چند اِقتباسات:

''راقم نے اس بات کا بھی مشاہدہ کیا ہے کہ کتبے سے صاحبِ قبر کے عقائد بھی معلوم ہو جاتے ہیں۔ دیو بندی مسلک سے تعلق رکھنے والے اصحابِ قبور کے کتبوں پر اللہ محمد اور یا حی یا قیوم کندہ ہوتا ہے۔ بریلوی مسلک سے تعلق رکھنے والے اصحاب قبور کے کتبوں پر یا اللہ جل جلالہ، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا پھر صلی اللہ علیک یا رسول اللہ مرقوم ہوتا ہے۔ جن اصحابِ قبور کا رُجحان تصوف کی جانب ہوتا تھا، اُن کے کتبوں پر یا غوث الاعظم دستگیر ما، یا شیخ عبدالقادر جیلانی شیاء اللہ یا اُن کے سلسلۂ تصوف کے اساطین کے اسما رقم ہوتے ہیں۔ اثنا عشری فرقے کے اصحاب کی قبور پر عموماً کلمہ طیبہ کے بعد علی ولی اللہ وصی رسول اللہ خلیفتہ، بلافصل اور دوازدہ آئمہ کرام کے اسما رقم ہوتے ہیں۔

الواحِ قبور سے خاندانی شجرے مرتب کرنے میں بھی مدد ملتی ہے۔

مثال کے طور پر خواجہ عبدالمجید صاحبِ جامع اللغات، کے کتبے پر اُن کے والد کا نام کریم بخش اور دادا کا نام محمد بُوٹا کندہ ہے جو شاید اور کسی طریقے سے معلوم نہیں ہوسکتا تھا۔

بعض اصحابِ ذوق اپنے اعزہ کی وفات پر مشہور شاعروں سے قطعاتِ تاریخ لکھوا کر کتبات پر کندہ کروا دیتے ہیں، یہ قطعات عموماً فرمائش پوری کرنے کے لیے لکھے جاتے ہیں، اس لیے شعرا اس کا ریکارڈ نہیں رکھتے۔ یوں بہت سے نامور شعرا کا کلام قبرستانوں میں بکھرا پڑا ہے۔ لاہور میں ایسی قبریں موجود ہیں جن پر علامہ اقبالؒ، حفیظ ہوشیار پوری، ابوالاثر حفیظ جالندھری، رئیس امروہوی، سیماب اکبر آبادی، احسان دانش، اُستاد داغ، صوفی تبسم، علامہ تاجور نجیب آبادی، غلام رسول مہر اور آغا خلش کی کہی ہوئی تاریخیں کندہ ہیں اور یہ ان میں سے اکثر شعرا کے کلام میں محفوظ نہیں ہیں۔ میں نے اُنھیں محفوظ کر لیا ہے۔ یہ کتبات مستقبل قریب میں ختم ہو جائیں گے۔ قبرستانوں میں سیم تھور کا مسئلہ پیدا ہو گیا ہے، جو سنگِ مرمر کو تباہ کر رہا ہے۔ بچے قبرستانوں میں کرکٹ کھیلتے اور پتنگ اُڑاتے ہیں، آوارہ جانور قبرستانوں میں پھرتے ہیں، اس سے بھی الواح کو نقصان پہنچتا ہے۔

لاہور خطاطی کا ایک عظیم مرکز رہا ہے۔ لاہور کے قبرستانوں میں امام وبردی، منشی عبدالمجید پروین رقم، حاجی دِین محمد، محمد صدیق الماس رقم، منشی تاج الدین زریں رقم، حافظ محمد یوسف سدیدی اور سید نفیسی رقم شاہ کے لکھے ہوئے کتبے موجود ہیں جنھیں اب عجائب گھر میں محفوظ کر لینا چاہیے کیونکہ مستقبل قریب میں اُن کے پائے کا کوئی خطاط اُبھرتا ہوا نظر نہیں آتا۔

لاہور کے قبرستانوں میں تجاوزات شروع ہو چکی ہیں۔ میانی صاحب کا قبرستان گزشتہ صدی میں چودہ سو کنال رقبے پر پھیلا ہوا تھا۔ اب اس

کا رقبہ آٹھ سو کنال رہ گیا ہے۔ چھ سو کنال پر باغ گل بیگم، نیا مزنگ، اسلامیہ پارک، سعدی پارک اور بہاول شیر روڈ کی بستیاں بس چکی ہیں۔ دوسرے قبرستانوں کا بھی یہی حال ہے۔ خدا بہتر جانتا ہے کہ کتنے مشاہیر کی قبروں کے نشان مِٹ چکے ہیں۔ جناب بشیر ہندی مرحوم نے ایک بار جامی لاہوری کے مزار کا نشان مجھے دِکھایا تھا۔ میں نے ان سے درخواست کی کہ وہ اس پر کتبہ لگوا دیں، میں کتبے کے مصارف برداشت کرنے کے لیے بھی تیار تھا۔ اُنھیں ایام میں بشیر ہندی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اب جامی لاہوری کی قبر کا نشان بھی باقی نہیں رہا، ایک روز اُنھوں نے مجھے مشہور مُغنیہ عنایتی ڈھیرو والی کی قبر دکھائی جس کا چند روز پہلے ہی انتقال ہوا تھا۔ اب میں کئی بار اس جگہ گیا ہوں لیکن قبر کا نشان نہیں رہا۔ اس کی قبر حکیم غلام جیلانی کی قبر سے جانبِ قبلہ پندرہ بیس میٹر کے فاصلے پر تھی۔ علامہ تاجور نجیب آبادی کی قبر کی مَیں نے نشاندہی کی تو جناب عبدالصّمد صارم نے اس پر کتبہ لگوا دیا اور اس پر 30 جنوری کے بجائے 29 جنوری لکھوا دیا۔ اس طرح کے مٹتے ہوئے قبرستانوں میں الواح قبور کو محفوظ کرنا اور بھی ضروری ہو گیا ہے۔

اُردو زبان میں ابھی تک کسی نے Epigraphy کے موضوع پر کام نہیں کیا، میں نے اب یہ طرح ڈال دی ہے۔ وکان سعیکم مشکوراً۔"

پروفیسر محمد اسلم نے اپنی تحقیق کے دوران میں دُنیا کی کئی لائبریریوں سے استفادہ کیا۔ اُس وقت، آج کی جدید سہولیات نہیں تھیں، اس لیے قلمی نسخوں اور دیگر اہم کتب کی فوٹو کاپیاں کروائی جاتی تھیں اور انتہائی مخدوش حالت میں موجود کتب کو کیمرے سے مائیکرو فلم میں محفوظ کر لیا جاتا تھا۔ پروفیسر محمد اسلم نے اپنی کئی تحریروں میں ان کتب کی فوٹو کاپیاں اور مائیکرو فلم کے حوالہ جات دیے ہیں۔ اُن میں سے ایک بڑی تعداد انتہائی نادر اور نایاب کتب کی ہے۔ کوئی بھی حکومتی یا نجی ادارہ اُن کتب کی کاپیاں اُن کے بچوں سے حاصل کر کے سلسلہ وار چھاپنا شروع کرے تو وہ نہ صرف تاریخ کے طالبہ بلکہ عام قارئین کے لیے بھی انتہائی

مُفید ہوں گی۔

پروفیسر محمد اسلم نے اعلیٰ پایے کے کئی تاریخی اور تحقیقی مضامین تحریر کیے۔ قارئین کی دلچسپی کے لیے ان کے ایک مضمون ''شاہانِ مُغلیہ کا ذوقِ موسیقی'' میں سے ایک اقتباس:

''شاہی دربار کے علاوہ صوفیائے کرام کی خانقاہیں بھی اس دور میں موسیقی کا گہوارہ بن گئی تھیں۔ عہدِ شاہجہاں میں قادریہ سلسلہ کی ترویج کے ساتھ سماع کو بھی فروغ ہوا اور اس سلسلہ کے بزرگوں نے دل کھول کر گویّوں کی سرپرستی کی۔ قادری بزرگوں کے علاوہ شطاریہ سلسلہ کے درویشوں نے بھی موسیقی کی ترویج میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس جگہ ایک شطّاری بزرگ شیخ پیر کا ذکر بے جا نہ ہوگا جو عہدِ شاہجہاں میں میرٹھ میں رہتے تھے۔ اُنھیں قدرت نے ذوقِ موسیقی ودیعت کیا تھا اور اُن کی خانقاہ میں ہر وقت شعر و نغمہ کی محفل جمی رہتی تھی۔ شاید اسی سبب سے اُن کے ہم عصر اُنھیں سببِ رونقِ اربابِ غنا کہتے تھے۔ طبقات شاہجہانی کا مؤلف اُن کے متعلق رقم طراز ہے کہ:

بوجدو سماع میلانِ خاطر عظیم داشت دنقشہائے ہندی می است و عرسہائے بزرگان خودمی کردہ و مجلس ہا عالی برپانمود ونقشہائے دی تاثیر عجب دارد

وجد و سماع کی طرف ان کا میلان بہت زیادہ تھا اور وہ خود بھی ہندی راگ ترتیب دیا کرتے تھے وہ اپنے بزرگوں کے عرس مناتے اور اس موقع پر بڑی بڑی مجالس منعقد کرتے ۔ اُن کے مُرتب کردہ راگوں میں ایک عجیب اَثر ہوتا تھا۔

شیخ پیر میرٹھی کے انتقال پر محمد صادق نے یہ تاریخ کہی تھی:

گفت تاریخ وفاتش خرد دُور اندیش
وِہ کہ از مردنِ دی بی سروپا شد نغمہ

(ترجمہ) اگر نغمہ کے سر اور پاؤں یعنی ''ن'' اور ''ہ'' حذف کر دیے جائیں تو ''غم'' باقی رہ جاتا ہے اور حروفِ ابجد کے حساب سے اس

کے عدد 1040 ہوتے ہیں اور یہی اُن کا سالِ وفات ہے۔

راگ درپن میں سیف خان نے عہدِ شاہجہاں کے جن 33 موسیقاروں کا ذکر کیا ہے اُن میں صوفی بہاء الدین سرِفہرست ہیں۔ آپ جھنجھانہ کے ایک قریبی گاؤں برناوہ کے رہنے والے تھے لیکن سیر و سیاحت کا شوق اُنھیں اوائلِ عمر میں ہی دکن لے گیا۔ وہاں آپ نے 25 سال درویشوں کی خدمت میں گزارے اور اُن کی صحبت میں رہتے ہوئے خود بھی درویشِ کامل بن گئے۔ آپ ہمیشہ سبز رنگ کا لباس زیبِ تن کرتے تھے۔ سیف خان رقم طراز ہے کہ دکن میں رہتے ہوئے آپ نے سنگیت میں کمال حاصل کیا۔ شاہجہان کے دور میں اس فن میں اُن کا کوئی ہمسر نہ تھا۔ آپ ترانہ اور خیال بہت اچھا گاتے تھے اور رُباب اور بین امرتی بجانے میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔

آپ نے — خیال — نامی ایک ساز بھی ایجاد کیا تھا۔ پچاس سال کی عمر میں آپ دکن سے واپس لوٹے اور بقیہ عمر اپنے آبائی وطن میں فقر و تجرد میں گزار دی۔ سیف خان کی روایت کے مطابق آپ نے 117 سال کی عمر پائی۔

شیخ شیر محمد بھی اس دور میں ایک نامور موسیقار اور صاحبِ دل درویش ہوئے ہیں۔ اُن کی تربیت صوفی بہاء الدین اور شیخ نصیر الدین نے کی تھی۔ شیخ نصیر الدین کی دعا سے اُنھوں نے نغمہ و سرود میں خوب ترقی کی اور سُلطان حسین شرقی کی طرز کو مقبول بنانے میں پوری تندہی سے مصروف رہے۔ سیف خان نے اُنھیں سنا تھا اور اس کے خیال میں وہ ''خیال'' خُوب گاتے تھے اور اس پر طرہ یہ کہ اُن کے گانے میں درد ہوتا تھا۔ شاید اسی وجہ سے وہ درویشوں کی مجالس میں بڑے مقبول تھے۔ وہ خیال کے علاوہ ترانہ اور تکلہ بھی گا لیتے تھے۔

ع مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی

اُنھوں نے پٹنہ میں بمرضِ استسقا وفات پائی اور اس وقت اُن کی عمر پچاس اور ساٹھ سال کے درمیان تھی۔عنایت خان راسخ، شیخ شیر محمد کو اکبر آباد کے رہنے والے بتاتا ہے اور اس کے خیال میں وہ قوالی کے بھی بڑے ماہر تھے اور گاہے بگاہے شاہجہان کے حضور میں اس فن کا مظاہرہ کرتے رہتے تھے۔

میاں ڈالوڈاڈھی شیخ شیر محمد کے ہم قوم اور اپنے فن میں یکتائے روزگار تھے۔ وہ درویشانہ وضع رکھتے تھے اس لیے اہل دولت سے ملنا جلنا اُنھیں ناپسند تھا۔سیف خان نے اُن کا راگ سن کر یہ کہا تھا:

درد دہر پدخواندن ہچو اُو دیگری شنید

(یعنی) ان جیسا دُھر پد اور کوئی گو یا نہیں گا سکتا

سیف خان جیسے فنکار کو بھی اس بات کا اعتراف ہے کہ:

وی سُبو ہچومی نواخت کہ مثل او دیگری

نشد ہ در ہیچ عصری نشیدہ

(یعنی) وہ گھڑا بجانے میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے اور

کسی دور میں بھی اُن جیسا فنکار سننے میں نہیں آیا۔

میاں ڈالو نے اکبر آباد میں ذات الجنب کے مرض سے وفات پائی۔ اُن کی عمر کچھ زیادہ نہیں ہوئی۔

شیخ شیر محمد کا بھائی پوجا بھی اچھا گو یا تھا۔ وہ بعارضہ بھگندر اکبر آباد میں فوت ہوا۔ وفات کے وقت اس کی عمر پچاس اور ساٹھ سال کے درمیان تھی۔ شیخ شیر محمد کا پوتا معین الدین بھی اپنے آبائی فن میں کامل دسترس رکھتا تھا۔شاہنواز خان کا بیان ہے کہ وہ خیال بہت ہی اچھا گاتا تھا۔عنایت خان راسخ نے اُسے رسالہ ذکرِ مغنیانِ ہندوستان کی تدوین کے وقت احمد شاہ کے پانچویں سال جلوس میں دیکھا تھا، اس وقت کافی مُعمر ہو چکا تھا۔ اُس کا یہ کہنا ہے کہ اپنے زمانے میں وہ قوالی اور ترانہ

گانے میں اپنی مثال آپ تھا۔

میاں ڈالو ڈاڈھی کا شاگردِ رشید شیخ کمال بھی بڑا اچھا گویا تھا۔ سیف خان کے ساتھ اس کی اکثر صحبت رہتی تھی۔ 1076ھ میں راگ درپن کی تصنیف کے وقت شیخ کمال بقیدِ حیات تھا لیکن نغمہ وسرود سے کنارہ کش ہوکر فوج میں بھرتی ہو چکا تھا۔

کبیر قوال شیخ شیر محمد کا شاگرد تھا اور قوالی کے فن میں اپنے اُستاد سے بھی گوئے سبقت لے گیا تھا۔ اس نے قوالی کی ایک نئی طرز وضع کی تھی۔ شاہی دربار میں بھی اسے بڑی عزت کا مقام حاصل تھا۔ راگ درپن کی تصنیف کے وقت وہ زندہ تھا اور سیف خان کو اکثر راگ اور قوالی سے محظوظ کرتا رہتا تھا۔

باقیائی نائی بڑی اچھی طبیعت کا مالک تھا اور اُس نے ہندوستانی اور ایرانی نغموں کو ملا کر ایک نئی طرز نکالی تھی۔ ماہرین فن کا یہ کہنا ہے کہ باقیائی نائی کے راگ میں بڑی تاثیر تھی۔ ایک موقع پر اس نے شاہجہان کی مدح میں قصیدہ پڑھا جس کے صِلہ میں اسے اپنے وزن کے برابر پانچ ہزار روپے ملے۔ سیف خان نے روز قوال کے فن کی بھی تعریف کی ہے۔ وہ بھی شاہجہان کے حضور میں قوالی پیش کیا کرتا تھا۔ شاہجہان کے عہد میں شیخ شیر محمد، کبیر، روڑا اور میر صالح بڑے اونچے پایہ کے قوال تھے اور اس فن میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ ان کا زیادہ تر وقت درویشوں کی خانقاہوں میں ہی گزرتا تھا بلکہ حق تو یہ ہے کہ اُنھیں کے دم قدم سے کئی خانقاہوں کی رونق قائم تھی۔ پیشہ ور گویوں میں سے جہانگیر کا درباری طبنورہ نواز شوقی ہنوز زندہ تھا۔ وہ ہندی اور ایرانی راگ سے کماحقہٗ واقف تھا۔ جہانگیر نے اپنی تزک میں اور سیف خان نے راگ درپن میں اس کے کمالِ فن کا اعتراف کیا ہے۔

جگن ناتھ کلاونت شاہجہان کا درباری گویا تھا اور دُھرپد گانے میں اپنا ثانی نہ رکھتا تھا۔ سیف خان کا کہنا ہے کہ تان سین کے بعد اس جیسا گویّا سرزمینِ ہندوستان میں پیدا نہیں ہوا۔ جب تان سین نے جگن ناتھ کو گاتے ہوئے دیکھا تو بے ساختہ کہا کہ اس کے بعد وہ اس فن پر کام کرے گا۔ قزوینی ساتویں سال جلوس کے واقعات کے ضمن میں اس کے متعلق لکھتا ہے:

جگنات کلاونت کہ بخطاب مہا کب رائے نامور است، دور ساختن تصنیف ہندی د پیدا کردن معانی بلند ومضامین عالی امروز نظیر نہ دارد د بندگان حضرت لورا بواسطہ بستن تصانیف کہ ہندیان آنرا درپت گویند در دارالسلطنت لاہور گذاشتہ بوند سعادت اندوز ملازمت گشتہ دوازدہ تصانیف کہ بنام ہمیون آنحضرت بمضامین تازہ درنغمات مختلف ساختہ بود بحضور اشرف خواند و پسند خاطر مشکل پسند بادشاہ ورنکتہ دان افتاد و برحسبِ اشارہ علیہ اور ابزر وزن کردہ چہار ہزارد پانصد روپیہ کہ ہم سنگ او برآمد باؤ مرحمت فرمودند۔

جگن ناتھ کلاونت جو مہا کب رائے کے لقب سے مشہور ہے، بلند پایہ اور معنی خیز ہندی راگ تصنیف کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ بادشاہ سلامت نے اسے ہندی راگ جنھیں دُھرپد کہتے ہیں، تصنیف کرنے کے لیے لاہور میں چھوڑا ہوا تھا۔ حضور میں باریاب ہوا۔ اس نے وہ بارہ راگ جو بادشاہ کے نام پر مرتب کیے تھے، حضور میں پیش کیے جو دانشور اور نکتہ ور بادشاہ کی مشکل پسند طبیعت کو پسند آئے۔ بادشاہ کے حکم سے اسے روپوں کے عوض تولا گیا اور اس کے وزن کے برابر چار ہزار پانچ سو روپے اُسے مرحمت ہوئے۔

عہدِ شاہجہاں کے تمام مؤرخین نے جگن ناتھ کے کمالِ فن کا بڑی فراخ دلی کے ساتھ اعتراف کیا ہے۔ یاد رہے کہ یہ وہی ''متعصب'' شاہجہان ہے جس نے خطۂ بنارس میں چھہتر مندر مسمار کروا دیے تھے۔ شاہجہان نے جہاں قاضی محمد اسلم ہرویؒ اور مولانا عبدالحکیم سیالکوٹیؒ جیسے جیّد اور مُستند علما کو روپوؤں کے عوض تلوایا تھا، وہاں اس نے جگن ناتھ جیسے ہندو موسیقی دان کی بھی ویسی ہی عزت افزائی کی۔ ہمارے خیال میں جہاں تک علم وفن کا

تعلق ہے، ہندو اور مسلمان دونوں اس کی نظر میں مساوی تھے۔
مسلمان موسیقاروں میں دربارِ شاہجہاں میں لعل خان کلاونت کا بڑا اُونچا مرتبہ تھا۔لعل خان ابھی نوعمر میں ہی تھا جب وہ تان سین کی خدمت میں اکتسابِ فیض کی غرض سے حاضر ہوا۔ تان سین نے کمال توجہ سے اس کی تربیت شروع کی۔ ابھی یہ نوآموز ہی تھا کہ تان سین کو پیغامِ اجل آ پہنچا۔ اُس کی وصیت کے مطابق اس کے فرزند بلاس خان نے اسے اپنی شاگردی میں لے لیا۔ جب وہ اس فن میں خوب طاق ہوگیا تو بلاس خان نے اپنی بیٹی اس کے حبالۂ نکاح میں دے دی۔ سیف خان نے اسے اپنے وقت کا سب سے بڑا دُھرپد راگی لکھا ہے۔عبدالحمید لاہوری کے بادشاہ نامہ سے بھی سیف خان کے بیان کی تصدیق ہوتی ہے۔
شاہجہان کے دربار میں اُس کا بڑا عالی رتبہ تھا اور وہ تان سین کی جگہ پر کھڑا ہو کر اپنا راگ پیش کیا کرتا تھا۔ شاہجہاں کو چونکہ دُھرپد راگ بے حد مرغوب تھا، اس لیے وہ لعل خان کی بڑی قدر کیا کرتا تھا اور ہر جشن کے موقع پر اسے انعام و اکرام سے لاد دیا کرتا تھا۔عبدالحمید لاہوری کی روایت کے مطابق ایک بار بادشاہ نے اسکا راگ سن کر اُسے گن سمندر کا خطاب اور ایک ہاتھی بطورِ انعام دیا تھا۔
لعل خان نے ۱۰۶۲ھ میں بعارضۂ فالج انتقال کیا، بقولِ سیف خان وفات کے وقت اس کی عمر اسّی برس کے لگ بھگ تھی۔
لعل خان کے بیٹے خوشحال خان اور بسرام خان بھی شاہی دربار میں ملازم تھے۔ ان میں سے اوّل الذکر کا راگ شاہجہان کو بہت پسند تھا۔لعل خاں کے مرنے کے بعد اس کا منصب خوشحال خان کو ملا اور اسے بھی تان سین کے مقام پر کھڑے ہو کر گانا پیش کرنے کا شرف حاصل تھا۔‘‘
(تاریخی مقالات،صفحہ 159)

پروفیسر محمد اسلم نے تحقیق کے ساتھ ساتھ ایک مُعلم کی حیثیت سے بھی اپنے فرائض انجام دیے۔ پنجاب یونیورسٹی کے ساتھ ساتھ وہ مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی میں بھی کام کرتے رہے۔ اس اکیڈمی کا دفتر سمن آباد میں ''ہریاں کوٹھیاں'' کے پاس تھا۔ وہ کئی مرتبہ اکیڈمی سے مسجد جمعہ پڑھانے بھی چلے جاتے تھے۔ مزاج فلسفیانہ تھا اور آواز اونچی مگر ٹھہری ہوئی تھی۔ اس اکیڈمی ہی کے توسط سے ڈاکٹر وحید قریشی کے ساتھ دوستی کے رشتے گہرے ہوتے گئے۔ ملازمین کے ساتھ انتہائی مشفقانہ رویہ تھا۔ خاص طور پر اشرف نامی ملازم سے بڑا پیار تھا۔ اشرف آج کل مجلس ترقی ادب میں ملازم ہے اور اکثر اوقات اُن کے ساتھ گزرے لمحات لوگوں کو سناتا رہتا ہے۔ پروفیسر محمد اسلم کا انتقال 6 اکتوبر 1998ء کو ہوا اور اُنھیں اسی قبرستان میانی صاحب میں دفنایا گیا جس پر مرحوم نے سالہا سال تحقیق کی تھی۔ اُن کی قبر فتح شیر روڈ، نیا مزنگ سڑک کے ساتھ ہی ہے اور سڑک پر کاروباری حضرات بگھیاں باندھا کرتے تھے۔ آج کل وہاں رکشے مرمت کیے جاتے ہیں۔ قبرستان کا یہ حصہ احاطہ بابا حاموشاہ کہلاتا ہے۔ یہیں ڈاکٹر کاش کی فری ڈسپنسری بھی ہے جس کے شمال میں تین قبریں اکٹھی ہیں۔ جو چپسوں والی قبروں کے نام سے مشہور ہیں۔ اُن میں ایک قبر پروفیسر محمد اسلم کے والد کی اور ایک اُن کی والدہ کی ہے اور ان کے ساتھ ہی پروفیسر صاحب کی قبر ہے۔ اُن کی قبر کا کتبہ درج ذیل ہے:

هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ

پروفیسر محمد اسلم

ابن

چودھری طفیل محمد

''آہ! مؤرخ روانہ شد''

ولادت 28 نومبر 1932ء ۲۸ جمادی الاولیٰ ۱۳۵۱ھ

وفات 6 اکتوبر 1998ء ۱۳ جمادی الاخری ۱۴۱۹ھ

نوٹ: کتبے میں جمادی الاول اور جمادی الثانی کی جگہ، جمادی الاولیٰ اور جمادی الاخری کتبہ لکھنے والے کی اپنی اختراع بھی ہوسکتی ہے۔/ کچھ پرانی قبور پر اس طرح کی املاء دکھائی بھی دیتی ہے۔

مصنف کی دیگر تصانیف

سے	(ناولٹ)	سچیت کتاب گھر	(2009ء)
نین پران	(کہانیاں)	سچیت کتاب گھر	(2010ء)
چک نمبر 6	(شاعری)	سچیت کتاب گھر	(2011ء)
لہور دی وار	(تاریخ لہور)	سچیت کتاب گھر	(2011ء)
سجن نال میلہ	(پندھ کتھا)	سانجھ پبلی کیشنز	(2013ء)
بابا جی چاچا جی تے میں	(لوک کہانیاں، باتاں، شاعری)	سانجھ پبلی کیشنز	(2014ء)
کاں واگے بارڈر	(کہانیاں)	سانجھ پبلی کیشنز	(2017ء)

تالیفات

نوشاہی پھُل	کلام مولوی سراج الدین	سچیت کتاب گھر	(2008ء)
آکھیا قاضی نے	کلام قاضی اللہ دین کشش	سچیت کتاب گھر	(2008ء)

زیر طبع

کون/ یوگی مہاراج	(دو ناولٹ)	
لہور دی وار 2	(تاریخ لہور)	
بارش میں سورج	(افسانے)	مترجم: زاہد نبی
کنفیشن باکس	(ناول)	
وارکنیاں	(ناول)	
Lahore's Hidden Jewels	(تاریخ لاہور)	مترجم: ڈاکٹر اطہر سعید

یادداشتیں

مدثر بشیر 6رفروری 1974ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ سکول کی تعلیم کے دوران ہی میں اُنھوں نے مضامین اور کہانیاں تحریر کرنا شروع کر دیں۔ اُن کا پہلا افسانچہ ’’چاندنی‘‘ ایس ایم ظفر کی اِدارت میں شائع ہونے والے جریدے ’’بنیادی حقوق‘‘ میں اُس وقت شامل ہوا جب وہ گیارھویں جماعت کے طالبِ علم تھے۔

مدثر بشیر نے 1995ء میں محکمہ SNGPL میں ملازمت اختیار کی اَور ملازمت کے ساتھ ساتھ تخلیق کاری اَور تحقیق کا کام بھی جاری رکھا۔ اُنھوں نے سیاسیات‘ اُردو اَور تاریخ میں ایم اے اَور پھر ایم بی اے اَور ایل ایل بی بھی کیا۔ 2002ء سے 2006ء تک لیف (LEAF) اَور لاہور آرٹس فورم (Lahore ArtsForum) کے ساتھ مل کر اَلحمرا کلچرل کمپلیکس میں سنگیت اور اَدب کے پروگرام کراتے رہے۔ اُن کے بیشتر مضامین اَخبارات اَور اَدبی جرائد کا حصہ بنے۔ زیرِ نظر تالیف اُن کی دسویں کتاب ہے جبکہ اُن کی تین کتابوں ’’سمے‘‘ (ناولٹ)، ’’نین پران‘‘ (کہانیاں) اَور ’’بابا جی چاچا جی تے میں‘‘ (کہانیاں اَور باتاں) پر مختلف جامعات میں ایم اے اَور بی ایس آنرز کے مقالے (Thesis) لکھے جا چکے ہیں۔ اُن کی مختلف کتب پر ورلڈ پنجابی فورم‘ مسعود کھدر پوش ٹرسٹ اَور PILAC جیسے اِداروں سے ایوارڈ مل چکے ہیں۔ لاہور کی تاریخ اَور فکشن پر اُن کے پنجابی کام کا انگریزی‘ اُردو اَور ہندی میں ترجمہ ہو چکا ہے اَور اُن کی مختلف تحریریں گرمکھی لپی میں بھی چھپ چکی ہیں۔ اِس کتاب کے علاوہ مدثر بشیر کی پانچ کتابیں زیرِ ترتیب ہیں جو عنقریب منظرِ عام پر آ جائیں گی۔

سانجھ
SANJH
PUBLICATIONS
Book Street, 46/2 Mozang Road, Lahore, Pakistan.
Phone: +92 42 37355323. Fax: +92 04 37323950
e-mail: sanjhpk@yahoo.com, sanjhpks@gmail.com
Web: www.sanjhpublications.com
ISBN:978-969-593-282-7
9789695932827